آدمی کا باپ

محی الدین نواب

آدمی کا باپ

معاشرے کے نباض ہر دل عزیز مصنف محی الدین نواب کی سلگتی ہوئی معاشرتی کہانیاں

محی الدین نواب

علم و عرفان پبلشرز

الحمد مارکیٹ، 40۔ اُردو بازار، لاہور

فون: 37352332-37232336

نام کتاب	....	آدمی کا باپ
مصنف	....	محی الدین نواب
ناشر	....	گل فراز احمد
		علم و عرفان پبلشرز، لاہور
مطبع	....	زاہدہ نوید پرنٹرز، لاہور
پروف ریڈنگ	....	رخسانہ نازلی
کمپوزنگ	....	اکرم، انیس احمد
سن اشاعت	....	ستمبر 2011ء
قیمت	....	=/400 روپے

......ملنے کے پتے......

ویلکم بک پورٹ	خزینہ علم و ادب
اُردو بازار	الکریم مارکیٹ اُردو بازار
کراچی	لاہور
اشرف بک ایجنسی	کتاب گھر
اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی	اقبال روڈ کمیٹی چوک، راولپنڈی

ادارہ کا مقصد ایسی کتب کی اشاعت کرنا ہے جو تحقیق کے لحاظ سے اعلیٰ معیار کی ہوں۔ اس ادارے کے تحت جو کتب شائع ہوں گی اس کا مقصد کسی کی دل آزاری یا کسی کو نقصان پہنچانا نہیں بلکہ اشاعتی دنیا میں ایک نئی جدت پیدا کرنا ہے۔ جب کوئی مصنف کتاب لکھتا ہے تو اس میں اس کی اپنی تحقیق اور اپنے خیالات شامل ہوتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں کہ آپ اور ہمارا ادارہ مصنف کے خیالات اور تحقیق سے متفق ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم، انسانی طاقت اور بساط کے مطابق کمپوزنگ طباعت، تصحیح اور جلد سازی میں پوری احتیاط کی گئی ہے۔ بشری تقاضے سے اگر کوئی غلطی یا صفحات درست نہ ہوں تو از راہِ کرم مطلع فرما دیں۔ انشاء اللہ اگلے ایڈیشن میں ازالہ کیا جائیگا۔ (ناشر)

انتساب!

لاہور کی خوشگوار یادوں

کے نام!

فہرست

حرفِ اوّل

میں پچھلے چالیس برسوں سے لکھتا چلا آ رہا ہوں اور اتنے ہی برسوں سے میرے قارئین مجھے پڑھتے آ رہے ہیں۔ اس طویل مدت میں بے شمار نو عمر بچے مجھے پڑھتے پڑھتے جوان ہو گئے اور جوان میری کہانیوں میں محو ہو کر بوڑھے ہوتے چلے گئے۔

پچھلی دو صدیوں سے اُردو زبان کو بارہا عروج و زوال حاصل ہوتا رہا ہے اور ہر بار کتابوں کی اشاعت نے اس زبان کو سنبھالا ہے۔ تاریخ گواہ ہے کہ اُردو زبان کو دہلی، لکھنؤ اور حیدر آباد دکن نے جنم دیا ہے لیکن اس کی پرورش لاہور نے کی ہے۔ اور اسے تراش خراش کر بھرپور جوانی دی ہے۔ آج بھی پورے برصغیر میں اُردو بازار لاہور اشاعت کتب کی سب سے بڑی مارکیٹ ہے۔

الیکٹرونک میڈیا نے اچانک ہی نمودار ہو کر مطالعہ کتب پر کاری ضرب لگائی ہے۔ پڑھنے والے ٹی وی چینلز کی رنگین دنیا میں گم ہو رہے ہیں۔ ایک وقت تھا جب لوگ کتاب کے چند صفحات پڑھے بغیر سوتے نہیں تھے۔ اب ٹی وی پروگرام دیکھ کر بیدار ہونا بھول گئے ہیں۔

الیکٹرونک میڈیا کو اپنا اثر قائم کئے بارہ برس ہوئے ہیں اور اب رفتہ رفتہ اس کا طلسم ٹوٹ رہا ہے۔ ٹی وی سلسلہ وار ڈراموں سے بیزاری دیکھنے میں آ رہی ہے۔ پڑھنے والے کہانیوں کے کردار کے جو خیالی خوبصورت خاکے بناتے ہیں اور پڑھنے کے دوران تصور میں کہانیوں کا جو ماحول دیکھتے ہیں وہ انہیں ٹی وی ڈراموں میں نظر نہیں آ رہا ہے۔

انسان ازل سے خیالی محل تعمیر کرنے کا عادی رہا ہے۔ کتابیں پڑھ کر اپنے جیسے امیروں اور غریبوں کو تصور میں دیکھتا آ رہا ہے۔ جو پردے سے باہر آ جائے اس کے لیے تجسس ختم ہو جاتا ہے۔ ٹی وی اسکرین پر نگاہوں کے سامنے سب آشکار ہوتے ہیں کتاب کے پردوں میں رہ کر وہ تصور میں جھلکتے ہیں۔ ہمیشہ قائم رہنے والا تجسس اور دلچسپی پیدا کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ کتاب کی حرمت اور پائیداری پھر رفتہ رفتہ واپس آ رہی ہے اور اسے واپس لانے میں کراچی کے ڈائجسٹ اور اُردو بازار لاہور کے پبلشرز اہم فرائض انجام دے رہے ہیں۔

ان پبلشروں میں علم و عرفان کا نام بہت نمایاں ہے۔ یہ ادارہ قابل قلم کاروں کا شکاری ہے۔ قابل لکھنے والوں کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے جس کے نتیجے میں نو آموز لکھنے والوں سے لے کر مشہور و معروف شاعروں اور

ادیبوں کی کتابیں اس ادارے سے شائع ہوتی رہتی ہیں۔

یہ شرف مجھے بھی حاصل ہوا ہے۔میری کہانیوں کے مجموعے اور ناول بھی اس ادارے سے شائع ہو رہے ہیں اور اپنے قارئین کو علم و عرفان تک پہنچا رہے ہیں۔

''ایمان کا سفر'' اور ''کچرا گھر'' دل و دماغ میں نقش ہونے والی ایسی کہانیاں ہیں جو پچھلی تین دہائیوں سے قارئین کے ذہنوں میں گونج رہی ہیں۔ایمان کیا ہے اور اسے کس طرح کچرا بنایا جا رہا ہے۔اس زہریلی سچائی کو پڑھ کر کوئی بھی صاحب ایمان ان کہانیوں کو بھول نہیں پاتا۔

میرے تمام ناولوں میں مقبولیت کے حساب سے ''آدھا چہرہ'' سرفہرست ہے۔ پڑھنے والوں کے خطوط موصول ہوتے ہیں اور فون کالز کے ذریعہ تقاضہ کیا جاتا ہے کہ میں ایسا ہی سلگتا ہوا ناول پھر لکھوں اور قارئین سے وعدہ ہے کہ جلد ہی لکھوں گا پھر اس ناول کو علم و عرفان کی وساطت سے آپ کے ہاتھوں میں پہنچاؤں گا۔

دنیا کی ہر شئے کو زوال ہے۔ دعا مانگتا ہوں کہ مجھ بوڑھے قلمکار کی عمر کو زوال آیا ہے۔قلم کو تاحیات زوال نہ آئے۔آمین

محی الدین نواب

آدمی کا باپ

وہ میرا باپ تھا۔
میں اس کا باپ بن گیا۔
پھر وہ اس کا باپ بننے لگا۔
ایک شرمناک سوال کہ
ہم آدمیوں کا باپ کون ہے؟

ڈاکٹر عظیم صدیقی جانتا تھا اور پورے یقین کے ساتھ جانتا تھا کہ شے می نہیں مرے گی۔ پھر اس نے اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کی تمام کوششیں کر ڈالیں۔ پہلی کوشش یہ تھی کہ اسے ایک نہایت ہی زود اثر زہریلا انجکشن دیا تھا۔ شے می نہیں جانتی تھی کہ اس کا خاوند اس کی جان کا دشمن ہے، اس نے چپ چاپ انجکشن لگوالیا۔ زہر اس کے جوان جسم کے اندر سرایت کر گیا۔ چند لمحوں تک اسے اپنے اندر کچھ گڑبڑ سی محسوس ہوئی پھر اس نے باتھ روم جا کر قے کر دی۔ اس کے بعد اس نے پانی منہ میں لے کر کلی کی اور منہ پونچھتی ہوئی کھانا پکانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ عظیم صدیقی پریشانی سے سوچتا رہا کہ اپنی شریک حیات کو اپنی حیات سے ہمیشہ کے لیے الگ کر دینے کا بہترین طریقہ کیا ہوگا؟

شے می کا اصل نام شمیم بیگم تھا، وہ نچلے طبقے سے بیاہ کر لائی گئی تھی۔ ڈاکٹر عظیم صدیقی نے دو مقاصد کے تحت اس سے شادی کی تھی۔ پہلا مقصد تو یہ تھا کہ شمیم سترہ سال کی ایک حسین دوشیزہ تھی۔ ڈاکٹر پچپن سال کا بوڑھا تھا۔ اس عمر میں اتنی حسین لڑکی اس سے عشق نہیں کر سکتی تھی لیکن شمیم اس سے شادی کے لیے راضی ہوگئی تھی کیونکہ وہ ڈاکٹر تھا اور یہ سرطان کے مہلک مرض میں مبتلا تھی۔

ڈاکٹر کا دوسرا مقصد یہ تھا کہ وہ اپنی بیمار محبوبہ پر ایک تجربہ کرنا چاہتا تھا۔ وہ اس تجربے سے صحت مند ہوتی تو یوم آخر تک زندہ سلامت رہتی ورنہ اس کے مرنے کا افسوس نہ ہوتا کیونکہ اسے بلڈ کینسر ہوگیا تھا اور اس کا مرنا یقینی تھا۔

خوش قسمتی سے ڈاکٹر کا تجربہ کامیاب ہوگیا اور بدقسمتی سے اس پر ایک جوان بیوی ہمیشہ کے لیے مسلط ہوگئی۔ پہلے پہل اس کی جوانی کا اتنا شدید احساس نہیں ہوا کیونکہ ان دنوں وہ اپنے کامیاب تجربے پر نازاں و شاداں تھا۔ سب سے پہلے اس نے خوش ہو کر شمیم بیگم کا نام بدل دیا اور اسے پیار سے شے می کہنے لگا۔ انسان کے طبقوں کی طرح ناموں کے بھی طبقے ہوتے ہیں۔ نچلے طبقے میں جو شمیم اور رضیہ ہوتی ہیں وہ اونچے طبقے میں پہنچ کر شے می اور راضی بن جاتی ہیں۔

شے می کی زندگی بدل گئی۔ نام بدل گیا حتیٰ کہ بیمار اور لاغر جسم بھی ڈبل روٹی کی طرح صحت مند ہوگیا۔ بس اس مقام پر آکر جوان بیوی اور بوڑھے خاوند کا فرق نمایاں ہوگیا۔ کئی بار ایسا ہوا کہ وہ بے زاری سے ''اونہہ'' کہہ کر خاوند کے بیڈ روم سے نکلی اور اپنے بیڈ روم میں آکر ذرا آنسو بہا کر سوگئی۔

کوئی مرد اپنی عورت کی نظروں سے گرنا پسند نہیں کرتا حالانکہ اس میں مرد ذات کی توہین کا پہلو نہیں نکلتا اگر کوئی عقلمند بوڑھا کسی جوان لڑکی سے شادی کرنے کی حماقت کرے تو یہ مرد برادری کی نہیں، بوڑھی برادری کی غلطی ہے۔

ویسے ڈاکٹر نے سوچا کہ ابھی کچھ نہیں بگڑا ہے جو دوا اس نے شے می پر آزمائی ہے وہی دوا خود استعمال کرے گا اور شے می کی طرح جوان اور زندہ جاوید ہو جائے گا۔ دوا کا فارمولا اس کے پاس محفوظ تھا لیکن اسے تیار کرنے کے لیے سکون وتحمل اور ذہنی یکسوئی کی ضرورت تھی اور اس کا تمام سکون شے می نے درہم برہم کر رکھا تھا۔ جب بھی وہ پکی ہوئی فصل کی طرح اس کے سامنے لہراتی، وہ شدید احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا۔ ایسی حالت میں وہ اپنے لیے آب حیات کیسے تیار کرتا؟ اگر مختلف دواؤں کے اوزان اور ترکیب میں کوئی گڑبڑ ہو جاتی یا خامی رہ جاتی تو وہ آب حیات اس کے لیے سم قاتل بن جاتا۔

اس نے جھنجلا کر یہی فیصلہ کیا کہ پہلے شے می کی موت کا سامان کرنا چاہیے۔ نہ رہے گا بانس نہ بجے گی بانسری۔ پھر وہ اطمینان سے اپنے فارمولے پر عمل کرے گا۔ شے می کیا چیز ہے، ابدی زندگی حاصل کرنے کے بعد اسے لاکھوں حسینائیں مل جائیں گی۔

لیکن پہلی کوشش میں وہ ناکام ہوگیا۔ وہ زہریلا انجکشن شے می کے جسم میں گیا اور پانی بن کر نکل گیا۔ دوسری بار ایسا ہوا کہ شے می آدھی رات کو تنہا باغیچے میں ٹہل رہی تھی کہ ڈاکٹر نے ایک درخت کے پیچھے چھپ کر ریوالور میں سائلنسر لگایا پھر ایک ماہر نشانہ باز کی طرح پوری چھ گولیاں اس کے جسم میں اتار دیں۔ شے می کے حلق سے چیخیں نکلیں پھر وہ لڑکھڑا کر گھاس پر گر پڑی۔

ڈاکٹر نے ریوالور کو ایک جھاڑی میں چھپا دیا، اس کے بعد تیزی سے چلتا ہوا اس کے قریب آیا۔ اس وقت تک شے می اٹھ کر بیٹھ گئی تھی اور اپنے بدن سے ریوالور کی ایک گولی یوں نکال رہی تھی جیسے پاؤں میں چبھا ہوا کانٹا نکال رہی ہو۔ بدن میں کئی سوراخ ہوگئے تھے۔ جہاں جہاں سوراخ تھے وہاں خون کے دھبے نظر آرہے تھے۔ اگرچہ زیادہ مقدار میں خون بہنا چاہیے تھا لیکن وہ تمام سوراخ آپ ہی آپ بھرتے جا رہے تھے۔ فوم کے بستر میں انگلی گڑو دینے سے وہاں انگلی کا نشان نہیں پڑتا۔ فوم جلدی اپنی صحیح حالت میں آجاتا ہے۔ یہی حال اس کے فوم جیسے لچکیلے بدن کا تھا۔ ڈاکٹر اپنے ماتھے سے پسینہ پونچھنے لگا۔

شے می اس کے لیے دن رات کا عذاب بن گئی۔ جیسے جیسے دن گزرنے لگے، شے می کا مزاج بدلنے لگا۔ وہ اس لیے بیاہ کر نہیں آئی تھی کہ ایک خوبصورت ڈیکوریشن پیس کی طرح اس کے گھر میں سجی رہے اور خاوند اسے دور سے دیکھتا رہے۔ آخر وہ عورت تھی۔ اس کی اپنی ضروریات اور جذبات تھے اور سب سے اہم بات یہ کہ اس کی عمر ایک جگہ تھم گئی تھی۔ ڈاکٹر کے بڑھاپے میں مزید پانچ سال کا اضافہ ہوگیا تھا، اس کے چہرے کی جھریاں کچھ اور گہری ہوگئی تھیں۔ شے می کے چہرے اور بدن کے شگوفوں پر وہی سترہ سال کی تازگی اور رعنائیاں تھیں۔ لہٰذا اس کا بھٹکنا فطری امر تھا۔ وہ دوسروں کے بازوؤں میں کلی کی طرح چٹخنے اور پھول کی طرح مہکنے لگی۔

ڈاکٹر کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا۔ اس نے خوب سوچ سمجھ کر ایک بہت ہی مضبوط شیشم کی لکڑی کا تابوت بنانے والے بڑھئی کو اچھی خاصی رقم دے کر اپنا رازدار بنالیا کیونکہ آئندہ اس تابوت کو قبر کی تہ میں پہنچانے کے لیے اسے ایک معاون کی ضرورت تھی۔

جب تابوت تیار ہوگیا تو ڈاکٹر شے می کو باتوں سے بہلاتا ہوا مکان کے تہ خانے میں لے کر آیا۔ تابوت کھلا ہوا تھا اور شے می کے حسین وجود کا انتظار کررہا تھا۔ قریب ہی بڑھئی کھڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر نے شے می کو مضبوطی سے پکڑ کر کہا۔

''چلو اب اس میں لیٹ جاؤ''۔

''نہیں!'' وہ گھبرا کر بولی ''کیا تم مجھے اس میں بند کردینا چاہتے ہو؟''

''میں، میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ تم اپنی قبر میں بھی زندہ رہوگی یا مرجاؤ گی؟''

''نہیں۔ میں جیتے جی قبر میں نہیں جاؤں گی۔ چھوڑ دو مجھے...... جانے دو''۔

وہ خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔ بڑھئی نے بھی آکر اسے پکڑلیا۔ وہ دوطرفہ شکنجوں میں تڑپنے لگی، مچلنے لگی۔ اگرچہ اس میں جوانی کا زور تھا۔ اس کے باوجود وہ عورت تھی۔ اس میں عورت کی نزاکت تھی اور جلد ہی خائف ہو کر شکست کھاجانے والی کمزوری تھی۔ ان دو بوڑھوں نے اسے پکڑ کر زبردستی تابوت کے اندر ٹھونس دیا پھر اس کے ڈھکنے کو بند کرکے اسے ہر طرف سے لاک کردیا۔

تابوت کے اندر سے کھٹا کھٹ کی آواز آرہی تھی۔ آواز سے پتہ چل رہا تھا کہ وہ اندر پھڑپھڑا رہی تھی اور کچھ کہتی جارہی تھی لیکن اس کی آواز منمناہٹ کی طرح باہر آرہی تھی۔

وہ دونوں تہہ خانے سے باہر آگئے۔ آئندہ کل تک ڈاکٹر کو مطمئن ہوجانا چاہیے تھا مگر اس نے بڑی بے چینی سے کروٹ بدل بدل کر رات گزاری۔ دوسرے دن وہ تہ خانے میں گیا۔ دور سے تابوت بالکل خاموش نظر آیا۔ وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب آیا اور تابوت سے کان لگا کر سننے لگا۔ گہری خاموشی تھی۔

خوشی سے اس کی باچھیں کھل گئیں۔

لیکن دوسرے ہی لمحے اس کا منہ لٹک گیا۔ اندر سے کچھ ایسی سرسراہٹ سنائی دی جیسے وہ انسانی زندگی کے آخری بستر پر کروٹیں بدل رہی ہو۔

ڈاکٹر نے ناگواری سے تابوت پر دستک دی۔ دستک دیتے ہی جیسے اندر کھلبلی مچ گئی۔ وہ بھی اندر سے تابوت کی دیوار پر ہاتھ مارنے لگی۔

وہ جھلا کر کھڑا ہوگیا۔ پھر تابوت پر ایک زور کی لات مارتے ہوئے بولا۔

''سالی جان کا عذاب بن گئی ہے لیکن میں بھی ضد کا پکا ہوں۔ اسی میں تجھے قید رکھوں گا، دیکھتا ہوں کب تک زندہ رہے گی۔ تڑپ تڑپ کر مرنے گی''۔

یہ کہہ کر وہ پاؤں پٹختا ہوا تہ خانے سے باہر آگیا اور بے چینی سے اپنے کمرے میں ٹہلنے لگا۔

شام کو بڑھئی اس کے پاس آیا۔ ڈاکٹر نے کہا۔

''اس عورت سے اس طرح پیچھا نہیں چھوٹے گا۔ ہم آج رات اس تابوت کو جنگل میں لے جاکر ایک گہرے گڑھے میں دفن کردیں گے، کسی کو پتہ نہیں چلے گا کہ جنگل کے کسی حصے میں زمین کے اندر وہ چھپا کر رکھ دی گئی

ہے۔ نہ کسی کو معلوم ہوگا اور نہ ہی کوئی اسے کھود کر باہر نکالے گا''۔

وہ بہت دیر تک اسے اپنی پلاننگ سمجھاتا رہا۔ جب رات گہری ہوگئی تو ڈاکٹر گیراج میں گیا، وہاں سے اپنی وین میں بیٹھ کر ڈرائیو کرتا ہوا کوٹھی کے پچھلے دروازے پر آیا۔ بڑھئی کدال اور بیلچہ لے کر آگیا۔ وہ دونوں وین کا پچھلا دروازہ کھول کر کوٹھی کے اندر آئے۔ پھر وہاں سے تہ خانے میں پہنچے۔ تابوت پہلے کی طرح بظاہر خاموش نظر آرہا تھا مگر جب وہ دونوں اسے کھینچتے ہوئے تہ خانے سے نکالنے لگے تو اس تابوت میں پھر جان پڑگئی۔ وہ اندر ہاتھ مار مار کر دستک کی زبان میں التجا کررہی تھی کہ اسے باہر نکالا جائے۔

مگر وہ دونوں اس کی التجا سے موم ہونے والے نہ تھے، اسے خاموشی سے گھسیٹ کر لے جارہے تھے۔ اس وزنی تابوت کو تہ خانے کی سیڑھیوں سے اوپر چڑھاتے وقت انہیں پسینہ آنے لگا۔ وہ ہانپ رہے تھے اور زور لگا رہے تھے۔ تھوڑی تھوڑی دیر میں تھک کر سانسیں درست کرنے کے لیئے رک جاتے تھے۔ آخری بڑی کوششوں کے بعد وہ اسے تہ خانے سے نکال لائے۔

کوٹھی سے باہر لا کر اسے وین میں رکھتے وقت بھی خاصی دشواری پیش آئی لیکن وہ مرحلہ بھی طے ہوگیا۔ انہوں نے وین کے پچھلے دروازے کو اچھی طرح بند کیا پھر اگلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئے۔

اندھیری رات کی خاموشی میں وین تیز رفتاری سے بھاگنے لگی۔ اس خاموشی میں وین کے پچھلے حصے سے کبھی کبھی کھٹ کھٹ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ ڈاکٹر نے غصے سے کہا ''سالی کے ہاتھ بھی نہیں دکھتے، طبلہ بجاتی جارہی ہے۔ ہم سے بڑی غلطی ہوئی اسے تابوت میں بند کرنے سے پہلے اس کے ہاتھ پاؤں کو رسی سے اچھی طرح جکڑ دینا چاہیے تھا۔ مجھے ڈر لگ رہا ہے، کوئی کار والا ہمیں اوورٹیک کرتے ہوئے اس طبلے کی آواز نہ سن لے''۔

بڑھئی گھبرا کر کھڑکی سے باہر سر نکالتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے لگا۔

''ہم آبادی سے بہت دور نکل آئے ہیں۔ آگے پیچھے کوئی گاڑی نظر نہیں آرہی ہے اور اتنی رات کو بھلا اس ویران راستے میں کون آئے گا؟ کون آئے گا؟ کوئی نہیں آئے گا۔ ہاں کوئی نہیں آئے گا مگر مجھے پھر بھی ڈر لگ رہا ہے''۔

وہ دونوں ڈرتے جارہے تھے اور ایک دوسرے کو تسلیاں بھی دیتے جارہے تھے۔ دو گھنٹے کے بعد جنگل کے اونچے نیچے راستوں پر ان کی وین ڈگمگاتی جارہی تھی پھر وہ گھنے درختوں کے درمیان آکر رک گئی۔

ڈاکٹر نے اپنی رسٹ واچ میں وقت دیکھا۔ ڈیڑھ بج رہا تھا۔ بڑھئی پچھلے دروازے کو کھول کر کدال اور بیلچے کو نکال رہا تھا۔ پھر وہ دونوں وین سے دور آکر گڑھا کھودنے لگے۔ بڑھئی کے ہاتھوں میں کدال تھی وہ کھود رہا تھا اور ڈاکٹر بیلچے سے مٹی اٹھا کر ایک طرف ڈھیر کررہا تھا۔

ایک زندہ عورت کے قبر کھودی جارہی تھی، بیلچے سے مٹی ہٹاتے وقت ڈاکٹر سوچ رہا تھا کہ ایک قبر میں دو انسانوں کے سونے کی گنجائش بھی ہوسکتی ہے۔ شمی تو وہاں قیامت تک پڑے رہے گی لیکن اس کے ساتھ وہ بڑھئی بھی قیامت کی نیند سوئے گا۔ اتنے بڑے جرم کے ایک رازدار کو زندہ چھوڑنا دانشمندی نہیں ہے۔ اس قبر میں تمام راز دفن ہوجائیں گے تب ہی وہ اطمینان سے اپنے لیے آب حیات تیار کرسکے گا۔

چھ فٹ کی گہری قبر تیار ہوگئی۔ وہ دونوں وین کے پچھلے حصے سے تابوت کھینچتے ہوئے قبر کے کنارے تک لے آئے پھر اسے گہرائی میں دھکیل دیا۔ وہ لڑھکتا ہوا نیچے جاکر قبر کی تہ میں جم گیا۔ ڈاکٹر نے بیلچے کو اٹھاتے ہوئے بڑھئی سے کہا۔

''ذرا جھانک کر دیکھو اور سنو کیا وہ طبلہ بجا رہی ہے''۔

وہ قبر کے کنارے گھٹنے ٹیک کر جھک گیا اور توجہ سے سننے لگا۔ آواز آ رہی تھی۔ صاف پتہ چل رہا تھا کہ شے می
تابوت کی دیواروں پر ہاتھ مار رہی ہے۔

بڑھی نے صرف چند لمحوں تک وہ آواز سنی۔ وہ چند لمحے ڈاکٹر کے لیے کافی تھی۔ اس کے ہاتھوں میں وہ بیلچہ
بلند ہوا اور بڑھی کی کھوپڑی نشانہ بن گئی۔ اس کے حلق سے ایک چیخ نکلی وہ قبر کے کنارے لڑھک گیا۔ دوسری بار بیلچے کا
پھل اس کی گردن میں اتر گیا۔ گردن آدھی کٹ گئی، وہ تڑپ رہا تھا اور مٹی اس کے لہو سے بھیگ رہی تھی۔ تھوڑی دیر
بعد اس کا جسم ساکت ہو گیا۔ ڈاکٹر نے جلدی سے وہ لاش قبر میں لڑھکا دی۔

''دھپ'' کی آواز کے ساتھ وہ لاش تابوت پر جا کر اوندھی ہو گئی۔ دو انسانوں کی گنجائش نکل آئی۔ ایک
تابوت کے اندر زندہ تھی، دوسرا تابوت کے اوپر مردہ تھا اور ڈاکٹر بیلچے سے مٹی اٹھا اٹھا کر قبر کے خالی پیٹ کو بھر رہا تھا۔

گڑھا بھر گیا۔ زمین پہلے کی طرح ہموار ہو گئی۔ وہ بیلچے کو ایک طرف رکھ کر بیٹھ گیا اور زمین سے کان لگا کر
سننے لگا۔ آواز نہیں آ رہی تھی۔ منوں مٹی کی تہ جمی ہوئی تھی۔ اس لیے وہ سپاٹ قبر ساؤنڈ پروف ہو گئی تھی۔ اب اس دنیا کا
کوئی فرد شے می کی آواز نہیں سن سکتا تھا۔

وہ صبح پانچ بجے تک وہاں بیٹھا رہا پھر مطمئن ہو کر وہاں سے چلا آیا۔

O☆O

ڈاکٹر عظیم صدیقی کے عملی تجربے کو وہ تینوں بڑی توجہ سے دیکھ رہے تھے۔ اس وقت تینوں کے ذہن میں
ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔

''کیا عظیم صدیقی آب حیات تیار کر لے گا؟''

''شوں شک'' کی ہلکی آواز کے ساتھ سفید دھوئیں کا ایک بھپکا صراحی سے اٹھ کر لیبارٹری کی صاف ستھری
فضا میں تحلیل ہونے لگا۔ شیشے کی صراحی سے دو فٹ کے فاصلے پر عظیم صدیقی میز سے لگا کھڑا تھا، اس کی نگاہیں صراحی
کے پیندے پر مرکوز تھیں، جہاں زرد رنگ کا محلول نظر آ رہا تھا۔ آہستہ آہستہ صراحی میں سے وہ سفید دھواں غائب ہونے
لگا شاید زرد رنگ کے محلول میں جذب ہو رہا تھا۔

وہ تینوں اس عمل کو یک ٹک دیکھے جا رہے تھے، صرف وہی نہیں بلکہ لیبارٹری کے ایک گوشے میں آہنی
سلاخوں کے پیچھے بیٹھا ہوا بندر بھی اس عملی تجربے کو ٹکر ٹکر دیکھے جا رہا تھا۔

ایک بندر کو بھلا سائنسی تجربات سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ لیکن کہتے ہیں کہ آدمی اور بندر کی عادتیں ایک
جیسی ہوتی ہیں۔ یہ دونوں اس تماشے کو خاص طور سے دیکھتے ہیں جو ان کی سمجھ میں نہیں آتا۔

بندر عظیم صدیقی کے تجربے کو سمجھے یا نہ سمجھے لیکن وہ بڑی سنجیدگی سے دیکھ رہا تھا۔ شاید یہ سوچ رہا تھا کہ عظیم صدیقی
ہمیشہ کی طرح اس دوا کو بھی اس پر آزمائے گا۔

وہ کٹہرے کی آہنی سلاخوں کے پیچھے تقریباً ستر سال سے بیٹھا ہوا اس لیبارٹری کو دیکھ رہا تھا۔ ایک بندر کی طبعی
عمر ستر سال کی نہیں ہوتی کوئی بھی یہ یقین نہیں کر سکتا تھا کہ وہ اتنی طویل مدت سے اس لیبارٹری کے کٹہرے میں اچھل
کود رہا ہے اور اپنی بندریا کے ساتھ اس ائیر کنڈیشنڈ لیبارٹری میں عیش کر رہا ہے۔

اس نے سر گھما کر اپنی بندریا کی طرف دیکھا۔ وہ بے چاری ایک جانب چپ چاپ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے پھولے ہوئے پیٹ کو دیکھ کر معلوم ہوتا تھا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ بندر دانت نکال کر اسے یوں دیکھنے لگا جیسے باپ بننے پر خوشی کا اظہار کر رہا ہو۔ یہ اس کی زندگی میں پہلی بندریا نہیں تھی۔ ستر سال کے عرصے میں کتنی ہی آئی تھیں اور اپنی فانی عمر گزار کر چلی گئی تھیں۔ بندر سمجھتا تھا کہ وہ جو ماں بننے والی ہے وہ بھی کسی دن ہمیشہ کے لیے رخصت ہو جائے گی اور اس کی جگہ پھر ایک نئی بندریا اس کا دل بہلانے آجائے گی۔

اس نے سر گھما کر ڈاکٹر عظیم صدیقی کو دیکھا، اسے یہ طویل عیش وعشرت کی زندگی عظیم صدیقی کے دادا نے اپنے تجربوں سے دی تھی۔ اس کے دادا کلیم صدیقی نے آب حیات تیار کرنے کی کوشش کی تھی۔ انسان ازل سے ابدی زندگی کی تلاش میں بھٹک رہا ہے اور اس کے لیے طبی سائنس میں نت نئے چونکا دینے والے تجربات کر رہا ہے۔ خوش قسمتی سے کلیم صدیقی نے آب حیات تیار کرنے میں کسی حد تک کامیابی حاصل کر لی تھی۔ ان دنوں جدید طبی دوائیں، بے داغ فولاد کے آلات اور مشینیں وغیرہ نہیں تھیں اور ایسی ائیر کنڈیشنڈ لیبارٹری بھی نہیں تھی۔ کلیم صدیقی چٹائی پر بیٹھ کر ہاون دستے میں دوائیں پیستے اور حل کرتے تھے۔ کہاں وہ چٹائی پر بیٹھنے کا زمانہ اور کہاں یہ لیبارٹری کی ائیر کنڈیشنڈ دنیا۔ اس بندر نے انسان کے دماغ کو اور اس کی تہذیب کو کتنی ہی کروٹیں بدلتے دیکھا تھا۔

بہر حال کلیم صدیقی نے آب حیات تیار کر لیا تھا اور اسے اس بندر پر آزما کر اس بات کا یقین کر لیا تھا کہ اس دوا میں انسانی جسم کی مناسب سے کچھ تبدیلیاں کر لی جائیں تو وہ اسے پی کر بندر کی طرح ابدی زندگی حاصل کر سکتا ہے۔ اس خیال کے تحت اس نے مختلف فارمولوں سے اس آب حیات میں تھوڑی سی تبدیلیاں کیں۔ اسے اپنے تجربات پر بڑا اعتماد تھا اور اس اعتماد سے وہ اس آب حیات کو نوش کر گیا۔

بندر نے اس لیبارٹری میں بیٹھ کر عجیب عجیب تماشے دیکھے تھے۔ کلیم صدیقی نے اس کے سامنے ہی اس آب حیات کو نوش کیا تھا۔ فوری طور پر اس کا کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا لیکن ہر روز جب وہ لیبارٹری میں آتا تو پہلے سے زیادہ کمزور اور بیمار بیمار نظر آتا۔ وہ اندر ہی اندر کھوکھلا ہو رہا تھا۔ اس نے اپنی تمام صلاحیتوں کو آزما کر اس آب حیات کے ردعمل سے بچنے کی کوششیں کیں لیکن ایک روز اسی لیبارٹری میں خون تھوک کر مر گیا۔

اس کے بعد عظیم صدیقی کے باپ سلیم صدیقی کی باری آئی۔ سلیم صدیقی نے اپنے باپ کلیم صدیقی سے ہونے والی غلطیوں کا اچھی طرح جائزہ لیا تو اس آب حیات میں کچھ ایسی خامیاں نظر آئیں جنہیں دور کیے بغیر ابدی زندگی حاصل نہیں کی جا سکتی تھی۔

پھر بندر نے سلیم صدیقی کو اس لیبارٹری میں تجربے کرتے اور آب حیات میں رہ جانے والی کمی کو پورا کرتے دیکھا۔ اسی لیبارٹری میں اسے خوشی سے مغلوب ہو کر آب حیات کا جام چڑھاتے اور اپنے باپ کی طرح دم توڑتے دیکھا تھا۔

اور اب عظیم صدیقی کی باری تھی لیکن وہ اتنا جلد باز نہیں تھا اور اس دوا کو سب سے پہلے خود پر آزما کر اپنے دادا اور باپ کے عبرتناک انجام تک نہیں پہنچنا چاہتا تھا۔

وہ بیس برس کی عمر سے اپنے دادا اور باپ کے ساتھ اس لیبارٹری میں کام کر رہا تھا یعنی اسے تجربات سے گزرتے ہوئے پینتیس برس ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے باپ اور دادا کی ذہانت اور تجربات میں اپنے پینتیس سالہ

تجربات سمو کر نئے سرے سے آبِ حیات تیار کیا تھا پھر اسے اپنی جوان اور حسین بیوی شے می پر آزمایا تھا۔

اس آبِ حیات کو شے می پر آزمانے کی وجہ یہ تھی کہ وہ اپنے باپ دادا کی طرح مرنا نہیں چاہتا تھا۔ اگر شے می اسے نوش کر کے مر جاتی تو دوسری بیوی آسکتی تھی اور اگر زندۂ جاوید ہو جاتی تو...... تو وہ اسے ٹھکانے لگا چکا تھا۔ شے می دور بہت دور کسی جنگل میں منوں مٹی کے تلے دبی پڑی تھی۔ وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ اب بھی زندہ ہوگی یا مر چکی ہوگی۔

ویسے عظیم صدیقی نے بڑی احتیاط سے کام کیا تھا۔ اسے دفن کرنے کے بعد وہ ہر دوسرے تیسرے دن وہاں جایا کرتا تھا اور اس جگہ کو دیکھتا تھا کہ وہاں کی مٹی ہٹائی تو نہیں گئی ہے؟ ہر بار وہاں پہنچ کر یہی اطمینان ہوا کہ گڑھا بدستور مٹی سے بھرا ہوا ہے، اس جنگل سے کسی کا گزر نہیں ہوتا تھا۔ کبھی کسی جانور کے پنجوں کے نشان بھی نظر نہیں آئے تھے۔ ڈاکٹر نے کئی بار اس زمین کے حصے سے کان لگا کر سنا۔ اندر سے اس کی آواز سنائی نہیں دی۔ پتہ نہیں وہ قبر کی تہ میں طبلہ بجا رہی تھی یا نہیں۔ اس گڑھے کو کھود کر طبلہ سننے کی جرات نہ ہوئی۔ کچھ دنوں کے بعد اس حصے میں ہری ہری گھاس اگنے لگی۔ پھر زمین کا وہ ٹکڑا جنگل کی طرح ہریالی کا ایک حصہ بن گیا۔ اب کوئی نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ جگہ کبھی کھودی گئی تھی۔

بندر نے کٹہرے کی سلاخوں کو تھام کر عظیم صدیقی اور اس کے ساتھیوں کو دیکھا۔ عظیم صدیقی شیشے کی نلکی کو بڑی توجہ سے دیکھ رہا تھا۔ اس کے تینوں ساتھی بھی اس تجربے کو للچائی ہوئی نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بے زبان بندر اس لیبارٹری میں آنے والے ہر شخص کو جانتا تھا۔ ان میں سے ایک جو سفید سرج کا سوٹ پہنے ہوئے تھا اس کا نام ہارڈی میسن تھا۔ وہ کسی مغربی ملک سے عظیم صدیقی کے باپ دادا کی شہرت سن کر وہاں آیا تھا۔ بندر کی طویل عمری نے یہ بات مشہور کر دی تھی کہ کلیم صدیقی کے خاندان کا کوئی فرد ایک دن آبِ حیات بنانے میں کامیاب ہو جائے گا اور اسی کامیابی کو دیکھنے اور سمجھنے کے لیے ہارڈی میسن اکثر خاص موقعوں پر عظیم صدیقی کے ساتھ رہتا تھا۔ مقصد یہ تھا کہ کسی طرح وہ کامیاب فارمولا اس کے ہاتھ آجائے۔ وہ خود کو بہت ہی ذہین اور عظیم سائنس دان سمجھتا تھا۔ یہ دیکھ کر اس کے دل کو ٹھیس پہنچ رہی تھی کہ آج عظیم صدیقی اس دنیا کے سب سے عظیم اور سب سے انوکھے تجربے میں کامیاب ہو رہا ہے۔

ہارڈی میسن سے تھوڑے فاصلے پر یہودی جیمس کھڑا تھا۔ جیسا کہ مشہور ہے، یہودی بہت زیادہ دولت مند ہوتے ہیں، وہ بھی دولت کے اعتبار سے رئیس اعظم تھا۔ رئیس اعظم ہونے کے باوجود اس دنیا میں تنہا تھا۔ تنہا اس لیے تھا کہ نہ تو اس نے جوانی میں شادی کی تھی اور نہ ہی بڑھاپے میں کرنے کا ارادہ تھا۔ وہ جتنا دولت مند تھا اتنا ہی کنجوس بھی تھا۔ اس کے سوچنے کا انداز یہ تھا کہ اگر شادی کرے گا تو بیوی کا خرچ بڑھے گا پھر اولاد ہوگی اور جوان ہونے تک بیٹھ کر کھائے گی، ظاہر ہے کہ باپ کی طرح اولاد بھی لالچی ہوگی لہٰذا اتنی ساری دولت حاصل کرنے کے لیے اپنے باپ کو قتل کرنے سے باز نہیں آئے گی۔

جیمس موت سے بہت ڈرتا تھا اور موت سے زیادہ اپنی دولت سے ڈرتا تھا کہ موت کے بعد یہ پرائی ہو جائے گی۔ اس لیے وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتا تھا کہ کسی طرح اس کی زندگی طویل سے طویل تر ہوتی چلی جائے۔ وہ کنجوس ضرور تھا لیکن دائمی زندگی کے لالچ میں اس کی دولت ڈاکٹروں کی جھولی میں جاتی رہتی تھی۔

پھر وہ عظیم صدیقی کی شہرت سن کر یہاں آیا اور اس سے دوستی گانٹھنے لگا۔ اس نے ستر سالہ بندر کو دیکھا تھا اور شے می جیسی بلڈ کینسر کی مریضہ کی حیرت انگیز صحت مندی کی رپورٹ پڑھی تھی اور اب اس کے سامنے جو آبِ حیات تیار ہو رہا تھا، اسے وہ بڑی سے بڑی قیمت دے کر خریدنا چاہتا تھا۔

زندگی...... ابدی زندگی...... وہ شیشے کی شفاف صراحی کو گھور رہا تھا اور انتہائی جوش اور جذبے کے تحت اس طرح آگے پیچھے جھول رہا تھا جس طرح سانپ ڈسنے سے پہلے جھومتا ہے۔ اس کی نگاہوں کا نشانہ ٹھیک صراحی پر تھا۔

ہارڈی اور جیمس کے درمیان سوسن بارڈلے کھڑی ہوئی تھی۔ وہ جوان تھی، حسین تھی اور اس کا جسم شراب سے بھری ہوئی بوتل کی طرح نشہ انگیز تھا۔ وہ ہارڈی کی سیکرٹری تھی۔

اس وقت وہ اپنے خیالات کی دنیا میں بالکل تنہا کھڑی تھی۔ اس کے آس پاس کوئی نہ تھا، صرف ایک شیشے کی شفاف صراحی تھی جس میں سرخ رنگ کا سیال لہریں لے رہا تھا اور اپنی ہر لہر کے ساتھ کہہ رہا تھا کہ میں نے شے می کو سدا بہار جوانی دی ہے۔

شے می کہاں ہے؟ آب حیات نوش کر کے کہاں غائب ہوگئی؟ سوسن نے یہ سوال عظیم صدیقی سے کیا تھا اور عظیم صدیقی نے ہر ایک کو یہی جواب دیا تھا کہ وہ جوانی اور ابدی زندگی کے غرور میں مجھے بھول گئی ہے اور اپنے کسی آشنا کے ساتھ بھاگ گئی ہے۔

عورت کچھ نہیں چاہتی، وہ دولت نہیں چاہتی، وہ دین نہیں چاہتی، دنیا نہیں چاہتی کیونکہ یہ سب چیزیں مرد خود ہی اس کی جھولی میں ڈال دیتا ہے بشرطیکہ وہ جوان ہو۔ وہ اپنے حسن اور منہ زور جوانی سے مرد پر حکومت کر سکتی ہے۔ اس کی دولت چھین سکتی ہے اور اپنی توبہ شکن اداؤں سے اس کی عاقبت خراب کر سکتی ہے۔ عورت صرف اپنی جوانی کی عمر طویل چاہتی ہے۔

سوسن اپنے تازہ رخساروں پر ہاتھ پھیر رہی تھی اور سوچ رہی تھی، کیا ان رخساروں پر بھی بڑھاپے کی جھریاں پڑ جائیں گی؟ وہ کانپ سی گئی۔ عورت اپنے برے اعمال سے نہیں کانپتی بڑھاپے کے تصور سے کانپ جاتی ہے۔

''نہیں۔ میں بوڑھی نہیں ہو سکتی۔ صراحی کا وہ سرخ سیال میرے لیے۔ صرف میرے لیے ہے''۔

''ہاہاہا'' لیبارٹری کی خاموشی میں عظیم صدیقی کا قہقہہ گونجنے لگا۔ وہ صراحی کی گردن کو اپنی مٹھی میں جکڑے ہوئے کہہ رہا تھا ''میرے معزز دوستو! دیکھو، دیکھو میں نے آب حیات تیار کر لیا ہے۔ یہ دنیا والے میرے دادا جان اور میرے ابا جان کو دیوانہ کہتے تھے شاید مجھے بھی پیٹھ پیچھے دیوانہ کہتے ہوں مگر ہم دیوانے نہیں ہیں۔ دیوانے تو مجنوں اور فرہاد جیسے عاشق تھے جنہوں نے محبت کے نام پر اچھی بھلی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔ میں اپنی دھن کا پکا ہوں۔ ایک طویل مدت کی محنت اور جدوجہد کے بعد میں نے قیامت تک زندہ رہنے والی دوا بنالی ہے اور اس کا فارمولا میری یادداشت میں محفوظ ہے''۔

یہودی جیمس نے خوشی سے کانپتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر عظیم صدیقی! میں اس کامیابی پر تمہیں مبارکباد دیتا ہوں۔ تم اس آب حیات کو میرے ہاتھ فروخت کر دو۔ میں تمہیں ایک لاکھ ڈالر دینے کو تیار ہوں''۔

ہارڈی اور سوسن نے چونک کر بوڑھے جیمس کو دیکھا لیکن عظیم صدیقی مسکراتا ہوا شیشے کے ایک شوکیس کی طرف چلا گیا اور اس میں صراحی کو حفاظت سے رکھنے لگا۔ جیمس بڑی بے تابی سے بولی بڑھانے لگا۔

''دو لاکھ ڈالر لے لو......''

عظیم صدیقی جواب میں قہقہے لگانے لگا۔

''تین لاکھ، چار لاکھ، تم ہی کہو اس کی قیمت کیا ہو سکتی ہے؟''

اس نے بدستور ہنستے ہوئے جواب دیا۔

''اس کی کوئی قیمت نہیں ہے، تم اپنی تمام دولت بھی میرے قدموں میں رکھ دو تو بھی میں اسے فروخت نہیں کروں گا۔ میں اسے خود ہی نوش کروں گا اور امر ہو جاؤں گا پھر تا قیامت اس دنیا کی حسین لڑکیوں سے شادی کرتا رہوں گا۔ اس بندر کی طرح جو اس کٹہرے میں ستر سال سے عیش کر رہا ہے۔ ایک بندریا مر جاتی ہے تو دوسری آ جاتی ہے۔ اسی طرح میری ایک بیوی اپنی طبعی عمر گزار کر مر جائے گی تو دوسری آ جائے گی یعنی بیویاں مرتی جائیں گی اور ان سے ہونے والی اولاد بڑھتی جائے گی۔ چند صدیوں میں اس زمین کے چپے چپے پر میرے ہی بچے ہوں گے۔ اس وقت میں اس دنیا کے آدمیوں کا واحد باپ کہلاؤں گا''۔

''پھر یہ کہ میں صرف زمین پر نہیں رہوں گا، چاند پر بھی جاؤں گا اور وہاں ایک نئی دنیا قائم کروں گا۔ دنیا بھر کے اخبارات میری تصویریں شائع کریں گے۔ اپنے گھروں میں مسیح کی جگہ میری تصویریں لگایا کریں گے اور مجھے اپنا ایور گرین باپ سمجھ کر میری پوجا کرتے رہیں گے''۔

اس کی باتیں ہارڈی میسن کے دماغ میں ہتھوڑے کی طرح لگ رہی تھیں۔ ایک ایشیائی باشندہ سائنسی دوڑ میں اس سے بازی لے جائے گا، یہ بات ناقابل برداشت تھی۔ اس نے پیچ و تاب کھاتے ہوئے دل ہی دل میں فیصلہ کر لیا کہ وہ کسی نہ کسی طرح اس آب حیات کو ضرور حاصل کرے گا۔ عظیم صدیقی کو موقع نہیں دے گا کہ وہ اسے نوش کر سکے لیکن اس وقت اس نے اخلاقاً مسکراتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر عظیم صدیقی، تم واقعی عظیم ہو، میں اس کامیابی پر تمہیں مبارکباد دیتا ہوں''۔

''شکریہ''، عظیم صدیقی نے کہا ''میرے دوستو! کل کی تاریخ بہت لکی ہے یعنی لکی سیون۔ میں تم لوگوں کو کل صبح یہاں آنے کی دعوت دیتا ہوں۔ کل صبح تک یہ آب حیات استعمال کرنے کے قابل ہو جائے گا۔ میں تم لوگوں کے سامنے اسے نوش کروں گا تاکہ اخباری رپورٹروں کو بھی تم یہ بیان دے سکو کہ عظیم صدیقی ایک عظیم سائنس دان ہے''۔

سوسن اس کی باتیں سن رہی تھی۔ کبھی اسے اور کبھی شوکیس کو دیکھ رہی تھی جہاں آب حیات رکھا ہوا تھا۔ پھر وہ ایک ادائے ناز سے مسکراتی ہوئی عظیم صدیقی کے پاس آئی اور اسے قاتلانہ انداز سے دیکھتی ہوئی بولی۔

''میری جان عظیم! تم نے وہ عظیم کارنامہ سرانجام دیا ہے کہ جس کی مثال نہیں ملتی۔ اتنی زبردست کامیابی پر محض زبانی مبارکباد دینا ایک طرح کی کنجوسی ہے، میں کنجوس نہیں ہوں، بڑی فراخ دلی سے مبارکباد دینا چاہتی ہوں۔ زبان سے نہیں، اپنے گلابی ہونٹوں کی حرارت سے......''

یہ کہتے ہوئے وہ عظیم صدیقی کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر پنجوں کے بل اٹھ گئی۔ سوسن کے شگفتہ چہرے کو اپنی سانسوں کے قریب دیکھ کر عظیم صدیقی نے جذباتی لہجے میں کہا۔

''واقعی یہ مبارکباد کا سب سے خوبصورت انداز ہے۔ میں چاند کی دنیا میں جانے کے بعد مبارکباد دینے کا یہی طریقہ رائج کروں گا''۔

اس کے بوڑھے ہونٹ سوسن کے جوان لبوں میں پیوست ہو گئے۔ اس طویل بوسے کے دوران وہ دل ہی دل میں کہہ رہی تھی۔

''بے وقوف ڈاکٹر! جس طرح تم ان ہونٹوں کے قریب آئے ہو اسی طرح آب حیات کا وہ لبریز جام بھی ان لبوں کو چومنے آئے گا......''

بندر ان کی طرف دیکھ رہا تھا خوخیا رہا تھا اور اچھل اچھل کر اور چیخ چیخ کر کسی خطرے کا احساس دلانے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔

O☆O

آدھی رات گزر چکی تھی۔ لیبارٹری میں زیرو کا بلب روشن تھا۔ جس کی روشنی میں ہر چیز مٹی مٹی سی نظر آ رہی تھی۔ ڈاکٹر لیبارٹری بند کرتے وقت بندر کی خاطر زیرو کا بلب روشن رکھتا تھا۔ اس وقت بندر اپنی بندریا کے ساتھ مزے کی نیند سو رہا تھا۔ اچانک ہی کسی کھٹکے سے اس کی آنکھ کھل گئی۔

ایک سایہ لیبارٹری میں حرکت کر رہا تھا۔ وہ اچھل کر اکڑوں بیٹھ گیا اور اپنی ہتھیلیوں کی پشت سے آنکھیں ملنے کے بعد غور سے دیکھنے لگا۔

سیاہ رنگ کے اسکرٹ اور بلاؤز میں سوسن بارڈلے کے بدن کی چاندنی پھوٹ رہی تھی۔ وہ لیبارٹری کے وسط میں آ کر چند لمحوں تک دم سادھے کھڑی رہی اور گہری نظروں سے چاروں طرف کا جائزہ لیتی رہی۔ پھر وہ قدم جما کر آہٹ پیدا کیے بغیر شیشے کے شوکیس کے پاس آئی اور اسے کھول کر آب حیات کی صراحی کو باہر نکال لیا۔

سرخ سیال کو دیکھ کر اس کی آنکھیں حیات جاوداں کی مسرتوں سے چمکنے لگیں۔ اس نے صراحی کو میز پر رکھ کر اپنے وینٹی بیگ سے شیشے کی دو نلکیاں نکالیں۔ ایک نلکی میں سرخ سیال بھرا ہوا تھا اور دوسری نلکی بالکل خالی تھی۔

اس حسین عورت کے میٹھے لبوں پر کڑوی مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔ اس نے صراحی کو پہلے کی طرح شوکیس میں بند کر دیا۔ پھر شیشے کی دونوں نلکیوں کو اپنے وینٹی بیگ میں رکھ کر وہ سبک خرامی سے چلتی ہوئی کٹہرے کے پاس آئی اور مسکراتی ہوئی بولی۔

''پور منکی! کل تم اپنے مالک کا حشر دیکھ لینا۔ اس نے قیامت تک زندہ رہنے کی دوا بنائی تھی لیکن اب اس صراحی کی دوا پی کر وہ قیامت کے دن ہی آنکھیں کھول سکیں گا۔ میں اسی وقت اس دوا کو نوش کر سکتی ہوں لیکن ڈاکٹر نے اسے پینے کے لیے جو وقت مقرر کیا ہے اسی وقت مجھے نوش کرنا چاہیے، ہوسکتا ہے کہ اس میں کوئی مصلحت ہو۔ کل میں یہاں آؤں گی اور اس کا طریقہ استعمال دیکھوں گی۔ ویسے یہ آب حیات میں مفت میں نہیں لے جا رہی ہوں، میں نے اس کے لیے ایک بوسے کی قیمت ادا کی ہے اور یہ احمق مرد نہیں جانتے کہ ایک عورت کا بوسہ بعض اوقات کتنا مہنگا پڑتا ہے''۔

یہ کہہ کر اس نے بندر کو ایک ہوائی بوسہ دیا پھر فاتحانہ انداز سے چلتی ہوئی لیبارٹری سے چلی گئی۔

بندر بہت دیر تک اکڑوں بیٹھا رہا۔ وہ شاید اس حقیقت پر غور کر رہا تھا کہ انسان بھی اس کی طرح دوسروں سے چھیننے اور جھپٹنے کا عادی ہے، فرق صرف اتنا ہے کہ بندر بلا جھجک کوئی بھی چیز چھین کر بھاگ جاتا ہے اور انسان اسی چیز کو دھوکے اور چالبازی سے حاصل کرتا ہے۔

آدھے گھنٹے بعد پھر ایک کھٹکا سنائی دیا۔ لیبارٹری کے اندر دروازے کے قریب پھر ایک سایہ نظر آیا۔ جب وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا قریب سے گزرا تو بندر نے اسے پہچان لیا۔ وہ ہارڈی میسن تھا۔ اپنے ملک کا عظیم سائنس دان۔ وہ بھی آب حیات چرانے آیا تھا۔ وہ سائنسی دوڑ میں عظیم صدیقی سے پیچھے نہیں رہنا چاہتا تھا اس لیے عظیم صدیقی کی

ایجاد پر اپنے نام کی چھاپ لگا کر شہرت حاصل کرنا چاہتا تھا۔

اس نے شوکیس سے صراحی نکال کر میز پر رکھ دی اور اپنے لانگ کوٹ کی جیب سے شیشے کی دو نلکیاں نکال کر انہیں زیرو پاور کی روشنی میں دیکھنے لگا۔ ایک نلکی میں سرخ سیال بھرا ہوا تھا اور دوسری نلکی بالکل خالی تھی۔

اس نے صراحی کے سیال کو خالی نلکی میں بھرنے کے بعد دوسری نلکی کے سیال کو صراحی میں انڈیل دیا اور اسے پہلے کی طرح شوکیس میں رکھ دیا۔ پھر شیشے کی دونوں نلکیاں لانگ کوٹ کی جیب میں پہنچ گئیں۔ وہ فاتحانہ انداز میں چلتا ہوا کٹہرے کے پاس آیا اور اپنی ایک انگلی سے بندر کی ٹھوڑی کو اٹھا کر مسکراتے ہوئے بولا۔

''میرے بے زبان دوست۔ اب میں تمہارے ساتھ قیامت تک زندہ رہوں گا اور تمہارا مالک اس صراحی کے آب حیات کو پی کر ہمیشہ کی نیند سو جائے گا۔ اس آب حیات کو میں ابھی نوش کر سکتا ہوں لیکن میں دیکھنا چاہتا ہوں کہ ڈاکٹر اس صراحی کی دوا پینے سے پہلے کوئی تبدیلی کرنا چاہتا ہے یا نہیں۔ اگر اس نے طبی نقطہ نظر سے کوئی اہم تبدیلی کی تو میں بھی اصلی آب حیات میں وہی تبدیلی لاؤں گا۔ پھر اسے پی کر زندہ جاوید ہو جاؤں گا''۔

یہ کہہ کر وہ ابدی زندگی کے نشے میں جھومتا ہوا وہاں سے چلا گیا۔

بندر کی نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔ اس لیے وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے تنہائی سے اکتا کر بندریا کی جانب دیکھا۔ اس کی ستر سالہ زندگی میں وہ دسویں بندریا تھا۔ اس کے آقا جانتے تھے کہ انسان اور بندر کی ضروریات ایک جیسی ہوتی ہیں۔ شاید ڈارون نے درست کہا تھا کہ انسان کے آباؤ اجداد بندر تھے جو ارتقائی منزلیں طے کرتے ہوئے انسان بن گئے۔ ڈارون نے ارتقائی منزلوں کا ذکر کیا تھا۔ یہ نہیں بتایا تھا کہ تباہی کی منزلیں طے کرتا ہوا انسان دوبارہ بندر بن سکتا ہے یا نہیں؟

کوئی ایک گھنٹے بعد ایک بار پھر کھٹکا سنائی دیا۔ بندر نے سلاخوں کے پیچھے سے سر اٹھا کر دیکھا۔ وہ بوڑھا یہودی جیمس تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ لبادے میں چھپے ہوئے تھے۔ جب اس نے میز کے قریب آ کر لبادے سے ہاتھوں کو نکالا تو اس کی گرفت میں دو بوتلیں تھیں ایک بوتل میں سرخ سیال بھرا ہوا تھا اور دوسری بوتل خالی تھی۔

پھر اس نے بھی وہی عمل دہرایا۔ صراحی کے سیال کو خالی بوتل میں بھر کر اس نے دوسری بوتل کے سرخ سیال کو صراحی میں انڈیل دیا اور صراحی کو پہلے کی طرح شوکیس میں رکھ کر دونوں بوتلوں کو پھر لبادے میں چھپا لیا۔

ابدی زندگی کی دوا مفت حاصل کرنے کی خوشی سے وہ پھولا نہیں سا رہا تھا۔ اس نے بندر کے سامنے دانت نکال کر کہا۔

''میں بھی کتنا احمق ہوں۔ ڈاکٹر کو لاکھوں ڈالر دینے کے لیے تیار ہو گیا تھا۔ ابے او بندر کی اولاد! اپنی زبان سے اگر اپنے آقا کو بول سکتا ہے تو بول دینا کہ اب اس صراحی میں زہر رکھا ہوا ہے۔ میں یہ آب حیات مفت لے جا رہا ہوں اور اسے زہر بھی مفت دیئے جا رہا ہوں۔ میں کل آ کر اس کی موت کا تماشہ دیکھوں گا۔ ہی ہی ہی''۔

وہ دھیمے سروں میں ہنستا ہوا لیبارٹری سے چلا گیا۔

رات آہستہ آہستہ گزرتی جا رہی تھی اور وہ بے چارہ بندر کسی اداس فلسفی کی طرح سر پر ہاتھ رکھے اکڑوں بیٹھا ہوا تھا۔

دوسری صبح لیبارٹری پھر آباد ہو گئی۔ رات کی تاریکی میں جو لوگ عظیم صدیقی کے دشمن بن کر آئے تھے وہ اب دوست بن کر اس کے سامنے کھڑے ہوئے تھے لیکن ان میں سوسن ہارڈے نہیں تھی۔ عظیم صدیقی نے مسکراتے

ہوئے ہارڈی سے پوچھا۔

''کیا بات ہے آج تمہاری خوبصورت سیکرٹری نہیں آئی؟ ہائے کل کے بوسے کی لذت مجھے ابھی تک یاد ہے''۔

ہارڈی میسن نے اپنی رسٹ واچ کو دیکھتے ہوئے جواب دیا۔

''میں نے اس سے کہہ دیا تھا کہ ٹھیک وقت پر یہاں پہنچ جائے لیکن یہ عورتیں آئینے کے سامنے میک اپ کرنے بیٹھتی ہیں تو پھر وقت کا خیال نہیں رکھتیں''۔

''بہرحال میرے لیے وقت کی پابندی لازمی ہے''۔ عظیم صدیقی نے شوکیس سے صراحی نکال کر میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

ہارڈی اور جیمس کے دل دھڑکنے لگے۔ آج ایک عظیم سائنس دان ان کے زہر سے ہلاک ہونے والا تھا۔ انہوں نے آج تک کسی کو ایک طمانچہ بھی نہیں مارا تھا لیکن ابدی زندگی کی خواہش انہیں قاتل بنا رہی تھی۔

ڈاکٹر عظیم صدیقی نے ریک کے مختلف سوراخوں میں لٹکی ہوئی شیشے کی نلکیوں میں سے ایک نلکی کو نکال کر کہا۔

''مسٹر ہارڈی! اس نلکی میں کون سا سیال ہے؟ اسے میرے سوا کوئی نہیں جانتا۔ میں نے اپنی ڈائری میں آب حیات کا جو فارمولا لکھ رکھا ہے اس میں اس نلکی کا ذکر میں نے مصلحتاً نہیں کیا ہے۔ یہ وہی دوا ہے جس کی کمی کے باعث میرے باپ دادا کو موت کے منہ میں جانا پڑا۔ اس کے صرف تین قطرے صراحی میں ٹپکا دیے جائیں تو یہ آب حیات مکمل ہو جاتا ہے''۔

یہ کہہ کر اس نے تین قطرے صراحی کے سیال میں ٹپکا دیئے۔ پھر صراحی کو اچھی طرح ہلانے کے بعد اس مکمل آب حیات کو یا دوسرے لفظوں میں اس مکمل زہر کو ایک گلاس میں انڈیلنے لگا۔

ہارڈی اور جیمس دم سادھے کھڑے تھے۔ عظیم صدیقی نے گلاس اٹھا کر قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔

''آب حیات...... ہاہاہا...... آسمانی کتابیں کہتی ہیں کہ ہر انسان کو موت کا مزہ چکھنا ہے۔ سب بکواس ہے، میں موت کو شکست دے رہا ہوں اور ابدی زندگی کا مزہ چکھ رہا ہوں''۔

یہ کہہ کر اس نے زہر کے جام کو ہونٹوں سے لگا لیا اور اسے غٹا غٹ پینے لگا۔

''اونک......!'' دوسرے ہی لمحے اس کے ہاتھوں سے جام چھوٹ گیا۔ جام چھوٹ گیا اور ٹوٹ گیا۔ وہ ٹوٹنے لگا۔ اس نے لڑکھڑاتے ہوئے میز کا سہارا لیا لیکن اس کے تمام جسم کے اندر ایسی آگ پھیل رہی تھی کہ وہ سنبھل نہ سکا۔ اوندھے منہ گر پڑا۔

وہ دم توڑ رہا تھا اور جیمس قہقہے لگا رہا تھا۔

''ہاہاہا...... میرے دوست! کاش تم میری بات مان لیتے اور میرے ہاتھوں اسے فروخت کر دیتے مگر تمہاری حماقتوں کا شکریہ...... تمہارا ایجاد کردہ آب حیات مجھے مفت حاصل ہو گیا ہے۔ پچھلی رات میں نے اسے صراحی سے نکال کر اس میں زہر بھر دیا تھا۔ ہاہاہا......''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی عظیم صدیقی ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو گیا۔ ہارڈی اب جیمس کو حیرانی سے دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ جیمس نے اس سے پہلے آ کر صراحی کا آب حیات نکالا تھا یا بعد میں۔ اگر وہ پہلے آیا تھا تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ جیمس سے دھوکہ کھانے والا ہے۔

جیمس اس وقت اس خاص نلکی سے تین قطرے ایک بوتل میں ٹپکا رہا تھا۔ ہارڈی نے اس سے پوچھا۔
''کیا تم پچھلی رات یہاں آئے تھے؟''
''ہاں!'' جیمس نے ہنستے ہوئے کہا۔
''کس وقت؟''
''صبح ہونے سے کوئی دو گھنٹہ پہلے......''
ہارڈی نے اطمینان کی سانس لی اور طنزیہ نظروں سے جیمس کو دیکھنے لگا کیونکہ وہ یہودی اب ہارڈی کے رکھے ہوئے زہر کو پینے جا رہا تھا۔
اس نے ایک گلاس میں زہر انڈیل کر اسے ہاتھوں میں لیا اور خوشی سے جھوم کر کہنے لگا۔
''میں زندہ جاوید ہو رہا ہوں۔ اب کوئی میری دولت کو ہاتھ نہیں لگا سکے گا۔ اب میری دولت قیامت تک میرے ساتھ رہے گی''۔
یہ کہتے ہوئے اس نے ایک ہی سانس میں تمام زہر حلق سے نیچے اتار لیا۔
''آہ......!'' ایک کراہ کے ساتھ گلاس اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ ٹھوڑی سے نیچے اپنے حلق کو جلدی جلدی سہلانے لگا۔ کوئی چیز اس کے حلق سے لے کر کلیجے تک کو چھیلتی چلی جا رہی تھی۔ پھر اس پر ایسا لرزہ طاری ہوا کہ وہ اپنا توازن برقرار نہ رکھا سکا اور ایک کٹی ہوئی شہتیر کی طرح فرش پر ڈھیر ہو گیا۔
ہارڈی خاموشی سے تماشہ دیکھ رہا تھا۔ پھر اس نے حقارت سے دونوں لاشوں کو دیکھتے ہوئے کہا۔
''بے وقوف لالچی بوڑھے! ابدی زندگی اتنی سستی نہیں ہوتی کہ ایک سائنس دان تجھے اتنی آسانی سے بخش دے۔ تم دونوں کا یہی انجام ہونا چاہیے تھا۔ ڈاکٹر عظیم میں تمہارا شکر گزار ہوں کہ تم اس انمول دوا کے ساتھ میرے لیے شہرت کے راستے بھی ہموار کر گئے ہو۔ یہ دنیا تمہارے اس کارنامے کو میرے نام سے منسوب کرتی رہے گی''۔
وہ حاصل کیے ہوئے آبِ حیات میں اسی خاص نلکی سے تین قطرے ٹپکانے لگا۔
''یہ ہے اصلی آبِ حیات۔ میں ہوں عظیم سائنس دان جس نے اس آبِ حیات کا فارمولا بنایا ہے۔ ڈاکٹر عظیم گمنامی کے اندھیرے میں جا چکا ہے۔ اب میری شہرت کا دور آیا ہے''۔
یہ کہہ کر وہ بھی اس زہر کو غٹا غٹ پی گیا۔
بندر دیکھ رہا تھا...... دیکھ رہا تھا کہ انسان کس طرح زندگی کے لالچ میں موت کو گلے لگاتا ہے۔ اس کے سامنے ہارڈی بھی سسک کر دم توڑ چکا تھا۔
تین لاشیں ادھر ادھر پڑی ہوئی تھیں، زندگی ناپائیدار ہے۔ ناپائیدار ہی رہی۔ موت نے اپنا فرض پورا کر دیا تھا۔
پھر اچانک ہی لیبارٹری کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا اور سوسن ہارڈے تیزی سے اندر آئی لیکن تین لاشوں کو دیکھ کر ٹھٹک گئی کیونکہ اس نے صرف عظیم صدیقی کی موت کی توقع کی تھی۔ وہ محض اس لیے دیر سے آئی تھی کہ اپنے دیئے ہوئے زہر سے ڈاکٹر کو مرتے ہوئے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ عورت بہت رحم دل ہوتی ہے جسے قتل کرتی ہے اس کے تڑپنے کا منظر نہیں دیکھ سکتی۔
وہ تین لاشوں کا مطلب اچھی طرح نہ سمجھ سکی۔ اس نے سوچا کہ شاید ان تینوں نے اس زہر کو بانٹ کر پیا

ہے یا کوئی اور وجہ بھی ہو سکتی ہے۔ ابدی زندگی کا لالچ کسے نہیں ہوتا۔ وہ اسی لالچ میں مر گئے ہیں۔

اس نے سوچا یہ اچھا ہی ہوا۔ اب کوئی یہ الزام عائد نہیں کرے گا کہ سوسن ہارڈے نے اصلی آب حیات کو چرا کر اس لیبارٹری سے ایک نئی زندگی کی ابتدا کی ہے۔

اس خیال سے مطمئن ہو کر اس نے اپنے وینٹی بیگ سے شیشے کی ایک نلکی نکالی جس میں ڈاکٹر کا تیار کردہ ادھورا آب حیات بھرا ہوا تھا۔ اس خوبصورت ناگن کو یہ نہیں معلوم تھا کہ اس کے علاوہ بھی ایک خاص نلکی ہے جس سے تین قطرے اس ادھورے آب حیات میں ٹپکائے جاتے ہیں، وہ دیر سے پہنچی تھی اس لیے ڈاکٹر کے فارمولے کے آخری آئٹم کو نہ سمجھ سکی تھی، اس نے نلکی کھول کر ڈاکٹر کی لاش کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ڈاکٹر میری جان! یہ آب حیات تیرے مقدر میں نہیں تھا۔ یہ میری سدا بہار جوانی کی ضمانت بن گیا ہے۔ اب میں کبھی بوڑھی نہیں ہو سکتی۔ میری زلفیں اسی طرح ریشم کی مانند ملائم رہیں گی، میرا جسم اسی طرح شاداب رہے گا۔ میں ہمیشہ ہمیشہ جوان رہوں گی''۔

یہ کہہ کر اس نے گلابی ہونٹوں سے زہر کے جام کو لگا لیا۔

''کھی کھی کھی......'' بندر کٹہرے کی سلاخوں کو پکڑ کر زور زور سے ہلانے لگا اور دانت نکال کر کھوخیانے لگا۔ اس کی آواز کے ساتھ سوسن کی کراہیں اور ہچکیاں گڈمڈ ہو رہی تھیں۔ وہ لڑکھڑا رہی تھی۔ سائنسی آلات اور شیشے کے مرتبان اس کی زد میں آ کر چھناکوں سے ٹوٹ رہے تھے۔ وہ اپنی بھاگتی ہوئی زندگی کو پکڑنے کے لیے لیبارٹری کے در و دیوار سے ٹکرا رہی تھی لیکن موت اس کی شہ رگ تک پہنچ گئی تھی۔ وہ دھپ سے تین لاشوں کے درمیان آ کر گر پڑی۔ اب چوتھی لاش کا بھی اضافہ ہو گیا۔

لیبارٹری میں سناٹا چھا گیا۔ بندر اکڑوں بیٹھا اپنی ہتھیلیوں پر ٹھوڑی رکھے ایک فلسفی کی طرح سوچ میں گم ہو گیا تھا۔

انسان اسی طرح دوسروں کی زندگی چھینتا رہے گا اور اپنی زندگی سے بھی ہاتھ دھوتا رہے گا۔ وہ سب مر گئے اور وہ بندر، انسانوں کو ایک دوسرے کے ہاتھوں سے مرنے کا اور اس دنیا کے فنا ہونے کا تماشہ دیکھنے کے لیے زندہ رہ گیا۔ لیبارٹری سے باہر وقت گزرنے لگا۔ سال گزر گیا، صدیاں بھی گزرنے لگیں۔ وقت کے ہاتھوں نے اس لیبارٹری کا حلیہ بگاڑ دیا۔ اسے کھنڈر بنا کر آثار قدیمہ کے کھاتے میں لکھ دیا۔ وہ بندر پہلے چڑیا گھر پہنچایا گیا پھر عجائب گھر بھیج دیا گیا، اس کے بعد وہ ایک دن موقع پا کر عجائب گھر سے فرار ہو گیا۔ کوئی نہ جان سکا کہ وہ تا قیامت بھٹکنے کے لیے کہاں چلا گیا ہے۔

اس عرصے میں دنیا کا نقشہ بدل گیا تھا۔ کتنے ہی براعظم سمندر کی تہ میں چلے گئے تھے اور کتنے ہی سطح سمندر پر ابھر آئے تھے۔ اس وقت بھی انسانوں کے درمیان ایک دوسرے کو قتل کرنے کا عمل جاری تھا۔ ایک انسان دوسرے انسان کو، ایک مذہب دوسرے مذہب کو اور ایک قوم دوسری قوم کو کبھی زندہ سلامت نہیں دیکھنا چاہتی۔ جب سے انسان نے زندہ رہنے کے تہذیبی اصول سیکھے ہیں تب سے دوسروں کو مارنے کے تدریجی حربے بھی کامیابی سے آزماتے آئے ہیں۔ ان دنوں پستول اور بندوقیں پرانے زمانے کی چیزیں ہو گئیں تھیں۔ ایٹم بم اور ہائیڈروجن بموں کے توڑ دریافت کر لیے گئے تھے۔ انسانوں کو جدید طریقوں سے مارنے کے لیے لیزر شعاعیں بھی کام میں لائی گئیں لیکن ہوتا یہ تھا کہ ایک انسان ہلاک کرنے کا نیا ہتھیار ایجاد کرتا تھا اور دوسرا اس سے بچاؤ کی تدابیر کر لیتا تھا۔

آخر چند بڑے بڑے دماغوں نے یکجا ہو کر سوچا اور اس نتیجے پر پہنچے کہ اس دنیا کی آبادی کم کرنے کے لیے دوسرں کو جبراً ہلاک نہیں کرنا چاہیے کوئی ایسا طریقہ سوچنا چاہیے کہ لوگ خود ہی راضی خوشی مرجایا کریں۔

اس مقصد کے لیے انسانی فطرت کا گہرا مطالعہ کیا گیا۔ اس مطالعہ سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ زمانے کے ساتھ ساتھ انسان کی فطرت بھی بدل گئی ہے۔ کبھی وہ شہادت کا درجہ حاصل کرنے میدان جنگ میں جاتا تھا اور اپنی خوشی سے مرجاتا تھا۔ کبھی مارے غیرت کے جان پر کھیل جاتا تھا مگر اب اس کے سوچنے کا انداز بدل گیا ہے۔ وہ مرنے مارنے والے جذبات اور احساسات کی طرف بھٹکتا بھی نہیں تھا۔

پھر ایک عالم فاضل عمر دراز مؤرخ نے کہا کہ انسان کی فطرت بدل سکتی ہے لیکن جو چیز اسے ورثے میں ملی ہے، وہ اس کے دل و دماغ سے نہیں جاتی۔ وہ چیز کیا ہے؟ وہ عورت ہے۔ عورت پر مرنا، آہیں بھر بھر کر راضی خوشی مرنے کی عادت اس کی گھٹی میں پڑی ہے۔ مرنے کا یہ دستور باوا آدم سے شروع ہوا اور ہزار ہا سالوں کے بعد بھی جاری و ساری ہے۔

اس نکتے پر پہنچ کر اس دور کی حسین و جمیل عورتوں کو ایک نئے ہتھیار سے آراستہ کیا گیا۔ یوں تو وہ ہتھیار عورتوں کے پاس پہلے سے موجود تھا صرف اس میں دھار پیدا کی گئی۔ اسے استعمال کرنے کے نت نئے طریقے سکھائے گئے۔ ان کی غزالی آنکھوں میں کچھ ایسا الیکٹرونک سسٹم رکھا گیا کہ وہ حسینائیں جسے آنکھ مارتیں وہ ہائے کے ساتھ مرجاتا۔ پہلے لوگ شاعرانہ انداز میں مرتے تھے اب جی جان سے مرکر اس دنیا سے رخصت ہونے لگے۔

اس طرح انسان گھٹنے لگے۔ چونکہ وہ راضی خوشی مر رہے تھے اس لیے دنیا کی آبادی تیزی سے کم ہو رہی تھی۔ کچھ عرصے بعد بڑے بڑے دماغوں کو اپنی ایک غلطی کا علم ہوا۔ وہ غلطی یہ تھی کہ عورتیں قاتل تھیں اور مرد مقتول، اس طرح مردوں کی تعداد گھٹ رہی تھی اور عورتوں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔

اس غلطی کی تلافی کرنا کوئی بڑی بات نہیں تھی۔ بڑے بڑے دماغوں نے ایک متفقہ فیصلے پر عمل کرتے ہوئے عورتوں کے جسمانی نظام سے وہ خانہ نکال کر پھینک دیا جہاں مادہ تولید پناہ لیتا ہے اور بچے پرورش پاتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پیدائش کا عمل رک گیا۔

قدرت کے نظام میں ذرا بھی تبدیلی ہو تو انسان کی تہذیب یکسر بدل جاتی ہے۔ اب کوئی عورت مہذب ماں نہیں بنتی تھی، اب عورت محض داشتہ تھی کیونکہ جب عورت وارث نہ پیدا کرے اور ایک نسل کو آگے نہ بڑھائے تو پھر بیوی کے رشتے کی تمام اہمیت ختم ہو جاتی ہے لہٰذا اب عورت صرف اس مصرف کے لیے رہ گئی کہ وہ رات کو ساتھ سوئے اور دن کو بھلا دی جائے۔

نصف صدی کے بعد مردوں اور عورتوں کی تعداد بہت ہی کم ہوگئی۔ ہر ملک میں لوگ صرف سینکڑوں کی تعداد میں رہ گئے۔ کچھ بڑے دماغ اپنی عمر گزار کر مر گئے، جو بچ گئے انہیں لوگوں نے مار دیا کیونکہ ان کی ہی وجہ سے یہ وقت دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ اب اس دنیا میں کوئی عورت ایسی نہیں تھی جو ماں بن سکتی اور اس ویران ہونے والی دنیا کو پھر ننھے منے بچوں سے آباد کر سکتی۔

کوئی ہے ایسی عورت؟

اس دنیا کے بچے کھچے لوگ ایسی کسی عورت کو تلاش کرنے کے لیے ملک ملک کی خاک چھاننے لگے لیکن۔

ایسی کوئی عورت نہ ملی۔ اس دنیا میں جو عورتیں رہ گئی تھیں وہ گھسے پٹے ریکارڈ کی طرح چل رہی تھیں جن میں سے پرانے جانے پہچانے سر نکلتے تھے مگر کسی کے اندر سے لوری کی مترنم آواز نہیں آتی تھی۔

پھر ایک نجومی نے بتایا کہ ایسی ایک عورت ابھی اس دنیا میں موجود ہے جو ماں بن سکتی ہے اور اس دنیا کی آبادی کو آگے بڑھا سکتی ہے۔

اس نجومی نے اپنے علم کی قوت سے ہزاروں سال پیچھے ماضی کی تہ در تہ میں جھانک کر دیکھا تو اسے زمین کے ایک خطے میں منوں مٹی تلے ایک تابوت نظر آیا۔ اس نجومی نے کہا۔

''میں اپنے علم کی آنکھ سے ایک ایسی حسین دوشیزہ کو دیکھ رہا ہوں جس کے حسن کی مثال ہماری دنیا کی کوئی عورت پیش نہیں کر سکتی۔ میں اپنی سمعی قوت سے بتا سکتا ہوں کہ اس تابوت میں اس کے سانسوں کی سرگم گونج رہی ہے۔ وہ ہزاروں سال سے زندہ ہے اور زندہ رہے گی''۔

ایک سائنس دان نے بے یقینی سے کہا۔

''یہ کیسے ممکن ہے؟ ایک عورت ہزاروں سال سے کیسے زندہ ہے؟ ہم نے حیرت انگیز سائنسی ترقیاں کی ہیں۔ سمندر کی تہ سے ہم آسمان کی بلندیوں تک جا پہنچے ہیں۔ ہم کائنات کے کتنے ہی اسرار بے نقاب کر چکے ہیں۔ قدرت کے صرف دو راز ایسے ہیں جہاں ہم نہیں پہنچ سکے۔ ایک تو یہ کہ ربر کی مصنوعی عورت سے اصلی بچے پیدا کرنا اگرچہ ایسی عورت سے بچے پیدا ہوئے تھے مگر وہ چند منٹ یا چند گھنٹوں سے زیادہ زندہ نہ رہ سکے۔ اس کوشش میں ہمیں ناکامی ہوئی۔ ہماری دوسری کوشش یہ تھی کہ ہم ابدی زندگی حاصل کریں۔ ایسی کوششیں ہر زمانے میں ہوتی رہی ہیں مگر آج تک کسی کو کامیابی نہیں ہوئی۔ پھر آج کیسے یقین کریں کہ ایک عورت ہزاروں سال سے مٹی کے نیچے دبی ہوئی ہے اور ہوا اور روشنی کے بغیر کچھ کھائے پیئے اب تک زندہ ہے''۔

''میں نہیں جانتا کہ وہ کیسے زندہ ہے البتہ منطق سے سمجھا سکتا ہوں۔ مچھلی روشنی اور ہوا کے بغیر سمندر کی تہ میں زندہ رہتی ہے۔ ایک کیڑا روشنی اور ہوا کے بغیر مٹی کی تہ میں زندہ رہتا ہے دونوں کی زندگی کے لیے قدرتی طور پر خوراک ملتی رہتی ہے۔ اس دوشیزہ میں بھی کیڑے اور مچھلیوں کی سی خاصیتیں ہیں۔ قدرت کا اپنا بھید ہے جسے ہم اور تم نہیں سمجھ سکتے۔ ہم نے آج تک جتنی بھی سائنسی ترقیاں کی ہیں وہ دوسروں کو ہلاک کرنے اور خود کو زندہ رکھنے کے لیے کی ہیں''۔

نجومی کے دلائل سننے کے بعد وہ اس مقام پر گئے جہاں وہ تابوت دفن کیا گیا تھا۔ دنیا کی آبادی بہت مختصر تھی اور وہ تمام مختصر آبادی اس جگہ آ کر جمع ہو گئی تھی۔ ان میں مرد بھی تھے اور عورتیں بھی تھیں لیکن کوئی بچہ یا جوان نہیں تھا کیونکہ نصف صدی سے پیدائش کا عمل رکا ہوا تھا۔ پچاس برس پہلے جو جوان تھے وہ اب اسی نوے سال کے بوڑھے ہو گئے تھے۔

وہ سب اس جگہ کو باری باری کھود رہے تھے کہ بڑھاپے کی وجہ سے مسلسل کدالیں نہیں چلا سکتے تھے۔ ذرا سی دیر میں تھک کا ہانپنے لگتے تھے پھر یہ کہ ہزاروں سال کی مدت میں اس جگہ مٹی اور پتھروں کا اتنا ڈھیر جمع ہو گیا تھا کہ وہ چھوٹی سی پہاڑی نظر آتی تھی۔

اس پہاڑی کے اطراف انسانوں کا میلہ سا لگا ہوا تھا۔ رات کے وقت کھدائی کی رفتار سست ہو گئی۔ سست رفتاری کے باوجود یہ یقین تھا کہ صبح تک تابوت برآمد ہو جائے گا۔

اس رات چند سمجھدار اور چالاک انسان ایک خیمے میں آ کر کچھ خاص قسم کے مشوروں کے لیے جمع ہو گئے۔

تیل کا کنواں ہو، سونے اور ہیرے کی کان ہو یا عورت کی قبر۔ جب بھی کوئی نایاب چیز کھود کر نکالی جاتی ہے تو عالمی سیاست عمل میں آجاتی ہے۔ صبح برآمد ہونے والی شے ہی ان کے لیے ایک نایاب عورت تھی۔ ایک ایسی عورت جو اس دنیا کے لیے نئے انسانوں کو جنم دے سکتی تھی۔

اس خیمے میں چار بڑے آدمی یا چار بڑی طاقتیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان میں سے ایک طاقت نے کہا۔

''اس دنیا کی پرانی آبادی تقریباً ختم ہو چکی ہے جو رہ گئے ہیں وہ اولاد پیدا کیے بغیر مر جائیں گے۔ اب نئی دنیا کے نئے انسان اس عورت کی کوکھ سے جنم لیں گے جو صبح ہمیں دستیاب ہونے والی ہے لہٰذا ہمیں آپس میں فیصلہ کر لینا چاہیے کہ وہ عورت ہم میں سے کس کے بچے کی ماں بنے گی؟ یعنی آئندہ دنیا کے آدمیوں کا باپ کون بنے گا؟''

''میں بنوں گا'' دوسری طاقت نے کہا ''کیونکہ میں بھی ایک بڑی طاقت ہوں''۔

تیسری اور چوتھی طاقتوں نے بھی یہی دعویٰ کیا کہ وہ اس دنیا کے بڑے ہیں۔ اتنی بڑی دنیا میں ہر طرف ان کی اولاد پھیلے گی اور پھلے پھولے گی۔ ایک طاقت نے کہا۔

''ہم میں سے ہر ایک کی خواہش ہے کہ ہم آئندہ دنیا کے باپ بنیں لیکن ہم چار طاقتوں نے اگر الگ الگ اپنے متعلق خودغرضی سے فیصلہ کیا تو پھر ہمارے درمیان جنگ چھڑ جائے گی۔ ہم اس دنیا کی ابتدا سے لڑتے آئے ہیں اس لڑائی جھگڑے کا نتیجہ اب ہمارے سامنے ہے۔ ہم تعداد کے لحاظ سے برائے نام رہ گئے ہیں۔ اگر جنگ چھڑ گئی تو ہم سب مارے جائیں گے۔ اس دنیا میں ہم انسانوں کا یہ آخری وجود ہے۔ اس کے بعد یہاں ایک بھی آدمی کا بچہ نظر نہیں آئے گا لہٰذا دانش مندی یہ ہے کہ ہم آپس میں اس ایک عورت کو بانٹ لیں۔ پہلے ہم میں سے کسی ایک کے پاس رہے گی۔ ایک سال کے اندر جب وہ بچے کا باپ بن جائے گا تو پھر وہ عورت دوسری طاقت کے پاس چلی جائے گی''۔

دوسری طاقت نے سر ہلا کر تائید کی۔

''ہاں ہزاروں سال پہلے جب کہ دنیا آباد ہوئی تھی اور جب انسان تہذیب کا مطلب اور شرم و حیا کے معنی نہیں جانتا تھا۔ ان دنوں بھی عورت مختلف وقتوں میں مختلف قبیلوں کے سرداروں کے بس بچے پیدا کرنے کام آیا کرتی تھی۔ ہماری اس دنیا کی جو ابتدا تھی انتہا میں بھی وہی بے شرم تہذیب آئی ہے مگر کیا کیا جائے؟ مجبوری ہے۔ ابھی تو یہی دانشمندی ہوگی کہ وہ عورت ہر سال ہم میں سے ہر طاقت کے پاس رہے۔ یہ اچھا ہے۔ اس دنیا میں صرف ہم چار طاقتوں کی اولادیں رہیں گی۔

وہ چاروں دانشمند فیصلے پر متفق ہوگئے۔ صبح کھودنے والے زمین کی تہ میں تابوت تک پہنچ گئے۔ چاروں طرف شور مچ گیا کہ تابوت نظر آگیا ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں مزید حیرانی اور خوشی کی بات یہ تھی کہ اس تابوت کے اندر سے ٹھہر ٹھہر کر طبلہ بجانے کی آوازیں آرہی تھیں۔

پھر کتنے ہی ہاتھوں نے اس تابوت کو سنبھال کر اٹھایا اور اسے چار طاقتوں کے درمیان لا کر رکھ دیا۔ تابوت کے اوپر انسانی ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ اوندھا پڑا ہوا تھا، اسے اٹھا کر ایک طرف پھینک دیا گیا۔ چند لمحوں کے بعد اس تابوت کا اوپری حصہ کھل گیا۔

سب نے بے قراری سے آگے بڑھ کر دیکھا۔ اندر ایک حسین مہ جبیں اپنی آنکھوں پر دونوں ہاتھ رکھے لیٹی ہوئی تھی برسوں زمین کی تہ میں رہنے کے بعد اب اس کی آنکھیں صرف اندھیرے کی عادی ہوگئی تھیں اس لیے وہ

آنکھیں روشنی کو برداشت نہیں کر رہی تھیں۔

چاروں طاقتیں اس کے آس پاس بیٹھ گئی تھیں اور اسے بڑی نرمی سے چھو کر دیکھ رہی تھیں۔ ایک نے پوچھا۔
''تم نے اپنی آنکھوں پر ہاتھ کیوں رکھ لیے ہیں؟ اپنے ہاتھ ہٹاؤ۔ ہم تمہاری خوبصورت آنکھوں میں جھانکنا چاہتے ہیں''۔

شے می نے ہاتھ نہیں ہٹائے۔ اس نے ذرا سا آنکھیں کھولیں اور مخروطی انگلیوں کی چلمن سے پہلی بار اس دنیا کے لوگوں کو دیکھنے لگی۔ وہ کچھ عجیب قسم کے لوگ تھے ان میں سے کسی کے چہرے پر تازگی اور شگفتگی نہیں تھی، وہ سب بوڑھے اور وقت کے طمانچے کھائے ہوئے جھریاں دار چہرے تھے۔ انہیں دیکھنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ شے می نے آنکھیں بند کرتے ہوئے پوچھا۔

''تم کون ہو؟ میں اس وقت کہاں ہوں؟ مجھے کہیں اندھیرے میں لے چلو، یہ روشنی میری آنکھیں میں چبھ رہی ہے''۔

انہوں نے اسے تابوت سے اٹھا کر ایک اسٹریچر پر لٹا دیا۔ وہ آنکھیں بند کیے پڑی رہی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اسے کہاں لے جایا جا رہا ہے۔ آدھ گھنٹے بعد جب اس نے آنکھیں کھولیں تو خود کو ایک عالیشان محل کی ائیر کنڈیشنڈ خواب گاہ میں پایا۔ اس کے دروازے اور کھڑکیاں بند تھیں۔ خواب گاہ میں ہلکی ہلکی روشنی تھی۔ اس روشنی میں اس نے چند بوڑھی عورتوں کو دیکھا جو اسے غسل کرانے اور نیا لباس پہنا کر دلہن بنانے آئی تھیں۔ انہیں دیکھ کر شے می نے کہا۔
''میں نے وہاں بھی بوڑھے دیکھے یہاں بھی بوڑھیاں نظر آ رہی ہیں۔ آخر میں کس دنیا میں آ گئی ہوں کہ کوئی نوجوان چہرہ نظر ہی نہیں آتا''۔

اس کے جواب میں وہ بوڑھیاں اسے عجیب و غریب باتیں بتانے لگیں۔ انہوں نے بتایا کہ نصف صدی سے وہاں کسی نوزائیدہ بچے کی صورت نہیں دیکھی گئی ہے۔ اس دنیا میں جتنے میٹرنٹی ہوم ہیں وہاں پالتو کتوں اور بلیوں کے بچے جنم لیتے ہیں۔ بے بی فوڈ تیار کرنے والی جتنی صنعتیں ہیں، اب وہ بابا فوڈ تیار کرتی ہیں۔ وہاں کی عورتیں پچاس برس سے کسی بچے کو سینے سے لگانے اور لوری سنانے کے لیے ترس رہی ہیں۔ اس دنیا کے چار بڑوں کو بھی اپنی غلطی کا احساس ہو گیا کہ اگر قانون قدرت کے خلاف عورتوں کی کوکھ اجاڑ دی جائے تو یہ دنیا کس طرح اجڑ جاتی ہے۔

شے می کو غسل کرایا گیا۔ اسے رفتہ رفتہ ہر بات معلوم ہوتی گئی کہ اتنی بڑی دنیا میں وہی صرف ایسی عورت ہے جس کی کوکھ سلامت ہے اور وہ اس دنیا کو نئے سرے سے آباد کر سکتی ہے۔ پھر یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دنیا کی آبادی اب صرف چند سو یا ہزار افراد پر مشتمل ہے جن میں نصف سے زیادہ عورتیں ہیں۔ باقی بوڑھے مرد ہیں اور وہ لوگ بھی رفتہ رفتہ موت کی طرف رینگتے جا رہے ہیں۔

غسل کے بعد شے می کو اس دور کا بہترین نیم ٹرانس پیرنٹ لباس پہنایا گیا۔ پر تکلف کھانا کھلا گیا۔ پھر وہ بوڑھی عورتیں اسے اس دنیا کی سب سے بڑی طاقت کے بیڈ روم میں لے گئیں اور اسے پھولوں کی سیج پر بٹھا کر آ گئیں۔

شے می سیج پر بیٹھ کر چاروں طرف دیکھنے لگی۔ وہ بہت ہی خوبصورت اور آرام دہ خواب گاہ تھی۔ دیواروں پر عریاں اور جذبات میں ہیجان پیدا کرنے والی تصویریں آویزاں تھیں۔ ہزاروں برس مٹی کی تہ میں ساکت و جامد رہنے کے بعد پہلی بار شے می کے بدن میں انگڑائیاں مچلنے لگیں۔ وہ خوشبوؤں میں بسی ہوئی تھی اور اس کی آنکھوں میں خمار چھا

رہا تھا۔ تھوڑی دیر بعد اس دنیا کا پہلا بڑا خواب گاہ میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر گھبرائی ہوئی سی مسکراہٹ تھی۔ پھولوں کی سیج پر سترہ سال کی ایک دوشیزہ کو دیکھ کر وہ گہری گہری سانسیں لینے لگا پھر وہ کانپتے ہوئے قدموں سے اس کے قریب آیا اور اس کا ملائم ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر محبت بھرے مکالمے ادا کرنے لگا۔

زمین کی تہ میں آتش فشاں کی طرح پگھلنے والی شے می کو مکالموں سے دلچسپی نہیں تھی اس نے اپنی مرمریں بانہیں اس کی گردن میں حمائل کردیں۔ پھر اپنے لبوں کو اس کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔ بوسے کی پہلی منزل بڑی صبر آزما تھی اتنی دیر میں وہ پسینہ پسینہ ہوگیا۔

خواب گاہ کے باہر اس محل کے باہر فوری طور پر ایک میٹرنٹی ہوم قائم کردیا گیا تھا۔ تجربہ ڈاکٹروں اور نرسوں کی تقرری ہو چکی تھی۔ پرانے صنعتکاروں کو بے بی فوڈ بنانے کے لائسنس جاری کردیے گئے تھے اور بوڑھی عورتیں اپنے گھروں میں بیٹھ کر بھولی ہوئی لوریاں یاد کررہی تھیں۔

تمام لوگ نئی نسل کو خوش آمدید کہنے کے انتظامات میں مصروف تھے لیکن محل کے اندر سناٹا تھا۔ آدھی رات کے بعد اس دنیا کے پہلے بیڈروم کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھلا شے می جھنجلا کر ''اونہہ'' کہتی ہوئی باہر نکلی اور اپنی خواب گاہ میں آکر اور ذرا آنسو بہا کر پھر تکیے کو سینے سے لگا کر سوگئی۔

وہ ''پہلا بڑا'' ندامت سے مرگیا۔ سچ مچ مرگیا۔ اس دنیا کو تباہ کرنے کے بعد جب اولاد نہ ہو، جب وہ ایک عورت کو فتح نہ کرسکے اور جب ایک عورت ''اونہہ'' کی ہتک آمیز برچھی سینے میں اتار کر چلی جائے تو اسے شرم سے مر جانا چاہیے تھا اس لیے وہ مرگیا۔

شے می دوسرے بڑے کے حصے میں آگئی۔

دوسرا بڑا زیادہ ہی سمجھدار تھا کیونکہ وہ اپنے بڑھاپے اور شے می کی جوانی کے درمیان جو طویل فاصلہ ہے، اس فاصلے کو اچھی طرح سمجھتا تھا کہ وہ اتنا طویل سفر نہیں کرسکے گا۔ اس نے شے می کو بہلا پھسلا کر رکھا تھا اور اپنے خاص آدمیوں کو کسی ایسے شخص کی تلاش میں روانہ کردیا جو اس دنیا کے بوڑھوں میں کم بوڑھا ہو۔ یعنی قدرے جوان ہو اور شے می کے بچوں کا باپ بن سکتا ہو۔

منصوبہ یہ تھا کہ خفیہ طور سے باپ کوئی بنے گا۔ پھر اس گمنام باپ کو ہلاک کردیا جائے گا۔ اس طرح باپ کا ٹائٹل اس دنیا کے دوسرے بڑے کو مل جائے گا۔

دوسرے دن اس کے خاص آدمی ایسے بوڑھوں کو پکڑ لائے جو دوسروں کے مقابلے میں کم عمر تھے اور اب سے پچاس برس پہلے وہ نوزائیدہ بچے تھے اب وہ پچاس برس کے ہوگئے تھے انہیں مکمل بوڑھا نہیں کہا جاسکتا تھا وہ ادھیڑ عمر کے تھے اور کافی صحت مند نظر آتے تھے۔

اُن کی صحت کو دیکھ کر دوسرے بڑے کو خطرہ لاحق ہوا کہ اگر شے می ان میں سے کسی ایک کو پسند کرلیتی تو پھر اس دنیا کے بڑوں کی ملکیت بننے سے انکار کردیتی کیونکہ عورت کسی بڑے کی بڑی بن کر کھلی دنیا کی حکمرانی نہیں چاہتی۔ وہ ایسی مسرتوں کی تکمیل چاہتی ہے جو اس کے اندر سے پھوٹتی ہیں۔ وہ ایک جوانمرد کی آرزو کرتی ہے اور اسی کی آغوش میں جینا اور مرنا چاہتی ہے۔ صرف اتنا ہی نہیں وہ اپنے بچوں کے باپ کا نام بھی فخر سے لیتی ہے اور کسی بوڑھے کے وجود پر باپ کا جھوٹا لیبل لگا کر اپنی آئندہ نسل کی توہین نہیں کرتی۔

دوسرا بڑا اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ گیا تھا۔ اس نے مجبور ہو کر تیسرے اور چوتھے بڑے سے مشورہ کیا۔ وہ بھی حقیقت حال کو اچھی طرح سمجھ گئے اور اپنی کمزوریوں کا بھی اعتراف کر لیا۔ پھر انہوں نے سوچا کہ جب ہم سے ہماری اولاد نہیں ہوگی تو پھر یہ دنیا رہے یا انسانوں سے خالی ہو جائے، ہمارے لیے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ لہٰذا اس دنیا کو خالی ہو جانے دو۔ ہم یہ توہین برداشت نہیں کریں گے کہ کسی دوسرے کی اولاد اس دنیا پر حکمرانی کرے۔

اب اس دنیا میں صرف دو ہی نیم جوان اور نیم بوڑھے ایسے تھے جن میں باپ بننے کی صلاحیتیں تھیں اور جو وہاں پکڑ کر لائے گئے تھے۔ تین بڑوں کے حکم سے انہیں قتل کر دیا گیا اور ان کی لاشیں چھپا دی گئیں۔ اس کے بعد شے می کو آزاد چھوڑ دیا گیا۔ اب وہ کہیں بھی جا کر اس دنیا کو آباد کرنے کے لیے اپنی قسمت آزما سکتی تھی۔

اتنی بڑی دنیا میں کوئی ایسا نہ تھا جو اس کا جیون ساتھی بن سکتا۔ وہاں صرف ایسے لوگ تھے جو بڑھاپے کی آخری منزل پر اپنی اپنی موت کا انتظار کر رہے تھے۔

وہ مایوس ہو کر رونے لگی۔ وہ تابوت میں دفن ہوگئی تھی۔ اچھا ہی تھا وہاں سکون سے تھی۔ اب اسے قبر سے نکال کر اور اس کے جذبات بھڑکا کر اسے رونے کے لیے چھوڑ دیا گیا تھا۔ وہ جگہ جگہ جاتی تھی کبھی فریاد کرتی تھی اور کبھی ان پر لعنت و ملامت کرتی تھی۔

"یہ کیسی دنیا ہے؟ کیا یہ ان ہی انسانوں کی دنیا ہے جنہیں اشرف المخلوقات کہا جاتا ہے۔ ذرا آئینہ اٹھا کر دیکھو تمہارے مردہ چہروں پر کیسے پھٹکار برس رہی ہے"۔

تم سمجھتے تھے کہ بچوں اور جوانوں کے بغیر تمہاری دنیا آباد رہے گی۔ کیسے رہے گی؟ جوانی ایک قوت کا نام ہے جو پھول کھلاتی ہے فصل اگاتی ہے اور عورت کو ماں بناتی ہے۔ اس حقیقت سے کوئی انکار کر سکتا ہے۔ تم سب احمق ہو، تم نے اپنی تقدیر کو خدا کے بجائے اس دنیا کے چار بڑے شیطانوں کے حوالے کر دیا۔ وہ بڑی طاقتیں تمہاری تقدیر کی مالک بن گئیں۔ وہ تمہیں اخلاقی موت مارتے تھے اور زندہ رکھنے کے لیے گندم کی خیرات دیتے تھے۔ انہوں نے آبادی کم کرنے کے لیے تمہاری ماؤں اور بہنوں کی کوکھ اجاڑ دی اور اب آخری وقت تم اپنی اور اس دنیا کی تباہی کا تماشا دیکھ رہے ہو۔

وہ جہاں جاتی تھی فریاد کرتی تھی اور روتی تھی، روتے روتے وقت گزرنے لگا۔ گزرتے ہوئے وقت کے ساتھ بوڑھیاں اور بوڑھے مرنے لگے۔ ان تین بڑی طاقتوں نے بھی دم توڑ دیا اور وہ اس دنیا میں تنہا رہ گئی۔

بستیاں ویران ہوگئیں۔ راستوں میں دھول اڑنے لگی۔ زمین کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک کسی انسان کی آواز سنائی نہیں دیتی تھی۔ ہر طرف گہری خاموشی اور بوجھل سناٹا چھایا ہوا تھا۔ وہ ویران بستیوں کو چھوڑ کر جنگلوں میں بھٹکنے لگی۔

جنگلوں میں چہچہاتے ہوئے پرندے اور غراتے ہوئے درندے تھے۔ وہ دنیا اب جانوروں سے آباد تھی اور وہاں ہر پرندے اور ہر جانور کا جوڑا تھا صرف شے می تنہا تھی۔ اس کا کوئی جوڑ نہیں تھا وہ قیامت کے انتظار میں تنہا بھٹک رہی تھی اور قیامت کا دور دور تک پتہ نہیں تھا۔

وہ گھنے جنگلوں سے نکل کر ایک پہاڑ کی چوٹی پر آکر بیٹھ گئی۔ اس بلندی سے دھرتی نظر آرہی تھی۔ لباس کے بغیر یہ دنیا ننگی ہو جاتی ہے اس لیے یہ دنیا ننگی نظر آرہی تھی۔

اس پہاڑ کی چوٹی پر صبح سے شام ہونے لگی۔ تب اچانک ہی اسے عجیب سی آواز سنائی دی۔ وہ ہنسی کی آواز

تھی۔ آدھی انسانی ہنسی تھی، آدھی حیوانی ہنسی تھی۔ ''ہی ہی ہی کھی کھی کھی ......''

سامنے ایک درخت کی شاخیں ہل رہی تھیں اور پتیاں شور مچا رہی تھیں۔ پھر اس گھنے درخت سے ایک بندر چھلانگ لگا کر اس کے سامنے آیا اور ایک قلابازی کھا کر کھڑا ہو گیا۔

شے می نے حیرانی سے پلکیں جھپک جھپک کر دیکھا۔ وہ ایسا بندر تھا جو ڈارون کی تھیوری کے مطابق ترقی کی منزلیں طے کرتا ہوا انسانی سراپے میں ڈھل گیا تھا اس کے جسم کے بال وقت کے ساتھ ساتھ سوکھے پتوں کی طرح جھڑ گئے تھے۔ اس کے ہاتھ پاؤں کسی قدر سیدھے ہو گئے تھے اور چار پاؤں کے بجائے دو پاؤں سے چلنے لگا تھا۔

وہ دو پاؤں سے چلتا ہوا اس کے قریب آیا پھر اس نے اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر اور سر جھکا کر کہا۔

''آپ نے شاید مجھے پہچانا نہیں لیکن میں نے پہچان لیا۔ آپ میری مالکہ ہیں ہم ہزاروں سال سے بچھڑے ہوئے ہیں اور آج پہاڑ کی اس چوٹی پر آ ملے ہیں''۔

شے می کو یاد آ گیا کہ اس کے خاوند عظیم صدیقی کے دادا نے اس بندر کو آبِ حیات پلایا تھا۔ وہ خوش ہو کر بولی۔

''میں نے تمہیں پہچان لیا ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم مل گئے۔ میں تنہائی سے گھبرا رہی تھی۔ اب مجھ سے باتیں کرنے والا ایک ساتھی مل گیا ہے''۔

''ہاں ہم باتیں کریں گے دیکھو یہ دنیا کیسی اجڑ گئی ہے''۔

''ہاں اب زمین پر میں اکیلی رہ گئی ہوں''۔

بندر نے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''اب اس دھرتی پر ہم دو ہی جاندار رہ گئے ہیں۔ یہ دنیا بچوں کی ہنسی کے بغیر کتنی اداس ہے آؤ ہم ایک نئی دنیا کی تیاری کریں۔

یہ کہتے ہی اس نے شے می کو اپنی آغوش میں کھینچ لیا۔ وہ ایک دم سے کانپ گئی۔ اس نے دھڑکتے دل سے سوچا۔

''آہ! کیا ڈارون کی تھیوری کے مطابق اب یہ آدمیوں کا باپ بنے گا؟''

اس خیال کے آتے ہی وہ شرم سے پانی پانی ہو گئی۔

☆O......O☆

سدا سہاگن

میں نے اسے دیکھا۔ وہ شیشہ تھی۔
میں نے ہاتھ لگایا۔ وہ پتھر تھا۔
وہ تھی اور وہ تھا۔
ایک متعفن ماحول میں ایک نازک جذبے کی کہانی
جو نازک دلوں میں اتر کر لہو کی طرح گھل جاتی ہے۔

یہ ان دنوں کی بات ہے کہ جب جوانی اٹھان پر تھی اور مجھے ہر چمکتی ہوئی چیز سونا نظر آتی تھی۔ میں ادھ کھلی کلی اور ایک شاداب پھول کی شگفتگی کے فرق کو سمجھنے لگا۔ ایسے ہی وقت میں نے زلیخا کو دیکھا تو لگا کہ جاڑے کی ہلکی سنہری دھوپ آنکھوں کے دریچوں سے اتر کر دل کو آنچ دے رہی ہے۔

زندگی میں پہلی بار ایسا چندن سا روپ دیکھا تھا اس لیے بڑی محویت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ وہ داتا دربار کے اس دروازے پر کھڑی ہوئی تھی جو خواتین کی آمد و رفت کے لیے مخصوص تھا۔ اس کے قریب ایک خسرا اپنے زانوں پر ڈھولک رکھے زینے پر بیٹھا ہوا تھا۔ آنے جانے والی خواتین کی بھیڑ میں وہ کبھی نگاہوں سے اوجھل ہو رہی تھی اور کبھی اجاگر ہو رہی تھی۔ حسن چھپتا رہے اور جھلکتا رہے، پردہ گرتا رہے اور اٹھتا رہے تو لمحہ بہ لمحہ جلوے کی تابناکی بڑھتی ہی چلی جاتی ہے۔ وہ چاند سا مکھڑا عورتوں کے سیلاب میں لہر لہر چمک رہا تھا۔ میں داتا صاحب سے کچھ مانگنے آیا تھا۔ کیا مانگنے آیا تھا؟ اس وقت بھول گیا تھا یعنی اس سخی داتا سے مانگنا ضرور تھا مگر دعا بدل گئی تھی۔ پہلے زبان سے مانگنے آیا تھا اب دل سے مانگ رہا تھا اور اس یقین کے ساتھ کہ وہ دینے والا میرے حسن طلب کو خوب سمجھتا ہے۔

تھوڑی دیر بعد ایک بوڑھی عورت شیرینی اور اگربتیاں لے کر اس کے پاس آئی۔ خسرا زینے پر بیٹھا رہا او وہ بوڑھی عورت کے ساتھ دربار میں داخل ہوگئی۔ میں بھی جلدی سے پلٹ کر دوسرے دروازے پر آیا جو مردوں کے لیے مخصوص تھا۔ وہاں میں نے ٹوکن لے کر جوتیاں جمع کیں اور دل کو سنبھالتا ہوا مزار مقدس تک پہنچ گیا۔ مزار کے ایک طرف مرد کھڑے دعائیں مانگ رہے تھے اور کلام پاک کی تلاوت کر رہے تھے دوسری طرف عورتیں نذر نیاز میں مصروف تھیں۔ میں نے وہاں پہنچتے ہی پہلے داتا صاحب کے حضور سجدہ کیا۔ حالانکہ سجدہ صرف خدا کے سامنے کیا جا ہے مگر وہاں میری طرح اکثر لوگ سجدے کرتے ہیں۔ اس پر بحث نہیں کہ ہم ایسا کیوں کرتے ہیں بس عقیدت سے

سر جھکتا ہے اور سجدے تک پہنچ جاتا ہے۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں جانتا۔

میں سجدے سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا اور دونوں ہاتھ دعا کے لیے اٹھا دیئے۔ اٹھے ہوئے دونوں ہاتھوں کے درمیانی فاصلے سے میں نے مزار کے دوسری جانب دیکھا جہاں عورتیں کھڑی ہوئیں تھیں۔ پرائی عورتوں کو دیکھنا مقصود نہ تھا۔ میں جسے داتا صاحب سے مانگنے آیا تھا اسے تلاش کر رہا تھا۔

میں اس جگہ تھا جہاں لوگ دنیا کی دولت بھی مانگنے آتے ہیں اور دل کی دولت بھی۔ اس مقدس مزار کو چھو کر ایک غریب ماں اپنی بیٹی کو سہاگن بنانے کی آرزو کرتی ہے، وہیں ایک نائیکہ اپنی بیٹی کے پاؤں میں گھنگھرو باندھنے سے پہلے یہ منت لے کر آتی ہے کہ کاروبار چل نکلا تو وہ وہاں کے لنگر خانے میں چار دیگیں پہنچا دے گی۔ وہاں ایک مجبور اور بیمار شخص بھی آتا ہے اور ایک صحت مند اسمگلر بھی۔ میں نے ایسے فلم پروڈیوسر بھی دیکھے ہیں جو ریلیز سے پہلے فلم کے ڈبے لے کر وہاں آتے ہیں۔ آدھی اگر بتیاں مزار پر رکھتے ہیں، آدھی اگر بتیاں فلم کے ڈبوں پر۔ پھر اس فلم کے سپر ہٹ ہونے تک پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتے ہیں۔ دراصل بے ایمانی اتنی عام ہو گئی ہے کہ اب لوگ اسے ایمان کی طرح برتنے لگے ہیں۔ میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ میں اپنے طور پر کسی حد تک ایک ایماندار تھا اور ایک پرائی لڑکی کی آرزو کرنا کہاں تک درست تھا میں یہ بھی نہیں جانتا تھا۔ میں نے دیکھا کہ محبت کرنے والے بھی مرادیں مانگنے آتے ہیں لہٰذا میں بھی آ گیا تھا۔

میں نے اسے دیکھا وہ عورتوں کی بھیڑ سے گزرتی ہوئی مزار کی جالی کے پاس آکر کھڑی ہو گئی تھی اور دعا مانگنے سے پہلے اپنے سر پر آنچل کو درست کر رہی تھی۔ وہ سرخ لباس میں تھی، لباس کی سرخی اس کے گورے مکھڑے پر جھلک رہی تھی۔ عجیب سحر انگیز حسن تھا۔ میرا دل و دماغ اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا۔ میں دل سے دیکھ رہا تھا اور آنکھوں سے دعا مانگ رہا تھا کہ ''اے داتا! اے مظہر نور خدا! خدا سے میرے لیے اس لڑکی کو مانگ لے۔ میں اور کچھ نہیں چاہتا''۔

اس نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے تو ہاتھوں کے ساتھ اس کی نگاہیں بھی اٹھ گئیں۔ چند لمحوں تک اس کی نگاہیں مجھ پر ٹھہر گئیں۔ میں خود کو یوسف ثانی نہیں سمجھتا۔ مگر مجھ میں کوئی بات تھی یا میرے دعا مانگنے کا انداز ایسا تھا کہ وہ متوجہ ہو گئی تھی۔ شاید وہ سمجھنا چاہتی تھی کہ میں دعاؤں میں گم ہو گیا ہوں یا اس بہانے سے اسے دیکھ رہا ہوں۔ میرے لبوں پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی اور وہ سمجھ گئی کہ میری نگاہیں اس پر مرکوز تھیں۔ اس کی پلکیں فوراً ہی جھک گئیں۔ اس کے سر کا آنچل اپنی جگہ موجود تھا پھر بھی وہ ہاتھ اٹھا کر اسے خواہ مخواہ ادھر اُدھر سے درست کرنے لگی۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت تھا کہ وہ کچھ بدحواس سی ہو گئی ہے۔ میری نگاہوں سے چھپنے کی کوئی جگہ نہیں تھی اس لیے اپنے دوپٹے سے بدن کو ڈھانپ رہی تھی۔

اس کے بعد دوبارہ دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتے وقت اُس نے دیکھا کہ کہیں میں اسے دیکھ تو نہیں رہا ہوں۔ میں اسے برابر دیکھے جا رہا تھا اس لیے اس کی آنکھیں فوراً ہی جھک گئیں، دونوں ہاتھ اٹھے رہ گئے تھے۔ ہمارے درمیان زیادہ سے زیادہ آٹھ دس فٹ کا فاصلہ تھا۔ مجھے صاف طور سے اس کے کانپتے ہوئے ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ وہ دعا کے لیے کھڑی تھی مگر دعا سے خالی تھی مجھے یقین تھا کہ وہ میری نگاہوں کو اپنے چہرے پر محسوس کر رہی تھی۔

بڑی دیر تک ہم رو برو کھڑے رہے۔ بڑی دیر کے بعد اس نے پھر جھجکتے ہوئے نظریں اٹھائیں شاید اس نے سمجھا تھا کہ میں چلا گیا ہوں یا جواباً نظریں نہ ملانے سے مایوس ہو کر اب اسے نہیں دیکھ رہا ہوں مگر میں بھی دھن کا پکا

تھا۔اسے دیکھتا ہی جارہا تھا۔اس نے جلدی سے سر کے آنچل کو کھینچ کر گھونگٹ بنالیا۔

نصف چہرہ چھپ گیا۔شرافت کا تقاضہ یہ ہے کہ جو چھپ رہا ہے اسے جبراً نہیں دیکھنا چاہیے لیکن اس کے چھپنے کی ادا اتنی پیاری تھی کہ میری نگاہیں اس کے سوا دنیا کے کسی نظارے کو دیکھنا نہیں چاہتی تھیں۔ میں اس کی اداؤں سے یہ سمجھنا چاہتا تھا کہ وہ میرے متعلق کیا سوچ رہی ہے۔

چھپنے کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ مجھے نہ دیکھو۔ایک مطلب یہ ہوتا ہے کہ ابھی ترستے رہو، چاند پھر کبھی گھونگھٹ سے طلوع ہوگا، یہ ایک محبوبانہ انداز ہے۔

لیکن نہیں، محبوبانہ انداز اس وقت سمجھا جاتا جب وہ جواباً مسکرا کر دیکھتی میرے لیے کوئی ہلکا سا، نازک سا اشارہ چھوڑ دیتی یا پھر ناگواری سے منہ پھیر لیتی تو یہ قصہ ہی ختم ہو جاتا۔نہ اقرار نہ تھا نہ انکار۔وہ ان لڑکیوں میں سے نہیں تھی جو پہلے ہی مرحلے میں آنکھیں لڑا کر حوصلہ افزائی کرتی ہیں۔اس کی معصومیت میرے لیے ایک معمہ بن گئی تھی۔

پھر وہ سر جھکا کر میری جانب دیکھے بغیر واپس جانے لگی۔ میں بھی الٹے پاؤں واپس ہو گیا۔ میں اور کہاں جاتا؟ ایک عرصے سے تنہا بھٹک رہا تھا۔بچپن ہی میں ماں باپ کا سایہ سر سے اٹھ گیا تھا۔ایک ظالم چچا نے مار پیٹ کر میری پرورش کی۔آٹو رکشہ کی ریپئرنگ ورکشاپ میں ایک روپیہ روز پر کام کرتا تھا۔جوان ہوتے ہوتے اچھا خاصا کاریگر بن گیا ہوں۔ جناز گاہ کے قریب رکشوں کی مرمت کا ایک چھوٹا سا کارخانہ کھول لیا ہے۔ ہر ماہ ہزار روپے کی بچت ہوتی ہے۔چچا بھی مر چکا ہے۔میں بالکل تنہا ہوں مجھ اکیلے کے لیے ہزار روپے کی بچت بہت زیادہ ہے۔ان دنوں یار دوست ہیرا منڈی کا راستہ دکھاتے تھے، میرے بہکنے کا وقت آچکا تھا نہ کوئی نصیحت کرنے والا تھا اور نہ ہی میں کسی کے رعب اور دبدبے میں تھا، میرا بہکنا لازمی تھا۔ایسے ہی وقت وہ میری نگاہوں کے سامنے آگئی اور میرے دل میں سما گئی۔

میں تو سمجھ رہا تھا کہ تقدیر مجھے غلط راستے سے بچا کر اس اجنبی لڑکی کے راستے پر لے جا رہی تھی۔ دربار سے نکل کر وہ باہر آئی اور دروازے کے قریب مجھے دیکھ کر ٹھٹک گئی۔

بوڑھی عورت نے اس سے کچھ کہا، شاید اس کی گھبراہٹ کی وجہ پوچھ رہی تھی اور وہ نفی میں سر ہلا کر اس کے سوال کو ٹال رہی تھی۔ بوڑھی عورت نے بڑی محبت سے اس کی بلائیں لیں پھر اس کا ہاتھ پکڑ کر جانے لگی۔خسرا ان کے ساتھ چل رہا تھا۔ میں پیچھے دس قدموں کے فاصلے پر تھا۔آگے جا کر وہ رک گئے۔ مین روڈ پر ٹریفک زیادہ تھی۔سڑک پار کرنے سے پہلے وہ ذرا گردن گھما کر دیکھنے لگی کہ کہیں میں پیچھا تو نہیں کر رہا ہوں۔ مجھے دیکھتے ہی اس نے جلدی سے منہ پھیر لیا اور سڑک کی جانب تکنے لگی۔

پھر وہ سڑک پار کر کے بھاٹی گیٹ کی طرف جانے لگیں۔ میں سوچتا ہوا اس کے پیچھے چل رہا تھا اور یہ فیصلہ کر رہا تھا کہ ورکشاپ میں نہیں رہوں گا، اس محلے میں ایک مکان کرائے پر حاصل کروں گا جہاں وہ رہتی ہے۔ مجھے محبت کا جواب محبت سے ملے نہ ملے مگر اب اس کے قریب رہ کر ہی دل کو قرار آسکتا تھا۔

وہ بھاٹی گیٹ سے گزر کر آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ تنگ راستے کے اطراف صدیوں پہلے کی بوسیدہ عمارتیں تھیں۔ دو منزلہ اور تین منزلہ عمارتیں، جن کی شکستہ دیواریں اس طرح جھکی ہوئی تھیں جیسے اب تب میں گرنے والی ہوں۔وہ آگے اور آگے بڑھتی جا رہی تھی اور آگے ہیرا منڈی کی سرحد قریب آتی جا رہی تھی۔ میرا دل ڈوبنے لگا کہ کیا وہ بدنام علاقے کی رہنے والی ہے؟ دل نہیں مانتا تھا۔وہ ایسی شرمیلی تھی کہ مجھ جیسے اجنبی سے نظریں نہیں ملا سکتی تھی، اس

کے چہرے پر ایسی معصومیت تھی جو بازار حسن کی لڑکیوں میں بھولے سے بھی نظر نہیں آتی پھر میں کیسے مان لیتا کہ وہ اس بازار کی رہنے والی ہے۔

آؤٹ آف بونڈ کا بورڈ دور سے نظر آ رہا تھا، اس کے قدم بڑھتے ہی جا رہے تھے۔ اس کے چلنے کے انداز سے پتا چل رہا تھا کہ وہ اپنے پیچھے میری موجودگی کو محسوس کرتی جا رہی ہے۔ پھر وہ ممنوعہ علاقے تک پہنچنے سے پہلے ہی ایک گلی میں مڑ گئی۔ میرا خیال صحیح نکلا۔ وہ ایک شریف زادی تھی۔ جس بوسیدہ عمارت کی طرف وہ جا رہی تھی وہاں شریف لوگ رہتے تھے۔

مکان کے قریب پہنچ کر وہ رک گئی۔ محلے کے بچے اس کے آس پاس اچھلتے کودتے شور مچا رہے تھے۔

''سہاگن باجی آ گئی، سہاگن باجی آ گئی۔ باجی ہمیں تھوڑی سی شیرینی دو......''

چاروں طرف گھومتے ہوئے بچوں کو دیکھنے کے بہانے اس نے گھوم کر مجھے دیکھا۔ اس کی آنکھوں سے حیرانی ظاہر ہو رہی تھی جیسے پوچھ رہی ہو کہ میں کیوں اس کے پیچھے اتنی دور تک چلا آیا ہوں۔ اس بار میں نے اور توجہ سے اسے دیکھا، بچوں نے اسے سہاگن باجی کہا تھا لیکن وہ دبلی پتلی سی نازک اندام لڑکی مجھے سہاگن نظر نہیں آ رہی تھی۔ حالانکہ اس نے سرخ جوڑا پہن رکھا تھا۔ ایسے لال جوڑے تو کنواریاں بھی پہنتی ہیں۔ اس کی جسمانی ساخت ایسی تھی کہ پندرہ یا سولہ برس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ آدھ کھلی کلی کا چہرہ بتا رہا تھا کہ ابھی اس نے سہاگ کا سفر شروع نہیں کیا ہے۔

میں سوچ رہا تھا اور خود کو مایوسی سے بچانے کے لیے ہر ممکن طریقے سے دل کو سمجھا رہا تھا۔ اسی وقت ایک مکان کا دروازہ کھلا اور ایک ادھیڑ عمر کی عورت نے اس نام نہاد سہاگن کو دیکھ کر بڑی محبت سے مخاطب کیا ''زلیخا بیٹی! داتا کے دربار سے آئی ہو۔ شیرینی کے دو دانے میری بیٹی کو بھی دو۔ تمہارے ہاتھوں میں کتنی برکت ہے۔ اے بیٹی! مجھے بھی......'' دوسرے مکان کی کھڑکی سے کسی عورت نے آواز دی۔ پھر تو آس پاس کے مکانوں کی کھڑکیاں اور دروازے کھلنے لگے۔ کہیں سے عورتیں اور کہیں سے مرد آواز دے رہے تھے اور اسے اپنے ہاں بلا رہے تھے۔ وہ اپنے لبوں پر سنجیدہ سی مسکراہٹ لیے باری باری سب ہی کے دروازوں پر جا رہی تھی۔ کسی کے ہاتھ میں شیرینی کے دانے رکھ رہی تھی تو کوئی التجا کر کے اسے اپنے گھر کے اندر آنے کے لیے کہہ رہا تھا۔ ذرا سی دیر میں مجھے اندازہ ہو گیا کہ محلے کے تمام لوگ اس کی بے انتہا عزت کرتے ہیں۔ وہ کسی کے دروازے پر چلی جائے تو اس کیلئے آنکھیں بچھا دی جاتی ہیں۔

میں ایک پان والے کی دکان کے پاس آ کر کھڑا ہو گیا۔ اب وہ میری طرف نہیں دیکھ رہی تھی شاید اس لیے کہ دکان کے سامنے کچھ نوجوان کھڑے ہوئے تھے۔ وہ اپنے چہرے اور لباس سے چھٹے ہوئے بدمعاش معلوم ہوتے تھے مگر وہ بھی زلیخا کو بڑی عزت اور عقیدت سے دیکھ رہے تھے۔ ان میں سے ایک نے کہا۔

''خدا کی قدرت بھی عجیب ہے کیسی کیسی مخلوق پیدا کرتا ہے۔ زلیخا کو دنیا جہان کا حسن دیا ہے مگر کسی کی کیا مجال کہ کوئی اسے میلی نظر سے دیکھ لے۔ دیکھے گا تو ساری عمر پچھتائے گا''۔

''ہاں یار!'' دوسرے نے کہا ''اس پر فرشتوں کا سایہ ہے انسان اسے چھو نہیں سکتا''۔

میں حیرانی سے ان کی باتیں سن رہا تھا وہ لفنگے جو عورت کو کھلونا سمجھتے ہیں۔ بدمعاشی پر اتر آئیں تو کسی بھی جوان لڑکی کو کاندھوں پر اٹھا کر لے جا سکتے ہیں وہ زلیخا کے متعلق ایسی باتیں کر رہے تھے جیسے اس لڑکی کو کوئی ماورائی ہستی سمجھ رہے ہوں۔ جو فرشتوں کی دنیا سے آئی ہے اور جسے انسان چھونا چاہے تو کسی عذاب میں مبتلا ہو جائے۔ اس

لڑکی میں کوئی بات تھی جب ہی محلے کے بچے، بوڑھے، جوان، عورت اور مرد سب کے سب اس کی ایسی عزت کر رہے تھے جیسے وہ آسمان سے اتر کر آئی ہے۔ کوئی نوجوان اسے ایک عاشق کی نظر سے نہیں دیکھ رہا تھا۔ مجھے بھی محتاط ہو جانا چاہیے تھا مگر اس کی ذات سے میری دلچسپی اور بڑھ گئی۔ ایک تجسس پیدا ہو گیا کہ آخر وہ کون ہے؟ اس میں کیا بات ہے، سب ہی اسے عزت و احترام سے دیکھتے ہیں۔ وہ ایک مکان سے نکل کر اپنے مکان کی طرف جا رہی تھی۔ ایک نوجوان نے اسے آواز دی۔

''زلیخا! مجھے بھی دو دانے دیتی جا......!''

اس کے قدم رک گئے۔ اس نے نوجوان کی طرف دیکھا۔ پھر مجھے دیکھ کر ذرا جھجکنے لگی۔ دوسرے نوجوان نے کہا۔ تیرے آنچل میں بڑی برکت ہے۔ شیرینی کبھی ختم نہ ہوگی۔ لا ہمیں بھی دے دے۔ وہ ان کی جانب آہستہ آہستہ سر جھکا کر بڑھنے لگی۔ مجھے یوں لگا کہ وہ میری طرف آ رہی ہے۔ یہ اچھا موقع تھا۔ میں اسے سنانا چاہتا تھا کہ میں اس کے قریب رہنا چاہتا ہوں۔ میرا ارادہ وہاں سے واپس جانے کا نہیں ہے۔ جب وہ قریب آ کر ان نوجوانوں میں شیرینی تقسیم کرنے لگی تو میں نے پان والے سے کہا۔

''بھائی صاحب میں کرائے پر ایک مکان تلاش کر رہا ہوں۔ کیا اس محلے میں مل سکتا ہے؟''۔

''تمہارے ماں باپ اور بیوی بچے ہیں؟'' دکاندار نے پوچھا۔ ''نہیں میں اس دنیا میں بالکل تنہا ہوں''۔ زلیخا کی نظریں میری جانب اٹھ گئیں۔ دکاندار نے جواب دیا ''پھر تو مشکل ہے۔ اکیلے آدمی کو بڑی مشکل سے کوئی مکان دیتا ہے۔ کیوں زلیخا! میں ٹھیک کہتا ہوں نا؟''

یہ بات بھی عجیب سی تھی کہ مکان کے سلسلے میں بھی اس لڑکی کی رائے پوچھی جا رہی تھی۔ مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ حقیقتاً ایک محترم ہستی ہے۔

وہ سر جھکا کر مجھ سے نظریں چراتی ہوئی پان والے کے پاس آئی اور شیرینی کے چند دانے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے بولی۔

''نکے ماما! اس سے پوچھ، کیا یہ پانچوں وقت کی نمازیں پڑھتا ہے؟''

پان والے نے مجھ سے پوچھا۔ میں ذرا جھجکنے لگا۔ مجھے بچپن سے کسی نے نماز روزے کی تعلیم نہیں دی تھی۔ وہاں زلیخا کے ذریعے مذہبی احکامات پر عمل کرنے والے کو مکان مل سکتا تھا۔ اگر انکار کر دیتا تو اس کے قریب رہنے کا موقع ہاتھ سے نکل جاتا۔ میں نے جھوٹ کا سہارا لیا۔

''جی ہاں! میں نماز پڑھتا ہوں''۔

میں نے محسوس کیا کہ زلیخا نے اطمینان کی سانس لی ہے۔ وہ نکے پان والے سے بولی ''تو باقی باتیں کر لے میں ماں جی کو بھیج دیتی ہوں''۔

یہ کہہ کر وہ اپنے مکان کی طرف واپس جانے لگی۔ نکے نے مجھ سے پوچھا۔

''تمہارا نام کیا ہے؟''

میں تفصیل سے اسے بتانے لگا۔ میرا نام اقبال ہے۔ بچپن میں والدین اقبالے کہتے تھے پھر یہ نام گھستے گھستے بالے بن گیا۔ جنازگاہ کے پاس آٹو رکشہ کی مرمت کرتا ہوں۔ معقول آمدنی ہے۔ مکان کا کرایہ باقاعدگی سے ادا

کرتا رہوں گا۔ جہاں میرا ورکشاپ ہے وہاں سے معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔ میں ایک شریف آدمی ہوں، نشہ تو دور کی بات میں پان سگریٹ کو بھی ہاتھ نہیں لگاتا۔ یہاں رہوں گا تو کبھی مالک مکان کو شکایت کا موقع نہیں دوں گا"۔

نکے نے ہاتھ کے اشارے سے بتایا" دیکھو وہاں سے یہاں تک جتنے مکانات ہیں۔ یہ سب کے سب زلیخا کے نام پر ہیں۔ یہاں اس کے پانچ کرایہ دار ہیں، وہ ہمیشہ پاک صاف رہتے ہیں۔ زلیخا انہیں پہلے ہی سختی سے تاکید کردیتی ہے۔ ایک کرایہ دار اس کے مکان کے ساتھ رہا کرتا تھا۔ ایک رات وہ شراب پی کر مکان میں آیا۔ وہ سمجھتا تھا کہ زلیخا کی پاک روح اسے نہیں دیکھ رہی ہے جیسے ہی اس نے دہلیز کے اندر قدم رکھا، اسے ابکائی سی آئی۔ وہ لڑکھڑا کر گرا اور خون کی قے کرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہوگیا۔

مرنے والے کی بیوی کا بیان ہے کہ وہ گرنے کے بعد اس دیوار کی طرف دیکھ رہا تھا جس کے پیچھے زلیخا رہتی ہے۔ وہ تڑپ رہا تھا اور ہکلاتے ہوئے معافی مانگ رہا تھا مگر بہت دیر ہوچکی تھی۔ اسے اچانک خون کی ایک قے ہوئی اور وہ مرگیا۔

دیکھو بالے بھائی! راتوں کو ہم بھی نشہ کرتے ہیں۔ اپنی ...... عادت سے مجبور ہیں مگر ہم زلیخا کے قریب یا اس کے مکان کے دروازے پر نہیں جاتے۔ وہی کبھی مہربان ہوکر ہمارے قریب آتی ہے اور ہمیں نیاز کی شیرینی دے کر چلی جاتی ہے، وہ بڑی کرموں والی ہے جس روز میری دکان پر آتی ہے میری آمدنی بڑھ جاتی ہے۔ وہ سدا سہاگن ہے جس کنواری کے سر پر ہاتھ رکھ دیتی ہے وہ کچھ ہی دنوں میں سہاگن بن جاتی ہے۔

زلیخا کہہ گئی ہے تمام باتیں تمہیں سمجھا دوں۔ سمجھانے کے بعد بھی تم نے جھوٹ کہا اور اسے دھوکا دینے کی کوشش کی تو تمہیں توبہ کی مہلت بھی نہیں ملے گی اور تم ایک عبرتناک انجام کو پہنچ جاؤ گے۔

نکے پان والا سمجھا رہا تھا اور میں سمجھ رہا تھا مگر ایمان کی بات یہ ہے کہ اس ہستی کے روحانی پہلو سے زیادہ میں اس کے رومانی پہلو کو دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا۔ میں دل سے مجبور تھا۔

میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مجھے اتنی آسانی سے وہاں مکان مل جائے گا۔ میں سمجھتا ہوں کہ تقدیر مجھے ایک بڑے اور بہت اہم تجربے سے دوچار کرنا چاہتی تھی اس لیے مجھے وہاں لا پھینکا تھا بہرحال اس وقت میں اپنے آپ کو بہت ہی خوش نصیب سمجھ رہا تھا۔

وہ دو کمروں کا مکان تھا۔ آنگن میں دو دروازے تھے۔ ایک دروازہ باہر کی طرف کھلتا تھا جو فی الحال بند تھا اور میری سب سے پہلی کوشش یہی تھی کہ وہ میرے دل کی طرح اس کی نگاہوں کے سامنے کھل جائے۔ کچھ اور بھی کوششیں تھیں ایک تو پاک صاف رہنے کی کوشش، دوسرے نماز کی پابندی۔ کوئی دنیاوی دولت حاصل کرنے کے لیے کوئی عقبیٰ میں جنت حاصل کرنے کے لیے نماز پڑھتا ہے، میں زلیخا کو خدا سے مانگنے کے لیے نماز پڑھ رہا تھا، اس کی ابتدا ایک جھوٹ سے ہوئی تھی مگر رفتہ رفتہ مجھے نماز میں ایک ایسا سکون اور سرور محسوس ہونے لگا جس سے پہلے میں ناآشنا تھا۔

جب میں سجدے کے دوران اس کون و مکاں کی عظمت کا اعتراف کرتا تو اس وقت میرے دل و دماغ کے کسی گوشے میں دنیاوی لالچ کی ہلکی سی رمق بھی نہ ہوتی مگر ہاں، جب دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا تو اس دینے والے سے ایک ہی چیز مانگتا۔ زلیخا، زلیخا اور زلیخا......

اور زلیخا کے آنگن میں وہ دروازہ کھلنے لگا۔ کبھی اس کی بوڑھی ماں نذر نیاز کا حلوہ یا شیرینی لے کر آتی کبھی

میں ایسے ہی چیزیں لے کر ان کے ہاں پہنچ جاتا۔ کبھی وہ چولہے کے پاس نظر آتی اور کبھی کمرے میں بیٹھی کپڑے سلائی کرتی رہتی۔ اپنے ہوں یا پرائے، سب سے باتیں کرتی تھیں ایک مجھ سے ہی ذرا کتراتی تھی۔ دو ماہ کا عرصہ گزرنے کے بعد بھی وہ اسی طرح چور نظروں سے مجھے دیکھتی تھی کہ کہیں میں اسے دیکھ تو نہیں رہا ہوں۔ اس نے اب تک ناراضگی ظاہر نہیں کی تھی اور نہ میری میٹھی نظروں کا خاطر خواہ جواب دیا تھا۔

اس دوران مجھے یقین ہوتا جا رہا تھا کہ وہ سہاگن نہیں ہے۔ اس روز محلے کے بچوں نے اور نکے پان والے نے نہ جانے کیوں اسے سہاگن کہہ دیا تھا۔ میں نے کوئی ایسا مرد یا رقیب نہیں دیکھا تھا جو وہاں خاوند کے رشتے سے زلیخا کے ہاں رہتا ہو۔ وہاں عورتوں کے علاوہ وقتاً فوقتاً کئی مرد آتے تھے مگر کوئی منہ بولا چچا تھا، کوئی ماموں اور کوئی پھوپھا تھا۔ سب اس کے سامنے سر جھکا کر بیٹھتے تھے۔ رفتہ رفتہ میں سمجھنے لگا کہ وہ کیوں آتے ہیں؟

وہاں آنے والے بوڑھے عقیدے کے لوگ تھے۔ زلیخا کو کوئی آسمانی ہستی سمجھتے تھے جو انسان کے روپ میں آئی ہے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ وہ ایک پاک روح ہے۔ اس دنیا کا کوئی بھید اس سے چھپا ہوا نہیں ہے اس لیے ایک صاحب اس سے نمبر پوچھنے آتے تھے (سٹے کا نمبر)۔ دوسرے صاحب محلے کا چیئرمین بننے کے لیے الیکشن لڑنے والے تھے انہیں یقین تھا کہ زلیخا کے ایک اشارے پر تمام محلے کے لوگ انہیں ووٹ دینے پر آمادہ ہو جائیں گے۔ ایک اور صاحب زمینوں کے مقدمے میں تین سال سے الجھے ہوئے تھے اور اب زلیخا کی دعاؤں سے مقدمہ جیتنے کے آثار پیدا ہو گئے تھے، کوئی اولاد کے لیے آتا تھا یا آتی تھی، کوئی شادی بیاہ کے لیے، کوئی خاوند کی شکایت لے کر اور کوئی بیوی کی شکایت لے کر آتا تھا غرضیکہ سب ہی چھوٹی بڑی ضرورتوں کے لیے زلیخا کے سامنے زانو تہ کرتے تھے۔

مجھے اس دھان پان سی معصوم صورت لڑکی میں کوئی روحانی قوت یا خاصیت نظر نہیں آتی تھی البتہ یہ خاصیت تھی کہ وہ حد درجہ حسین تھی۔ لوگ دنیا جہاں کی آرزوئیں لے کر اس کے پاس آتے تھے اور میں اس کی آرزو میں بیٹھا ہوا تھا۔

پھر میرا پیار، میری چاہت کچھ اثر دکھانے لگی۔ ایک شام کو میں گھر واپس آیا تو میرے میلے کپڑے دھلنے کے بعد آنگن کی رسی پر سوکھ رہے تھے۔ اس کی بوڑھی ماں نے بتایا کہ وہ کپڑے زلیخا نے دھوئے ہیں۔ میں نے خوش ہو کر کہا۔

''مجھے آج معلوم ہوا کہ زلیخا میرا اتنا خیال رکھتی ہے''۔

بوڑھی ماں نے مسکرا کر کہا۔

''میری بیٹی کو صفائی کا بڑا خیال رہتا ہے۔ پہلے تو میں تمہارے کمرے کی صفائی کیا کرتی تھی۔ اب مجھ سے بار بار اٹھنا بیٹھنا نہیں ہوتا۔ وہی جھاڑو دیتی ہے، فرش کو دھوتی ہے اور تمہارے کمرے کو سجا بنا کر رکھتی ہے''۔

میری خوشی کا کوئی ٹھکانہ نہ تھا۔ میں بوڑھی ماں سے باتیں کرتا ہوا اس کے آنگن میں آیا تاکہ شکریہ ادا کرنے کے بہانے اس سے باتیں کرنے کا سلسلہ بھی شروع کر دوں مگر وہ آنگن میں تنہا نہیں تھی۔ اس کے پاس دو خسرے بیٹھے ہوئے اپنا دکھڑا رو رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا۔

''اے بی بی! ہم بھی انسان ہیں ہم بھی مسلمان ہیں...... مزاروں پر جاتے ہیں، شادی بیاہ کے موقعوں پر ناچتے گاتے ہیں، دوسروں کی خوشیوں میں شریک ہوتے ہیں مگر ہمارے دکھوں میں کوئی شریک نہیں ہوتا۔ مذہبی معاملات میں کوئی ہمیں مسلمان نہیں سمجھتا ہے۔ اگر ہم مر جائیں تو......''

وہ کہتے کہتے مجھے دیکھ کر رک گیا پھر مسکرا کر ہاتھ نچاتے ہوئے بولا ''اے بالے! تم بڑے نصیب والے

ہو۔ سدا سہاگن کے سائے میں رہتے ہو۔ تم سے ہزاروں بلائیں دور رہیں گی''۔

سدا سہاگن کے الفاظ سن کر میں پھر الجھ گیا۔ میں اس سلسلے میں کچھ پوچھنا چاہتا تھا۔ اگر وہ واقعی سہاگن نکلی تو میری چاہت کا کیا بنے گا؟ میں خود کو فریب دینا چاہتا تھا کہ وہ کنواری ہے۔ اس لیے میں نے کچھ پوچھنے کی بجائے مسکرا کر کہا۔

''زلیخا! میں تمہارا شکریہ ادا کرنے آیا ہوں۔ آج مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم نے میرے کپڑے دھوئے ہیں اور ہمیشہ میرے کمرے کی صفائی کیا کرتی ہو''۔

وہ جواب دینے کی بجائے اپنے سینے پر دوپٹے کی تہہ جمانے لگی۔ اس کے دوپٹہ اوڑھنے کا انداز دوسری لڑکیوں سے قدرے مختلف تھا۔ دوپٹہ بھی تقریباً تین گز سے کم نہیں ہوتا تھا۔ ایک بڑی سی چادر کی طرح اسے اوڑھے رہتی تھی۔ گردن کے نیچے اس کی اتنی تہیں ہوتیں کہ سینے کی شادابیاں چھپ کر رہ جاتی تھیں۔

اگر یہ گناہ ہے تو میں اس گناہ کا اعتراف کرتا ہوں کہ اس کے حسن سے متاثر ہو کر میری نگاہیں چوری چوری دور سے اس کے جسم کو ٹٹولتی تھیں۔ یہ مقصود بالذات تک پہنچنے کا ایک عام قاعدہ ہے کہ پہلے نگاہیں وہاں تک پہنچتی ہیں، اسے چھوتی ہیں، ٹٹولتی ہیں اور اسے اچھی طرح سمجھ کر اس شاہکار پر عاشق ہوتی ہیں۔ اگر میں ایسا کر رہا تھا تو یہ کوئی عجیب، انوکھی اور نئی بات نہیں تھی۔ ویسے یہ میری ناکامی تھی کہ میں نے اس دوپٹے کی تہہ میں سانسوں کی ابھرتی ہوئی شادابیوں کو کبھی نہیں دیکھا۔ وہ میری نگاہوں سے گھبرا کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور جلدی سے کمرے کے اندر جانے لگی۔

میں نے غلط موقعے پر شکریہ ادا کیا تھا۔ مجھے اس کے لیے تنہائی کا موقع تلاش کرنا چاہیے تھا۔ بہر حال غلطی ہوگئی تھی۔ میں نے سوچا کہ وہ میرے کمرے سے دلچسپی لے کر میرا حوصلہ بڑھا رہی ہے لہٰذا اب اگر تنہائی نصیب ہوئی تو میں اسے باتیں کرنے پر مجبور کردوں گا۔

یہ سوچ کر باہر جانے لگا۔ اسی وقت اس کی رس بھری آواز سنائی دی ''سنیے!''

میرے قدم رک گئے۔ میں نے پلٹ کر دیکھا وہ اپنے کمرے کے دروازے سے لگی کھڑی تھی۔ مجھ سے نظریں ملتے ہی سر جھکا کر بولی۔

''آپ میری ایک بات مانیں گے؟''

ہائے! پہلی بار وہ مجھے مخاطب کر رہی تھی، التجا کر رہی تھی، میں نے خوش ہو کر آگے بڑھتے ہوئے کہا ''ایک نہیں ہزار باتیں مانوں گا تم حکم کرو''۔

میرے کہنے کے انداز میں ایسی اپنائیت تھی کہ وہ ذرا سمٹ گئی۔ دروازے سے کچھ اور چپک گئی پھر ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''صمدو چاچا کی ایک عزیزہ فوت ہوگئی ہیں۔ کیا آپ کاندھا دینے جاسکتے ہیں؟''

میں ایک نئی امید ایک نئی زندگی کی آس میں آگے بڑھا تھا اور وہ مجھے کسی کی موت کی خبر سنا رہی تھی۔ جو کچھ بھی تھا اس نے پہلی بار التجا کی تھی۔ میں اس کی التجا پر ایک نہیں، ہزار جنازوں کو کاندھا دے سکتا تھا۔ اس لیے صمدو چاچا کا پتہ پوچھ کر مغل پورے کی طرف چلا گیا۔

مجھے کسی صمدو چاچا سے دلچسپی نہیں تھی لیکن زلیخا کی اس التجا کا میری کہانی سے گہرا تعلق ہے لہٰذا وہاں میں نے

جو کچھ دیکھا وہ مختصر طور سے بیان کر رہا ہوں۔ میں اپنے محلے کے ہونے والے چیئرمین کا ذکر کر چکا ہوں وہاں اس چیئرمین کے دو ملازم نظر آئے اور وہ صاحب بھی جو زلیخا سے سٹے کا نمبر پوچھنے آتے تھے۔ان کے علاوہ زلیخا کے پاس آنے والے دو چار عقیدت منداور بھی نظر آئے۔صمد و چاچا کے متعلق اتنا معلوم ہوا کہ انہوں نے پچھلے ہی دنوں مغل پورہ کے اس محلے میں وہ چھوٹا سا مکان کرائے پر لیا تھا۔ان کی بیوی اسپتال میں بیمار تھی۔پچھلی رات انتقال ہو گیا تھا اور وہ اسپتال سے اس مکان میں لائی گئی تھی۔صمدو چاچا محلے والوں سے کہہ رہے تھے کہ وہ مکان اس کے لیے منحوس ثابت ہوا ہے لہٰذا مرحومہ کی تجہیز و تکفین کے بعد وہ اس مکان کو چھوڑ دیں گے۔

میں نے ان سے ہمدردی ظاہر کی۔ جنازے کے ساتھ قبرستان تک گیا۔اس کی نماز جنازہ ادا کی اور اسے دفنانے کے بعد جب اپنے محلے میں واپس آیا تو رات کے گیارہ بج رہے تھے۔آس پاس کے تمام مکانوں پر نیند کی خاموشی مسلط ہو گئی تھی۔گلی کا راستہ بھی سنسان ہو گیا تھا۔ نکے پان والے کی دکان بھی بظاہر بند ہو چکی تھی مگر دکان کا پچھلا دروازہ ذرا سا کھلا تھا۔تین ماہ کے عرصے میں مجھے یہ معلوم ہوا تھا کہ نکے غیر قانونی طور سے چرس بیچتا ہے۔دن ہو رات نشہ کرنے والے دکان کی پچھلی طرف سے آتے تھے اور کھرے دام دے کر چرس کی گولیاں لے جاتے تھے۔

ایک نکے ہی اکیلا مجرم نہیں تھا۔دن کی روشنی میں جائز کاروبار کرنے والے کتنے ہی لوگ منافع کی شرح بڑھانے کے لیے ناجائز کاروبار کا ایک پچھلا دروازہ ضرور بناتے ہیں۔میں اس دکان سے کترا کر اپنے دروازے پر آ گیا۔تالا کھول کر میں نے دروازے کے دونوں پٹوں کو آہستگی سے وا کیا۔آنگن سے پرے میرے کمرے میں روشنی نظر آ رہی تھی اور کمرے کی ایک دیوار پر اس کا سایہ سر جھکائے بیٹھا ہوا تھا۔

اس کا سایہ جسے میں ہزاروں میں پہچان سکتا تھا۔

میرے دل کی دھڑکنیں تیز ہو گئیں۔ میں نے دروازے کو آہستگی سے بند کیا اور دبے پاؤں آنگن سے گزرتا ہوا اپنے دروازے پر آ گیا۔

وہ میری منجی کے سرے پر میرے تکیے کو دونوں بانہوں میں لیے اسے سینے سے بھینچے ہوئے سر جھکائے بیٹھی تھی اور رو رہی تھی۔

مجھے اس کی آمد سے جتنی خوشی ہوئی تھی اس کے آنسو دیکھ کر اتنی ہی حیرانی بھی ہوئی کہ وہ کیوں رو رہی ہے؟

"زلیخا!"

میری ہلکی سی میٹھی آواز اس کے لیے دھماکہ ثابت ہوئی۔ وہ یکبارگی اچھل کر کھڑی ہو گئی،اس کے چہرے پر ایسی پریشانی اور گھبراہٹ تھی جیسے چوری کرتی ہوئی پکڑی گئی ہو۔فرار ہونے کے راستے پر میں کھڑا تھا ورنہ وہ پلک جھپکتے ہی وہاں سے بھاگ جاتی۔ جب بھاگنے کا راستہ نہ ملا تو وہ منہ پھیر کر اپنے آپ کو دوپٹے میں چھپانے لگی۔

میں نے آگے بڑھ کر ذرا نرمی سے پوچھا"زلیخا! کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو؟"

وہ خاموش رہی۔ میں ذرا اور قریب چلا گیا۔

"ایک عرصہ گزر گیا ہے زلیخا! میں خاموشی سے تمہیں دیکھے جا رہا ہوں۔ میں نے آج تک زبان نہیں ہلائی۔ کیا اب تک تمہیں میری شرافت کا یقین نہیں ہوا ہے؟ تمہارے اس طرح منہ پھیر لینے کو میں کیا سمجھوں۔خوف یا نفرت؟"

وہ سر جھکا کر اپنے آنسو پونچھنے لگی۔

''تم کیوں رو رہی ہو؟ مجھے بتاؤ، مجھے اپنا سمجھ کر بتاؤ، میں...... میں تمہیں دل و جان سے چاہتا ہوں۔ میں تمہارے لیے آیا ہوں۔ تمہارے لیے یہاں رہتا ہوں۔ جب تک میری سانس چلتی رہے گی، میں تمہاری آس لگائے یہاں بیٹھا رہوں گا۔ مجھے اپنی محبت کا سہارا دو زلیخا!''

وہ فرش پر ایسے بیٹھ گئی جیسے نہ بیٹھتی تو گر پڑتی۔ پھر منجی کے پائے سے لگ کر نفی میں سر ہلاتی ہوئی بولی۔

''نہیں، نہیں۔ آپ ایسی باتیں نہ کریں۔ میں آپ کے قابل نہیں ہوں''۔

''کیسی باتیں کرتی ہو۔ تم کس قابل ہو یہ میرا دل جانتا ہے۔ کیا تم میری محبت، میری دیوانگی کو نہیں سمجھتی ہو؟''

میں نے اس کے قریب دوزانو ہو کر اس کے بازوؤں کو بڑی محبت سے تھام لیا۔ وہ ہولے سے کسمسانے لگی۔

''مجھے چھوڑ دیجیے، مجھے ہاتھ مت لگائیے۔ میں سہاگن ہوں''۔

میری امیدیں مرجھانے لگیں۔ میں نے دل برداشتہ ہو کر پوچھا ''کون ہے تمہارا خاوند؟ میں نے تو کبھی اسے نہیں دیکھا''۔

اس نے ایک سرد آہ بھری۔ میں نے سمجھا کہ وہ جواب دینے والی ہے مگر وہ دل سے نکلنے والی آہ کے بعد خاموش ہو گئی اور دوپٹے سے اپنے چہرے کو چھپانے لگی۔

جس ہاتھ سے دوپٹے کو تھام کر وہ پردہ کر رہی تھی میں نے اس ہاتھ کو تھام لیا، التجا کی ''مجھ سے منہ نہ چھپاؤ زلیخا! میرے سوال کا جواب دو۔ کون ہے تمہارا خاوند؟''

وہ نفی میں سر ہلانے لگی ''کوئی نہیں، کوئی نہیں۔ میں کسی خاوند کے متعلق کبھی سوچ بھی نہیں سکتی۔ آپ سمجھتے کیوں نہیں؟ میں سدا سہاگن ہوں''۔

''تعجب ہے۔ یہ بھی کہتی ہو خاوند نہیں ہے۔ یہ بھی کہتی ہو کہ سہاگن ہو۔ کیا یہ پاگل پن کی باتیں نہیں ہیں؟''

اس کی آنکھوں سے پھر آنسو بہنے لگے۔ وہ تھرتھراتے ہوئے لہجے میں بولی ''اللہ! میں آپ کو کیسے سمجھاؤں۔ آپ سدا سہاگن کا مطلب نہیں سمجھتے ہیں۔ میں آپ کو کیسے سمجھاؤں؟''

اس نے اپنا ہاتھ میری گرفت سے چھڑا لیا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے اپنے چہرے کو ڈھانپ کر اچانک ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''میں پیدائشی سہاگن ہوں'' اس کی آواز آنسوؤں اور ہچکیوں میں ڈوبنے لگی۔ میں خدا کی ایک عجیب تخلیق ہوں۔ جب میں پیدا ہوئی تو میرے ماں باپ بھی مجھے نہ پہچان سکے کہ میں مرد ہوں یا عورت۔ بعد میں انہیں پتہ چلا کہ اس دنیا میں کبھی کبھی مجھ جیسی ہستیاں بھی پیدا ہوتی ہیں جن کی صحیح تشخیص نہیں ہوتی چونکہ ان میں عورتوں کی خصوصیات زیادہ ہوتی ہیں اس لیے انہیں واضح طور پر عورت کہنے کی بجائے سدا سہاگن کہا جاتا ہے''۔

میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس وقت میں کتنی حیرانی سے اور کیسی بے یقینی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ اتنا حیرت انگیز انکشاف تھا کہ کچھ دیر کے لیے میری قوت گفتار ختم ہو گئی تھی۔ میں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ وہ عورت نہیں تھی مگر عورت تھی۔ ان بے ڈھنگے خسروں سے بالکل مختلف تھی جو اس دنیا میں آنے کے بعد مرد سے عورت بنتے ہیں۔ جو مرد کی تذلیل کرتے ہیں اور عورت کی ایک نقل بن کر نہ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر کے۔ زلیخا ان سے مختلف تھی۔ اس کی جسمانی ساخت، شاعرانہ نزاکت، بدن کی ریشمی ملائمت، حیران حیران سی سیاہ آنکھیں، ستواں ناک اور پتلے خمیدہ

رس بھرے ہونٹ۔ یہ سب اپنی زبان بے زبانی سے کہہ رہے تھے کہ قدرت نے اسے ایک حسین سانچے میں ڈھالا تھا اور عورت کے درمیان رکھ کر ایک ادھوری تخلیق کے طور پر اس دنیا میں بھیج دیا تھا۔

میرے کمرے میں سو کینڈل پاور کا بلب روشن تھا لیکن آنکھوں کے سامنے مایوسی کا اندھیرا پھیلا ہوا تھا۔ اس اندھیرے میں اس کی سسکیاں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ اپنی بدبختی پر رو رہی تھی کہ وہ عورت ہو کر بھی عورت نہیں تھی۔ وہ کسی کی بہن، بیٹی، بھانجی اور بھتیجی بن سکتی تھی لیکن قدرت نے اسے ان خزانوں سے محروم رکھا تھا جنہیں پا کر عورت بیوی بنتی ہے اور پھر ماں بنتی ہے۔

میں قسمت کی آڑھی ترچھی لکیروں پر چلتا ہوا اس عجیب مخلوق تک پہنچ گیا تھا اور اب بھی اس کے حسن اور اس کے سیمیں بدن کی نزاکتوں سے متاثر ہو رہا تھا بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ اس سے محبت کرنے اور اس کے تمام دکھوں کو اپنے بازوؤں میں سمیٹ لینے کی آرزو پہلے سے زیادہ شدید ہو گئی تھی۔

میں بڑی آہستگی سے ذرا اس کے قریب کھسک آیا اور اپنی دونوں ہتھیلیوں میں اس کے حسین مکھڑے کو سجا کر بولا۔

''زلیخا! میں یہ سوچنا نہیں چاہتا کہ تم کون ہو؟ اور کیسی ہو؟ میں تم سے محبت کرتا ہوں اور کرتا رہوں گا۔ مجھ سے تمہارے آنسو نہیں دیکھے جاتے۔ چپ ہو جاؤ میری جان ...... میری آرزو ...... میری زندگی''۔

میں نے محبت کے جذبوں سے مغلوب ہو کر اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ میرے بازوؤں کے حصار میں ایک سہمے ہوئے پنچھی کی طرح کانپنے لگی اور بڑی کمزوری سے احتجاج کرنے لگی۔

''چھوڑ دیجیے! اللہ! مجھے چھوڑ دیجیے! یہ اچھی بات نہیں ہے میں، میرا دل گھبرا رہا ہے۔ میں سدا سہاگن ہوں مجھے چھوڑ دیجیے''۔

''تم پہلے سہاگن نہیں تھی مگر اب میرے نام سے سہاگن ہو گی۔ کیا تمہارا جی نہیں چاہتا کہ کوئی تمہیں چاہے تم سے بے انتہا محبت کرے......''

میرے بازوؤں کی قید میں اس کی سرد آہ سرسرائی، اس کے دونوں ہاتھ آہستگی سے لرزتے ہوئے میری پشت پر آئے۔ وہ میرے سینے سے لگی ہوئی تھی کچھ اور لگ گئی۔ میری آغوش میں جذب ہو جانے کی خاموش ادا سے اس نے ظاہر کر دیا کہ اسے چاہے جانے کی آرزو ہے۔ انسان کوئی بھی ہو۔ مرد ہو، عورت ہو یا زلیخا۔ سب کی یہی آرزو ہوتی ہے کہ کسی ایک ہستی کی منفرد محبت اسے ملے ایسی محبت کہ کوئی دوسرا اس میں شریک نہ ہو۔ اس کے محبوب کا تمام پیار اور تمام توجہ اسے حاصل ہو۔ خصوصاً عورت اپنی فطرت سے مجبور ہوتی ہے۔ محبت کو بھی ایک جائیداد بنا کر اپنی ذات تک محدود رکھنا چاہتی ہے۔

وہ بھی ایک جائیداد تھی جسے میں نے بڑے انتظار کے بعد پایا تھا۔ ہم دونوں ایک دوسرے کے مطلوب اور مقصود تھے۔ میں اسے ادھر ادھر سے سمیٹ رہا تھا وہ بھی بڑی خاموشی سے مجھ میں جذب ہوتی جا رہی تھی۔ میں اس خاموشی کو توڑنا چاہتا تھا اور اس کی جھجک اور بے نام خوف کو دور کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے پیار بھری سرگوشیوں میں اسے یقین دلا رہا تھا۔

میں تمہارا ہوں، دل کی گہرائیوں سے تمہیں چاہتا ہوں، تم اپنی زندگی کی آخری سانس تک مجھے محسوس کرو اور سوچو اور یقین کرو کہ میں ہی تمہارا محافظ ہوں۔ میرے بغیر تم ادھوری ہو، بے سہارا ہو تم ...... میرا سہارا لے کر ہی مجھے اپنا کر ہی اپنی تکمیل کو پہنچ سکتی ہو......''

میں اسے سمجھا رہا تھا میری سانسوں کی سرگوشیاں اس کے لبوں پر مچلتی رہیں، اس کے رخساروں پر تڑپتی رہیں، اس کے کانوں میں گنگناتی رہیں اور صبیح گردن کے نشیب میں پھسلتی رہیں۔ اس پر ایک سحر طاری ہو رہا تھا۔ اسے ایسی محبت اور ایسی آغوش نصیب ہو رہی تھی جس کی وہ توقع نہیں کرسکتی تھی لہٰذا وہ بڑی اپنائیت سے اپنے آپ کو رفتہ رفتہ میرے حوالے کر رہی تھی۔

ایک عورت جب تنہائی میں خود کو اپنے محبوب کے حوالے کرتی ہے تو اس کے نیک و بد مقاصد بڑی دور تک جاتے ہیں۔ میں اس بات کی وضاحت کر دوں کہ زلیخا جس انداز میں خود کو میرے حوالے کر رہی تھی اس میں کسی برے ارادے کا دخل نہیں تھا۔ وہ قدرت کی ایسی ادھوری تخلیق تھی کہ اس کے وجود کے کسی حصے میں گناہ کا کوئی دروازہ نہیں کھلتا تھا۔ میں اسے دیکھ سکتا تھا، اس سے محبت کرسکتا تھا، اسے آغوش میں لے کر اپنے دل کی دھڑکنوں سے لگا سکتا تھا اور اسے چوم سکتا تھا اور بس اس سے آگے نہیں بڑھ سکتا تھا۔

وہ سدا سہاگن تھی۔ اس دنیا کا کوئی مرد اس کے ساتھ سہاگ کا سفر نہیں کرسکتا تھا۔ میرے نصیب سے مجھے ایسی محبوبہ ملی تھی جسے میں صرف ایک تصویر کی طرح سجا کر رکھ سکتا تھا۔ اسے بانہوں کے ہار پہنا سکتا تھا لیکن کبھی یہ شکایت زبان پر نہیں لا سکتا تھا کہ تصویر تیری دل میرا بہلا نہ سکے گی۔

ایسی صورت میں یہ بڑی سخت آزمائش تھی کہ میرا پیار کتنا پائیدار ہے اور میں کب تک کسی غرض لالچ کے بغیر اس کی قربت کے کٹھن مرحلوں سے گزرتا رہوں گا۔

اسے پاک روح اس لیے کہا جاتا تھا کہ وہ انسانی ہوس کی غلاظتوں سے وابستہ نہیں کی جاسکتی تھی کہ کسی کنواری کے سر پر ہاتھ رکھتی تو سہاگن بن جاتی۔ حقیقت کچھ اور تھی چونکہ وہ اس دنیا کی آلودگیوں سے پاک تھی اس لیے اسے جاننے والے ایک متبرک اور محترم ہستی مانتے تھے۔

وہ سدا سہاگن لڑکی اور لڑکے والوں کے ہاں جا کر کہہ دیتی کہ میرے دل میں یہ بات اتری ہے یا میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ فلاں لڑکی اور فلاں لڑکے کا رشتہ ہو جانا چاہیے تو دونوں خاندانوں کے بزرگ اس کی بات تسلیم کر لیتے تھے۔

زلیخا نے مجھے بتایا کہ ایک آدھ بار اسے ناکامی ہوئی ورنہ عقیدت مند ایسے تھے کہ اس کی بات نہیں ٹالتے تھے یہی وجہ تھی کہ صرف بوڑھے ہی نہیں جوان لڑکیاں اور لڑکے بھی اس کے احسان مند تھے۔ اسے دعائیں دیتے تھے اور ہمیشہ اس کی عزت کرتے تھے۔ اسی کے مشورے پر لوگوں نے حاجی خدا بخش کو ووٹ دے کر محلے کا چیئرمین بنا دیا تھا۔ ایک بار اس نے موسیٰ بھائی سے پانچ وقت کی نمازیں پڑھنے کے لیے کہا تھا۔ اتفاق سے سٹے کے کھیل میں وہ پانچ نمبر پر لگ گیا، اس دن سے موسیٰ بھائی پانچ وقت کی نماز پڑھنے لگا تھا۔ بلاشبہ انسان مطلب کا بندہ ہے مطلب براری کے لیے بندگی پر مائل ہوتا ہے اور وہ جو شراب پینے کے بعد خون کی قے کر کے اس جہاں سے رخصت ہوگیا تھا تو بے چاری زلیخا نے اسے بددعا نہیں دی تھی۔ شراب میں ملاوٹ کرنے والوں سے کوئی غلطی ہوگئی تھی۔ وہ ایک سیدھی سادی سی لڑکی تھی۔ اس کی معصومیت اور خدمت خلق کے جذبے نے اسے لوگوں کی نظروں میں محترم پاک روح، پراسرار ہستی اور نہ جانے کیا کچھ بنا دیا تھا۔ میری نظروں میں صرف اس محبت کی اہمیت تھی جو صرف میرے لیے تھی۔

تقریباً چھ ماہ کا عرصہ گزر گیا تو وہ محبت آہستہ آہستہ مجھے ڈسنے لگی۔ اگر مجنوں اور فرہاد بھی اتنے عرصے اپنی لیلیٰ اور شیریں کے ساتھ راتیں گزارتے اور صبح اپنی محبوباؤں کو بغیر پڑھے ایک کوری کتاب کی طرح بند رکھتے تو میری

طرح ذہنی خلجان اور اعصابی بے چینی میں مبتلا ہو جاتے یا پھر بہت مجبور ہو کر ان کوری کتابوں میں اپنی ہوس کی داستان لکھ کر مر جاتے۔ لیکن وہ اس لحاظ سے خوش نصیب تھے کہ انہوں نے وصال سے زیادہ ہجر کی گھڑیاں گزاری تھیں اور میں وصال میں ہجر کے صدمے سہہ رہا تھا۔

اب تک میں حوصلے اور ضبط سے کام لے رہا تھا اور خود کو سمجھا رہا تھا کہ محبت بے لوث اور بغیر کسی لالچ کے بھی کی جاسکتی ہے یا پھر میں دوسرے مسائل میں اب تک خود کو الجھا کر بہلا رہا تھا۔ اس دوران میں پھر زلیخا کی التجا پر دوبارہ ایسے جنازوں کو کاندھا دینے گیا جن سے میں واقف نہیں تھا۔ صمدو چاچا کا ذکر میں کر چکا ہوں، دوسری بار موسیٰ بھائی کے میت رکھی تھی۔ وہ کراچی کے رہنے والے تھے۔ سال بھر میں لاہور کے کئی چکر لگاتے تھے، اچھرے میں ایک چھوٹا سا مکان خرید رکھا تھا۔ اس بار انہوں نے اپنے پڑوسیوں کو بتایا تھا کہ ان کی بیوی آج رات کی ٹرین سے لاہور آرہی ہے لیکن آدھی رات کے بعد ان کی بیوی اپنے پیروں سے چل کر نہیں آئی چار آدمی اس کی لاش لے کر آئے۔

اس لاش کو وہی لوگ لے کر آئے جو صمدو چاچا کی مرحومہ کو اسپتال سے لائے تھے۔ اس لاش کو اسی بوڑھی عورت نے غسل دیا جو صمدو چاچا کی بیوی کو غسل دے چکی تھی۔ اگر وہ مغل پورے کی غسالہ تھی تو تقریباً آٹھ میل دور اچھرے میں آنے والی لاش کو غسل دینے کیوں آئی تھی؟ لاشوں کو لانے والے وہ مخصوص لوگ کون تھے؟

یہ سوالات میرے ذہن میں اس وقت پیدا ہوئے جب تیسری بار زلیخا کے کہنے پر میں اس کے منہ بولے ماموں احمد دین کے ہاں جنازہ اٹھانے گیا۔ اس بار لاش کہیں باہر سے نہیں آئی تھی۔

احمد دین کرشن نگر میں پچھلے دو سال سے اپنی بیوی کے ساتھ رہتا تھا اور اپنی بیوی کو سخت پردے میں رکھتا تھا۔ پڑوس کی چند عورتوں نے ایک آدھ بار اس کی بیگم کی جھلک دیکھی تھی۔ بیگم بڑی نک چڑھی اور مغرور تھی اس لیے محلے کی عورتوں سے دوستی نہ ہو سکی۔ احمد دین کا مزاج بھی کچھ ایسا ہی تھا۔ وہ محلے پڑوس والوں سے خود بھی دور رہتا تھا اور اپنی بیگم کو بھی کہیں آنے جانے کی اجازت نہیں دیتا تھا اسی لیے بیگم کے جنازے پر محلے کے دو چار آدمی نظر آئے۔ باقی وہی لوگ تھے جنہیں صمدو چاچا اور موسیٰ بھائی کے ہاں دیکھ چکا تھا اور وہ غسالہ بھی میری جانی پہچانی تھی۔

اس رات میں اپنے کمرے میں آیا تو مجھے ہلکا ہلکا سا بخار تھا ایسے بخار کی کوئی اہمیت نہیں ہوتی ہے۔ یہ تو پھر بھی اتر تا چڑھتا رہتا ہے مگر میں اندر ہی اندر جس بخار میں پھنک رہا تھا وہ اب نا قابل برداشت ہو چلا تھا۔ تمام دن اس انتظار میں گزرتا کہ رات آئے گی تو وہ میرے کمرے آئے گی۔ جب رات آتی تو مجھ ایک عجیب سی گھبراہٹ طاری ہو جاتی کہ اب آزمائش کا وقت آرہا ہے، صبح تک مجھے بے لوث محبت کا مظاہرہ کرنا ہوگا۔ وہ اپنے ہاتھوں سے تیار کیا ہوا سالن لے کر آئے گی، میرے ساتھ بیٹھ کر کھائے گی۔ میں بستر پر لیٹ جاؤں گا تو وہ میرے ہاتھ پاؤں دبائے گی۔ مجھ سے ٹھنڈے ٹھنڈے موضوعات پر گفتگو کرے گی۔ میں اسے آغوش میں لوں گا، وہ انکار نہیں کرے گی میں اسے پیار کروں گا، وہ شرمائے گی، میں اپنے جذبات کا اظہار کروں گا، وہ گھبرائے گی میں ضد کروں گا، وہ دامن بچا کر نکل جائے گی۔

بس یہی روز کا معمول تھا۔ میں محبت کی اس محدود یکسانیت سے بے زار ہو گیا تھا۔ وہ ایسی تھی کہ اسے دیکھے بغیر قرار بھی نہیں آتا تھا۔ اس سے دور رہ کر سکون نہیں ملتا تھا لہٰذا میں ہی اپنے صبر کو آزماتا تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ میں نیند کا بہانہ کر کے آنکھیں بند کر لیتا تاکہ ملاقات مختصر ہو جائے۔ کبھی اس سے ناراض ہو کر کروٹ بدل لیتا لیکن وہ کسی نہ کسی طرح اپنی پیار بھری اداؤں سے میری ناراضگی دور کر دیتی تھی۔

اس رات وہ آئی تو میں ان پراسرار جنازوں کے متعلق سوچ رہا تھا۔ میں نے اس سے پوچھا ''یہ تمہارے کیسے رشتے دار ہیں جن کی گھر والیاں کہیں باہر سے وفات پا کر آتی ہیں اور ان کا جنازہ اٹھانے کے لیے مخصوص لوگ آتے ہیں؟''

وہ میری جانب چند لمحوں تک حیرانی سے دیکھتی رہی پھر اس نے پوچھا ''کیا ممانی کی لاش گھر میں نہیں تھی؟''

''گھر میں تھی، ہوسکتا ہے کہ میرے وہاں پہنچنے سے پہلے کہیں سے لائی گئی ہو۔ پچھلی بار ایسا ہو چکا ہے۔ اس لیے مجھے یقین ہے کہ احمد دین کی بیوی کی لاش بھی کہیں سے لائی گئی تھی''۔

میں اسے صمدو چاچا اور موسیٰ بھائی کے ہاں ہونے والی میت کے متعلق بتانے لگا۔ میری باتیں سن کر وہ پریشان ہوگئی تھی کسی قدر گھبرا گئی تھی۔ وہ سر جھکا کر کچھ دیر سوچتی رہی پھر آہستگی سے لرزتی ہوئی آواز میں بولی۔

''میں نہیں کہہ سکتی کہ ایسا کیوں ہوتا ہے لیکن جو کچھ بھی ہوتا ہے اس کے اچھے برے کو سمجھنے والا خدا ہے۔ ہم کسی کو سمجھ کر یا سمجھا کر کچھ حاصل نہیں کر سکتے۔ میں تو اتنا جانتی ہوں کہ آپ کو اگر کوئی خوشی یا غمی میں بلائے تو ضرور جانا چاہیے۔ مرنے والی بے چاری کوئی بھی ہو، اس نے زندگی اچھی طرح گزاری ہو یا بری طرح۔ برے انسان کو بھی آخری وقت پرائے کاندھوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ آپ انہیں کاندھا دے کر نیکی کرتے ہیں۔ اگر آپ کی نیکیاں صرف اچھوں کے لیے ہیں اور بروں کے لیے اتنی نفرت ہے کہ آخری وقت کاندھا دینا بھی گوارا نہیں ہے تو آئندہ ایسی جگہ نہ جائیں۔ میں بھی آئندہ آپ سے التجا نہیں کروں گی''۔

وہ منہ پھیر کر بیٹھ گئی۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے ناراض ہوگئی۔ میں نے کہا۔

''میں نے تمہاری کسی بات سے انکار نہیں کیا ہے۔ تم جہاں کہوگی میں وہاں جاؤں گا مگر میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ تمہارے یہ نام نہاد رشتہ دار کوئی سنگین جرم کر رہے ہیں''۔

''نہیں۔ میں انہیں اچھی طرح جانتی ہوں وہ مجرم نہیں ہیں''۔

''پھر وہ لاشیں کس کی ہوتی ہیں؟''

''چند گناہ گاروں کی جن کا بوجھ اٹھا کر قبرستان تک جانا کوئی گوارا نہیں کرتا''۔

میں نے تعجب سے اسے دیکھا پھر اپنی سمجھ کے مطابق کہا ''اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ صمدو چاچا، موسیٰ بھائی اور احمد دین کی داشتائیں تھیں''۔

''ہاں''

ذرا دیر کے لیے اطمینان ہوگیا کہ میں...... سچائی تک پہنچ گیا ہوں۔ پھر میرے دماغ میں بات آئی کہ بھلا داشتاؤں کے لیے ایسی رازداری کی کیا ضرورت ہے؟ کتنے ہی دولت مند داشتائیں رکھتے ہیں اور اس سماج میں معزز کہلاتے ہیں۔ ان کی داشتاؤں کو آخری وقت کاندھا دینے والے بھی سینکڑوں مل جاتے ہیں، ان کے جنازے کبھی ایسی رازداری سے اٹھائے نہیں جاتے۔

میری یہ باتیں سن کر اس نے جواب دیا ''میں نہیں جانتی کہ وہ ایسی رازداری کیوں برتتے ہیں مجھے جو کچھ معلوم تھا وہ میں نے آپ سے کہہ دیا''۔

''نہیں زلیخا! میں سمجھتا ہوں کہ کوئی اور بات تم مجھ سے چھپا رہی ہو''۔

''میں کچھ نہیں چھپا رہی ہوں''

''میں جانتا ہوں''۔

''کیا ''اس نے پوچھا۔

میں نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کہا''کیا وہ عورتیں بھی تمہاری طرح سدا سہاگن تھیں؟''

وہ ہنسنے لگی۔ بڑی مترنم ہنسی تھی۔ وہ رس بھری گنگناتی ہوئی ہنسی خفتہ جذبات کو چھیڑتی تھی۔ پھر وہ منہ پر ہاتھ رکھ کر ہنسی پر قابو پاتی ہوئی بولی۔

''آپ بھی عجیب باتیں کرتے ہیں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ مجھ جیسی عورتیں ہر دوسرے تیسرے گھر میں پیدا ہوتی ہیں؟ میں تو ایک عجوبہ ہوں اور عجائب المخلوقات ہر جگہ نہیں پائی جاتی۔ ہوسکتا ہے کہ یہاں لاکھوں کی آبادی میں مجھ جیسی دو چار اور موجود ہوں مگر میں انہیں نہیں جانتی۔ آپ خود ہی سوچیے اگر وہ سدا سہاگن ہوتیں تو صمدو چاچا کی شریک حیات یا داشتائیں نہ بنتیں۔ ہمارے متعلق ایسا سوچنا بھی گناہ ہے''۔

وہ درست کہہ رہی تھی یہ میرا ذاتی تجربہ تھا۔ اگر میں زلیخا کو شریک حیات بنانا چاہتا تو اس کی ماں اور محلے والے کبھی اجازت نہیں دیتے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ وہ پاک روح ہے اور پاک روح کسی انسان کی نفسانی خواہشات کا شکار نہیں ہوسکتی۔

میں نے اسے نظر بھر کر دیکھا تو حسن سراپا میرے جذبات کو پکار رہا تھا۔ میں نے موضوع بدل کر کہا۔

''تمہارے متعلق سوچنا بھی گناہ نہیں ہے۔ میں تمہیں شریک حیات بنانا چاہتا ہوں مگر تم مجھ سے اس لیے کتراتی ہو کہ ابھی تک ہمارے درمیان وہ گہرا اور اٹوٹ رشتہ قائم نہیں ہوا جس کے بعد ہم ایک دوسرے کی ضرورت بن جاتے''۔

''آپ نے پھر وہی باتیں چھیڑ دیں'' اس نے شکایت کی۔ میں نے اسے بازوؤں میں بھر کر پوچھا''کیا صرف باتوں سے زندگی گزر جائے گی؟''

اس نے میرے شانے پر سر رکھ کر کہا''جو میرے اختیار میں ہے اس سے میں انکار نہیں کرتی۔ میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ آپ کے لیے جان بھی دے سکتی ہوں لیکن گناہ گار نہیں بن سکتی''۔

''تم چاہتی ہو میں ہمیشہ تڑپتا رہوں؟''

''گناہ کے لیے تڑپنا نادانی ہے''۔

''انسان ایسی نادانی نہ کرے تو فرشتہ بن جائے گا'' میں نے اسے چوم لیا۔

اس نے کسمسا کر میری گرفت سے نکلنے کی کوشش کی۔ میری گرفت ہمیشہ مضبوط ہوتی تھی لیکن میں جان بوجھ کر ڈھیل دیا کرتا تھا اس لیے کہ وہ میری آغوش سے نکلنا نہیں چاہتی تھی صرف میری دست درازی پر مجھے روکتی اور سمجھاتی رہتی تھی۔

وہ ایک ایسی آگ تھی جس میں حرارت نہیں تھی۔ اس کی پہلی اور آخری خواہش یہی تھی کہ میں اسے ٹوٹ کر پیار کروں۔ وہ ایک شمع کی طرح والہانہ محبت کی آرزو کرتی تھی کہ پروانہ آئے، دیوانہ وار اس کا طواف کرے۔ اس سے کچھ نہ مانگے اس کے لیے تڑپتا رہے اور تڑپنے کی سکت باقی نہ رہے تو خاموشی سے جل کر مر جائے۔ اس کے مرنے کے بعد بھی وہ جلتی رہے گی۔ اس دنیا میں کچھ ایسی چیزیں ہیں جو جلتی ہیں، جلاتی ہیں اور اپنی آگ سے ذرا بھی واقف نہیں ہوتیں۔

میں اس کی بے حسی سے جھنجھلا گیا تھا۔ وہ اپنی عادت کے مطابق بار بار کبھی التجائیں اور کبھی نصیحتیں کرنے

لگی۔ میں نے اسے پرے دھکیل دیا اور منجی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں پہلے بھی اس سے ایسا سلوک کر چکا تھا۔ اسے پرے ہٹا کر اور کروٹ بدل کر ناراضگی سے منہ پھیر لیا تھا مگر اس رات اسے بستر پر تنہا چھوڑ کر اٹھ گیا تو یوں گھبرا کر دیکھنے لگی جیسے میں اسے چھوڑ کر چلا جاؤں گا۔

میرا ارادہ بھی یہی تھا۔ میں نے جھلا کر کہا ''میں سمجھ گیا ہوں کہ تم صرف اپنی محبت سے مجبور ہو کر یہاں آتی ہو۔ تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے اگر ہوتی تو تم میرے جذبات کو سمجھتیں اور میری خوشیوں کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے سے دریغ نہ کرتیں مگر قربانیاں تو دور کی باتیں ہیں، تم میری ایک چھوٹی سی خوشی بھی پوری نہیں کر سکتیں......''

وہ تڑپ کر بستر سے اٹھی اور میری گردن میں بانہیں ڈال کر لپٹ گئی۔ ''میں آپ سے محبت کرتی ہوں۔ یہ خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ جب آپ سامنے نہیں ہوتے ہیں تب بھی میں آپ ہی کو یاد کرتی ہوں اور آپ کے متعلق سوچتی رہتی ہوں۔ آپ کے سوا میرا دنیا میں کوئی نہیں ہے جسے میں اپنا کہہ سکوں۔ آپ مجھے سمجھنے کی کوشش کیجیے۔

میں اس کے ہاتھوں کو اپنی گردن کے اطراف سے ہٹا کر ذرا دور ہو گیا ''میں تمہیں خوب سمجھتا ہوں۔ سمجھنے کے لیے چھ ماہ کا عرصہ کم نہیں ہوتا۔ آج تک میں تم سے قریب رہ کر تڑپتا رہا اب تم مجھ سے دور رہ کر تڑپتی رہو۔ میں تم سے دور چلا جاؤں گا تب ہی تمہیں معلوم ہوگا کہ تڑپ اور بے چینی کیا ہوتی ہے''۔ یہ کہہ کر میں اپنی چپلیں پہننے لگا۔ وہ مجھ سے پھر لپٹ گئی۔ میں نے ایک جھٹکے سے اسے الگ کیا اور دھکا دے کر منجی پر گرا دیا پھر تیزی سے چلتا ہوا کمرے سے نکل گیا۔

''بالے...... بالے!'' وہ مجھے پکار رہی تھی۔

میں آنگن میں آیا تو وہ کمرے کے دروازے پر آئی۔

''رک جائیے خدا کے لیے رک جائیے۔ مجھے چھوڑ کر نہ جائیے میں مر جاؤں گی''۔

وہ دھیمی آواز میں التجا کر رہی تھی تاکہ اس کی آواز دوسرے آنگن میں نہ پہنچے جہاں اس کی ماں گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

پھر وہ تیزی سے چلتی ہوئی آنگن میں آئی۔ اس وقت تک میں دروازے کے باہر چلا آیا تھا۔ اس کے قریب آنے سے پہلے میں نے دروازے کو باہر سے بند کر کے باہر سے تالا لگا دیا۔ مجھے ڈر تھا کہ اس کے آنسوؤں اور التجاؤں سے پھر پگھل جاؤں گا۔ وہ بند دروازے کے پیچھے سے ہولے ہولے مجھے پکار رہی تھی اور مجھے واپس آنے کے لیے کہہ رہی تھی مگر میں وہاں سے پلٹ کر اس کی آواز سے دور ہوتا چلا گیا۔

میں چاہتا تھا کہ وہ بھی جدائی کی تڑپ اور جلن کی اذیتوں کو سمجھ لے تب ہی اسے میرے جذبات کا شدت سے احساس ہوگا۔ میں ورکشاپ میں آ کر سو گیا۔

وہ رات میں نے بڑی بے چینی سے گزاری۔ کبھی سوتا رہا۔ کبھی جاگتا رہا۔ میں اسے رلا کر آیا تھا۔ اس لیے اس کی آنسو بھری آنکھیں بار بار نگاہوں کے سامنے گھوم رہی تھیں۔ دوسری صبح میں کام میں مصروف ہو گیا۔ دوپہر کو تھوڑی دیر کے لیے گھر میں آیا۔ میں اسے بتانا چاہتا تھا کہ صرف لباس بدلنے آیا ہوں اور آج رات کو بھی واپس نہیں آؤں گا۔

وہ اپنی ماں کے ساتھ میرے کمرے میں آ گئی۔ میں نے اسے صرف ایک نظر دیکھا پھر اس طرح منہ پھیر لیا جیسے اس کی پرواہ نہ ہو۔ اس ایک نظر میں، میں نے اس کے چہرے کی اڑی ہوئی رنگت، بکھری ہوئی زلفوں اور سوجی ہوئی آنکھوں سے اندازہ لگا لیا کہ پچھلی تمام رات جاگتی رہی ہے۔ اس کی ماں نے پوچھا۔

''کیا بات ہے بیٹا! پچھلی رات تم گھر نہیں آئے تھے؟ میں نے صبح اٹھ کر دیکھا تو باہر تالا پڑا تھا''۔

''جی ہاں'' میں نے جواب دیا ''آج کل کام بہت زیادہ ہے، میں ورکشاپ میں سویا کروں گا''۔

وہ میرے جھوٹ کو سمجھ گئی۔ میری بات کے جواب میں کچھ کہنا چاہتی تھی مگر میں نے اسے موقع نہیں دیا۔ اتنی تیزی سے کمرے کے باہر چلا آیا جیسے واقعی کام بہت زیادہ ہے اور وہاں ٹھہر کر اپنا وقت برباد نہیں کرنا چاہتا ہوں۔ میں نے باہر دروازے پر تالا لگایا اور ورکشاپ میں وقت گزارنے چلا آیا۔ یہ میں خوب اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ مجھے دل و جان سے چاہتی ہے۔ اس کی موجودہ حالت دیکھ کر یہ بھی یقین ہو گیا تھا کہ دور رہ کر اسے تڑپانے والا نسخہ کامیاب ثابت ہو رہا ہے۔

رات کے آٹھ بجے ایک بوڑھا خسرا میرے پاس آیا۔ مجھے خسروں سے سخت نفرت ہے۔ وہ اپنے بے ڈھنگے جسموں پر عورتوں کا لباس پہن کر اتنے بھدے اور برے لگتے ہیں کہ میں انہیں دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتا لیکن وہ زلیخا کا ہم جلیس تھا وہ گھنٹوں اس کے پاس بیٹھا باتیں کرتا رہتا تھا لیکن میں نے کبھی اس خسرے سے بات نہیں کی تھی۔ وہ اچانک ہی پہلی بار میرے پاس آیا تو میں سمجھ گیا کہ ضرور کوئی بات ہے۔ زلیخا کے پاس بیٹھنے والا یقیناً اس کا کوئی پیغام لایا ہے۔

میں ملازموں سے ذرا دور ورکشاپ کے ایک گوشے میں آ کر بیٹھ گیا۔ ایک ملازم کو میں نے چائے لانے کے لیے کہا۔ وہ خسرا میرے سامنے ایک لکڑی کی چوکی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''تم تو مجھے جانتے ہو میرا نام اختری ہے۔ میں ابھی زلیخا کے پاس سے آ رہی ہوں'' یہ کہہ کر اس نے میری آنکھوں کو گہری نظروں سے دیکھا۔ میں نے نظریں جھکا لیں تو وہ میری بلائیں لیتا ہوا بولا۔

''میں صدقے، میں واری، تمہارا چہرہ بھی پیلا پڑ گیا ہے۔ زلیخا کی بھی یہی حالت ہے۔ میں سب جانتی ہوں، زلیخا نے مجھے سب کچھ بتا دیا ہے''۔

میں نے اس سے نہیں پوچھا کہ اس نے کیا بتایا ہے۔ میں اس کی زبان سے سننا چاہتا تھا۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ بڑی سنجیدگی سے بولا۔

''میں زلیخا کو دل و جان سے چاہتی ہوں۔ وہ میری دریافت ہے''۔

میں نے چونک کر اسے دیکھا اور پوچھا ''دریافت کا مطلب کیا ہوا؟''

''اس کا مطلب ہے اپنے جنس کی تلاش کرنا۔ جن گھروں میں ولادتیں ہوتی ہے وہاں چھٹی کی رسم میں ہم ناچنے گانے ضرور جاتی ہیں۔ کوئی بلائے یا نہ بلائے مگر ہم وہاں پہنچ کر ضد کرتی ہیں کہ ہمیں بھی خوشی منانے کا موقع دیا جائے۔ پڑھے لکھے گھرانوں میں ہمیں اجازت نہیں ملتی۔ مگر پڑھے لکھے ہیں کتنے؟ ہم ان کی طرف نہیں جاتیں اگر جانے کا موقع دیا جائے تو میرا دعویٰ ہے کہ میں دولت مند گھرانوں میں بھی زنخوں کو ڈھونڈ نکالوں گی۔ شاید اسی ڈر سے وہ ایسی خوشی کے موقعوں پر ہمیں نہیں بلاتے۔ ہماری بجائے رنڈیوں کو نچاتے ہیں اونہہ!''

اس نے اس طرح منہ بنا کر اونہہ کیا جیسے وہ رنڈیوں سے افضل ہوں اور محض ناقدری کی وجہ سے انہیں اونچے طبقے میں جانے کا چانس نہیں ملتا ہے۔

''مگر ہم اپنی قدر کرانا جانتے ہیں۔ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی کے ہاں ایک سدا سہاگن پیدا ہوتی ہے۔ ہم وہاں چھٹی کی رسم میں ناچتے گاتے پتہ کر لیتی ہیں کہ کوئی ایسی مخلوق پیدا ہوئی ہے جس کا شمار نہ مردوں میں ہے نہ عورتوں میں۔ وہاں ہم یہ ثابت کرتی ہیں کہ اس دنیا میں آخر اگر ہم خسرے بن گئی ہیں تو اس میں کوئی برائی نہیں ہے قدرتی طور

سے بھی ہماری جیسی تیسری جنس پیدا ہوتی ہے۔ اگر وہ قابل نفرت نہیں ہے تو ہم سے کیوں نفرت کی جاتی ہے۔ کوئی مرد کے نقش قدم پر چلتا ہے کوئی عورت کے نقش قدم پر۔ ہم سدا سہاگن کے نقش قدم پر چلتی ہیں کیا میں غلط کہتی ہوں؟''

میں نے اکتا کر جواب دیا۔ ''میں تمہارے مسائل پر بحث نہیں کر سکتا۔ تم زلیخا کے متعلق کچھ کہہ رہی تھیں؟''

''ہاں، میں زلیخا کے بارے میں کہہ رہی ہوں، تم اسے حاصل کرنا چاہتے ہو تو ہماری زندگی کو بھی سمجھو۔ نہیں سمجھو گے تو کسی دن زلیخا بدنام ہو جائے گی''۔

''اس نے کوئی ایسا کام نہیں کیا ہے کہ بدنام ہو جائے گی'' میں نے کہا۔

وہ ہنسنے لگا پھر رازدارانہ لہجے میں بولا ''زلیخا مجھے رازدار سہیلی سمجھ کر سب کچھ بتا دیتی ہے۔ نہ بھی بتاتی تو میں کچھ کم نہیں ہوں، اڑتی چڑیا کے پر گن لیتی ہوں۔ بھلا یہ کوئی ماننے والی بات ہے کہ راتوں کو تمہارے ساتھ سوئے اور صبح پاک باز عورت کی طرح اٹھے۔ وہ اپنی پاک بازی جتاتی ہے مگر میں نہیں مانتی۔ اگر میں یہ بات پھیلا دوں تو جو لوگ پاک روح سمجھ کر اس کی عزت کرتے ہیں وہ عزت مٹی میں مل جائے گی اور لوگ اسے ہماری طرح پیشہ ور مخنث سمجھنے لگیں گے''۔

میں نے غصے سے اسے دیکھا، میرے جی میں آیا کہ مار مار کر اس کا کچومر نکال دوں۔ وہ ایک سیدھی سادی شریف عورت کو بدنام کرنے کی دھمکی دے رہا تھا۔ میں اسے غصے اور نفرت سے دیکھتا رہا اور ضبط کرتا رہا۔ میں جانتا تھا کہ اس پر ہاتھ اٹھانا دانشمندی نہیں ہے۔ یہ خسرے اول درجے کے ڈھیٹ اور بے شرم ہوتے ہیں۔ وہ مار کھا کر سامنے سڑک پر جائے گا اور ہاتھ ہلا ہلا کر مجھے اور زلیخا کو کوسے گا۔ میرے عشق کی داستان عام ہو گی اور زلیخا بدنام ہو جائے گی۔ جس لڑکی کو تمام محلے میں ہاتھوں ہاتھ لیا جاتا تھا، آنکھوں میں بٹھایا جاتا تھا، میں اسے رسوا نہیں کرنا چاہتا تھا۔

اس نے میرے بگڑے ہوئے تیور دیکھ کر کہا ''میں زلیخا کی دشمن نہیں ہوں اگر دشمن ہوتی تو بچپن ہی سے اسے اپنی ٹولی میں اٹھا کر لے جاتی کیونکہ جہاں کوئی سدا سہاگن پیدا ہوتی ہے، اس دروازے پر ہماری ٹولی دھرنا دے کر بیٹھ جاتی ہے کہ اس سدا سہاگن کو ہمارے حوالے کر دو کیونکہ وہ ہماری جنس سے تعلق رکھتی ہے۔

ہوتا یوں ہے کہ جس گھر میں وہ پیدا ہوتی ہے اس کے والدین اس کی اصلیت چھپاتے ہیں۔ باپ شرم سے کسی کو نہیں بتا سکتا کہ بیٹا ہے یا بیٹی۔ اکثر بیٹی ہی مشہور کرتے ہیں۔ زلیخا کی اصلیت کو میں نے پہچان لیا تھا پھر میں اپنی ٹولی کے ساتھ وہاں جا کر شور مچانے لگی تو سارے محلے والوں کو خبر ہو گئی۔ زلیخا بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوئی تھی۔ اس کا باپ جاہل تھا مگر بہت پیسے والا تھا۔ میں نے اس سے سمجھوتہ کر لیا۔ ایک ایسا سمجھوتا جس کے متعلق ابھی میں تمہیں نہیں بتا سکتی کیونکہ تم زلیخا سے ناراض ہو کر آئے ہو۔ اگر تم نے اس کا دل نہیں توڑا اور اسے اپنا بنا کر رکھا تو میں تمہیں سب کچھ بتا دوں گی کہ میرے اور زلیخا کے درمیان کتنا اہم رشتہ ہے اتنا اہم کہ میں کسی موقعے پر بھی اسے بدنام نہیں کرنا چاہتی۔ اس نے مجھے بتایا ہے کہ تم اسے دیوانگی کی حد تک چاہتے ہو۔ کسی بات پر ناراض ہو کر پچھلی رات سے گھر نہیں جا رہے۔ اس نے مجھ سے کہا کہ میں تمہارے پاس جاؤں اور تم سے منت اور سماجت کروں کہ راتوں کو گھر سے باہر نہ رہا کرو۔ ایک محبت کی ماری تمہارا انتظار کر رہی ہے۔ جاؤ بالے! اس کا دل نہ توڑو۔ وہ بہت کمزور لڑکی ہے۔ اسے محبت ہی محبت ملی ہے کسی کی ناراضگی کبھی نہیں ملی۔ یہ تم ہو کہ اس سے ناراض ہو کر آئے ہو۔ وہ تمہاری بے رخی برداشت نہیں کر سکے گی۔ اپنی جان کو روگ لگا لے گی۔ ابھی یہاں سے سیدھے گھر چلے جاؤ، وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے''۔

اس کی باتیں سن کر میرے ہونٹوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ وہ میری توقع کے مطابق میرے لیے تڑپ رہی تھی۔

میری ضرورت محسوس کر رہی تھی اور میں یہی چاہتا تھا۔

ایک گھنٹے کے بعد میں ورکشاپ بند کر کے گھر واپس آیا تو تمام محلے میں رات کی خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ گلی سنسان تھی اور نکے پان والا دکان کے پچھلے دروازے سے کاروبار کر رہا تھا۔

میں تالا کھول کر اندر آیا اور دروازے کو بند کر کے جب کمرے میں پہنچا تو وہ میرے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی وہ دوڑتی ہوئی آئی اور میرے قدموں سے لپٹ کر فرش پر بیٹھ گئی۔ پھر میں نے اس کی سسکیاں سنیں۔ اس کا بدن کانپ رہا تھا اور وہ رو رہی تھی۔

مجھے اس کی محبت اور دیوانگی نے اتنا متاثر کیا کہ میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ کسی کو ایسی محبت کرنے والی ہستی مل جائے تو وہ کتنا خوش نصیب ہوتا ہے۔ یہ میں اس رات سمجھ گیا۔

میں نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اٹھایا اور سینے سے لگا کر بھینچ لیا۔ وہ میری آغوش میں ایک ننھی بچی کی طرح ہمکنے اور شکایتیں کرنے لگی میں اسے پچکارنے اور چومنے لگا۔

''آپ مجھے چھوڑ کر کیوں چلے گئے تھے، کیوں چلے گئے؟''

''یہ دیکھنے کہ تم میرے بغیر کس طرح تڑپتی ہو؟''

''اللہ! آپ نے بہت ظلم کیا ہے۔ میں کیا بتاؤں کہ میری کیا حالت ہوگئی تھی۔ مجھے ایسا لگ رہا تھا کہ میری جان نکل گئی ہے۔ میری زندگی میرے پاس نہیں ہے، آپ کے ساتھ چلی گئی ہے اور میں بالکل خالی ہوگئی ہوں۔ کسی سے باتیں کرنے کو جی نہیں چاہتا تھا۔ بھوک پیاس مرگئی تھی۔ ماں جی پوچھتی رہیں کہ مجھے کیا ہوگیا ہے، صبح سے میں نے کچھ کھایا کیوں نہیں ہے مگر میں انہیں ٹالتی رہی کہ طبیعت ٹھیک نہیں ہے کھانے کو جی نہیں چاہتا۔ نہ جانے آپ میں کیا جادو ہے کہ آپ کے بغیر بھوک پیاس......''

میں نے اس کے لبوں پر اپنے ہونٹ رکھ دیئے۔ اس کی آواز گھٹ گئی پھر میں نے اسے چوم کر کہا ''اور باقی باتیں بعد میں ہوں گی تم صبح سے بھوکی ہو۔ جاؤ روٹیاں لے کر آؤ میں تمہیں اپنے ہاتھوں سے کھلاؤں گا'' اس نے خوش ہو کر مجھے دیکھا۔ پھر میرے گلے میں بانہیں ڈال کر بولی ''ایسا لگتا ہے کہ آپ کو کھو کر بڑی مدت کے بعد پایا ہے، چھوڑ کر جانے جی نہیں چاہتا''۔

میں نے اسے سمجھا بجھا کر روٹی لانے کو بھیج دیا اور منجی پر آ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ سالن اور روٹیاں لے کر آئی، ہم دونوں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر کھانے لگے۔ کبھی میں نوالہ بنا کر اسے کھلاتا تھا اور کبھی وہ مجھے کھلاتی تھی۔ اس وقت اتنی بڑی دنیا ہماری نظروں سے اوجھل ہوگئی تھی۔ اس کائنات میں صرف ہم دو محبت کرنے والے تھے۔ ہمارے علاوہ کوئی دنیا، کوئی ہستی اور کوئی آواز نہیں تھی۔ وہ بول رہی تھی میں سن رہا تھا۔ میں محبت کے گنگناتے وعدے کر رہا تھا وہ خوشی سے پھولی نہیں سما رہی تھی۔

کھانے کے بعد اس نے برتنوں کو ایک طرف رکھ دیا۔ پھر میرے پہلو میں آ کر بیٹھ گئی اور پچھلی رات سے اب تک کے ہجر کی داستان سنانے لگی کہ کس طرح اس کی نیند اڑ گئی تھی دن کے وقت بھی وہ سو نہ سکی میرے انتظار میں اب تک جاگتی رہی۔ میں نے کہا۔

''تمہیں اب سو جانا چاہیے چلو یہاں لیٹ جاؤ میں تمہیں سلا دیتا ہوں''۔

یہ کہہ کر میں وہاں سے اٹھ گیا اور سوئچ بورڈ کے پاس آ کر لائٹ آف کر دی۔ کمرے میں اندھیرا پھیل گیا، نگاہوں سے ہر چیز اوجھل ہو گئی۔ اس تاریکی اور خاموشی میں صرف منجی بول رہی تھی کہ ایک مہکتا دہکتا بدن کروٹ لے رہا ہے۔ میں آہستہ آہستہ چلتا ہوا منجی پر آ گیا اور اس کے پہلو میں لیٹ کر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ پھر اس کے کان میں سرگوشی کی ”تم صرف کل سے تڑپ رہی تھیں، میں چھ ماہ سے تڑپ رہا ہوں۔ اب تمہیں میری تکلیف کا احساس ہو گیا ہوگا“۔

وہ خاموش رہی۔ شاید اس لیے نہیں بول رہی تھی کہ کوئی بات میرے مزاج کے خلاف ہو گی تو پھر میں روٹھ کر چلا جاؤں گا۔ اس کی خاموشی میرے لیے سود مند تھی۔ میں اس خاموش مجسمے سے کھیلنے لگا۔

چاند کی چاندنی آنگن میں اتر رہی تھی اور اس کی دھندلی سی روشنی کمرے کی تاریکی سے کھیل رہی تھی۔ اس دھندلکے میں زلیخا کا وجود کچھ چھپ رہا تھا اور کچھ جھلک رہا تھا۔ میرے ہاتھ ہر جنبش پر چھپنے اور سمٹنے والی کو دریافت کر رہے تھے۔ وہ کبھی کبھی میرے بے باک ہاتھوں کو پکڑ لیتی تو میں اپنے ہونٹوں سے اس کے ہونٹوں میں ڈوبتا ابھرتا اور اسے سمجھاتا۔

”مجھ سے نہ شرماؤ۔ میں تمہارا ہوں اور تم میری ہو۔ گناہ کے تصور کو ذہن سے نکال دو۔ میں تمہیں صدق دل سے اپنا رہا ہوں اگر تمہیں مجھ پر اعتماد نہیں ہے تو اس قربت کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دو۔ مجھے کہیں دور چلے جانے دو......“

دور ہونے کے ذکر پر وہ گھبرا کر مجھ سے لپٹ جاتی تھی۔ میں نے اسے اچھی طرح خوف زدہ کر دیا تھا اس لیے وہ میری بے باکیوں پر برائے نام احتجاج کر کے ہار جاتی تھی۔ میرے حوصلے بڑھتے گئے، میں حجاب کے پردے ہٹاتا گیا۔ اس کے نازک بدن کی ملائمت سے آشنا ہوتا گیا کچھ دیر بعد مجھے بھٹکنے کا احساس ہوا کہ کمرے کی نیم تاریکی میں ہوس کی چمگادڑ بھٹک رہی ہے، اندھیرے کی دیواروں سے ٹکریں مار رہی ہے، پھڑ پھڑا رہی ہے مگر اسے دیوار کے اس پار جانے کا راستہ نہیں مل رہا ہے کوئی دروازہ نظر نہیں آ رہا ہے۔

میں ہوش سے بے گانہ ہو رہا تھا، مدہوش ہونے کے لیے مزید نشے کی ضرورت تھی۔ نشہ وہ بھی ہوتا ہے جو نکے پان والا فروخت کرتا ہے لہٰذا پہلی بار، زندگی میں پہلی بار میں اس دکان کے پچھلے دروازے پر گیا اور نشے کی انتہا کو چھو لیا۔ اف! کیسا ظالم اور کیسا مہربان نشہ تھا۔ میں ان نشیلے لمحات کو کبھی بھول نہیں سکتا۔ وہ لمحات جبکہ میں خود کو اور ساری دنیا کو اور نیکی و بدی کو بھلا بیٹھا تھا۔

جب مجھے ہوش آیا تو وہ اپنی بانہوں میں منہ چھپائے رو رہی تھی۔

میرا سر ندامت سے جھک گیا۔ جب جوش اور جذبے سرد پڑ گئے تب احساس ہوا کہ جسے میں جان سے زیادہ عزیز سمجھتا ہوں، اسے تکلیف پہنچائی ہے۔ اس کے ساتھ ایک غیر انسانی سلوک کیا ہے۔ میں بڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھا رہا اور وہ ہچکیاں لے کر روتی رہی۔ شرمندگی سے میری زبان نہیں کھل رہی تھی، میں نے خاموشی سے اسے تسلی دینے اور چپ کرانے کے لیے اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھا۔ اس نے فوراً ہی میرا ہاتھ پرے جھٹک دیا۔ انداز ایسا ہی تھا جیسے ایک غلاظت کو اپنے جسم سے جھٹک رہی ہو پھر وہ کھسکتی ہوئی منجی کے سرے پر گئی اور اپنے لباس کو درست کیا اور کراہتی اور کانپتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

نیم تاریکی میں وہ ایک سائے کی طرح نظر آ رہی تھی اور سسکیاں لیتی، کراہتی ہوئی قدم قدم پر ڈگمگاتی اور سنبھلتی ہوئی مجھ سے دور ہوتی جا رہی تھی۔ میں اس سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ کیوں جا رہی ہے؟ میں اسے روکنا چاہتا تھا، ایک بار سینے سے لگا کر تسلی دینا چاہتا تھا مگر میری زبان ساتھ نہیں دے رہی تھی۔

میں ایک مجرم کی طرح خاموش رہا اور وہ چلی گئی۔ دوسری صبح بیدار ہوا تو آنگن میں دھوپ پھیل گئی تھی۔ دوسری طرف آنگن میں کچھ مردوں اور عورتوں کی باتیں کرنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ پھر کسی عورت کے رونے کی آواز سن کر میرا دل دھک سے رہ گیا۔

''زلیخا کے گھر میں کوئی عورت کیوں رو رہی ہے؟'' یہ سوال میرے دماغ میں چیخنے لگا۔ میں دروازے کھول کر اس آنگن میں گیا، وہاں محلے کی عورتیں تھیں کچھ جانے پہچانے لوگ تھے اور ان کے درمیان زلیخا کی ماں بیٹھی رو رہی تھی۔ میں نے گھبرا کر پوچھا۔

''کیا بات ہے؟ خیریت تو ہے؟''

ایک نے جواب دیا ''زلیخا پر سکتہ طاری ہے کچھ بولتی نہیں ہے۔ پتہ نہیں اسے کیا ہو گیا ہے؟''

میں تیزی سے چلتا ہوا اس کے کمرے میں آیا، وہاں بھی مرد عورتوں کی بھیڑ لگی تھی۔ سب ہی اسے چاہتے تھے اس لیے اس کے دکھ میں شریک ہونے آ گئے تھے اور اسے آوازیں دے دے کر اپنی طرف مخاطب کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔

وہ اپنی منجی پر لیٹی ہوئی چھت کی جانب تک رہی تھی۔ پلکیں نہیں جھپک رہی تھی۔ یوں لگتا تھا کہ دیدے پتھر ہو گئے ہیں۔ بستر پر سفید چادر بچھی ہوئی تھی۔ اس کے جسم پر صاف ستھرا سرخ رنگ کا لباس تھا۔ وہ ہمیشہ سرخ لباس پہنتی تھی کیونکہ سدا سہاگن تھی اور ایک پاک روح تھی۔ ہمیشہ پاک صاف رہتی تھی۔ وہ پاک روح ہو نہ ہو لیکن میں ندامت سے مرا جا رہا تھا کہ اس کی پاکیزگی کو دھبہ لگایا تھا۔

اس کی ماں روتی ہوئی کمرے میں آئی۔ ایک شخص نے پوچھا۔

''ماں جی! یہ کل شام تک اچھی بھلی تھی پھر اچانک اسے کیا ہو گیا ہے؟''

وہ اپنے آنسو پونچھتی ہوئی بولی ''کیا بتاؤں بیٹا! پرسوں رات کو تین بجے میری آنکھ کھلی تو یہ آنگن میں ٹہل رہی تھی، صبح اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ یہ رات بھر جاگتی رہی ہے۔ کل تمام دن اس نے کچھ نہیں کھایا، کل رات کو ایک بجے میری آنکھ کھلی تو دیکھا یہ آنگن میں غسل کر رہی ہے۔ پاک صاف رہنے کا مطلب یہ تو نہیں ہے کہ آدھی رات کو غسل کیا جائے۔ نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ میں پوچھتی رہی مگر اس نے جواب نہیں دیا۔ لباس بدل کر یہاں آ کر لیٹ گئی تب سے اٹھاتی ہوں تو اٹھتی نہیں، بات کرتی ہوں تو جواب نہیں دیتی ہائے میری بچی کو کسی کی نظر لگ گئی ہے۔ دو راتیں گزر گئیں، دوسرا دن گزر رہا ہے اور یہ اب تک جاگ رہی ہے۔ ہائے ربا! ایسے جاگتی رہی تو مر جائے گی۔ لوگو! کچھ کرو یہ معصوم تمہارے کام آتی رہی ہے آج تم اس کے کام آؤ اسے کسی طرح بچاؤ......''

ماں جی کی باتیں سن کر میرے دل پر کیا گزر رہی تھی میں بیان نہیں کر سکتا۔ میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ غلطی میں کروں گا اور پچھتاوے کے عذاب میں وہ مبتلا ہو جائے گی۔ وہ جسے بچپن سے سمجھا گیا تھا کہ وہ ایک پاک روح ہے اس دنیا کی کوئی غلاظت اسے چھو نہیں سکتی، وہی معصوم لڑکی آنکھیں کھولے سکتے کے عالم میں اس غلاظت کو دیکھ رہی تھی جو اس کے دامن پر لگ گئی تھی۔ اس نے آدھی رات کو غسل کیا تھا، صاف ستھرا لباس پہنا تھا، بستر پر سفید اجلی چادر بچھائی تھی پھر بھی احساس گناہ کا دھبہ اس کے دماغ سے نہیں مٹ رہا تھا۔ میں ندامت سے سر جھکا کر منجی کے قریب آیا اور اسے آواز دی۔

''زلیخا!''

وہ ایسے خاموش رہی جیسے اس کے کان اس دنیا کی کوئی آواز نہیں سن رہے ہوں۔

میں نے منجی کے سرے پر جھک کر اسے پھر ایک بار بڑی محبت سے مخاطب کیا۔

''زلیخا! میں ہوں بالے۔ میری طرف دیکھو......''

اس کے پھیلے ہوئے ویدے ذرا...... ادھر سے ادھر ہوئے۔ وہ مجھے دیکھنے لگی۔ جب تک اس کی نظریں چھت پر مرکوز تھیں۔ اس کی آنکھوں میں ویرانی تھی۔ مجھے دیکھتے ہی اس کی آنکھوں میں زندگی کی ہلکی سی چمک پیدا ہوئی۔ دور کھڑے ہوئے افراد منجی کے قریب آ کر اسے غور سے دیکھنے لگے۔ انہوں نے صرف اتنا ہی دیکھا کہ اس کی آنکھوں میں ذرا سی حرکت پیدا ہوئی ہے لیکن میں سمجھ رہا تھا کہ وہ کتنی محبت اور شکایت بھری نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھی۔

اس کی ماں نے قریب آ کر کہا ''ماں صدقے، میری بچی تجھے کیا ہو گیا ہے؟''

اس نے ایک گہری سانس لی۔ میرے لباس کو دیکھا جسے میں پچھلی رات سے پہنے ہوئے تھا۔ پھر وہ بڑی نقاہت سے بولی ''غسل کر لیجیے!''

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ اس پاکیزگی کے سامنے میں نے خود کو دنیا کا سب سے غلیظ انسان محسوس کیا۔ میں نے ایک قدم پیچھے ہٹ کر کہا۔

''اچھا میں ابھی غسل کر کے آتا ہوں۔ میں تمہیں سلاؤں گا تم سو جاؤ گی نا؟''

''ہاں!'' وہ پھر چھت کی جانب گھورنے لگی۔

میں فوراً ہی وہاں سے پلٹ کر اپنے مکان میں آیا۔ جلدی جلدی غسل کیا۔ دھلے ہوئے کپڑے پہنے۔ کچھ لوگ میرے آنگن میں آ کر کہہ رہے تھے کہ میں بڑا خوش نصیب ہوں۔ پاک روح مجھ پر مہربان ہے اور میری موجودگی میں سونا چاہتی ہے۔

میں نے دل میں کہا کہ اچھا ہی ہے تم لوگ اسی غلط فہمی میں مبتلا رہو۔ میں تو زلیخا کے دماغ سے گناہ کا احساس مٹانے جا رہا ہوں۔

جب میں وہاں پہنچا تو اس کی ماں تمام لوگوں کو کمرے سے باہر لا رہی تھی تاکہ کوئی آواز نہ ہو اور بیٹی سکون سے سو جائے۔ میں منجی کے سرے پر بیٹھ گیا اور اس کے ہاتھ کو بڑی محبت سے تھام کر کہا۔

''زلیخا! تم گناہ کا احساس کر رہی ہو اور میں ندامت سے مرا جا رہا ہوں۔ جو کچھ ہوا اسے بھول جاؤ''۔

''کیسے بھول جاؤں۔ محبت کے نام پر میں کچھ دے رہی تھی، آپ نے کچھ دیا۔ میں روح کی پاکیزگی دے رہی تھی، آپ نے جسم کی غلاظت دی۔ میں آپ کو ناراض نہیں کرنا چاہتی تھی اس لیے آپ کی خاطر اسے قبول کر لیا''۔

اب آپ اس پر بحث نہ کریں۔ میرے پاس وقت بہت کم ہے اور مجھے بہت گہری نیند آ رہی ہے۔ ایسی نیند مجھ جیسی عورت کو ایک ہی ٹھوکر کے بعد سلا دیتی ہے۔ آپ میری باتیں غور سے سنیں۔ صدو چاچا، موسیٰ بھائی اور احمد دین کے آئندہ کبھی کوئی میت ہو تو آپ وہاں نہ جائیں۔ آج کے بعد میں خسروں کی پابندیوں سے آزاد ہو جاؤں گی۔ وہ لوگ خسروں کا جنازہ اٹھاتے ہیں۔ آپ سب اس دنیا میں خسروں کا وجود دیکھتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ وہ کب مرتے ہیں اور کہاں دفن ہوتے ہیں؟

یہ ایک لمبی داستان ہے۔ اختری نے مجھے بتایا ہے، وہی خسرا جو کل آپ کے پاس گیا تھا اسی نے میرے ابان جان سے کہا تھا کہ مجھے ان کے حوالے کیا جائے ورنہ میرے جوان ہونے پر وہ مجھ پر بدفعلی کا الزام لگائیں گے۔ مجھ جیسی ہستی جو نہ مرد ہے نہ عورت اس پر ایسا الزام لگایا جائے تو ایک باپ کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔

• خسروں کا ڈھیٹ پن مشہور ہے انہیں لات جوتے مار کر بھی ان کی زبانیں بند نہیں کی جاسکتیں۔ یہ خسرے جس شہر میں رہتے ہیں بڑے اتحاد سے ایک جماعت بنا کر رہتے ہیں۔ اپنی کمائی کا کچھ حصہ ایک فنڈ کی صورت میں جمع کرتے ہیں۔ ہر شہر میں ان کے خاص ملازم ہوتے ہیں جو آدھی رات کے بعد مرنے والے خسروں کا جنازہ اٹھاتے ہیں اور انہیں اپنی کوئی عزیزہ بنا کر قبرستان لے جاتے ہیں۔

صمدو چاچا، موسیٰ بھائی اور احمد دین جیسے شوقین مزاج رئیس کسی جوان خسرے کو اپنی داشتہ بناتے ہیں تو اس بات کا وعدہ کرتے ہیں کہ ان کے کفن دفن کا انتظام وہ خود کریں گے۔ آدھی رات کے بعد صمدو چاچا اور موسیٰ بھائی کی داشتاؤں کی لاشیں انہی خسروں کے گھر سے نکلی تھیں۔ اسپتال یا کراچی سے ان کی بیویاں نہیں آئیں تھیں۔ پھر یہ خسرے مجھ جیسی سدا سہاگنوں کی تلاش میں رہتے ہیں اور ہماری پیدائشی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر ہمارے والدین کو مجبور کرتے ہیں کہ وہ خسروں کے کفن دفن کا بندوبست کریں ورنہ وہ سدا سہاگن جوان ہو کر بدنامی کی زندگی گزاریں گی۔ میرے ابا جان راضی ہو گئے۔ جب تک وہ زندہ رہے مرنے والے خسروں کے کفن دفن کے لیے چندہ دیتے رہے۔ کئی بار چوری چھپے انہیں کاندھا دے کر بھی آئے۔

ہمارے پاس روپے پیسے کی کمی نہیں ہے۔ ابا جان نے مرنے سے پہلے نصیحت کی تھی کہ میں ان خسروں کی ضروریات پوری کرتی رہوں ورنہ میری نیک نامی پر حرف آئے گا۔ میں اس نصیحت پر آج تک عمل کرتی رہی۔ سدا سہاگن پاک ہستی سمجھی جاتی ہے۔ مجھے اپنے وجود کے آئینے کو صاف رکھنا تھا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ الزام تراشی ہو مگر آہ! آپ کی محبت نے مجھے زندگی بھی دی اور موت بھی۔ میں جھوٹی عزت واحترام کے سہارے نہیں جی سکتی۔ پاکیزگی کا جو آئینہ سب سے زیادہ عزیز تھا وہ ٹوٹ گیا ہے۔ میں نے خود کو بہت سمجھایا کہ میں نے اپنے محبوب کی خوشی پوری کی ہے مگر دل نہیں مانتا۔ جب میں پیدائشی طور پر مکمل عورت نہیں ہوں تو میں نے کیسے خوشی پوری کی؟ مجھے کیا حق پہنچتا ہے کہ نام نہاد سہاگن ہو کر سیج پر جاؤں؟ آج مجھ میں اور ایک خسرے میں کوئی فرق نہ رہا۔ یہ توہین کیسے برداشت کروں؟ میں قانون قدرت کے خلاف آپ کی سیج پر چلی گئی اور وہ خسرے شریعت کے خلاف نماز جنازہ سے گزر کر دفن ہوتے ہیں۔ اس دنیا میں کیسے کیسے تماشے ہوتے ہیں۔ میرے مالک! میرے محبوب! مجھے نیند آرہی ہے۔ میں نے غسل کرلیا۔ آپ نے غسل کرلیا۔ اب وہی پرانی آرزو ہے کہ آپ مجھے چاہیں۔ مجھ سے محبت کریں۔ ایسی محبت جس میں کوئی غرض نہیں ہوتی، کوئی لالچ نہیں ہوتا۔ کیا ایسی محبت اس دنیا میں ہے؟ میں اس پر جھک گیا اور اس آئینے کی طرح صاف اور شفاف چہرے کو اپنی دونوں ہتھیلیوں میں سجا کر بولا۔

''ہاں! ہر محبت کے پیچھے ایک غرض پوشیدہ ہوتی ہے لیکن اب مجھے نصیحت مل گئی ہے۔ میں تم سے بے لوث محبت کروں گا تم سے کچھ طلب نہیں کروں گا، تمہارے پاکیزہ پیار کی ہر طلب پوری کروں گا، میں وعدہ کرتا ہوں۔ میں قسم کھاتا ہوں''۔

اس کے لبوں پر پھیکی سی، بے جان سی مسکراہٹ آئی اس نے آنکھیں بند کرلیں۔

وہ سو رہی تھی۔ باہر لوگ دھیمی سرگوشیوں میں باتیں کر رہے تھے کہ کہیں اس کی نیند اچاٹ نہ ہو جائے۔ کمرہ بھی خاموش تھا، میں بھی خاموش کہ وہ سو رہی ہے۔ وہ سو رہی تھی اور میرا دل رو رہا تھا۔ میرا ایک ہاتھ اس کے سینے پر تھا اور دوسرا ہاتھ اس کی نبض پر۔ اسے گہری نیند آگئی تھی۔ نیند خواہ کتنی ہی گہری ہو میرا ایمان ہے کہ وہ قیامت کے روز ضرور اٹھے گی۔

☆O.....O☆

میٹھا زہر

کہانی وہ ہوتی ہے
جو ایک تہذیب کے اس مخصوص دور کو اپنے
اندر ہمیشہ زندہ رکھتی ہے۔
پنجاب کی تہذیب کی زندہ کہانی
اس کا اختتام نہایت چونکا دینے والا اور ناقابل فراموش ہے۔

عمارہ کو دیکھتے ہی گونگی مورت اور بولتی صورت کو دیکھنے کا فرق واضح ہوگیا۔ واجد نے اب سے پہلے محض اس کی تصویر دیکھی تھی اور اسے دیکھ کر سوچا تھا کہ لڑکی بے حد حسین ہے، اپنے معیار کی ہے۔ اس کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزارا جا سکتا ہے مگر عین نگاہوں کے سامنے اسے دیکھتے ہی خود تصویر کی صورت گم صم ہوگیا۔ وہ اوپر سے قاتل تھا اندر سے بسمل بن کر رہ گیا۔

عمارہ کی تصویر کو اس نے ایک ہی زاویے سے دیکھا تھا اور اس وقت وہی عمارہ رنگ برنگے لباس پہنے ہوئے عورتوں کی بھیڑ میں صد ہزار پہلوؤں سے جلوہ کناں تھی۔ چاروں طرف شادی کی رونق لگی ہوئی تھی۔ وہ مہمان عورتوں کی خاطر مدارت کے لیے ادھر سے ادھر بجلی کی طرح چھب دکھا کر چھپ رہی تھی۔ کبھی اس زاویے سے، کبھی اس زاویے سے نگاہوں کی پیاس بڑھا رہی تھی۔ وہاں اور بھی ڈھیر ساری لڑکیاں تھیں۔ ایک سے ایک طرح دار، کوئی سج دھج میں ہیر سیال، کوئی حسن میں زلیخا اور کوئی اداؤں میں شیریں تھی لیکن عمارہ کی بات کچھ اور تھی۔ وہ تول میں بھی بھاری تھی اور مول میں بھی۔ اس کے جلوے میں محض حسن و ادا کی فتنہ گری نہیں تھی۔ رعب حسن اس لیے بھی طاری ہو رہا تھا کہ وہ چک نمبر دو سو بتیس کے زمیندار کی اکلوتی بیٹی تھی۔

واجد چک نمبر دو سو تیرہ کے زمیندار جناب علی کا بیٹا تھا۔ وہ ایک زمیندار کی بیٹی سے مرعوب نہ ہو سکا۔ اس کے دل میں جو ہلچل سی مچ گئی تھی وہ محض اس لیے کہ وہ دشمن کی بیٹی تھی اور اس کے داؤ پیچ سے دور تھی۔ جو چیز دسترس سے باہر ہو اس کے لیے دل زیادہ مچلتا ہے۔ یہی وجہ تھی کہ وہ اس الہڑ دیہاتی لڑکی کے لیے کچھ زیادہ ہی بے تاب ہوگیا تھا۔

وہ خود بھی اپنے پنڈ کا ایک گبرو جوان تھا۔ چیختے ہوئے رنگوں کی قمیص اور چھینٹ کی ریشمی لنگی پہنتا تھا۔ چھ مربعے کی زمینداری میں جہاں جاتا تھا اپنی رعیت سے حاکموں جیسا سلوک کرتا تھا۔ اگر کوئی بغاوت پر اتر آتا تو زوردار بڑک لگا کر اسے للکارتا تھا۔ کبھی اپنی طاقت سے اور کبھی جاگیردارانہ حکمت سے اس باغی کو کڑی سزائیں دیتا تھا۔ تعلیم کا

صدیوں سے رواج نہ تھا، زندگی کے اہم مسائل لاٹھیوں، رائفلوں سے یا دولت سے حل کیے جاتے تھے لیکن بقول شاعر

سرخ پوش بہ لب بام نظر آید
نہ بزور و نہ بزاری نہ بزری می آید

وہ جو حسینہ نظر آ رہی تھی وہ نہ تو طاقت سے، نہ آہ و زاری سے اور نہ ہی دولت سے حاصل ہو سکتی تھی لہٰذا پہلی بار اس نے دولت بھرے دماغ کی بجائے محبت بھرے دل سے سوچا کہ وہ دشمنی اور داؤ پیچ سے نہیں بلکہ پیار و محبت سے اپنائی جا سکتی ہے۔

اس وقت وہ گلبرگ کی ایک شاندار کوٹھی کے برآمدے میں کھڑا تھا۔ سامنے ڈرائنگ روم کے کھلے ہوئے دروازے سے عمارہ عورتوں کی بھیڑ میں کبھی نظر آتی تھی اور کبھی کوٹھی کے پچھلے حصے میں جا کر نظروں سے اوجھل ہو جاتی تھی۔ برآمدے کی دوسری طرف کوٹھی کے بڑے سے احاطے میں میز اور کرسیاں لگی ہوئی تھیں۔ دور دور کے پنڈوں سے آئے ہوئے زمیندار، پٹواری اور تحصیل دار اپنے اپنے حواریوں کے ساتھ بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ ان میں واجد کا باپ چوہدری جناب علی بھی تھا اور اس کا دشمن یعنی عمارہ کا باپ چوہدری کرم دین بھی تھا۔ دونوں کے شانوں سے ریوالور اور گولیوں کی پیٹیاں لٹک رہی تھی۔ وہ ایک دوسرے سے بہت دور تھے پھر بھی ایک دوسرے کو دیکھ کر اس طرح مونچھوں پر تاؤ دے رہے تھے جیسے وہ ریوالور کی بجائے مونچھوں سے فائر کرنے کا ارادہ کر رہے ہوں۔

وہ برآمدے سے اتر آیا اور لان میں ٹہلنے لگا۔ ٹہلنے کا صرف بہانہ تھا، وہ آہستہ آہستہ کوٹھی کے پچھلے حصے کی طرف جا رہا تھا۔ ایسے وقت جب دو بوڑھے مزید دشمنی کے لیے پر تول رہے تھے، وہ عمارہ کی طرف دوستی کا پہلا قدم اٹھا رہا تھا اور دل ہی دل میں حشمت چاچا کو دعائیں دے رہا تھا جن کی وجہ سے دو دشمنوں کا پورا خاندان اٹھ کر اس کوٹھی میں آ گیا تھا۔ اگر وہ بھی اپنے گھر والوں کے ساتھ یہاں نہ آتا تو کبھی عمارہ کا دیدار نصیب نہ ہوتا اور زندگی میں پہلی بار کسی کو چاہنے اور کسی سے چاہے جانے کی تڑپ پیدا نہ ہوتی۔

کوٹھی کے پیچھے سرونٹ کوارٹرز کے قریب نازنین خالہ سے سامنا ہو گیا۔ توقع کے خلاف ایک دوسرے کو آمنے سامنے دیکھ کر وہ دونوں ٹھٹک گئے تھے۔ نازنین خالہ نے چاروں طرف محتاط نظروں سے دیکھا۔ جب انہیں یقین ہو گیا کہ آس پاس دوست یا دشمنوں میں سے کوئی انہیں دیکھنے والا نہیں ہے تو انہوں نے آگے بڑھ کر واجد کو گلے لگا لیا۔

''میرے بچے! تمہیں اپنے کلیجے سے لگانے کے لیے ایک مدت سے ترس رہی ہوں۔ یہاں کوئی آئے گا تو نہیں؟''

''نہیں۔ میں خوب سوچ سمجھ کر آیا ہوں۔ ابھی وہاں مجرا شروع ہونے والا ہے۔ اس طرف کوئی نہیں آئے گا۔ کیا آپ میرا انتظار کر رہی تھیں؟''

''ہاں میں سوچ رہی تھی کہ کسی طرح تم سے یا تمہارے ابا سے ملاقات ہو جائے۔ خدا کا شکر ہے کہ تم ادھر آ گئے۔ میں چاہتی ہوں کہ جو کل ہونا ہے، وہ آج ہی ہو جائے۔ وہ دیکھو سامنے مالی کا کمرہ ہے، تم وہاں جا کر بیٹھو۔ میں سب انتظام کر چکی ہوں، وہاں کوئی نہیں آئے گا۔ میں ابھی جا کر وہاں عمارہ کو بھیجتی ہوں......''

عمارہ! واجد کا دل بے اختیار دھڑکنے لگا۔ جس کی تلاش میں وہ بھٹکتا ہوا یہاں تک آیا تھا، وہ آپ ہی آپ اس کے قریب پہنچنے والی تھی۔ نازنین خالہ نے پوچھا۔

''تم نے عمارہ کی تصویر دیکھی تھی؟''

''جی، جی ہاں۔ابھی ابھی اسے دیکھا ہے وہ بہت اچھی ہے''۔

''بس تو ٹھیک ہے جو کل ہونا ہے وہ آج ہو جائے۔تم آج ہی اسے لے جاؤ''۔

''جی!'' وہ چونک کر بڑی حیرانی سے اپنی خالہ کو دیکھنے لگا۔خالہ نے پوچھا۔

''تم اس طرح کیا دیکھ رہے ہو؟ کیا انتقام نہیں لوگے؟ آج سے پچیس برس پہلے چوہدری مجھے اٹھا کر لے گیا تھا۔کیا تم اپنی خالہ کا انتقام لینے کے لیے چوہدری کی بیٹی کو اس سے چھین کر نہیں لے جاؤ گے؟''

''آں......ہاں...... لے جاؤں گا مم......مگر یہاں تو چاروں طرف لوگوں کی بھیڑ ہے اگر عمارہ نے شور مچایا تو کیا ہو گا؟''

''تم اس کی فکر نہ کرو۔ میں نے ایسی چال چلی ہے کہ وہ تمہارے قدموں میں لوٹے گی۔تمہاری ہر بات پر آمنا وصدقنا کہے گی۔ میں نے اس کے دماغ میں کیسا زہر گھولا ہے، یہ بتانے کا وقت نہیں ہے۔تم اب جاؤ اور مالی کے کمرے میں اس کا انتظار کرو''۔

یہ کہہ کر نازنین خالہ نے اس کی پیشانی کو چوم لیا پھر تنبیہہ کے انداز میں بولی۔

''دیکھو جتنی جلدی ہو سکے اسے یہاں سے لے کر چلے جانا ہے اگر تم ناکام ہوئے تو اپنے باپ کا غصہ بھی جانتے ہو وہ تمہاری ناکامی برداشت نہیں کریں گے''۔

یہ کہہ کر وہ جلدی جلدی قدم اٹھاتی ہوئی کوٹھی کی جانب چلی گئی۔واجد تھوڑی دیر تک وہاں گم صم کھڑا رہا۔اس وقت اس کی حالت عجیب سی تھی۔ وہ اپنی قسمت پر نازاں تھا کہ عمارہ اسے مل رہی ہے، وہ حیران تھا کہ پلک جھپکتے ہی نازنین خالہ نے اس کے لیے سارے راستے ہموار کر دیئے تھے، وہ پریشان تھا کہ اب آگ اور خون کے دریا سے عمارہ کے ساتھ کس طرح گزر سکے گا۔

وہ آہستہ آہستہ چلتا ہوا مالی کی کوٹھری میں آ گیا اور ایک چارپائی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔اس کے آگے عمارہ کی محبت تھی اور پیچھے برسوں پرانی دشمنی اور نفرتیں تھیں۔

اب وہ محبت اور دیانتداری سے عمارہ کو نہیں اپنا سکتا تھا۔ نازنین خالہ اور چوہدری جناب علی کی نفرتوں کا سہارا لے کر ایک باپ سے جبراً اس کی بیٹی کو چھین سکتا تھا۔

وہ پچیس برس پرانی نفرتوں کی طرف پلٹ گیا۔

پچیس برس پہلے انسان کسی حد تک آسودہ اور خوش حال تھا۔کھانا، کپڑا اور ضروریات زندگی کی دوسری چیزیں قدرے سستی تھی مگر محبت اس وقت بھی مہنگی تھی۔

جہاں زن، زر اور زمین کا جھگڑا ہو وہاں سے محبت کا گزر نہیں ہوتا۔ جناب علی اور کرم دین کے خاندانوں میں پشت ہا پشت سے دشمنی چلی آ رہی تھی۔ دونوں کی زمینیں ایک حد پر آ کر ملتی تھیں اس لیے کبھی زمینوں کے لیے مقدمے بازیاں ہوتی تھیں کبھی نہری پانی کے لیے لاٹھیاں اور رائفلیں چلتی تھیں۔ جب ان جھگڑوں سے بھی قرار نہ آتا تو پھر کسی عورت کے لیے کوئی فساد کھڑا ہو جاتا تھا۔

دونوں زمینداروں کی حویلیوں میں عورتوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا۔کبھی شہنشاہوں کے ہاں گیلری ہوتی ہے جہاں ملک بھر کی حسینائیں ہابی کے طور پر جمع کی جاتی ہیں اور زمیندار کی حویلی ایک بیگار کیمپ ہوتی ہے جہاں کسانوں

کی بہو بیٹیاں خدمت گزاری کے لیے بلائی جاتی ہیں پھر ان کا خون پسینہ نچوڑنے کے بعد انہیں واپس بھیج دیا جاتا ہے۔

جناب علی اور کرم دین کی حویلیوں میں جو خادمائیں آیا کرتیں تھیں ان کا شمار نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ ایک بیمار یا بوڑھی ہو کر جاتی تھی تو دوسری چار اس کی جگہ آجاتی تھیں۔ جس طرح خاندانی منصوبہ بندی کے دفتر میں مرنے والوں کی تعداد کم اور پیدا ہونے والوں کی تعداد زیادہ ہے اسی طرح حویلیوں میں بڑھاپے کی طرف جانے والیاں کم اور بچپن سے جوانی کی طرف آنے والی زیادہ ہوتی تھیں۔ اتنی زیادہ کہ ان کے نام باقاعدہ یاد نہیں رہتے تھے۔ یہ بھی یاد نہیں رہتا تھا کہ کون باپ کی خدمت کے لیے مامور تھی اور کون بیٹے کی خدمت کے لیے مخصوص تھی۔ آقاؤں کی غلطیوں کی وجہ سے بیچاریاں ادھر سے ادھر ہو جاتی تھیں۔ انسان خطا کا پتلا ہے زمیندار بھی خطا کے پتلے تھے۔

اگر یہ بات اپنی اپنی زمینداری تک محدود ہوتی تو جھگڑے فساد کی نوبت نہیں آتی کیونکہ اپنے کھیتوں کی فصل سے بھوک مٹانے کا حق ہر زمیندار کو پہنچتا ہے۔ مگر وہاں اپنی آن اور شان کا سوال تھا کہ کس کے پاس سب سے زرخیز زمین ہے؟ کس کے پاس سب سے زیادہ دولت اور کس کے پہلو میں سب سے زیادہ حسین عورت ہے؟

یہ مقابلہ ہر سال لاہور کی ہیرا منڈی میں ہوا کرتا تھا۔ اس منڈی کی کسی بھی نئی دریافت کے لیے دونوں طرف سے بڑھ چڑھ کر بولیاں دی جاتی تھیں۔ کوئی کسی سے مات کھانا پسند نہیں کرتا تھا۔ بولیاں اس حد تک بڑھ جاتی تھیں کہ دس ہزار کی گڑیا پچاس ہزار میں پڑ جاتی تھی۔ جناب علی ایک ایک پیسہ دانتوں سے پکڑنے کا عادی تھا۔ جب اس نے دیکھا کہ محض آن کی خاطر دولت ضائع ہو رہی ہے تو ایک بار اس نے مقابلے میں کرم دین کو چھوٹ دے دی۔

چوہدری کرم دین نے جیت کے نشے میں یہ نہیں سوچا کہ دشمن آسانی سے شکست کھا کر پیچھے کیوں ہٹ گیا ہے؟ وہ تو اسے اس وقت پتہ چلا جب وہ بازار حسن کی سب سے مہنگی طوائف کے ساتھ سیزن گزارنے کے لیے مری جا رہا تھا۔ راستے میں جناب علی کے مسلح آدمیوں نے اسے روک لیا۔ وہ پہلے سے محتاط نہیں تھا، اس کے پاس صرف ایک ریوالور اور ایک بوڑھا ملازم تھا۔ وہ چاروں طرف سے اٹھی ہوئی رائفلوں کو دیکھتا ہی رہ گیا۔ جناب علی کے آدمیوں نے اس کے ریوالور کو ان لوڈ اور کار کے پہیوں کو پنکچر کیا، اس کی دولت سے خریدی ہوئی طوائف کو اٹھا کر جیپ میں ڈالا اور راستے کی دھول اڑاتے ہوئے نظروں سے اوجھل ہو گئے۔

یہ توہین ناقابل برداشت تھی۔ اگر اس کے ساتھ بھی مسلح آدمی ہوتے تو وہ ایک طوائف کے لیے خون کی ندیاں بہا دیتا کیونکہ اس وقت وہ محض ایک طوائف نہیں تھی، اس کا غرور تھی، دشمن کے مقابلے میں جیتنے والا ایک تمغہ تھی۔ زمینداروں کی شان و شوکت اس کی زمینوں سے یا ان داشتاؤں کی تعداد سے پہچانی جاتی ہے اور جناب علی نے اس کی پہچان پر ڈاکہ ڈالا تھا۔ اس وقت کرم دین مجبور تھا، کوئی قانونی کارروائی بھی نہیں کر سکتا تھا کیونکہ وہ ایک عورت کا خریدار تھا جو چور دروازے سے خریدی گئی تھی لہٰذا قانون کی نظروں میں وہ خود بھی ایک مجرم تھا اس لیے صبر کر کے رہ گیا۔

یہ خبر دور دور کے زمینداروں تک پہنچ گئی کہ چوہدری جناب علی سب سے خوبصورت ہیرے کو کرم دین کے پہلو سے اڑا کر لے گیا ہے۔ اس کے حواریوں نے مشورہ دیا کہ جناب علی سے انتقام لینے کے لیے اس کی حویلی سے کسی حسین لڑکی کو اغوا کیا جائے۔ لیکن وہ کوئی اونچا شکار کرنا چاہتا تھا۔ حویلیوں میں غریب کسانوں کی بہو بیٹیاں ہوتی ہیں خواہ وہ کتنی ہی خوبصورت ہوں ان کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔ جو چیز مفت مل جائے وہ چرائی نہیں جاتی۔ وہ کوئی قیمتی نایاب ہیرا اٹھا کر لانا چاہتا تھا جو اس طوائف کی ٹکر کا یا اس سے بھی زیادہ مہنگا ہو۔

ایک سال تک وہ صبر کرتا رہا۔اس دوران جناب علی کی بیوی کچھ عرصے تک بیمار رہ کر اس دنیا سے ہمیشہ کے لیے رخصت ہوگئی۔ان دنوں واجد پانچ برس کا تھا۔وہ مرنے کے بعد جناب علی کا نام لیوا اور جائیداد کا وارث چھوڑ گئی تھی۔اگر وہ دوسری شادی نہ کرتا تو کوئی فرق نہ پڑتا کیونکہ عورتیں تو ہر وقت ہوس کے دسترخوان پر موجود رہتی تھیں لیکن اس کی چھوٹی سالی یعنی واجد کی خالہ نازنین بے حد حسین تھی۔ایسی حسین عورت کسی دوسرے کی آغوش میں جائے یہ جناب علی کو منظور نہیں تھا۔اس نے اپنے سسر کے پاس اپنی سالی کے لیے پیغام بھیجا۔وہ ایک آزمودہ داماد تھا انکار کی گنجائش نہیں تھی اس لیے رشتہ منظور ہوگیا اور نکاح کی تاریخ مقرر ہوگئی۔

نکاح کے دن جناب علی بڑی شاندار بارات لے کر گیا۔اس کی حویلی سے سسرالی پنڈ تک ڈھول تاشے بجتے رہے اور بارات میں شریک ہونے والے گبرو جوان لہک لہک کر گیت گاتے اور بھنگڑا ناچتے رہے۔سسرال والوں نے بھی خوب رونق لگائی تھی۔اپنے چھوٹے سے پنڈ کو دلہن کی طرح سجا دیا تھا۔دلہن کی ڈیوڑھی سے پچاس گز کے فاصلے تک راستے کے اطراف رائفل بردار جوان کھڑے ہوئے تھے اور سلامی کے طور پر دنادن رائفلوں کی زبان سے دلہا کو خوش آمدید کہہ رہے تھے۔راستے کا ایک موڑ کاٹ کر جب بارات دروازے پر پہنچی تو اچانک جناب علی کو خطرے کا احساس ہوگیا۔اس کے سامنے کھلے دروازے پر چوہدری کرم دین دونوں ہاتھ کمر پر رکھے تنہا کھڑا تھا۔اسے دیکھتے ہی ڈھول تاشوں کی آواز مرگئی۔شادی کی جگہ موت کی سی خاموشی چھاگئی۔

چوہدری کرم دین نے ایک بڑک لگا کر کہا۔

''اوئے جنابے! یہاں سے وہاں تک رائفلیں گن لے۔یہ سب میرے بندے ہیں، میرے ایک اشارے پر تیرا قیمہ بنا دیں گے۔میں ہمیشہ اونچا شکار کھیلنے کا عادی ہوں۔تیری طرح ذلیل نہیں ہوں کہ ایک بازاری عورت پر ہاتھ ڈالوں۔تو جس شریف زادی کو بیاہنے آیا ہے، میں اسے تیری نگاہوں کے سامنے لے جاؤں گا۔بول اپنے جوانوں سے کہ وہ میرا راستہ روک لیں''۔

جناب علی نے اپنا سہرا نوچ کر پھینک دیا اور گھوڑی سے اتر کر بولا۔

''چوہدری! تو مجھے نہیں قانون کو للکار رہا ہے۔یاد رکھ تو ایک بازاری عورت کی وجہ سے عدالت تک نہیں پہنچ سکا لیکن میں ایک شریف زادی کو اغوا کرنے اور اس کی بے عزتی کرنے کے جرم میں تجھے کڑی سے کڑی سزا دلا سکتا ہوں''۔

چوہدری کرم دین نے ایک فلک شگاف قہقہہ لگایا۔تھوڑی دیر تک اس کے قہقہوں سے سارا ماحول گونجتا رہا پھر اس نے کہا۔

''بے وقوف میں وہی کھاتا ہوں جسے میں آسانی سے ہضم کر لیتا ہوں۔کل رات میں نے نازنین سے نکاح پڑھوالیا ہے۔وہ ذہنی، جسمانی اور قانونی طور پر میری ہو چکی ہے۔جس طرح میں مری کے راستے سے خالی ہاتھ واپس آگیا تھا اسی طرح تو اپنی اجڑی ہوئی بارات لے کر خالی ہاتھ یہاں سے واپس جائے گا''۔

نازنین کا باپ ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے آہستہ آہستہ چلتا ہوا جناب علی کے پاس آیا اور ہاتھ جوڑ کر بولا۔

''بیٹا! میں مجبور ہوگیا تھا۔چوہدری کرم دین نے بندوق کے زور پر نکاح پڑھوایا ہے۔جو کچھ بھی ہوا زبردستی میں ہوا۔مگر اب نازو چوہدری سے راضی ہے۔شریف زادیوں کو تقدیر جس کے ہاتھ سونپ دیتی ہے، وہ ساری زندگی اسی کا دم بھرتی ہیں اور کسی دوسرے کا خیال تک دل میں نہیں لاتیں۔میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں یہاں جھگڑا

فساد نہ کرو۔تم بھی میرے داماد ہو میرے غریب خانے میں آؤ۔میری خوشیوں میں شریک ہو جاؤ‘‘۔

اس نے غصے سے جھلا کر کہا’’تمہاری خوشیاں تمہیں مبارک ہوں۔میں یہاں سے برات واپس لے جا رہا ہوں۔اس بے عزتی کے بعد میں کسی کے سامنے سر نہیں اٹھا سکوں گا۔لیکن میری یہ ناکامی کرم دین کو بڑی مہنگی پڑے گی۔میں بہت جلد اس کا یہ قرض چکا دوں گا‘‘۔

یہ کہہ کر وہ گھوڑی پر سوار ہونے لگا۔کرم دین گرج کر کہا۔

’’جناب،رک جا۔پہلے میری برات تیرے سامنے سے گزرے گی تاکہ تجھے بھی معلوم ہو کہ کسی کو بے بس کر کے اس کی عزیز ترین شے چھین کر لے جائی جائے تو دل پر کیا گزرتی ہے‘‘۔

’’جناب علی نے چاروں طرف اٹھی ہوئی رائفلوں کو دیکھا،موت کے دہانے پر کھڑے ہو کر کرم دین کے حکم سے انکار کرنے کی جرأت نہ ہوئی۔وہ گھوڑی سے نیچے اتر آیا پھر ڈھول تاشے بجنے لگے۔تھوڑی دیر بعد دو کہار نازو کی ڈولی اٹھا کر باہر آ گئے۔کرم دین کے آدمی آگے آگے بھنگڑا ناچ رہے تھے اور پیچھے پیچھے نازو کی ڈولی جناب علی کے سامنے سے گزر رہی تھی۔

توہین کے احساس سے آدمی مر نہیں جاتا۔مجبوراً صبر کرتا ہے اور انتقام لینے کے لیے اپنی باری کا انتظار کرتا ہے۔جناب علی نے بھی قسم کھائی کہ وہ کرم دین سے ایسا عبرتناک انتقام لے گا کہ اس کی آئندہ نسلیں بھی جناب علی کا نام سن کر تھرائیں گی۔

پھر مناسب موقع کا انتظار ہونے لگا۔چوہدری کرم دین بہت محتاط تھا وہ اپنی کسی کمزوری سے اسے فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں دے رہا تھا۔تین سال بعد اس کی پہلی بیوی سے عمارہ پیدا ہوئی۔عورت کی عزت کو کھلونا سمجھنے والے بیٹی کے وجود کو اپنے لیے گالی سمجھتے ہیں۔کرم دین عمارہ کی پیدائش پر جھلا گیا۔اس نے اپنی بیوی کو ایک ہزار گالیاں دے ڈالیں۔ایک ماہ تک حویلی میں نہیں آیا۔نازنین کو لے کر دوسرے مکان میں چلا گیا۔جناب علی نے جب عمارہ کے متعلق سنا تو خوشی سے اچھل کر کہا۔

’’آہا۔اب چوہدری منہ کی کھائے گا۔اب میری باری ہے وہ نازنین کو مجھ سے چھین لے کر گیا تھا اگر میں نے اس کی بیٹی کو بھری جوانی میں نہ اٹھایا تو میرا نام چوہدری جناب علی نہیں......‘‘

ابھی عمارہ کے جوان ہونے میں دیر تھی۔برسوں کا انتظار اور صبر و تحمل کی ضرورت تھی۔دشمن کو ذلت کی موت مارنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کرنا پڑتا ہے۔صرف انتظار ہی نہیں بلکہ سوچ سمجھ کر رفتہ رفتہ اپنی سازش کو دشمن کی دہلیز تک پہنچانا پڑتا ہے اور دشمن کی دہلیز پر اس کا ایک مہرہ تھا،وہ نازنین تھی،جس سے سالی اور بہنوئی کا پرانا رشتہ تھا۔پرانے رشتوں کی محبت اور مروت نہیں جاتی۔

نازنین کی بہن مر گئی لیکن بہن کا بیٹا واجد زندہ سلامت تھا جسے گلے سے لگانے کو وہ ترستی تھی مگر دو زمینداروں کی دشمنی نے واجد تک پہنچنے کے تمام راستے بند کر دیئے تھے۔

شروع شروع میں نازنین نے جناب علی کا ساتھ دینے سے انکار کر دیا کیونکہ وہ چوہدری کرم دین کے پاس بہت خوش تھی۔ایک سال بعد عمارہ کی ماں چل بسی تھی اس لیے وہ تنہا چوہدرانی بن کر حویلی میں راج کر رہی تھی۔دولت اس کے قدموں میں تھی،چوہدری اس کا دیوانہ تھا۔اس کی رعیت میں جتنے بھی لوگ تھے ان کی تقدیریں چوہدرانی کے ایک اشارے پر بنتی اور بگڑتی رہتی تھیں۔پھر وہ کیوں جناب علی کی باتوں میں آ کر اپنے نصیب کی آپ دشمن بن جاتی؟

اس لیے اس نے جناب علی کا ساتھ نہیں دیا۔

پھر رفتہ رفتہ اس کا مزاج بدلنے لگا۔ عمارہ جب بھی کرم دین کے سامنے آتی تو وہ اسے جھڑکیاں دے کر بھگا دیتا تھا اور جھنجھلا کر نازنین سے کہتا تھا۔

''تم کب تک مجھے یونہی بہلاتی رہو گی۔ مجھے ایک بیٹے کی ضرورت ہے، بیٹا پیدا کرو، نہیں تو میں دوسری لے آؤں گا۔ نازنین واقعی اسے بہلا رہی تھی اور پیروں فقیروں کے ہاں جا کر تعویز گنڈے کر رہی تھی مگر گاؤں کی ایک تجربے کار دائی نے بتا دیا تھا کہ وہ بانجھ ہے اس سے اولاد نہیں ہوگی۔

یہ سنتے ہی کرم دین چار ماہ کے بعد ایک نئی لڑکی بیاہ کر لے آیا۔ عورت اپنے مرد کی داشتاؤں کو تو برداشت کر لیتی ہے مگر نکاح بیاہی سوکن کو کبھی برداشت نہیں کرتی۔ بس یہیں سے نازنین کا دل کھٹا ہو گیا۔ اسے اپنی وفاداری اور کرم دین کی پچھلی زیادتی یاد آنے لگی۔ ایک تو اس نے جبراً بندوق کے زور پر نکاح قبول کروایا تھا اور جبکہ وہ جسم و جان سے اس کی ہو چکی تھی تو وہ محض ایک بیٹا پیدا نہ کرنے کے جرم میں اس کے اوپر سوکن لے آیا تھا۔

وہ غصے سے تلملاتی رہی، کبھی عمارہ پر غصہ اتارتی اور کبھی اپنی سوکن سے جھگڑتی رہتی۔ جناب علی کو اپنے مخبر کے ذریعے وہاں کی خبریں ملتی رہتی تھیں۔ وہ مخبر کرم دین کی حویلی کا ایک ملازم بشیرا تھا۔ جناب علی نے بشیرا کے ذریعے نازنین کو کہلا بھیجا کہ جھنجھلانے سے تمہاری بگڑی ہوئی تقدیر نہیں بنے گی۔ کرم دین مطلب کا بندہ ہے، صرف تمہارے حسن و شباب کا رسیا ہے، شباب ڈھلتے ہی تمہیں حویلی کے ایک کونے میں بٹھا کر بھول جائے گا۔ اگر تم اس کا دماغ درست کرنا چاہتی ہو تو عمارہ سے محبت کرو۔ اتنی محبت کرو کہ وہ تمہارے اشاروں پر ناچنے لگے۔ وہ ظالم باپ کی ستائی ہوئی ہے تمہاری محبت پا کر وہ تمہارے ہاتھوں سے زہر بھی پینے کے لیے تیار ہو جائے گی''۔

نازنین نے ایسا ہی کیا۔ وہ رفتہ رفتہ عمارہ کو اپنی محبت کا میٹھا زہر پلانے لگی۔ جیسے جیسے عمارہ بچپن سے جوانی کی طرف بڑھتی گئی، نازنین سے اس کی محبت اور عقیدت بھی بڑھتی گئی۔ باپ نے اسے مدرسے میں نہیں پڑھایا تھا اور نہ ہی حویلی میں بٹھا کر پڑھانے کے لیے کوئی ماسٹر رکھا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکیاں پڑھ لکھ کر چالاک ہو جاتی ہیں، انہیں ہزار پردوں میں رکھو پھر بھی چٹھیاں لکھ کر عشق بازی کرتی ہیں لہٰذا عمارہ کو جاہل رہنا چاہیے۔ وقت آنے پر وہ بیٹی کو جس کے پلے باندھے گا اسی کے ساتھ وہ بے زبان گائے کی طرح چلی جائے گی۔

لیکن نازنین اسے ایسا سبق پڑھا رہی تھی جو کتابیں نہیں پڑھا سکتی تھیں۔ جوانی میں خواب بھی بدل جاتے ہیں اور خیالات بھی۔ انہی کی مناسبت سے عمارہ کو عشق و محبت کی داستانیں سنایا کرتی تھی۔ ایسی داستانیں جن میں باپ ظالم ہوتا تھا اور بیٹی مظلوم۔ وہ اپنے محبوب سے ملنا چاہتی تھی لیکن باپ اس کے راستے کا پتھر بن جاتا تھا۔ کہانی سنانے کے دوران کسی خوبرو عاشق کا ذکر آتا تو نازنین چٹخارے لے کر کہتی ''ہائے ہائے وہ ایسا خوبصورت تھا جیسے واجد ہے۔ تم واجد کو دیکھو گی تو بس دیکھتی ہی رہ جاؤ گی۔ میں کسی دن تمہارے ابا سے چوری اس کی تصویر منگواؤں گی۔ تم دیکھنا وہ ایک شہزادہ معلوم ہوتا ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی کہ وہ لڑکی جس سے محبت کرتی تھی وہ نوجوان دشمن قبیلے کے سردار کا بیٹا تھا''۔

کہانی ایسے نفسیاتی انداز میں سنائی جاتی کہ عمارہ کی نگاہوں کے سامنے کہانی کا ہر کردار مجسم ہو جاتا تھا۔ ہر کہانی کا ولن اسے اپنے باپ کی صورت میں نظر آتا تھا اور ہیرو کا تصور کرتے وقت واجد کی خیالی تصویر سامنے آ جاتی تھی۔

کچھ دنوں کے بعد نازنین نے واجد کی تصویر منگوا کر چپکے سے اسے دے دی۔ تصویر دیکھتے ہی کہانیوں کے

تمام شہزادے پھیکے پڑ گئے۔ جتنے رازدارانہ طریقے سے وہ تصویر آئی تھی اتنے ہی رازدارانہ انداز سے واجد اس کے دل میں آ کر بیٹھ گیا اور اس کے دماغ کی سادہ تختی پر محبت کی ایک نئی کہانی لکھنے لگا۔

اب وہ تھی اور واجد کی تصویر تھی۔ جب بھی اسے تنہائی نصیب ہوتی وہ اپنے صندوق سے اسے نکال کر دیکھنے لگتی۔ رات کو بستر پر جب تک جاگتی اسے دیکھتی رہتی۔ نیند آ جاتی تو اسے دھڑکتے ہوئے سینے سے لگا کر سو جاتی۔

ایک رات نازنین نے پوچھا ''واجد سے ملو گی؟''

اس نے شرما کر منہ چھپا لیا۔

''دیکھو میں ہزار بار تمہیں سمجھا چکی ہوں کہ مجھے سوتیلی ماں نہ سمجھو۔ میں تمہاری سہیلی ہوں''۔

''آپ...... آپ بہت اچھی ہیں''۔

''اگر میں اچھی ہوں تو مجھ سے اپنے دل کی بات کیوں چھپاتی ہو؟ کیا مجھ پر بھروسہ نہیں ہے؟''

عمارہ نے بڑی عقیدت سے اس کا ہاتھ تھام کر کہا۔

''آپ پر بھروسہ نہیں کروں گی تو کس پر کروں گی۔ اس دنیا میں میرا اور کون ہے؟''

''ہاں میرے سوا تمہارا کوئی نہیں ہے۔ باپ کتنا ظالم ہے وہ تم دیکھ رہی ہو۔ یہ کتنی عجیب سی بات ہے کہ میں سوتیلی ہوں مگر سگوں سے زیادہ چاہتی ہوں، وہ سگا ہے لیکن سوتیلوں کی طرح تم سے نفرت کرتا ہے۔ تم بہت بدنصیب ہو عمارہ!''

وہ اپنی بدنصیبی پر ہمیشہ روتی اور کڑھتی رہتی تھی۔ اس وقت بھی اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ نازنین نے اس کی ٹھوڑی پکڑ کر کہا۔

''پگلی کہیں کی۔ روتی کیوں ہو؟ میں جو تمہارے ساتھ ہوں۔ میری بات مانو واجد سے شادی کر لو، تمہاری زندگی سنور جائے گی۔ وہ خوبصورت ہے، دولت مند ہے، تمہارے لیے زندگی کی ساری خوشیاں خرید سکتا ہے۔ بولو اس سے ملو گی؟''

وہ ہولے سے بولی ''مم...... مجھے ڈر لگتا ہے۔ ابا کو معلوم ہو گیا تو وہ جان سے مار ڈالیں گے''۔

''جب تمہارے ساتھ تمہاری زندگی کا محافظ ہو گا تو تمہارے دل سے سارا ڈر نکل جائے گا۔ واجد تمہیں اپنے ساتھ لے جائے گا اور تم سے نکاح پڑھائے گا۔ اس کے بعد تمہارے ابا تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگا سکیں گے۔ تم حشمت بیگ کو جانتی ہو، وہ جو اپنے کپڑوں کی مل کے لیے یہاں کپاس کا سودا کرنے آتے ہیں وہ چوہدری جناب علی سے بھی کپاس کی فصل کا سودا کرتے ہیں۔ دونوں زمینداروں سے ان کے کاروباری تعلقات ہیں۔ انہوں نے اگلے ہفتے اپنی بیٹی کی شادی میں ہمیں لاہور بلایا ہے۔ ادھر سے جناب علی اور واجد بھی آئیں گے۔ میں موقع دیکھ کر تمہیں واجد سے ملاؤں گی یا جناب علی سے کہوں گی کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ لے جا کر واجد کے ساتھ تمہارا نکاح پڑھا دے''۔

''مجھے ڈر لگتا ہے''۔

''پھر وہی ڈر، کیا تم سمجھتی ہو کہ میں تمہیں تباہی کی طرف لے جاؤں گی؟''

''نہیں۔ آپ میری بہت اچھی امی ہیں۔ ابا مجھ سے دشمنی کرتے ہیں لیکن آپ کبھی مجھ سے دشمنی نہیں کر سکتیں۔ میں یہ سوچ کر ڈرتی ہوں کہ نہ جانے وہ لوگ مجھ سے کیسا سلوک کریں گے''۔

''اتنا اچھا سلوک کریں گے کہ تم وہاں سے واپس آنا بھول جاؤ گی۔ تمہارے ابا خواہ مخواہ جناب علی کے دشمن

بن گئے ہیں مگر جناب علی تمہیں بیٹی سمجھ کر محبت کرتا ہے۔ وہ تمہیں آنکھوں میں بٹھائے گا، دل میں جگہ دے گا اور واجد تو ہمیشہ تمہیں اپنے سینے سے لگا کر رکھے گا اور اس طرح پیار کرے گا......''

نازنین نے اسے سینے سے لگا کر چوم لیا۔ وہ پلنگ پر لیٹے ہی لیٹے شرم سے دوہری ہوگئی۔

سازش کتنی دھیمی، کتنی میٹھی اور کتنی محبت میں ڈوبی ہوتی ہے۔ یہ ایک ان پڑھ، نادان اور معصوم دیہاتی لڑکی نہیں جانتی تھی۔ خوابوں سے کون نہیں بہلتا؟ وہ بھی بہل رہی تھی۔

عشقیہ کہانیوں کے چکنے راستے پر کون نہیں پھسلتا؟ وہ بھی پھسل رہی تھی۔ انجام سے بے خبر۔

O☆O

مالی کے کمرے میں روشنی نہیں تھی کوٹھی کے جلتے بجھتے قمقموں کی چھچھلتی ہوئی روشنی وہاں تک پہنچتے پہنچتے دم توڑ رہی تھی۔ اس نیم تاریکی میں واجد سر جھکائے چارپائی پر بیٹھا ہوا تھا۔

دور کوٹھی کے اگلے حصے سے ہارمونیم اور طبلے کی آوازیں آرہی تھی۔ گھنگھروؤں کی جھنکار اور نغمے کی ڈوبتی ابھرتی لے میں کوئی بائی جی مجرا پیش کر رہی تھی۔ واجد ایسی محفلوں کا شوقین تھا۔ ناچ رنگ اور شراب و شباب کے نشے میں ڈوبے رہنے کی عادتیں اسے ورثے میں ملی تھیں۔ اس کے خاندان میں بھی تعلیم حاصل کرنے کا دستور نہیں تھا۔ ان کے ہاں کتابیں پڑھا کر عمر ضائع کرنے کی بجائے زراعت کی عملی تعلیم دی جاتی تھی۔ زرخیز اور بانجھ زمینوں کی شناخت، فصلوں کی بوائی کٹائی کے طریقے، ایک کسان کے پسینے سے کتنے کنال زمین کی سینچائی ہوسکتی ہے، کھیت مزدوروں کو آدھا پیٹ کھلا کر کس طرح زندہ رکھا جاتا ہے اور کس طرح ان کی بہو بیٹیوں کو مسل کر رکھا جاتا ہے تاکہ وہ اپنی عزت دار بہو بیٹیوں سے آنکھیں ملا کر باتیں نہ کرسکیں۔ جب تک انسان دوسروں کو نیچا نہ رکھے خود کو اونچا نہیں کر سکتا۔ غرضیکہ اس ماحول میں ایسی تعلیم دی جاتی تھی جو کتابوں اور درسگاہوں سے کبھی نہیں ملتی۔

لیکن واجد کے دل میں ایک ذرا سی شرافت کہیں سے بھولے بھٹکے آگئی تھی۔ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کبھی مولوی کے گھر میں شیطان پیدا ہوتا ہے اور کبھی شیطان کے گھر میں مولوی۔ اس کی نیک نیتی دور دور تک مشہور تھی کہ وہ پرائی بہو بیٹیوں کے سامنے سے نظریں جھکا کر گزر جاتا ہے۔ نہ کسی کو چھیڑتا ہے، نہ کسی سے بات کرتا ہے۔ اتنی بڑی حویلی میں جہاں رنگا رنگ لڑکیوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا وہاں کوئی کھب جانے والی ہوگی مگر وہ کسی کی آرزو نہیں کرتا تھا۔

چوہدری جناب علی نے جب بیٹے کو لڑکیوں سے کتراتے دیکھا تو تشویش پیدا ہوئی۔ نر بچہ جوانی میں پہچانا جاتا ہے، کہیں بیٹے کے روپ میں وہ بیٹی کی خصلتیں لے کر تو نہیں آیا ہے؟

کسی نے کہا ایسی بات نہیں ہے دراصل واجد نے لنگوٹ باندھ رکھی ہے، صبح و شام اکھاڑے میں جاتا ہے اب کے سال دنگل میں حصہ لینے کے لیے لاہور جائے گا۔ جناب علی نے جھلا کر کہا۔

''اتار دو اس کی لنگوٹ۔ زمیندار کا بیٹا ہو کر پہلوان بن رہا ہے الو کا پٹھا......''

حکم حاکم مرگ مفاجات کے مصداق الو کے پٹھے کی لنگوٹ اتار دی گئی۔ اسے رنگیلے اور زندہ دل لوگوں کی صحبت میں بٹھایا گیا۔ جب ان کی رنگین اور سنگین باتیں سن کر اس کی طبیعت میں ترنگ آنے لگی تو اسے کچھ دنوں کے لیے تجربہ کار دوستوں کے ساتھ لاہور کی رنگین گلیوں میں بھیج دیا گیا۔ زمینیں کس طرح خریدی جاتی ہیں وہ بچپن میں ہی سیکھ چکا تھا، عورت کس طرح خریدی جاتی ہے وہ جوانی میں سیکھنے لگا۔

جناب علی کا مقصد یہ نہیں تھا کہ اس کی دولت کوٹھے پر ضائع ہو بلکہ وہ صرف اتنا چاہتا تھا کہ شیر کے منہ کو خون کا چسکا لگ جائے اس کے بعد کوٹھے کا راستہ بند کر دیا جائے گا۔ ان کی اپنی کوٹھی میں عورتوں کی کمی نہیں تھی۔ بعض کوٹھی اور کوٹھے میں بس اتنا ہی فرق ہوتا ہے کہ کوٹھے سے تعلیم حاصل کی جاتی ہے اور کوٹھی میں اس تعلیم سے ساری زندگی استفادہ کیا جاتا ہے۔

لیکن واجد اپنے باپ کی امیدوں کے مخالف جا رہا تھا۔ کوٹھے کی رنگینیوں میں ڈوبنے کے باوجود پنڈ کی شریف بہو بیٹیوں سے بدکتا تھا۔ اس کی پرہیزگاری جناب علی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ اس نے غصے سے کہا۔

''اس گدھے سے جا کر کہو اگر مولوی بن کر رہے گا تو چوہدری کرم دین سے انتقام کیسے لے گا۔ اس کی بیٹی جوان ہو گئی ہے۔ وہ کسی کے ساتھ چلی گئی تو میں، اس مردود کو بیٹا ماننے سے انکار کروں گا''۔

باپ کا پیغام بیٹے تک پہنچا دیا گیا بلکہ عمارہ کی ایک تصویر بھی اسے دے دی گئی کہ وہ اپنے شکار کو اچھی طرح پہچان لے۔ یہ تصویر بس یونہی سی تھی کسی میلے میں اناڑی فوٹو گرافر کی اتاری ہوئی تھی۔ روشنی اور سائے کے امتزاج سے تصویر کے حسن کو جس طرح نکھارا جاتا ہے وہ بات اس میں نہ تھی پھر بھی چہرے کے تیکھے نقوش خمار آلود آنکھوں کی کشش اور جسم کی شادابیاں واضح تھیں۔ اگر یہ سب کچھ نہ بھی ہوتا تو تب بھی واجد اپنی توبہ توڑ دیتا کیونکہ وہ دشمن کی بیٹی تھی۔ خاندانی روایات کے مطابق انتقام لینا اس کا سب سے پہلا فرض تھا اور فرض کی ادائیگی میں بعض اوقات نیکی اور بدی کی تمیز نہیں کی جاتی۔

تصویر کو دیکھ کر اس نے سوچا کہ لڑکی حسین ہے، اپنے معیار کی ہے، اس کے ساتھ تھوڑا سا وقت بھی گزارا جا سکتا ہے اور اسے بھولنے کا وقت آئے تو جس طرح طوائفوں کو بھلا دیا جاتا ہے اسے بھی بھلایا جا سکتا ہے لیکن عین نگاہوں کے سامنے آتے ہی گونگی مورت اور بولتی صورت کو دیکھنے کا فرض واضح ہو گیا۔

وہ چارپائی سے ہڑبڑا کر کھڑا ہو گیا۔ وہ عین نگاہوں کے سامنے آ گئی تھی۔ دروازے پر پہلے ایک تاریک سا ہیولا نظر آیا۔ پھر کوٹھی کے سرخ قمقمے روشن ہوئے۔ عمارہ کا چہرہ انار دانے کی طرح کھل گیا۔ وہ چھینٹ کی چادر میں لپٹی سر جھکائے کھڑی تھی۔ سرخ قمقمے بجھ گئے، سبز روشن ہوئے، اس کا چہرہ ناگن کی چکنی جلد کی طرح سبزی مائل ہو گیا۔ وہ جھجکتی ہوئی ایک قدم آگے بڑھی اور کمرے کے اندر یوں آ گئی جیسے کوئی ناگن خاموشی سے ڈسنے کے لیے رگ جاں تک پہنچ گئی ہو۔

سبز قمقمے بجھ گئے، زرد روشن ہو گئے۔ شگفتہ چہرے پر یاسیت کا رنگ چھا گیا۔ اداس کلی، زندگی کے تیز جھکڑوں سے سہمی ہوئی چڑیا۔ بچپن کے خول سے نکل کر جوانی کے طلسم ہوشربا میں بھٹکنے والی نادان لڑکی۔ کتنے ہی رنگ اس کے چہرے پر آ رہے تھے اور اس کے حالات زندگی کی عکاسی کر رہے تھے۔

فوٹو گرافر نے خاک تصویر اتاری تھی۔ وہ ساری زندگی کوشش کرتا تب بھی جلتے بجھتے رنگوں کی دھوپ چھاؤں میں ایسی حسین لڑکی پیش نہیں کر سکتا تھا۔ واجد دم بخود تھا اور پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھے جا رہا تھا۔ یہ خاموشی چند لمحوں کی تھی پھر اچانک ہی عمارہ آگے بڑھ کر فرش پر بیٹھ گئی اور اس کے قدموں سے لپٹ کر فریاد کرنے لگی۔

''مجھے بچا لیجیے۔ خدا کے لیے میرے باپ کے ظلم وستم سے مجھے بچا لیجیے۔ میں بدنصیب ہوں۔ میں نے زندگی میں کوئی خوشی نہیں دیکھی۔ میں اپنی خوشیوں کی تلاش میں آپ کے قدموں میں آ گئی ہوں۔ میں ساری زندگی آپ کی کنیز بن کر رہوں گی اور...... اور...... اور......''

جیسے ریکارڈ کی سوئی پھنس گئی ہو، وہ اور اور کی تکرار میں الجھ گئی۔ واجد نے جھک کر اس کے گداز بازوؤں کو تھام لیا اور پوچھا۔

''اور کیا۔ آگے کہو، تم رک کیوں گئیں؟''
وہ اپنی ہتھیلیوں سے آنسو پونچھتے ہوئے بولی
''آپ......آپ ذرا ٹھہریئے میں امی سے پوچھ کر آتی ہوں''۔
واجد نے حیرت سے پوچھا۔
''کیا پوچھ کر آؤ گی؟''
''وہ انہوں نے سب کچھ سمجھا دیا تھا کہ آپ کے قدموں سے لپٹ کر مجھے کیا کہنا چاہیے۔ میں ابھی پوچھ کر آتی ہوں۔
''میں بتاتا ہوں۔ انہوں نے کہا ہوگا کہ تمہاری فریاد سن کر میں تمہیں قدموں سے اٹھاؤں گا اور دل میں بٹھا لوں گا۔ دیکھ لو، تم میرے دھڑکتے ہوئے دل کے قریب آ گئی ہو''۔
جیسے کوئی پنچھی پہلی بار جال میں پھنس کر کانپتا ہے اسی طرح وہ ہولے ہولے اس کی آغوش میں لرز رہی تھی۔
''تم بہت اچھی ہو عمارہ۔ بہت اچھی اور خوبصورت ہو۔ تمہارے بھولپن نے مجھے خرید لیا ہے۔ میں اپنے بزرگوں کی دشمنی اور ان کی آپس کی نفرتوں کو بھول کر تمہیں محبت سے اپنا رہا ہوں تم میرے ساتھ چلو گی؟''
اس نے اثبات میں سر ہلایا۔
''تم میرے لیے اپنے باپ کو اپنے رشتہ داروں اور اپنے گاؤں کو چھوڑ دو گی؟''
''ہاں۔ آپ مجھے چھوڑ تو نہیں دیں گے؟''
''نہیں۔ میں آخری سانس تک تمہارا ساتھ نہیں چھوڑوں گا جب میں مر جاؤں گا تو......''
عمارہ نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر کہا ''تو میں بھی مر جاؤں گی''۔ واجد نے اپنے منہ پر رکھی ہوئی گلابی ہتھیلی کو چوم لیا۔ تھوڑی دیر تک وہ ایک دوسرے کی محبت و قربت سے سرشار ہوتے رہے پھر کمرے کے باہر کسی کی آہٹ سن کر چونک گئے۔ نازنین نے دروازے پر آ کر کہا ''کیا تم لوگوں کو خطرے کا احساس نہیں ہے۔ چلو نکلو یہاں سے پچھلے گیٹ پر بشیرا انتظار کر رہا ہے وہ تمہیں جہاں لے جائے چلے جانا......''
واجد نے کہا ''لیکن میں تو عمارہ کو اپنے ایک دوست کے ہاں لے جانا چاہتا ہوں''۔
''نہیں!'' نازنین نے سخت لہجے میں کہا ''تمہارے ابا نے کہلا بھیجا ہے کہ تم دونوں بشیرے کے ساتھ جاؤ گے۔ رائل پارک میں تمہارے کہیں رہنے کا انتظام ہو چکا ہے۔ وہ صبح آ کر تم سے ملیں گے، تم دونوں کی حفاظت کرنا ان کا فرض ہے۔ وہ جیسا کہتے ہیں ویسا ہی کرو۔ چلو جلدی یہاں سے نکل جاؤ......''
واجد نے عمارہ کا ہاتھ تھام لیا۔ کہیں بھی وہ رات گزارنی تھی اور دوسری صبح اپنی زمینوں پر چلے جانا تھا لہٰذا اس نے نازنین خالہ سے بحث نہیں کی چپ چاپ عمارہ کو لے کر وہاں سے نکل گیا۔
رات گیارہ بجے تھے۔ لکشمی چوک اور رائل پارک میں اچھی خاصی چہل پہل تھی۔ تماش بین سینما گھروں کا طواف کر رہے تھے۔ کچی عمر کے چھوکرے جو گھروں سے بھاگ کر فلموں میں ہیرو بننے آتے تھے، وہ ہوٹلوں میں برتن دھو رہے تھے۔ ان میں کچھ ایسے تھے جو ہوٹلوں کے باہر بیٹھے ہوئے فلاپ فلموں کے پروڈیوسروں اور ڈائریکٹروں کی چمپی کر رہے تھے اور کچھ لڑکے رائل پارک کے دفتروں میں سوڈے کی بوتلیں پہنچا رہے تھے۔ رائل پارک کے دفتروں میں

گھروں سے بھاگ کر آنے والی لڑکیاں بھی تھیں، اشتہاری فلموں میں چانس لینے والی ماڈل گرلز بھی اور ادھیڑ عمر کی ایسی عورتیں جو ہیرا منڈی میں غیر قانونی طور پر دلالہ کہلاتی تھیں لیکن فلمی دنیا میں قانونی طور سے انہیں ایکسٹرا سپلائر کہا جاتا تھا۔

ان دفتروں میں عورتوں کی کھنکتی ہوئی ہنسی اور مردوں کے گونجتے، گرجتے ہوئے قہقہے گڈ مڈ ہو رہے تھے۔ سوڈے کی بوتلیں کھل رہی تھیں۔ کھلی ہوئی کھڑکیوں سے شراب کے بھبکے اور پان کی پیکیں آ رہی تھیں۔ وہیں ایک گلی کے آخری دفتر میں عمارہ اور واجد اپنی محبت کی پہلی رات گزار رہے تھے۔

کمرے میں اندھیرا تھا۔ اس اندھیرے میں کبھی کبھی ان کی میٹھی سرگوشیاں ابھرتی تھیں اور پارک کے کسی نازک موڑ پر پہنچ کر گم ہو جاتی تھیں۔ بند دروازے کے باہر بشیرا اپنے بھائی فضلے کے ساتھ بیٹھا ہوا باتیں کر رہا تھا۔

فضلا پانچ برس پہلے نوکری کی تلاش میں پنڈ چھوڑ کر یہاں آیا تھا اور تب سے فلم کے اس دفتر میں چپراسی کا کام کر رہا تھا۔ اس کی رہائش اسی دفتر میں تھی۔ ان دنوں اس کا صاحب آؤٹ ڈور شوٹنگ میں گیا ہوا تھا، اس لیے میدان خالی دیکھ کر اس نے بشیرے کو اجازت دے دی تھی کہ وہ کسی بھی چھوکری کو یہاں لا سکتا ہے۔ تھوڑی دیر بعد فضلے نے حقے کا کش لگا کر پوچھا ''تو نے کہا تھا کہ وہ بڈی (عورت) تیری ہے پھر وہ زمیندار کا بیٹا وہاں کیا کر رہا ہے؟''

بشیرے نے جواب دیا'' وہ بڈی میری ہے۔ جب پولیس یہاں آئے گی تو مجھے یہی بیان دینا ہوگا'' فضلے نے لاپروائی سے کہا'' یہاں پولیس کبھی نہیں آئے گی۔ یہاں جتنے دفتر والے ہیں سب تھانے والوں کو کھلاتے پلاتے رہتے ہیں اس لیے یہاں کبھی پولیس کا چھاپہ نہیں پڑتا''۔

''وہ اور بات ہے''۔ بشیرے نے کہا ''اپنا چوہدری جناب علی دور تک پہنچا ہوا ہے، یہاں کے تھانے دار سے سب باتیں کر لی ہیں۔ ابھی یہاں پولیس آئے گی۔ تجھے تو کسی بات کی فکر نہیں ہونا چاہیے۔ اس کام کے لیے تجھے دو سو روپے دیئے ہیں۔ اگر تجھ پر کوئی مصیبت آئے گی تو چوہدری تجھے اور پیسے دے گا۔ تیری ہر طرح سے مدد کرے گا''۔

فضلے نے حقے کی نے اس کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''تجھے اپنی فکر ہے یا نہیں؟...... وہ زمیندار کا چھوکرا وہاں عیش کر رہا ہے اور تو مفت میں اس لڑکی کے ساتھ بدنام ہو کر جیل جائے گا''۔

''مفت میں نہیں۔ چوہدری مجھے تگڑی رقم دیتا رہتا ہے، آگے بھی دیتا رہے گا اور میں کون سا نیک نام ہوں۔ اتنے بڑے زمیندار کی بیٹی کے ساتھ بدنام ہونا بھی بڑے نصیب کی بات ہے۔ ذرا ٹائم دیکھ، بہت دیر ہوگئی ہے۔ وہ لوگ ہوٹل میں میرا انتظار کر رہے ہوں گے''۔

''یہاں دفتر میں گھڑی نہیں ہے۔ میرے خیال میں ایک بج رہا ہے''۔ بشیرا حقہ چھوڑ کر اٹھ گیا اور دروازے پر دستک دینے لگا۔ اندر سے واجد کی آواز آئی۔

''کون ہے؟''

''میں ہوں بشیرا!''

''بھاگ جاؤ یہاں سے چپ چاپ سو جا''۔

''مالک بہت ضروری کام ہے چوہدری صاحب آپ سے ملنے آئے ہیں''۔ واجد نے اس بار کوئی جواب نہ دیا ذرا دیر کی خاموشی کے بعد کمرے کے اندر روشنی ہوگئی۔ اس کا مطلب تھا کہ وہ کمرے سے نکلنے کے لیے تیار ہو رہا

ہے۔بشیرا معنی خیز نظروں سے فضلے کو دیکھنے لگا۔واجد نے دروازے کھول کر ادھر ادھر دیکھنے کے بعد پوچھا۔

''کہاں ہیں ابا جان؟''

''وہ ادھر ایک ہوٹل میں بیٹھے ہیں، آپ کو بلا رہے ہیں''۔واجد تھوڑی دیر تک سوچتا رہا پھر اس نے پلٹ کر کہا''عمارہ دروازہ بند کرلو، میں ابھی آتا ہوں''۔وہ کمرے سے باہر آ گیا۔دروازہ اندر سے بند ہو گیا۔اس نے بڑی محبت اور حسرت سے بند دروازے کو دیکھا۔اس کا دل نہیں چاہتا تھا کہ عمارہ کو چھوڑ کر جائے لیکن جو باپ اس کا ساتھ دے رہا ہے اس کے حکم سے انکار کرنا بھی مناسب نہیں تھا۔وہ بڑی بے دلی سے ہوٹل کی طرف جانے لگا۔ہوٹل کے ایک کیبن کے باہر دو سپاہی ایک میز پر بیٹھے چائے پی رہے تھے۔کیبن کے اندر جناب علی ایک تھانے دار کے ساتھ باتیں کر رہا تھا۔تھانے دار نے کہا۔

''بہت دیر ہوگئی، آپ کا لڑکا ابھی تک نہیں آیا ہے''۔

''بس آتا ہی ہوگا اگر پانچ منٹ تک نہیں آیا تو میں خود جا کر اسے لے آؤں گا۔آپ بس اتنا خیال رکھیں کہ لڑکی حوالات ضرور پہنچ جائے اور اخباروں میں اس کا نام جلی حرفوں میں شائع ہو جائے'' جناب علی نے کہا۔

''سب ہو جائے گا، فکر نہ کریں''۔تھانیدار نے کہا۔

''ایک بات کی فکر ہے، چوہدری کرم دین بیٹی کو یہاں سے لے جانے اور خود کو بدنامی سے بچانے کے لیے آپ کو بڑی سے بڑی رقم دے گا۔میں دو ہزار آپ کو دے چکا ہوں، اس کے بعد کرم دین آپ کو جتنی بھی رقم دے گا، میں بھی اتنی رقم نقد ادا کروں گا۔میں چاہتا ہوں کہ وہ اپنی ساری دولت اور ساری زندگی داؤ پر لگانے کے بعد بھی بدنامی سے نہ بچ سکے''۔

''ٹھیک ہے ایسا ہی ہوگا، آپ اطمینان رکھیں'' تھانیدار نے کہا۔

اسی وقت واجد بشیرے کے ساتھ وہاں آ گیا۔جناب علی نے تھانیدار سے کہا۔

''یہ میرا لڑکا ہے، میں اسے لے جاتا ہوں۔اب آپ اپنا فرض ادا کیجیے''۔

تھانے دار نے گہری نظروں سے واجد کو دیکھا پھر کیبن سے باہر آ کر اپنے سپاہیوں کے ساتھ وہاں سے چلا گیا۔واجد نے حیرانی سے پوچھا''ابا جان کیا بات ہے؟''

''کچھ نہیں، تم میرے ساتھ آؤ'' وہ تیزی سے چلتا ہوا ہوٹل سے باہر جانے لگا۔واجد نے اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے پوچھا۔

''آخر کچھ تو بتایئے یہ انسپکٹر کہاں گیا ہے؟ آپ مجھے کہاں لے جانا چاہتے ہیں؟ عمارہ بالکل اکیلی ہے، میں اسے چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتا۔جناب علی اپنے پرانے ماڈل کی کار کے پاس آ کر رک گیا اور دروازے کھول کر بولا''چلو بیٹھو۔وہ بعد میں آ جائے گی''۔

واجد نے ایک دم پیچھے ہٹ کر کہا''نہیں وہ میری خاطر اپنے باپ کا گھر چھوڑ کر آئی ہے۔میں اسے چھوڑ کر یہاں سے نہیں جا سکتا''۔جناب علی نے غرا کر کہا''تم میرے حکم سے انکار کر رہے ہو۔جانتے ہو وہاں تھانے دار گیا ہے، اس کے ساتھ تمہیں بھی حوالات میں بند کر دیا جائے گا''۔

واجد کے چہرے پر سختی آ گئی''اس کا مطلب ہے کہ آپ نے چوہدری سے بدلہ لینے کے لیے یہ چال چلی ہے''۔

''ہاں۔اس نے سینکڑوں باراتیوں کے سامنے میری بے عزتی کی تھی۔تمہاری خالہ سے زبردستی نکاح پڑھا کر میری غیرت کو للکارا تھا۔میں نے قسم کھائی تھی کہ اس سے بھی اونچا شکار کھیلوں گا۔آج میری قسم پوری ہو رہی ہے''۔

''آپ چوہدری سے انتقام لینے کے لیے ایک معصوم لڑکی کو بدنام کر رہے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟ عمارہ نے آپ کا کیا بگاڑا ہے؟''

''نازنین نے بھی کسی کا کچھ نہیں بگاڑا تھا۔ وہ بھی کسی کی بیٹی تھی۔ کرم دین نے اس سے زبردستی کیوں کی تھی؟ تم مجھ سے بحث نہ کرو، چلو میرے ساتھ......''

واجد نے بے بسی سے کہا ''اچھی بات ہے میں آپ سے بحث نہیں کروں گا، آپ انتقام لیجیے لیکن میں عمارہ کا ساتھ نہیں چھوڑوں گا'' یہ کہہ وہ تیزی سے پلٹ گیا اور رائل پارک کی طرف جانے لگا۔ جناب علی نے کار کے دروازے کو ایک جھٹکے سے بند کرتے ہوئے کہا۔

''الو کا پٹھا''۔

O☆O

کمرے میں گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ ایک کرسی پر تھانے دار بیٹھا ہوا تھا۔ دوسری کرسی پر جناب علی تھا اس کے پیچھے بشیرا اور فضلا ہاتھ باندھے کھڑے تھے اور تھانے دار کے قریب کھڑا ہوا واجد سر جھکائے عمارہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔

وہ ایک کونے میں چھینٹ کی چادر اوڑھے بیٹھی تھی اور گھٹنوں پر سر رکھے منہ چھپائے سسکیاں لے رہی تھی۔ وہ اپنی زندہ لاش پر آنسو بہا رہی تھی۔

وہ ایسی لڑکی تھی جس نے اپنی زندگی میں کسی سے نفرت نہیں کی تھی بلکہ اپنے ہی باپ کی نفرتوں کا نشانہ بنتی رہی تھی۔ وہ ایسی بے نیاز تھی کہ اس نے کبھی کسی سے کچھ نہیں لیا۔ اور جب اپنے محبوب سے ایک اعتماد کا رشتہ لے کر محبت کی انمول سوغات اسے دی تو اسے بدنامی کے کانٹوں پر لا کر بٹھا دیا گیا۔

کچھ ہی دیر میں اس کا باپ آنے والا تھا۔ تھانے دار نے کریم دین کو بلانے کے لیے ایک سپاہی بھیج دیا تھا عمارہ کو اس بات کا خوف نہیں تھا کہ اس کا باپ اسے مار ڈالے گا۔ موت اب اسے آسان نظر آ رہی تھی لیکن ذلت اور رسوائی کی جو موت وہ مر رہی تھی وہ اتنی شرمناک تھی کہ شرم سے نظریں اوپر نہیں اٹھا سکتی تھی۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ عورت جو گناہ کی محرک کہلاتی ہے وہ پہلے شرماتی ہے۔ مرد کو صدیاں گزر جاتی ہیں لیکن وہ نہیں شرماتا۔

تھانے دار نے کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے جناب علی سے کہا ''چوہدری صاحب آپ کا لڑکا خود ہی اقرار کر رہا ہے کہ اس لڑکی کو بھگا کر لایا ہے۔ میں کیا کروں بتائیے۔ اب تو لڑکی کے ساتھ لڑکے کو بھی تھانے لے جانا ہوگا'' جناب علی غصے سے واجد کو دیکھنے لگا۔ واجد نے کہا۔

''انسپکٹر صاحب! ابا جان سے مت پوچھیے۔ میں آپ سے التجا کرتا ہوں کہ مجھے عمارہ کے ساتھ حوالات میں بند کر دیجیے۔ میں اسے چاہتا ہوں، میں اس سے شادی کروں گا۔ میرا دل صاف ہے اس لیے مجھے کسی کا ڈر نہیں ہے''۔

جناب علی نے غصے سے کہا ''تم ایک چھوکری کی خاطر چوہدری کے سامنے سر جھکانا چاہتے ہو۔ لیکن میں ہار ماننے والا نہیں ہوں۔ مجھے یہ منظور ہے کہ تم جیل چلے جاؤ لیکن یہ منظور نہیں ہے کہ چوہدری اتنی بڑی بدنامی سے بچ کر نکل جائے''۔

واجد نے پوچھا ''میں جیل جاؤں گا تو کیا آپ کی بدنامی نہیں ہوگی؟''

''ہوگی مگر وہ ایک مرد کی بدنامی ہوگی۔ ہزار گناہ کے بعد بھی مرد کی نیک نامی کو ٹھیس نہیں پہنچتی۔ لیکن عورت ایک بار بدنام ہو جائے تو اس کے دروازے پر رشتہ مانگنے تو کیا کوئی تھوکنے بھی نہیں جاتا۔ اب اس سے بہتر انتقام اور کیا ہو سکتا ہے کہ

چوہدری ساری زندگی ایک بیٹی کا بوجھ اٹھائے پھرے گا اور اپنے برابر کے لوگوں سے نظریں ملا کر بات نہیں کر سکے گا''۔

تھانے دار نے ہاتھ اٹھا کر جناب علی سے کہا ''چوہدری صاحب! آپ میرے سامنے کسی دشمن سے انتقام لینے کی باتیں نہ کریں۔ یہ قانون کے خلاف ہے مجھے جو کچھ کرنا ہے قانون کے مطابق سوچ سمجھ کر کروں گا۔ آپ چپ چاپ تماشے دیکھیے......''

اتنے میں دروازے پر دستک ہوئی۔ اس کے ساتھ ہی سپاہی کی آواز سنائی دی۔

''جناب! چوہدری کرم دین حاضر ہے''۔

عمارہ ذرا اور سمٹ کر کونے میں چلی گئی۔ جناب علی اپنی کرسی پر فخریہ انداز میں اکڑ گیا۔ واجد پریشان نظروں سے دروازے کی جانب دیکھنے لگا۔ تھانے دار اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے کی جانب جا رہا تھا۔ جناب علی نے کہا۔

''چوہدری کے پاس ریوالور ہے، وہ یہاں آتے ہی مجھ پر حملہ کرے گا۔ آپ اس سے ریوالور لے لیجیے''۔

تھانے دار ٹھٹک کر دروازے پر رک گیا۔ اس نے اپنے سپاہی کو آواز دی ''دین محمد! چوہدری سے ریوالور لے لو''۔ تھوڑی دیر بعد آواز آئی ''جی حضور! ریوالور میرے پاس ہے۔ تھانے دار نے دروازہ کھول دیا۔ باہر ایک سپاہی کے پیچھے چوہدری کرم دین اور حشمت بیگ کھڑے ہوئے تھے۔ کرم دین کے چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ دروازہ کھلتے ہی اس نے اندر آنا چاہا، تھانے دار نے اس کا بازو پکڑ کر کہا۔

''ٹھہریے! آپ ادھر دیوار کے پاس کھڑے ہو جائیے۔ اگر آپ نے کوئی ہنگامہ کیا تو میں بڑی سختی سے پیش آؤں گا''۔

حشمت بیگ نے کہا ''آپ اطمینان رکھیے ہم خود نہیں چاہتے کہ کوئی ہنگامہ ہو اور یہ بات اس کمرے سے باہر جائے''۔ وہ دونوں اندر آ گئے۔ کرم دین کی نظریں سب سے پہلے اپنے دشمن پر گئیں۔ وہ طنزیہ انداز میں مسکراتے ہوئے اپنی مونچھوں پر بل دے رہا تھا۔ پھر اس نے کونے میں دبکی ہوئی عمارہ کو دیکھا تو اسے یوں محسوس ہوا جیسے وہ اچانک اپنی عمر سے زیادہ بوڑھا ہو گیا ہے۔ اس کے گھٹنے کانپنے لگے، وہ ذرا سا لڑکھڑایا پھر حشمت بیگ کا سہارا لے کر سنبھل گیا۔ اس نے دل میں کہا۔

آہ! اسی دن کے لیے میں بیٹی کی پیدائش پر جھنجلایا تھا۔ میں تیر سے مرسکا نہ تلوار سے، نہ ہی دشمن کی چال سے لیکن ایک بیٹی کی لغزش نے مجھے بے موت مار دیا ہے۔ میں جناب علی کے سامنے نظریں نہیں اٹھا سکتا۔ میں یہ توہین کیسے برداشت کروں؟ میں غیرت کے جوش میں آ کر بیٹی کے ٹکڑے ٹکڑے کردوں تب بھی یہ بدنامی ہو کر رہے گی۔ اگر اس کی غلطی کو معاف کردوں پھر بھی وہ زندہ لاش کی طرح میرے گھر پر پڑے رہے گی، کوئی غیرت مند اسے قبول کرنے نہیں آئے گا۔

مجھے نہتا کر دیا گیا ہے میں نہ تو دشمن کو مار سکتا ہوں اور نہ ہی خودکشی کر سکتا ہوں کیونکہ میں بزدلوں کی طرح مرنا نہیں چاہتا آخری دم تک جناب علی سے انتقام لینے کی کوشش کرتا رہوں گا۔

ایسے وقت بھی وہ انتقام لینے کے متعلق سوچ رہا تھا حالانکہ اسے اپنی پچھلی غلطیوں کے متعلق سوچنا چاہیے تھا۔ وہ بھی کسی کی بیٹی کو اور کسی کی ہونے والی دلہن کو جبراً بیاہ کر لایا تھا۔ لیکن ایسے وقت انسان کو اپنی غلطیاں یاد نہیں آتیں۔ وہ جو انتقام کی آگ ہوتی ہے وہی غیرت کی بھٹی میں سلگتی رہتی ہے۔

حشمت بیگ نے جناب علی سے شکایت کی ''چوہدری صاحب آپ نے عمارہ کو میرے گھر سے لا کر اچھا نہیں کیا۔ آپ کو کم از کم میری عزت کا خیال کرنا چاہیے تھا''۔

جناب علی نے کہا ''میں کسی کو لے کر نہیں آیا ہوں عمارہ ہی واجد کے ساتھ آئی ہے۔ اب یہ دونوں حوالات میں جائیں گے اور ان کے دماغ درست ہو جائیں گے''۔

حشمت بیگ نے حیرانی سے کہا ''تعجب ہے آپ ابھی معاملے کو یہاں ختم کرنے کی بجائے اپنے بیٹے کو بھی حوالات میں بھیجنا چاہتے ہیں؟''

جناب علی نے غصہ سے کہا ''یہ نالائق میرا بیٹا نہیں ہے۔ جب تک یہ میری مخالفت کرتا رہے گا اس وقت تک میں اسے اپنا بیٹا تسلیم نہیں کروں گا''۔

''یہ کیا بات ہوئی؟'' حشمت بیگ نے پوچھا ''کیا واجد آپ کی مرضی کے خلاف عمارہ کو یہاں لایا ہے؟''

واجد نے حشمت بیگ سے کہا ''چاچا جی، ابا جان یہ چاہتے تھے کہ میں عمارہ کو یہاں لا کر بدنام ہونے کے لیے چھوڑ دوں اور خود ان کے ساتھ پنڈ واپس چلا جاؤں۔ لیکن مجھے نہ تو چوہدری صاحب سے دشمنی ہے اور نہ ہی میں عمارہ کو کسی مصیبت میں تنہا چھوڑنا چاہتا ہوں۔ یہ مجھے حوالات کی دھمکی دے رہے ہیں حالانکہ یہ حوالات تو کیا، میں عمارہ کے ساتھ پھانسی کے تختے پر بھی چڑھنے کو تیار ہوں''۔ چوہدری کرم دین نے چونک کر اسے دیکھا، وہ کبھی سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ واجد ایک دشمن کی بیٹی کے لیے اپنے باپ کی مخالفت کرے گا۔ اچانک کرم دین کے دماغ میں یہ بات آئی کہ وہ اپنے دشمن سے اس کے بیٹے کو چھین سکتا ہے۔

ہاں چھین سکتا ہے۔ بدنامی کے بعد بھی عمارہ کو کسی نہ کسی کے پلے باندھنا ہی ہوگا پھر واجد سے کیوں نہ اسے منسوب کیا جائے جبکہ وہ دونوں ایک دوسرے کو جی جان سے چاہتے ہیں۔ ہاں اس سے بہتر انتقام اور کیا ہوگا کہ ایک بیٹے کو اس کے باپ سے چھین لیا جائے۔ بیٹا تو خاندان کا چراغ ہوتا ہے، بڑھاپے کا سہارا ہوتا ہے۔ جناب علی کی کمر ایک دم سے جھک جائے گی۔ بعض اوقات دشمن تیر سے نہیں مرتا، تلوار سے نہیں مرتا، گھر میں ایک بیٹی ہو تو پیار کے رشتے سے مر جاتا ہے۔ بیٹی خدا کی دین ہے، دنیا کا سب سے قیمتی تحفہ ہے جو عورت اپنے خاوند کو دیتی ہے میں خواہ مخواہ بیٹی کی پیدائش پر جھنجھلا گیا تھا۔

اس نے واجد سے کہا۔

''بیٹے تم سمجھدار ہو۔ مجھے بھی تم سے کوئی عداوت نہیں ہے۔ اگر تمہارا باپ تمہیں عاق کرتا ہے تو کرنے دو۔ آج سے تم میرے بیٹے ہو''۔

حشمت بیگ نے خوش ہو کر تھانیدار سے کہا ''جناب لڑکی راضی ہے، لڑکی کا باپ بھی راضی ہے اور لڑکا بھی راضی ہے۔ میں آپ سے درخواست کرتا ہوں کہ اب اس معاملے کو آگے نہ بڑھائیں''۔

''نہیں جناب!'' جناب علی نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا ''میں راضی نہیں ہوں۔ میں اس معاملے کو عدالت تک لے جاؤں گا''۔

تھانیدار نے کہا ''میں کسی کا مشورہ نہیں سننا چاہتا۔ میں قانونی کارروائی کروں گا۔ لڑکے اور لڑکی کو فحاشی کے الزام میں گرفتار کر کے لے جاؤں گا''۔ فحاشی؟ کرم دین، حشمت بیگ اور واجد پریشان ہو کر تھانیدار کا منہ تکنے لگے اس نے کہا۔

''بشیرے اور فضلے کے بیان کے مطابق واجد اور عمارہ تین گھنٹے تک اس کمرے میں بند رہے۔ اس کمرے کی تاریکی میں وہ کیا کرتے رہے؟ یہ میڈیکل رپورٹ سے معلوم ہو جائے گا۔ میں اس لڑکی کو طبی معائنے کے لیے ابھی اسپتال بھیجتا ہوں''۔

چوہدری کرم دین چکرا کر رہ گیا۔ بات بنتے بنتے بگڑ رہی تھی۔ یہ تو ذلت اور رسوائی کی انتہا ہے کہ اس کی بیٹی طبی معائنے کے لیے اسپتال جائے گی۔ اس معائنے کی رپورٹ تھانے میں پہنچے گی پھر وہ تھانے سے نکل کر اخباروں میں شائع ہوگی اور جناب علی کی زبانی ایک ایک پنڈ اور ایک ایک زمیندار کے گھر تک پہنچے گی۔ وہ چکرا کر کرسی پر دھپ سے بیٹھ گیا۔ حشمت بیگ نے تھانے دار سے التجا کی۔

''جناب! یہ ایک شریف لڑکی کی عزت کا سوال ہے۔ آپ چاہیں تو بات یہیں ختم ہو سکتی ہے''۔

تھانے دار نے جواب دیا ''اگر یہ شریف لڑکی ہے تو پھر گھبرانے کی کیا بات ہے، میڈیکل رپورٹ بھی اسے شریف کہے گی۔ اگر یہ بدچلن ثابت ہوئی تو قانون اسے کبھی معاف نہیں کرے گا''۔

چوہدری کرم دین نے جیب سے نوٹوں کی گڈی نکال کر آگے بڑھا دی۔

تھانے دار نے انکار کر دیا۔

رشوت کی رقم بڑھتی گئی۔ تھانے دار جناب علی کی طرف دیکھتا گیا اور انکار کرتا گیا۔ جناب علی کی خاموش نظریں کہہ رہی تھیں کہ میں اس سے زیادہ رقم دے سکتا ہوں لیکن ٹھوس ثبوت کے لیے میڈیکل رپورٹ ضرور حاصل کرنی ہوگی۔

کونے میں سمٹی ہوئی عمارہ کی سسکیاں تیز ہوگئیں۔ اس کے بہت سے حامی اور ہمدرد تھے پھر بھی وہ تنہا تنہا سی تھی۔ بعض اوقات اپنوں کی ہمدردیاں کام نہیں آتیں، صرف دعا کا ایک کچا سہارا رہ جاتا ہے کہ شاید قبول ہو جائے۔ اس نے سسکتے ہوئے دعا مانگی۔ ایک کراہتی ہوئی بہت ہی دھیمی سی آواز اس کی دل کی گہرائی سے نکلی۔

''ربا! مینوں...... بچالے...... ربا......!''

O☆O

وہ سب اسپتال کے برآمدے میں یوں بیٹھے تھے جیسے عدالت کے دروازے پر عمارہ کی تقدیر کا فیصلہ سننے بیٹھے ہوں۔ یہ تو سب ہی جانتے تھے کہ فیصلہ کیا ہوگا لیکن اس فیصلے کو چھپایا جا سکتا تھا۔ غلطی کس سے نہیں ہوتی؟ اور اس غلطی کی سزا کسے نہیں ملتی؟ سزا ضرور ملنی چاہیے لیکن اسے ایک اشتہار بنا کر ایک لڑکی کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہیے، اس کے سارے خاندان کو بدنام نہیں کرنا چاہیے۔ بس وہ یہی چاہتے تھے جہاں تک بدنامی ہو چکی ہے وہاں سے آگے نہ بڑھے۔

چوہدری کرم دین نے کراہتے ہوئے کہا ''خدا مددگار ہے وہ ہماری عزت رکھے گا''۔

حشمت بیگ نے تائید کی ''ہاں جب تمام سہارے چھوٹ جاتے ہیں تو ایک اسی عالم الغیب کا سہارا رہ جاتا ہے''۔ واجد ان سے ذرا دور سر جھکائے بیٹھا تھا۔ اس نے دل میں کہا ''خدا میں پرانا پاپی ہوں مگر عمارہ ایسی نہیں ہے، زندگی میں پہلی بار اس سے ایک غلطی ہوگئی ہے، وہ بھی میرے بہکانے پر۔ تو اس کی سزا مجھے دے، اس مظلوم کو بچالے، اس کے کورے دامن پر جو دھبہ لگا ہے، اسے مٹا دے۔ تو قادر مطلق ہے، تیرے لیے ناممکن کو ممکن بنا دینا بڑی بات نہیں ہے''۔

آہ...... کم بخت انسان کو کس وقت خدا یاد آتا ہے۔ جب کہیں سے بچنے کی کوئی صورت نظر نہیں آتی تو وہ ایک معجزے کی تمنا کرتا ہے لیکن خدا اب کیا کر سکتا تھا؟ کیا طبی معائنے کی رپورٹ کو روک دیتا یا میڈیکل رپورٹ کو بدل دیتا؟ عقیدے کے مطابق یہی سوچا جا سکتا ہے کہ اچانک زلزلہ آئے گا اور معائنہ ملتوی ہو جائے گا یا بے چاروں کی دعا قبول ہوئی تو پیتھولوجیکل ٹیسٹ کے دوران خوردبین کا لینس تڑخ جائے گا۔

آج کے دور میں یہ سب باتیں مضحکہ خیز ہیں۔ طبی سائنس ایک اٹل حقیقت ہے۔ روحانی نظریات سائنسی

حقیقت کی مضبوط چٹان کو نہیں توڑ سکتے۔ لیکن وہ دیہاتی لوگ اس حقیقت کو نہیں سمجھ رہے تھے اس لیے دعائیں مانگ کر اپنے دل کو تسلیاں دے رہے تھے۔ اسپتال کے ایک کمرے میں پارٹیشن کے پیچھے عمارہ ایک بیڈ پر لاش کی طرح پڑی ہوئی تھی۔ اوپر چھت سے لٹکا ہوا الیکٹرک فین تیزی سے گردش کر رہا تھا اور وہ دیدے پھیلائے پلکیں جھپکائے بغیر اسے دیکھے جا رہی تھی۔ وہ خاموش تھی مگر اس کا دل رو رہا تھا۔

''میں گناہ گار ہوں۔ کیا میں گناہ گار ہوں؟''

عام طور سے یہی کہا جاتا ہے کہ جس لڑکی نے شادی سے پہلے اپنا کنوار پن کھو دیا، وہ گناہ گار ہوگئی۔ اگر یہ سچ ہے تو مجھے سزا ملنی چاہیے لیکن سزا دینے سے پہلے یہ ضرور سمجھنا چاہیے کہ میں اس مقام تک پہنچی؟ جب میں پیدا ہوئی تو جناب علی میری جوانی کے انتظار میں گھات لگا کر بیٹھ گیا۔ میری سوتیلی ماں سستے عشق کا زہر قطرہ قطرہ میرے دماغ میں ٹپکاتی رہی۔

میں جس ماحول میں تھی وہاں عورتیں مرد کے ایک اشارے پر بک جاتی تھیں۔ وہ حویلی نہیں تھی، میرے پ کا سجایا ہوا ایک چکلہ تھا۔ یہ چکلہ ہر شہر میں ہے، ہر گاؤں میں ہے اور ہر عیاش مرد کی مٹھی میں ہے۔ تم اس چکلے ہ اپنی بیٹی کو پالتے ہو اس کے سامنے رنگ رلیاں مناتے ہو اور دعا مانگتے ہو کہ بیٹی کسی مقام پر طبی معائنے تک نہ پہنچے۔ م کتنے ذلیل قسم کے احمق ہو! ہوس کے غلام! بیٹی کے دلال! تمہاری تہذیب اپنے ہی خنجر سے آپ خودکشی کر رہی ہے۔

''میں تم سے کچھ نہیں مانگتی۔ رحم کی بھیک بھی نہیں مانگتی۔ جہاں انصاف نہ ہو وہاں سے انصاف کیا مانگنا؟ میں خدا سے کہتی ہوں اگر میں مظلوم ہوں، اگر میرے دل میں نیکی اور شرافت ہے، اگر میں گناہ گار نہیں بنی بلکہ بنائی گئی ہوں تو مجھے تیری رحمانیت کا واسطہ ہے مجھے بچالے۔

ربا! میں سائنس کی ٹھوس سچائی کو نہیں جانتی صرف ایک سچائی کو جانتی ہوں اور وہ تو ہے۔ مجھے بچالے......''

اس کی پلکیں جھپک گئیں۔ اسی وقت ایک لیڈی ڈاکٹر پارٹیشن میں آگئی اس نے ایک نظر عمارہ پر ڈالی اور ٹرالی پر سے ربر کا دستانہ اٹھا کر بائیں ہاتھ میں پہننے لگی۔ باہر انتظار کرنے والے بے چینی سے برآمدے میں ٹہل رہے تھے۔ تھانے دار نے جھلا کر کہا ''لعنت ہے، میری تمام رات ضائع ہوگئی۔ مجھے نیند آرہی ہے''۔

وارڈ بوائے نے کہا ''ڈاکٹرنی صاحبہ ابھی اندر گئی ہیں، کم سے کم ایک گھنٹہ اور انتظار کرنا ہوگا''۔

تھانے دار پاؤں پٹختا ہوا ڈاکٹر باری کے کمرے میں چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی لیڈی ڈاکٹر باہر آئی، اس نے کاغذ کا ایک پرزہ وارڈ بوائے کو دیتے ہوئے کہا ''یہ ڈاکٹر باری کو دے دو۔ لڑکی کا معائنہ نہیں ہوسکتا۔ سننے والوں کے ذہن میں ایک دھماکہ سا ہوا۔ مسرتوں کی کتنی ہی آتش بازیاں نگاہوں کے سامنے جھلملا گئیں۔ چوہدری کرم دین مارے خوشی کے حشمت بیگ سے لپٹ گیا۔ اس وقت کسی نے نہیں سوچا کہ ایک ناممکن سی بات ممکن کیسے ہوگئی۔

پھر واجد ذرا ہوش میں آتے ہی دوڑتا ہوا ڈاکٹر باری کے کمرے میں آیا۔ ڈاکٹر تھانے دار سے کہہ رہا تھا۔

''لڑکی خوش نصیب ہے اس کی میڈیکل رپورٹ آپ کو نہیں ملے گی''۔

تھانے دار نے کہا ''کیوں نہیں ملے گی۔ میں قانوناً آپ سے مطالبہ کرسکتا ہوں''۔

''آپ ضرور مطالبہ کرسکتے ہیں لیکن دنیا کا کوئی ڈاکٹر اس لڑکی کی میڈیکل رپورٹ نہیں دے سکے گا اور وہ اس لیے کہ اس کا مہینہ شروع ہو چکا ہے۔ طبی سائنس مجبور ہے......''

☆O......O☆

آئینہ خانہ

ہم اس دنیا کے ایسے آئینہ خانے میں جی
رہے ہیں جہاں ہمیں اپنے گھناؤنے کردار
کا ہر پہلو نظر آتا ہے بشرطیکہ ہماری
آنکھیں دیکھنا جانتی ہوں......

میں اس دنیا کے ہر ملک، ہر شہر اور ہر بازار میں پایا جاتا ہوں۔ میرے دم سے انسانوں کی خوبصورتی [illegible] ہے۔ بے شک خداوند کریم نے اچھی صورت دے کر پیدا کیا ہے مگر میں ان صورتوں پر جھاڑ و پھیرتا ہوں، انہیں بناتا سنوارتا ہوں، ان کی مرمت کرتا ہوں اور ان کی اچھی طرح حجامت کرنے کے بعد ان کو سنوارتا اور نکھارتا ہوں۔ اب آپ سمجھ گئے ہوں گے کہ میں کون ہوں؟

میں ایک حجام ہوں۔ اگر آپ کہانیاں پڑھ کر انسانوں کے مسائل کو سمجھنا چاہتے ہیں تو میرا نام سن کر ناک بھوں نہ چڑھائیں۔ میں آپ ہی کی دنیا کا آدمی ہوں۔ آپ ہی کی طرح انسان ہوں۔ فیشن ایبل عورتوں کی تراشیدہ زلفیں، کمان جیسی بھنویں، تھریڈنگ کیے ہوئے چکنے چہرے اور مردوں کے سولجر کٹ، کالج کٹ اور ہپی کٹ جیسے تراشیدہ گیسو یا کلین شیوڈ چہرے، یہ سب کچھ میرے ہی ہاتھوں کی صفائی کا نتیجہ ہیں۔ آپ کو اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ادا کرنا چاہیے کہ اس نے مجھے آپ کی دنیا میں پیدا کیا اور جانوروں کو مجھ جیسی اہم ہستی سے محروم رکھا۔

جب انسان غار کے زمانے سے نکل کر تہذیبی دور میں داخل ہوا تو اسے بکروں، بندروں اور ریچھوں سے الگ نظر آنے اور خوبصورت بننے کے لیے سب سے پہلے میری ضرورت اور اہمیت کا احساس ہوا۔ وہ بھی کیا زمانہ تھا جب مجھے بڑی محبت اور احترام سے خلیفہ کہہ کر مخاطب کیا جاتا تھا اور اپنے پاس بٹھایا جاتا تھا۔ گھریلو مسائل اور پنچوں کی محفل میں شریک کیا جاتا تھا۔ غریب گھرانہ ہو یا امیر گھرانہ، شادی بیاہ کے موقعوں پر میری موجودگی لازمی ہوتی تھی۔ جب رشتوں کی بات چلتی تو اگوا کے طور پر میں ہی کام آتا تھا۔ لڑکے اور لڑکی کے متعلق چھان پھٹک کرنے اور صحیح معلومات حاصل کرنے کے لیے میری خدمات حاصل کی جاتی تھیں۔ پھر اس سلسلے میں لڑکے اور لڑکیوں کے متعلق جو بات میری زبان سے نکل جاتی وہ پتھر کی لکیر بن جاتی تھی مگر افسوس صد افسوس کہ نئی نسل کے نوجوان لڑکے اور لڑکیاں اب خود ہی اسکولوں، کالجوں، تفریح گاہوں اور بس کے اڈوں پر اپنے معاملات طے کر لیتے ہیں۔ اگر ماں باپ سیدھی

طرح جان گئے تو ان کی بزرگی کا بھرم رہ جاتا ہے...... ورنہ وہ عدالت میں پہنچ کر اپنے بالغ ہونے کا سرٹیفکیٹ پیش کر کے کورٹ میرج، سول میرج، لومیرج یا خانہ خراب میرج کر لیتے ہیں۔

میری دعا ہے کہ نئی نسل کے نوجوانوں کو کہیں سے لو لگ جائے مگر کسی سے لو نہ لگے، یہ بچے اسی طرح لومیرج تک پہنچ جاتے ہیں۔ دو برس پہلے ہماری برادری کا ایک بندہ لندن سے تربیت حاصل کر کے یہاں آیا تھا۔ جب وہ ہمارے ملک خداداد میں تھا تو محض ایک حجام تھا، لندن سے واپس آتے ہی باربر ماسٹر بن گیا۔ وہ اپنے ساتھ حجامت بنانے کی جدید مشینیں اور ایک عدد گوری میم لے کر آیا۔ میں نے پوچھا۔

''اس میم کا کیا مصرف ہے؟''

اس نے جواب دیا ''میں مشینوں سے حجامت بناؤں گا۔ وہ اپنے خوبصورت ملائم ہاتھوں سے مساج کرے گی اور تبسم کی بجلیاں گراتی ہوئی چمپی کیا کرے گی۔ تم مردوں کی پرابلم کو نہیں سمجھتے۔ پرابلم کے معنی جانتے ہو؟ اونہہ، تم کیسے جانو گے۔ تم تو کبھی لندن نہیں گئے۔ بس یہ سمجھ لو کہ حجام سے باربر ماسٹر بننے کے لیے بیچ بیچ میں انگریزی کا ایک آدھ لفظ بولنا ضروری ہے۔ ہمارے ملک کی پان کھانے والی کتنی ہی اماں جانیں اور حقہ پینے والے ابا جان اسی طرح ممی اور ڈیڈی کے خطابات پر پہنچ چکے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو تم بھی ایک دن باربر بن جاؤ گے''۔

''تم پرابلم کے بارے میں کچھ کہہ رہے تھے؟''

''ہاں، پرابلم کا مطلب ہے مسئلہ۔ مردوں کا مسئلہ یہ ہے کہ اپنی حجامت بنواتے وقت بھی وہ کسی حسین عورت کی قربت چاہتے ہیں۔ اگر عورت پانچ روپے کے بجائے پچیس روپے کی حجامت بنا دے تو وہ خوش ہو کر مستقل گاہک بن جاتے ہیں۔ نوجوانوں کے مسائل یہ ہیں کہ انہیں کہیں آرام سے بیٹھ کر عشق کرنے کا موقع نہیں ملتا ہے۔ میں ان مجبور عاشقوں کے لیے یہاں ایک بڑی سی دکان کھولوں گا، اس دکان کے دو حصے ہوں گے۔ ایک حصے میں لڑکیاں اپنی زلفوں کی کرلنگ، شیکی اور ببل اپ بنوائیں گی۔ دوسرے حصے میں نوجوان اپنا حلیہ درست کرانے آئیں گے۔ لڑکے اور لڑکیوں کے لیے ایک مشترکہ ویٹنگ روم ہوگا۔ وہ آمنے سامنے صوفوں پر بیٹھ کر اپنی اپنی باری کا انتظار کریں گے۔ اب آمنے سامنے بیٹھنے سے کوئی خوشگوار حادثہ پیش آجائے تو اس کی ذمے داری ہم پر نہیں ہوگی۔ اگر ہوگی بھی تو کیا فرق پڑتا ہے؟ پہلے بھی تو ہمارے باپ دادا اگوا بن کر لڑکے اور لڑکیوں کو شادی کے مرحلے تک پہنچاتے تھے''۔

میں نے قائل ہو کر سر ہلاتے ہوئے کہا ''واقعی، ناک ادھر سے پکڑو یا ادھر سے آخر ناک ہی پکڑی جائے گی۔ ہمارے باپ دادا کا انداز پرانا تھا۔ یہ ماننا پڑتا ہے کہ تم لندن سے بہت کچھ سیکھ کر آئے ہو۔ نئے دور کے تقاضوں کے مطابق ہم ہیئر ڈریسنگ اور بیوٹی پارلر کے خوب صورت اڈے بنا کر اگوا کے فرائض انجام دے سکتے ہیں۔ میں نے تمہیں استاد مان لیا۔ تم مجھے اپنا شاگرد بنا لو''۔

''اونہہ۔ یہ استاد کیا ہوتا ہے؟ میں نے کہا نا کہ تمہیں انگریزی کا ایک آدھ لفظ سیکھنا چاہیے تم مجھے ماسٹر کہہ سکتے ہو''۔

''اچھا استاد! ماسٹر کہا کروں گا''۔

''اوں ہونہہ۔ اس طرح ماسٹر نہ کہو۔ ماسٹر کے ما کو ذرا میڑھا کر کے مے سٹر کہو مے سٹر......''

میں نے ذرا منہ ٹیڑھا کر کے مے سٹر کہا۔ وہ خوش ہو کر سمجھانے لگا۔

''دیکھو۔ میں تمہیں انسان کے ٹیڑھے پن کا راز بتاتا ہوں۔ انسان نے ازل سے کبھی کسی چیز کو سیدھا رکھنے کی کوشش ہی نہیں کی۔ الفاظ بہت ملائم اور نازک ہوتے ہیں، یہ انسان تو فولادی تہذیب کو بھی جگہ جگہ سے ٹیڑھا کر دیتا ہے۔ ہمارے باپ دادا نے صدیوں سے ان کی حجامت کرتے کرتے انہیں آدمی کی شکل دی تھی۔ یہ پھر ادھر سے ادھر ٹیڑھے ہو کر ہی بن گئے۔ عورت کو پردہ سکھایا تو اس نے سیدھے سادے برقعے کو اپنے بدن کے شبابی حصوں کے مطابق تراش کرا کے میکسی برقعہ بنا دیا۔ اس طرح ہر چیز کو ٹیڑھا کرنے سے بعض اوقات ایک نیا حسن پیدا ہو جاتا ہے اور اکثر اوقات اچھا خاصہ حسن مضحکہ خیز بن جاتا ہے مگر مے سٹر کہنے میں بڑا حسن ہے، ہے نا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلایا۔ یہ شکایت نہیں کی کہ اسے مے سٹر کہتے کہتے میرا منہ ٹیڑھا ہو کر رہ جائے گا۔ مجھے اس سے بہت کچھ سیکھنا تھا۔ ویسے میں حجامت کرنے کے فن میں پہلے ہی سے استاد کامل تھا مگر وقت کے نئے تقاضوں کو سمجھنا اور ان سے نمٹنے کے جدید طریقے سیکھنا چاہتا تھا۔ اس مقصد کے لیے میں اس کا شاگرد بن گیا۔ لندن جانے سے پہلے اس کا نام رمضو نائی تھا۔ لندن پہنچتے ہی وہ اپنے نام کو توڑ مروڑ کر بار بر ماسٹر رمزی بن گیا تھا اور اب یہاں آ کر رمزی ہیئر ڈریسنگ اور بیوٹی پارلر کے نام سے ایک بڑی دکان کھول لی تھی۔ دکان تھی آئینہ خانہ تھا۔ چاروں طرف بیلجیم کے صاف و شفاف آئینے لگے ہوئے تھے۔ وہاں آنے والے گاہک کہیں بھی کھڑے ہو کر خود کو ہر زاویے سے دیکھ سکتے تھے۔ میں نے وہاں پہلی بار کھڑے ہو کر یہ گیان حاصل کیا کہ ایسی جگہ انسان کو اپنا ہر پہلو نظر آئے تب بھی وہ خود کو نظر انداز کر کے دوسروں کو ہر زاویے سے دیکھتا ہے۔ میں نے وہاں سوئٹی کو پہلی بار ہر طرف سے دیکھا کہ وہ کس طرح ایک ایک زاویے سے مقناطیس بن کر اپنی طرف کھینچ لیتی ہے۔

سوئٹی اس انگریزی حسینہ کا نام تھا جو مے سٹر رمزی کے ساتھ یہاں آئی تھی۔ وہ دراز قد کی بھاری بھر کم عورت تھی۔ بدن میں گوشت اور چربی کی اتنی بہتات تھی کہ اسے سوئٹی کی بجائے فیٹی (تگڑی) کہنا زیادہ مناسب ہوتا۔ اس کی جگہ کوئی دیسی عورت ہوتی تو ڈبے کی طرح بھدی نظر آتی مگر وہ لباس کے اندر کورسیٹ بیلٹ باندھ کر پیٹ کے لٹکتے ہوئے گوشت کو سمیٹ کر پچکا لیتی تھی۔ کمر کو پتلی بنا کر اس میں خم پیدا کر لیتی تھی۔ اس طرح کولہے خود بخود ابھر آتے تھے۔ سینے کے ابھار کو ان کی بھولی ہوئی بلندیوں پر قائم رکھنے کے لیے فوم کے بریزر پیڈ استعمال کرتی تھی۔ جتنی ہوشیاری سے بدیسی مال کی پیکنگ ہوتی ہے اور اسے اوپر سے خوبصورت بنایا جاتا ہے، اتنی ہی ہوشیاری سے وہ پیک ہو کر ہمارے ملک میں آئی تھی۔

ہمارے ہاں ایک سے بڑھ کر ایک مثالی حسن ہے۔ ایسی ایسی طرح دار حسینائیں ہیں کہ انہیں دیکھنے اور سمجھنے کے لیے حسن نظر چاہیے مگر ہماری نظریں لوٹ پوٹ کر بدیسی پیکنگ پر ہی ٹھہرتی ہیں۔ مے سٹر رمزی نے ہماری اسی کمزوری کو سمجھ کر سوئٹی کو یہاں امپورٹ کیا تھا۔ میں خود اس کے قریب رہنے کے باوجود اسے آئینے کے ایک ایک زاویے سے دیکھتا رہتا تھا۔ دیکھنے کے لیے یوں تو اور بھی بہت کچھ تھا۔ ہماری دکان کے خوبصورت ویٹنگ روم میں جوان لڑکے لڑکیاں آنے لگے تھے۔ وہاں ایک طرف کے صوفے پر لڑکے اپنی حجامت بنوانے کی باری کے انتظار میں بیٹھے ہوئے سامنے صوفے پر بیٹھی ہوئی لڑکیوں کو تکتے رہتے تھے۔ لڑکیاں سامنے میز پر رکھے ہوئے میگزین اٹھا کر ان کی ورق گردانی کرنے کے بہانے شرماتی، لجاتی اور نظریں چراتی رہتی تھیں۔ بڑا ہی رومان پرور ماحول تھا۔ پہلے پہل کنواری نظریں یونہی جھکتی ہیں۔ اس کے بعد دیکھنے والوں کو جھکاتی چلی جاتی ہیں۔ اس کا ایک بڑا فائدہ یہ ہوتا تھا کہ

جھکنے والے ہر دوسرے تیسرے روز ہمارے سیلون میں پہنچ جاتے تھے۔ وہ روزانہ اپنی حجامت نہیں بنوا سکتے تھے اس لیے کبھی چمپی کروانے اور کبھی ہیئر ڈائنگ کے بہانے آتے رہتے تھے۔

آئینہ خانہ میں روزانہ کتنے ہی چہرے نظر آتے تھے۔ ہر چہرہ اپنی ایک کہانی سناتا تھا۔ وہاں جمیلہ نام کی ایک لڑکی اکثر آتی تھی، اسے اپنے نام کی مناسبت سے حسین و جمیل ہونا چاہیے تھا مگر وہ خوبصورت نہیں تھی، بدصورت بھی نہیں تھی۔ اگر کوئی اسے محبت سے نہ دیکھتا تو نفرت سے بھی نہ دیکھتا۔ جس طرح گوشت کا ناغہ ہو تو سبزی سے گزارہ ہو جاتا ہے اس طرح وہ بھی گزارے کے قابل تھی، بالکل ہی گئی گزری نہیں تھی۔ بنانے والے نے اس کے ساتھ بالکل ناانصافی نہیں کی تھی۔ اس کی زلفوں کو بے حد خوبصورت بنایا تھا۔ ایسے گھنے اور لانبے بال تھے کہ پیچھے گھٹنوں تک آتے تھے۔ ریشم کی ملائمت کیا ہوگی، اس کی زلفیں تو نازک سے جذبوں کی طرح ملائم تھیں، جوانی کے ہر خطرناک موڑ کی طرح خم کھائی ہوئی تھیں اور ایسی گہری سیاہ تھیں کہ اس تاریک صحرا میں کوئی بھی مسافر راستہ بھول سکتا تھا۔

میں نے بارہا ڈرائر سے بال خشک کرنے کے دوران انہیں بار بار چھو کر دیکھا تھا۔ وہ سیدھی مانگ نکالتی تھی اور بڑی خوبصورتی سے چوٹی گوندھتی تھی۔ یعنی ہماری دکان میں بالوں کے اسٹائل بدلنے نہیں آتی تھی۔ وہ صرف تھریڈنگ کی محتاج تھی۔ میں یہ بتادوں کہ تھریڈنگ کیا ہوتی ہے۔ اکثر عورتوں کے چہروں پر مہین ملائم روئیں ہوتے ہیں جو بظاہر نظر نہیں آتے مگر ان کی موجودگی سے چہرے کی صباحت اور چکناہٹ ماند پڑ جاتی ہے۔ ہم بٹے ہوئے دھاگے سے ایک خاص تکنیک کے ذریعے یہ روئیں صاف کر دیتے ہیں۔ اس کے بعد چہرے کی قدرتی چکناہٹ اور اجلاپن نمایاں ہو جاتا ہے اور اس کے بعد واقعی جمیلہ کا چہرہ نکھر جاتا تھا۔ کام کے دوران ہمیں اپنے گاہکوں سے باتیں کرتے رہنے کی عادت سی ہوگئی ہے۔ ایک روز میں نے اس سے پوچھا۔

''باجی! آپ کے والد صاحب تو بڑے بزنس مین ہوں گے؟''

ہم اپنے گاہکوں کو بھائی جان اور باجی کہتے ہیں خواہ وہ عمر میں ہم سے کتنے ہی چھوٹے ہوں۔ اس نے جواب دیا۔

''میرے والدین مرچکے ہیں، میں اکیلی ہوں''۔

''آپ کیا کرتی ہیں؟''

''میں ایک انگلش سکول میں ٹیچر ہوں۔ اس کے علاوہ دو رئیس زادوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہوں۔ ہر ماہ بارہ سو روپے مل جاتے ہیں۔

رفتہ رفتہ گاہکوں سے بے تکلفی بڑھتی ہے۔ کچھ عرصے بعد اس نے بتایا کہ وہ واجد نامی ایک خوبرو نوجوان سے محبت کرتی ہے، جب وہ ٹیکنیکل کالج سے پاس ہو کر کہیں ملازمت کرلے گا تو ان کی شادی ہو جائے گی۔ ایک بار واجد نے اس کے قریب بیٹھ کر پوچھا تھا کہ وہ اسنو کریم وغیرہ کیوں استعمال نہیں کرتی ہے؟ ان کے بغیر چہرہ کچھ روکھا پھیکا سا نظر آتا ہے۔

جمیلہ اپنے چہرے کا رنگ نکھارنے کے لیے کتنے ہی جتن کرتی تھی۔ اس کی کسی سہیلی نے سمجھایا، اسے تھریڈنگ کرانا چاہیے تب سے وہ ہماری دکان کی مستقل گاہک بن گئی تھی۔ مردوں کی حسن پرستی عورتوں کو بیوٹی پارلر کا راستہ دکھاتی ہے۔ اگر واجد جمیلہ پر تنقید نہ کرتا تو وہ کبھی اس طرف نہ آتی۔ جمیلہ نے ایک دن بتایا کہ جب سے وہ

تھریڈنگ کے بعد واجد سے ملنے لگی ہے تو وہ محبوبانہ انداز میں اس کے چہرے کی صباحت اور گیسوئے دراز کی تعریفیں کرتا رہتا ہے۔ باربر ماسٹر رمزی نے جمیلہ سے کئی بار کہا۔

''آپ کے بال واقعی خوبصورت ہیں۔ اگر آپ کبھی بال ترشوانا چاہیں تو سیدھی ہمارے پاس آیئے گا، ہم بالکل مفت آپ کے بالوں کو تراش کر سیٹ کر دیں گے اور آپ کو دو سو روپے بھی دیں گے۔ ہم ضرورت مند عورتوں کو سو روپے سے زیادہ نہیں دیتے مگر آپ کے بال ایکسٹرا آرڈنری ہیں۔ ایکسٹرا آرڈنری سمجھتی ہیں؟ ہاں یاد آیا، آپ تو انگلش کی ٹیچر ہیں۔ ضرور سمجھتی ہوں گی''۔

جمیلہ نے مسکرا کر جواب دیا ''میں ایک ہی بات سمجھتی ہوں کہ میرے بال واجد کو بے حد پسند ہیں وہ اتنے لانبے بالوں کی وجہ سے مجھے ہزاروں کے مجمع میں پہچان جاتا ہے''۔

یہ کہتے کہتے اس نے شرما کر گردن جھکا لی۔ میں اس کے پیچھے دوسرے آئینے کے مقابل دوسری عورت کے بال سیٹ کر رہا تھا لیکن اس آئینے میں بھی جمیلہ نظر آ رہی تھی اس کی شرمیلی سوچ بتا رہی تھی کہ اس کا دلہا کنواری زلفوں کی خوشبو میں، گھنی زلفوں کی چھاؤں میں، لانبی زلفوں کی سیج پر اور کالی زلفوں کی رات میں کیسے صبح کرے گا۔

اس شرمیلی کو سوچنے دیجیے۔ جب وہ زندگی کے کسی نئے موڑ پر پہنچے گی تو میں آپ کو وہاں بھی پہنچا دوں گا۔ اب آپ دوسرا آئینہ دیکھیں۔ اس آئینے کے روبرو میڈم فیروزہ ہر دوسرے تیسرے دن آ کر بیٹھتی ہیں۔ میرے اندازے کے مطابق ان کی عمر چالیس برس ہو گی لیکن عورت کو عورت ہی پہچانتی ہے۔ سوئٹی نے مجھ سے شرط لگائی کہ میڈم پچاس برس سے نیچے کی نہیں ہیں کچھ اوپر ہی ہوں گی۔ چونکہ وہ دولت مند ہیں اچھا کھاتی ہیں اور پہنتی ہیں، کسی بھی فکر میں دبلی نہیں ہوتیں اور ڈائٹنگ کی وجہ سے موٹی نہیں ہوتیں اسی لیے ان کی صحیح عمر کا اندازہ نہیں کیا جا سکتا۔

اتنا تو میں سمجھ گیا تھا وہ اپنی دولت سے جوانی خریدنے کے لیے بیوٹی پارلر میں آتی تھیں۔ کبھی بالوں کی سفیدی کو چھپانے کے لیے بلیک یا براؤن کلر کی ڈائنگ کراتی تھیں کبھی خوبصورت بالوں کی وگ سیٹ کراتی تھیں۔ ایسے وقت انہیں اکثر جمیلہ یاد آ جاتی۔ ایک دن وہ مجھ سے بولیں۔

''وہ لڑکی یاد ہے نا، وہ جو پرسوں آئینے کے سامنے تھریڈنگ کروا رہی تھی؟''

انہوں نے جمیلہ کا حلیہ بتایا۔ میں نے اثبات میں سر ہلا کر کہا۔

''جی ہاں۔ اس باجی کا نام جمیلہ ہے۔ وہ ایک انگلش اسکول میں ٹیچر ہیں''۔

''وہ کچھ بھی ہو'' میڈم نے پہلے ناگواری سے کہا۔ پھر حسرت سے بولیں ''اس کے بال کتنے خوبصورت ہیں۔ ایسی قدرتی ملائمت اور چمک میں نے کسی کے بالوں میں نہیں دیکھی ہے''۔

یہ کہہ انہوں نے ایک انگلی کے اشارے سے مجھے اپنے قریب جھکنے کے لیے کہا۔ جب میں ذرا قریب جھک گیا تو وہ بڑی آہستگی سے بولی۔

''تمہارا باربر ماسٹر رمزی مجھے اصلی بالوں کی وگ پندرہ سو روپے میں دیتا ہے۔ اس سے کہو کہ اگر وہ میرے لیے جمیلہ کے بالوں کی وگ تیار کر دے تو میں دوگنی قیمت دوں گی۔ پورے تین ہزار روپے''۔

مجھے میڈم کی یہ خریدنے والی ذہنیت بہت بری لگی۔ یوں تو جمیلہ کے بال ہم بھی خریدنا چاہتے تھے مگر ہمارے خریدنے کے انداز میں تکبر نہیں تھا۔ ہم نے اس سے کہا تھا کہ اگر وہ کبھی اپنے بال کٹوانا چاہے تب ہم اسے دو

سو روپے دیں گے لیکن میڈم ہمارے آگے تین ہزار کا چارہ ڈال کر ایک طرح للچا رہی تھی اور بھڑ کا رہی تھی کہ ہم کسی طرح جمیلہ کو بال کٹوانے پر راضی کر لیں۔

سچ پوچھئے تو مجھے جمیلہ سے دلی لگاؤ تھا۔ آپ اسے عشق نہ سمجھیں۔ سچے عشق یا سستی محبت سے قطع نظر ہمارے دلوں میں کبھی کبھی کسی کے لیے اچھائی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ وہی جذبہ مجھ میں تھا۔ اس بے چاری جمیلہ کے پاس کیا تھا؟ وہ حسین نہیں تھی، دل نشین نہیں تھی۔ نہ جانے کتنے انتظار کے بعد اسے دل نشین بننے کیلئے ایک واجد کا دل ملا تھا۔ اب وہ واجد کی نظروں میں حسین بن کر رہنے کے لیے ہمارے ہاں آ کر اپنے چہرے کو جھاڑتی پونچھتی رہتی تھی۔ اس طرح وہ بہت زیادہ خوبصورت تو نہیں بن جاتی تھی مگر آئینہ دیکھ کر مطمئن ہو جاتی تھی۔ میں آپ کو ایک پتے کی بات بتاتا ہوں کہ جس عورت کو ایک محبوب کا پیار مل جائے وہ آئینے کے سامنے اپنی آنکھیں کھو دیتی ہے اور محبوب کی آنکھوں سے اپنا جلوہ دیکھتی ہے۔ پس آئینہ وہ ہوتی تھی، پیش آئینہ واجد ہوتا تھا اور چپکے چپکے اس کے دل میں کہتا تھا ''بس مجھے اتنا ہی حسن چاہیے جو صرف میری نگاہوں میں سما کر رہے۔ میں ایسی محدود دولت چاہتا ہوں جسے کوئی چرانے کی کوشش نہ کرے۔ جب مجھے بہت زیادہ حسن کی تمنا ہوگی تو میں تمہارے دل میں جھانک کر یہ گیان حاصل کر لوں گا کہ ایک خوبصورت چہرہ بڑھاپے میں مر جاتا ہے مگر ایک خوبصورت دل کبھی نہیں مرتا۔ لیلیٰ کالی تھی، تمہاری طرح معمولی صورت کی تھی، مگر اس کے دل کی خوبصورتی آج بھی تمام داستانوں میں دھڑکتی ہے''۔

میں میڈم کی بات کر رہا تھا جو بڑھاپے میں جوانی کا پیوند لگانے کے لیے جمیلہ کے بالوں کی وگ پہننا چاہتی تھی۔ یعنی جمیلہ کے پاس جو ایک حسن تھا اسے بھی چھین لینا چاہتی تھی۔ مشرقی طرز کے لانبے بالوں کو مغربی اسٹائل سے تراش دیا جاتا تو بیچاری مشرقی رہتی نہ مغربی۔ یہ انسان یوں تو دوسرے انسان کی جیب سے اس کا آخری پیسہ، اس کے منہ سے آخری نوالے اور اس کے ہونٹ سے مسکراہٹ چھینتا ہی ہے لیکن دوسرے سے چھیننے کے عمل میں دیوانگی ایسی ہے کہ وہ کسی معمولی سی صورت والی کے حسن کی آخری دلکشی بھی چھین لیتا ہے۔ کیا میڈم اس کے بالوں کو اپنے سر پر سجا کر از سر نو جوان بن سکتی تھی؟ نہیں مگر دوسروں سے کچھ چھین لینے کی ازلی خواہش کی تکمیل ہو جاتی تھی۔

ہیئر کٹنگ کے سیلون اور بیوٹی پارلر کے مردانہ حصے میں ایک خوبرو نوجوان کو دیکھیے۔ جب سوئٹی کو میرے تعاون کی ضرورت نہیں ہوتی تو میں مردانہ حصے میں چلا آتا ہوں۔ میں نے اس خوبرو جوان کو اکثر اپنے سیلون میں ایسے وقت دیکھا تھا جب میڈم فیروزہ وہاں پہنچتی تھی، وہ دونوں ویٹنگ روم میں ایک دوسرے کے سامنے بیٹھ کر اپنی اپنی باری کا انتظار کرتے تھے۔ انتظار کے دوران وہ نوجوان اپنے صوفے پر بیٹھا ہوا میڈم کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ میڈم تجاہل عارفانہ سے کام لیتے ہوئے کبھی کسی انگریزی رسالے کی ورق گردانی کرتی تھی، کبھی صوفے پر یہ پہلو سے وہ پہلو بدل کر اپنی خزاں رسیدہ عمر کو کہیں کہیں سے چھپانے کی کوشش کرتی تھی۔

میں اس نوجوان کو آئینہ خانہ میں بھی دیکھتا تھا اور ذاتی طور پر بھی جانتا تھا۔ اس کا نام پھکرو (فخرو) تھا۔ اکثر ناموں سے بھی ان نام والوں کے کردار اور ان کی زندگی کی کسی حد تک عکاسی ہو جاتی ہے۔ فخرو خود اپنے نام کو صحیح طور پر زبان تک نہیں لاسکتا تھا اور نہ ہی اپنی موجودہ زندگی پر فخر کر سکتا تھا۔ کیونکہ وہ ایک ہوٹل کا بیرا تھا۔ اسے تنخواہ کے علاوہ روزانہ اوسطاً پچیس روپے ٹپ کے طور پر مل جاتے تھے۔ یہ بات میڈم کو معلوم نہیں تھی۔ اس لیے کہ فخرو صرف خوش شکل ہی نہیں، خوش پوش بھی تھا۔ اس کے ظاہری حلیے کو دیکھ کر کوئی اسے ہوٹل کا بیرا نہیں کہہ سکتا تھا۔ یہ آمدنی کی بات نہیں ہے،

نمائشی جذبوں کی باتیں ہیں۔ ہوٹل کا بیرا تو کیا، مہتر اور چمار بھی کھچڑی سماج کے نمائشی آئینے میں پہچانے نہیں جاتے۔

میں اس بات پر حیران تھا کہ میڈم پچاس سے اوپر تھیں اور فخرو پچیس سے نیچے تھا۔ میڈم کے دل میں ممتا ہونا چاہیے تھی اور فخرو کی آنکھوں میں کسی حسین کم سن دوشیزہ کے خواب کی چمک ہونا چاہیے تھی مگر وہ اندھی خواہشات کے بازار میں خرید و فروخت کے لیے نکلے تھے اس لیے بوڑھے رشتوں کا تقدس اور جوان خوابوں کا حسن فنا ہو چکا تھا۔

آئینے! تو ابھی بہت کچھ دکھائے گا۔ ذرا دم لے۔ مجھے دوسرے آئینوں میں بھی جھانکنے دے۔ اس آئینہ خانے میں ایک عزت ماب رئیس احمد فدوی بھی نظر آیا کرتے تھے۔ ایک شاندار امپالا میں ان کی چودہ برس کی صاحب زادی مہ جبیں برقعہ پہن کر آتی تھیں۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ پردہ کرنے والیاں بیوٹی پارلر میں کیوں آتی ہیں؟ کیونکہ نمائش اور پردہ داری دو بالکل ہی متضاد عمل ہیں۔ وہ ہمارے ہاں سے بن سنور کر برقعہ کی چار دیواری میں کس طرح نمائشی جذبے کی تسکین کرتی ہیں؟ گھر کی چار دیواری میں جو تقریبات ہوتی ہیں ان میں صرف عورت کو عورت دیکھتی ہے۔ ٹھیک ہے کہ وہاں بھی مقابلہ حسن و سجاوٹ میں عورتیں ایک دوسرے سے برتر ہونے کی پوری کوشش کرتی ہیں لیکن فطرتاً مرد بھی مرد کو اور عورت بھی عورت کو اپنا آپ دکھا کر مطمئن نہیں ہوتی کیونکہ خالق کائنات نے عورت کو شعر کے حسن اور اس کی نزاکت میں ڈھال کر مرد کی زبان کو شاعری کا تکلم عطا کیا ہے۔ ایسا نہ ہوتا تو عورتیں اشعار کی نوک پلک درست کرنے کے لیے بیوٹی پارلر کا رخ نہ کرتیں۔

مہ جبیں کو ابھی مکمل عورت نہیں کہا جا سکتا تھا کیونکہ وہ چودہ برس کی بچی تھی اور عورت کے خانے میں قدم رکھنے کے لیے آئینہ خانے میں آئی تھی، اس کے پاس ساٹھ برس کے بوڑھے رئیس احمد فدوی کی بے انتہا دولت تھی اور قدرت کا دیا ہوا بے مثال حسن تھا۔ بناؤ سنگھار کے بعد وہ فتنہ قیامت بن جاتی تھی۔ اس کے باوجود دل اور زیادہ حسین بننے کے لیے مچلتا ہے۔ اس لیے وہ بھی جمیلہ کے بالوں کو دیکھ کر ترستی تھی۔ رئیس احمد فدوی اپنی لاڈلی کی ہر ضد پوری کرتا تھا۔ وہ بار بار ماسٹر رمزی سے کئی بار کہہ چکا تھا کہ مہ جبین کے لیے جمیلہ کے بالوں کی وگ تیار کی جائے گی تو وہ اس کی بڑی سے بڑی قیمت ادا کرے گا۔

جمیلہ کسی کی دشمن نہیں تھی مگر اس کے بال اس کے دشمن تھے۔ وہاں آنے والی سب ہی حسین اور دولت مند عورتیں اس کے بالوں کو حسرت سے مگر کینہ پرور نگاہوں سے دیکھتی تھیں، چپکے چپکے کہتی تھیں ''جھگی کے فرش پر قالین، ٹاٹ میں مخمل کا پیوند اور سانولے چہرے پر ریشمی زلفیں نہیں سجتیں۔ مانا کہ پھول کسی بالوں میں نہیں کھلتے مگر انہیں شاخ سے توڑ کر بالوں میں سجایا جا سکتا ہے۔ پھر اس جمیلہ کے بال اس کے وجود سے ٹوٹ کر ہمارے حسن کی جلوہ سامانی میں اضافہ کیوں نہیں کر سکتے؟ ضرور کر سکتے ہیں'' چونکہ اپنے حسن میں اضافہ کرنے کی ضد ضرور تھی اس لیے ہر طرف سے بولیاں بڑھ رہی تھیں۔ ان میں سب سے زیادہ دولت مند میڈم فیروزہ اور رئیس احمد فدوی تھے۔ میڈم نے بازار کا بھاؤ دیکھ کر چار ہزار کی بولی دی۔ رئیس احمد فدوی نے چھ ہزار تک چھلانگ لگائی۔ میڈم کو پتہ چلا تو وہ ایک قدم آگے بڑھ کر سات ہزار تک پہنچ گئی۔

چلیے بولیاں بڑھنے دیجیے۔ اس آئینہ خانے میں اب ہمیں بھی دیکھیے ''آخر ہم بھی تو ان آئینوں میں ہر پہلو سے نظر آتے ہیں۔ جیسا کہ میں بیان کر چکا ہوں، ماسٹر رمزی انگلینڈ جانے سے پہلے رمضو نائی تھا اور ایک سڑک کے کنارے کسی فٹ پاتھ پر بیٹھ کر چونی والی حجامت بناتا تھا۔ یہ اس دور کی بات ہے جب مہنگائی لوگوں کی حجامت نہیں

بناتی تھی۔ البتہ محبت اس وقت بھی مہنگی تھی۔ رمضو کو اٹھائیس برس کی عمر میں ایک رئیس زادی سے عشق ہو گیا تھا۔ کہاں ایک رئیس زادی اور کہاں ایک نائی، کہاں آسمان اور کہاں زمین۔ ایک خدا، ایک رسول کو ماننے اور مسلمان ہونے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ کسی کو بے مقصد فرش سے اٹھا کر عرش پر بٹھا دیا جائے۔ ایسا اس لیے نہیں ہوتا کہ سماجی حیثیت، تعلیم، تہذیب اور زندگی گزارنے کا معیار دیکھا جاتا ہے۔ کوئی بھی صاحب عقل اپنی لاڈ پیار سے پالی ہوئی بیٹی کو فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے نائی کے پلے باندھنا گوارا نہیں کرسکتا۔ رمضو کے بوڑھے باپ نے اسے سمجھایا۔

''بیٹا! اپنی حیثیت کو دیکھو۔ سر اٹھا کر آسمان کو دیکھو گے تو گردن دکھنے لگے گی''۔

''نہیں بابا! اگر میں آسمان تک پہنچ جاؤں گا تو پھر گردن نہیں دکھے گی۔ میں یہ حجامت کا پیشہ چھوڑ دوں گا کوئی دوسرا دھندہ کرلوں گا۔ اپنی حیثیت بدل دوں گا''۔

''پیشہ بدلنے سے کیا حیثیت بدل جائے گی؟ جب تمہارے باپ دادا کا ذکر آئے گا تم نائی ہی کہلاؤ گے۔ کیا تم اپنے باپ دادا کو بھی بدل دو گے؟''

رمضو نے جواب نہیں دیا۔ وہ بچپن سے ضدی تھا۔ عشق میں ناکامی ہوئی تو اور ضدی بن گیا۔ اس کے باپ نے کہا۔

''یہ دنیا اپنی ابتدا سے ایسی ہی ہے کہ ہم اپنے باپ دادا کے زمانے سے دیکھتے آرہے ہیں جب ایک انسان محنت، ہنر اور صلاحیت سے بالکل ہی خالی ہوتا ہے تو وہ اعلیٰ خاندان کا لیبل لگا کر دوسروں سے اونچا ہو جاتا ہے۔ خود ہماری برادری میں جو نائی سیلون میں حجامت بناتے ہیں وہ خود کو فٹ پاتھ پر بیٹھنے والے نائیوں سے افضل اور برتر سمجھتے ہیں۔ ایسا ہر مذہب، ہر فرقے اور ہر برادری میں ہوتا ہے۔ انسان کو برابر رہنے کی بجائے بڑا بننے کی ایسی لت پڑ گئی ہے کہ اس نے (نعوذ باللہ) خدا سے بھی برتر ہونے کی کوشش کر ڈالی۔ فرعون اور شداد اسی ذلیل کوشش میں اپنی بلندی سے قبر کی پستی میں چلے گئے۔

بیٹے! میں یہ سمجھانا چاہتا ہوں کہ جب تم اپنی حیثیت بدل کر اور بڑے بن کر جہاں رشتہ مانگنے جاؤ گے وہاں وہ تم سے کچھ اور اونچے بن جائیں گے۔ وہ صرف حجامت بنوانے کے دوران تمہارے سامنے سر جھکاتے ہیں لہٰذا اپنی تسلی کے لیے ان کی حجامت بناتے رہو اور ان کے سر جھکاتے رہو۔ جب یہاں انگریز کی حکومت تھی تو انگریز ہم سے برتر تھے ہمارے آقا تھے اور اس ملک کے تمام لوگوں کو حقارت سے کالا آدمی کہتے تھے۔ کسی کو ان کے برابر بیٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ ہمارے علاقے میں انگریز بہادر تھے ان کے پاس سواری کے لیے ایک بہت تیز رفتار کالی گھوڑی تھی۔ ایک بار انہیں ہمارے علاقے کی گوری پسند آگئی۔ انہوں نے اسے اپنی ریزیڈنسی میں بلوالیا۔ دو دن اور دو راتوں تک گوری کا پتہ نہ چلا۔ تیسرے دن جنگل میں اس کی لاش ملی۔ اسے گولی ماردی گئی تھی۔ پتہ نہیں کیوں؟ وہ تو بے چاری حکم کی بندی تھی۔ آقا کے کسی حکم سے انکار نہیں کیا ہوگا۔ اس ظلم کے خلاف کسی نے آواز نہیں اٹھائی۔ کس کی مجال تھی کہ انگریز بہادر کے خلاف چوں بھی کرتا۔ جب وہ صاحب یہاں سے جانے لگے تو ریاست کے ایک راجکمار نے ان سے درخواست کی کہ ان کی کالی گھوڑی اسے نشانی کے طور پر دے دی جائے۔

''نو نو جس پر ہم سواری کرتا، اس پر کالا آدمی سواری نئی کرنے سکتا''۔

یہ کہہ کر انگریز بہادر نے کالی گھوڑی کو اسی وقت گولی ماردی۔ پھر اسے بھی جنگل میں پھینکوادیا۔ یہ انسان کے

برتر بننے کی داستان! تم مغرور انسانوں کی دنیا میں جس مقام پر ہو وہاں سے اونچا اڑنے کی کوشش نہ کرو''۔

بار بر ماسٹر رمزی کے بوڑھے باپ نے اسے اپنے طور پر بہت سمجھایا لیکن وہ اونچا اڑنے کے لیے لندن چلا گیا۔ ہمارے سیلون اور بیوٹی پارلر میں جب رات کے آٹھ نو بجے سناٹا ہو جاتا ہے، اس وقت مے سٹر رمزی لندن اور انگریزوں کے بارے میں بہت کچھ بتاتا رہتا تھا۔ ایک رات جب سوئٹی موجود نہیں تھی تو میں نے اس سے پوچھا۔

''مے سٹر! یہ سوئٹی تمہارے ہاتھ کیسے لگ گئی؟''

اس نے ایک قہقہہ لگانے کے بعد جواب دیا ''سوئٹی جیسی لڑکیاں لندن کے گلی کوچوں میں مل جاتی ہیں۔ جس سیلون میں، میں کام کرتا تھا وہاں سوئٹی بھی کام کرنے آتی تھی۔ وہ خود ہی میری طرف مائل ہونے لگی تب مجھے اپنے باپ کی بہت سی باتیں یاد آئیں۔ میں نے سوچا یہ سوئٹی اسی انگریز کی بیٹی، پوتی یا نواسی ہوگی جس نے ہمارے گاؤں کی گوری کو اور کالی گھوڑی کو برتری کے غرور میں گولی ماردی تھی۔ تاریخ کے اس موڑ پر اب مجھے برتر ہونے کا موقع ملا تھا اس لیے میں انگریز بہادر کی نگری سے سوئٹی کو یہاں لے آیا''۔

یہ کہہ کر وہ فاتحانہ انداز میں مسکرانے لگا۔ اس کی مسکراہٹ بتارہی تھی کہ سوئٹی کو اس نے محبت یا کسی مہربان جذبے کے تحت نہیں اپنایا تھا بلکہ بہت پرانا انتقام لیا تھا۔ پتہ نہیں کیوں انتقام لینے کیلئے اکثر عورت ہی نشانہ بنتی ہے، انصاف کی نظر سے دیکھا جائے تو تاریخ کے اس موڑ پر گوری مظلوم تھی اور تاریخ کے اس موڑ پر سوئٹی مظلوم بن گئی تھی۔

آیئے اب آئینہ خانے میں ذرا سوئٹی کو دیکھیے۔

مجھے سوئٹی سے اکثر تنہائی میں باتیں کرنے کا موقع مل جاتا تھا۔ بڑے بڑے گھرانوں کی عورتیں کبھی مجھے اور کبھی ماسٹر رمزی کو وگ لگانے اور پلکیں لگانے کے لیے اپنے گھر بلایا کرتی تھیں۔ جب ماسٹر رمزی ان خدمات کے لیے دکان سے باہر جاتا تو سوئٹی مجھے اکثر اپنے بارے میں بہت کچھ بتایا کرتی تھی۔ یہ تو بعد میں پتہ چلتا ہے کہ عورت بہت کچھ بتانے کے باوجود اپنے بارے میں کچھ نہیں بتاتی۔

ابتدا میں اس نے یہی کہا تھا کہ وہ ایک اعلیٰ خاندان کی لڑکی ہے۔ زلفوں کو تراشنے اور سنوارنے کا کام محض اس نے مشغلے کے طور پر سیکھا تھا۔ پھر حالات سے مجبور ہو کر ملازمت کر لی۔ اس وقت تک وہ معصوم اور اچھوتی دوشیزہ تھی۔ ماسٹر رمزی اس کی زندگی کا پہلا مرد تھا۔ یہ دعویٰ ہر عورت کرتی ہے لیکن سوئٹی جیسی بھاری بھرکم عورت یہ دعویٰ کرے تو مشکل ہی سے یقین آتا ہے۔ ویسے میں کسی عورت کا دل نہیں توڑتا۔ ایک احمق کی طرح سوئٹی کی ہر بات کو سچ سمجھ لیتا تھا اس لیے وہ مجھ سے بہت خوش تھی۔ مجھے اپنا دوست اور ہمدرد سمجھ کر میرے سامنے رمزی کی شکایت کرتی تھی کہ وہ اس سے لڑتا جھگڑتا رہتا ہے اور اسے چھوڑ دینے کی دھمکی دیتا ہے۔

ایسا کہتے وقت وہ مجھے یوں دیکھتی تھی جیسے رمزی سے چھوٹنے کے بعد سہارا تلاش کر رہی ہو لیکن میرے لیے اتنی بڑی میم کو پالنا ہاتھی پالنے کے برابر تھا اس لیے میں اسے دور ہی سے دیکھ کر خوش رہتا تھا۔ ایک صبح میں کام کے اوقات کے مطابق دکان پر آیا تو دکان بند تھی۔ اس کی چابیاں رمزی کے پاس رہتی تھی۔ وہی سوئٹی کے ساتھ صبح آکر دکان کھولتا تھا۔ جب دیر ہوگئی تو میں خیریت معلوم کرنے کے لیے اس کی کوٹھی کی طرف چلا گیا۔ ادھر میں گیا ادھر ماسٹر رمزی نے آکر دکان کھول لی۔ لیکن کوٹھی میں سوئٹی سے ملاقات ہوگئی۔ میں نے اسے بڑی اجڑی ہوئی حالت میں دیکھا۔ وہ پلنگ کے پاس فرش پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اس کا شب خوابی کا لباس تار تار تھا اور ایسی بے لباسی تھی کہ بدن کا تار تار نظر آرہا

تھا۔اس وقت پہلی بار مجھے معلوم ہوا کہ آئینے خانے میں ہر پہلو سے صحت مند اور جوان نظر آنے والی اندر سے کتنی کھوکھلی اور خزاں رسیدہ ہے۔ مجھ پر نظر پڑتے ہی وہ ایک دم سے سمٹ کر خود کو چھپانے کی کوشش کرتے ہوئے چیخ کر بولی۔

''یو نان سنس! گٹ آؤٹ......''

میں جلدی سے آؤٹ ہوگیا۔ دوسرے کمرے میں آکر حیرانی سے سوچنے لگا کہ میں نے آئینہ خانے میں نظر آنے والی سوئٹی کو دیکھا تھا یا سوئٹی کی بوڑھی ماں کو؟ نہیں سچائی زہر سے بھی زیادہ زہریلی ہوتی ہے اور حقیقت یہ ہے کہ ایسی فیشن زدہ جوان عورتیں اپنے بیڈروم کی تنہائی میں خود اپنی اماں جان نظر آتی ہیں لیکن مجھے ایسی باتیں نہیں کرنا چاہئیں۔ایسی ہی عورتوں کے دم قدم سے ہمارے بیوٹی پارلر کا کام چلتا ہے۔میں تھوڑی دیر تک سوئٹی کا انتظار کرتا رہا پھر سمجھ میں آگیا کہ میں نے ایک عورت کے اندر جھانک کر اس کے غرور کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ وہ ابھی سامنے نہیں آئے گی۔ مجھے بھی اس کا سامنا نہیں کرنا چاہیے لہٰذا میں دکان پر واپس چلا آیا۔ وہاں ماسٹر رمزی کا موڈ بگڑا ہوا تھا۔اس وقت کوئی گاہک نہیں آیا تھا ورنہ وہ جبراً مسکراتا رہتا۔اس نے ناگواری سے پوچھا''آج تم اتنی دیر سے کیوں آئے ہو؟''

''ماسٹر! میں وقت پر آیا تھا پھر تم سے چابیاں لینے کے لیے تمہاری کوٹھی کی طرف جانا پڑا۔ابھی وہیں سے آرہا ہوں''۔

اس نے چونک کر پوچھا'' کیا سوئٹی تمہارے سامنے آئی تھی؟''

''ہاں نن نہیں......'' میں بوکھلا گیا کہ جواب کیا دوں؟ پھر میں نے سچ کہہ دیا''وہ میرے سامنے نہیں آئی تھی، میں اس کے سامنے پہنچ گیا تھا''۔

اس نے غصے سے میرا گریبان پکڑ کر مجھے جھنجھوڑتے ہوئے کہا''تم بے وقوف کے بچے! تم بغیر دستک دیئے کوٹھی کے اندر کیوں گئے تھے۔ یہ آؤٹ آف ایٹی کیٹ ہے۔ایٹی کیٹ کا مطلب جانتے ہو؟ نہیں تم حجام ہو، تم کیسے جانو گے''۔

میں نے کہا''میرا گریبان چھوڑ دو، ورنہ سوئٹی کے لباس کی طرح تار تار ہو جائے گا''۔

وہ ایک دم سے ڈھیلا پڑ گیا۔ میرا گریبان چھوڑ کر پیچھے رکھی ہوئی ریوالونگ چیئر پر گر پڑا۔ پھر دیدے پھاڑ کر مجھے یوں دیکھنے لگا جیسے معلوم کرنا چاہتا ہو کہ میری ان آنکھوں نے کیا دیکھا ہے کہاں تک دیکھا ہے؟ میں نے کہا۔

''مجھے آج معلوم ہوگیا کہ تم لندن کے کباڑ خانے سے سوئٹی کو کتنی خوبصورتی کے ساتھ پیک کر کے لائے ہو۔تم نے ایسا کیوں کیا؟ ہماری برادری میں نوجوان اور خوبصورت لڑکیوں کی کمی ہے؟''

''تم میرے ذاتی معاملات میں بولنے والے کون ہوتے ہو؟ جو میں نے بہتر سمجھا وہی کیا''۔

''اگر بہتر سمجھ کر کیا ہے تو پھر تم نے سوئٹی کو مارا کیوں؟ اس کے کپڑے کیوں پھاڑ ڈالے؟ نہیں، جو حماقت تم کر بیٹھے ہو، اسے اپنی ذات تک محدود رکھ کر دنیا والوں سے چھپا رہے ہو''۔

وہ ریوالونگ چیئر پر دوسری طرف گھوم گیا۔ میری طرف پشت کرلی۔ مجھ سے اپنا منہ چھپالیا۔ اس کے بعد کہنے لگا'' کیا میں نے لندن جانے سے پہلے اپنے ہی ملک کی، اپنے ہی مذہب کی ایک لڑکی کا رشتہ نہیں مانگا تھا؟ مجھے وہاں سے رشتہ نہیں حقارت ملی''۔

''تم اپنی حیثیت سے زیادہ مانگ رہے تھے'' میں نے کہا۔

''دیکھو حیثیت کی بات نہ کرو۔ شریفوں کے ہاں جب کوئی لڑکی کا رشتہ مانگنے جاتا ہے تو انکار کی صورت میں

کئی طرح کی باتیں بنائی جاتی ہیں مثلاً یہ کہ لڑکی ابھی پڑھ رہی ہے یا لڑکی کا رشتہ پہلے ہی سے کہیں طے ہو چکا ہے۔ اس طرح شریفانہ انداز میں باتیں بنا کر ٹالنا بہتر ہے یا رشتہ مانگنے والے کی حیثیت پر تنقید کرنا بہتر ہے؟ تمہیں کیا معلوم کہ انہوں نے مجھے دو ٹکے کا نائی کہہ کر ذلیل کیا تھا''۔

مجھے اس کا چہرہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ ہاتھ نظر آ رہے تھے۔ وہ غصے سے مٹھیاں بھینچ رہا تھا ''ہاں میں نائی ہوں مگر انسان بھی تو ہوں۔ دوسرے انسانوں کی طرح میرا دل بھی تو آرزوؤں کا گھر ہے۔ اگر میں اونچی کوالٹی کی آرزو کرتا ہوں تو مجھے بتایا جائے کہ اس کوالٹی کو چھونے کے لیے کتنی آزمائشوں سے گزرنا ہوگا؟ فرہاد کی طرح تیشہ لے کر چٹانوں کے سینے سے دودھ کی نہر نکالنی ہوگی یا قارون کا خزانہ لانا ہوگا؟ یہ لوگ انسان ہو کر انسانوں کو نہیں سمجھتے کہ وہ کیسا ضدی ہوتا ہے اسے آزمائش میں مبتلا کیا جائے تو وہ ذرے سے آفتاب بن جاتا ہے۔ میں نے بھی اپنی حیثیت بدل دی۔ اب کون ہے جو مجھے فٹ پاتھ کا نائی کہہ سکتا ہے۔ میرے پاس ایک شاندار کوٹھی ہے، کار ہے، انکم ٹیکس والے میری صحیح آمدنی تک نہیں پہنچ سکتے''۔ وہ ریوالونگ چیئر پر یک بیک گھوم کر میرے روبرو ہوگیا ''اگر حیثیت دولت سے بنتی ہے تو میں دولت مند ہوں۔ اگر شرافت سے بنتی ہے تو میں نے اپنی ذات سے آج تک کسی کا دل نہیں دکھایا۔ کوئی غیر شریفانہ حرکت نہیں کی اور اگر حیثیت مذہب سے بنتی ہے تو الحمد للہ میں مسلمان ہوں اور آخری نبی ﷺ کی امت سے ہوں۔ اس کے باوجود اپنے اعلیٰ خاندان پر فخر کرنے والے مجھے یا تو مسلمان نہیں سمجھتے یا انسان نہیں سمجھتے صرف نائی کہتے ہیں''۔

''تمہاری ان تھک کوششوں کو دیکھنے کے بعد اب میں کہہ سکتا ہوں کہ انسان اپنی جدوجہد سے اپنی حیثیت بدل سکتا ہے۔ دیکھو باٹا کمپنی کے ارب پتی مالک کو کوئی موچی نہیں کہتا۔ اس لیے کہ دنیا کے ایک بڑے حصے میں اس کے نام کا ڈنکا بجتا ہے۔ ہمارے ملک میں جو دولت مند آٹومیٹک ڈرائی کلیننگ کی بڑی بڑی دکانیں چلاتے ہیں کوئی انہیں دھوبی نہیں کہتا۔ اونچی سوسائٹی میں انہیں گلے لگایا جاتا ہے۔ اس طرح تمہیں بھی کوئی نائی نہیں کہے گا۔ ایک بار قسمت آزماؤ تم شریف آدمی ہو، کسی شریف گھرانے کی لڑکی کا رشتہ مانگو۔ لیکن نہیں، میں تمہیں غلط مشورہ دے رہا ہوں کیونکہ تم ایک گوری میم کو بیاہ کر لے آئے ہو''۔

وہ اچانک ہی قہقہے لگانے لگا ''شادی......اور سوئٹی سے ہاہاہاہا''۔

''آخر اس میں قہقہے لگانے کی کیا بات ہے؟'' میں ٹٹولتی ہوئی نظروں سے اسے دیکھنے لگا۔

جب قہقہوں کا طوفان گزر گیا تو اس نے کہا ''میں نے تم سے اور اپنی برادری کے دوسرے لوگوں سے جھوٹ کہا تھا کہ میں سوئٹی کو لندن سے بیاہ کر لایا ہوں''۔

''اس کا مطلب ہے کہ تم نے اسے داشتہ بنا کر رکھا ہے؟''

''نہیں، مجھے غلط نہ سمجھو۔ خدا گواہ ہے کہ میں گناہ گار نہیں ہوں۔ میں نے آج تک کبھی ایک رات بھی سوئٹی کے ساتھ نہیں گزاری۔ ہم دونوں کے بیڈ روم الگ ہیں۔ میں اسے یہاں کیوں لایا یہ بھی سن لو۔ سوئٹی ایک غریب والدین کی بیٹی ہے۔ سلطنت برطانیہ میں جہاں کبھی سورج غروب نہیں ہوتا تھا، اب وہاں غریبی، بھوک، افلاس اور گناہ کی تاریکی چھائی رہتی ہے۔ سوئٹی نے شریفانہ زندگی گزارنے کے لیے ہیئر ڈریسنگ کا کام سیکھا تھا لیکن تکلیف دہ رشتوں کی وہی پرانی کہانی ہے یعنی ماں اندھی، باپ بیمار اور لاغر اور بھائی آوارہ اور بدمعاش لہٰذا سارا بوجھ اور ساری ذمے داریاں ایک لڑکی کے کاندھے پر آجاتی ہیں۔ سوئٹی کو کال گرل بننا پڑا۔ وہ میرے ساتھ جس سیلون میں کام کرتی

تھی وہاں آنے والے کسی گاہک سے معاملہ طے ہوجاتا تو وہ ڈیوٹی کے بعد اس کے ساتھ چلی جاتی''۔

''تمہارے ساتھ کبھی نہیں گئی؟''

''نہیں۔ میں اپنی پارسائی جتاؤں گا تو تم یقین نہیں کرو گے۔ میں اپنے دل کا حال جانتا ہوں۔ میرے دل و دماغ پر بیس برس کی عمر سے صرف ایک ہی حسینہ نقش ہو کر رہ گئی ہے۔ تم سمجھے؟ نہیں سمجھے۔ میں بتاتا ہوں۔ وہی حسینہ جس کا نام ثمینہ ہے اور جس سے میں نے اس وقت محبت کی جب فٹ پاتھ پر بیٹھ کر دو ٹکے کا نائی کہلاتا تھا۔ میں ثمینہ کا ذکر بعد میں کروں گا پہلے سوئٹی کی بات پوری ہونے دو۔

ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ کال گرل بن گئی اس نے کئی بار میرے ساتھ بھی دوست کی حد سے آگے بڑھنا چاہا لیکن میں نے صاف طور پر کہہ دیا۔

''سوئٹی میں تمہارے لندن میں دولت کمانے آیا ہوں۔ میں ضرورت کے مطابق کھاتا ہوں اور ضرورت کے مطابق پہنتا ہوں۔ کوئی تیسرا شوق نہیں کرتا۔ ایک ایک پینی بچاتا ہوں۔ اگر میں اپنی موجودہ حیثیت سے بہت بلند ہو کر اپنے ملک میں نہیں جاؤں گا تو اپنی ثمینہ کو کبھی نہ پاسکوں گا''۔

پہلے پہل سوئٹی کو اپنی توہین کا احساس ہوا کیونکہ وہ میرے روبرو تھی اور میں اسے نظر انداز کر رہا تھا۔ ثمینہ خوابوں سے زیادہ دور تھی پھر بھی میں اسے ترجیح دے رہا تھا۔ اس بات پر وہ مجھ سے کئی ماہ تک ناراض رہی، مجھ سے بات تک کرنا گوارا نہیں کی۔ مجھے کب اس کی پروا تھی۔ میں تو اپنا بینک بیلنس بڑھا رہا تھا اور اسے آئے دن گناہوں کی دلدل میں دھنستے ہوئے دیکھ رہا تھا۔

رفتہ رفتہ وہ کال گرل، ماڈل گرل اور بزنس گرل کی حیثیت سے اتنی عام ہوگئی کہ ہوٹل اور کلبوں کے بیرے اور ٹیکسی ڈرائیور معقول کمیشن پر اسے بزنس پہنچانے لگے۔ تقریباً سات برس تک میں یہ تماشہ دیکھتا رہا۔ اس دوران میں نے خزاں کو بہت آہستہ آہستہ اس کی طرف بڑھتے دیکھا جیسے جیسے جوانی کی چمک ماند پڑتی جاتی تھی ویسے ہی ویسے اس کے میک اپ کے سامان میں اضافہ ہوتا جاتا تھا۔ پہلے وہ ہلکا سا سوسائٹی میک اپ کرتی تھی پھر وقت سے پہلے آنے والے بڑھاپے کو چھپانے کے لیے گہرا چیختا ہوا میک اپ کرنے لگی۔

جوانی اور بڑھاپے کے درمیان سفر کرنے والے اس سچائی کو نہیں سمجھتے کہ عمر کبھی اوپر سے حملہ نہیں کرتی، اندر سے کھوکھلا کرتی ہے۔ جب بڑھاپے کی گرد اندر سے اڑنے لگی تو سوئٹی کو کھانسی آگئی پھر کھانسی کے ساتھ بخار بھی آنے لگا۔ اب وہ پھر میری دوست بن گئی تھی کیونکہ دکھ بیماری میں اسے مجھ جیسے ہمدرد کی ضرورت تھی۔ دن بدن گاہک ٹوٹ رہے تھے، آمدنی گرتی جا رہی تھی، میک اپ اور دواؤں کے اخراجات بڑھتے جا رہے تھے۔ میں نے اس سے سیدھی اور کھری بات کہہ دی۔

''دیکھو سوئٹی! میں ثمینہ کا عاشق بن کر آیا تھا۔ اب بزنس مین بن گیا ہوں۔ میں تمہیں دوبارہ جوان اور صحت مند بنانے کے لیے اپنی محنت کی کمائی کا ایک پونڈ بھی خرچ نہیں کروں گا۔ ہاں اگر گناہوں کے راستے سے واپس آجاؤ تو میں دوسری طرح تمہاری مدد کر سکتا ہوں یعنی تمہیں بہترین وگ بنانے کا فن سکھاؤں گا، اس سے تمہاری آمدنی بڑھ جائے گی''۔

وہ مجھ سے یہ فن سیکھنے لگی۔ میری لاعلمی میں گناہ کے راستے پر چلتی رہی۔ اس عرصے میں اس کے ماں باپ مر چکے تھے بھائی جیل چلا گیا تھا اس کے باوجود اس کے اخراجات بڑھ گئے تھے۔ مزید ایک سال بعد وہ وی ڈی ٹریٹمنٹ

کے لیے اسپتال پہنچا دی گئی۔ وی ڈی ٹریٹمنٹ سمجھتے ہو؟ تم تو کبھی لندن نہیں گئے تم کیسے سمجھو گے میں سمجھاتا ہوں''۔

وہ مجھے سمجھانے لگا کہ لندن میں جو بازاری عورتیں بیماریوں کا گھر بن جاتی ہیں، انہیں ممنوعہ قرار دے کر ان کا باقاعدہ علاج کیا جاتا ہے۔ جب سوئٹی اسپتال سے باہر آئی تو اس کے پرس میں ایک سرخ کارڈ تھا۔ وہ کارڈ ظاہر کرتا تھا کہ سوئٹی زیر علاج ہے لہٰذا مرد اس سے دور رہیں۔ ایسی عورتوں کو اسپتال سے ملنے والے سبز، سرخ، نیلے یا کسی رنگ کے بھی کارڈ اپنے پرس میں رکھنے پڑتے ہیں تاکہ ان کے قریب آنے والے پرس کھول کر دیکھیں اور خطرے سے آگاہ ہو جائیں۔ جس عورت کے پرس میں ایسا کارڈ نہ ہو اسے جیل بھی جانا پڑتا ہے اور بھاری جرمانہ بھی ادا کرنا پڑتا ہے۔

سوئٹی وہ سرخ کارڈ لے کر میرے پاس آئی اور جھاگ کی طرح بیٹھ گئی۔ وہ کارڈ کیا تھا، ایک عورت کا اعمالنامہ تھا۔ حالانکہ اس کارڈ پر صرف چند الفاظ درج تھے لیکن ان کی سرخی بتا رہی تھی کہ وہ آٹھ برس تک کس طرح اپنے لہو کا قطرہ قطرہ ہوس کے درندوں کو پلاتی رہی ہے۔ وہ کارڈ خطرے کا سرخ سگنل تھا۔ وہ کارڈ بے حیائی کے حمام کا تولیہ تھا جسے طبی دھلائی کے دوران سوئٹی کے ہاتھ میں پکڑا دیا گیا تھا۔ وہ ایک آئینہ تھا۔ آنے والے اس میں اپنا مکروہ چہرہ دیکھ کر واپس چلے جاتے تھے۔ ذرا بالغ نظری سے دیکھا جائے تو وہ صرف سوئٹی کا نہیں بلکہ پورے گھناؤنے معاشرے کا شناختی کارڈ تھا۔

وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ اس کی آمدنی کے ذرائع ختم ہو گئے تھے۔ اب ایک ذریعہ تھا کہ سیلون میں محنت کرے اور حلال کی کمائی کھائے۔ وہ کام چور نہیں تھی، محنت کرتی تھی لیکن اخراجات بہت بڑھ گئے تھے کیونکہ وہ بیمار ہونے اور بے کار ہونے کے باوجود اپنے چہرے کو میک اپ کے لوازمات سے اور بھدے جسم کو رسٹ بیلٹ، فوم کے بریزر اور دوسری پیڈنگ کے ذریعے خوبصورت اور پرکشش بنا کر رکھتی تھی۔ عمر کتنی ہی ہو، حالات کیسے ہی ہوں، اکثر عورتیں اپنا آپ دکھائے بغیر اور دیکھنے والوں کی خاموش نگاہوں سے داد وصول کیے بغیر زندہ نہیں رہتیں۔

اس کے ظاہری حسن و شباب سے متاثر ہو کر لوگ اس کے پاس آتے تھے پھر سرخ کارڈ دیکھ کر واپس چلے جاتے تھے۔ وہ آنے والوں کو دھوکہ اس لیے نہیں دے سکتی تھی کہ دوسری لڑکیوں کی طرح اس کے پرس میں صحت یابی کا سرٹیفکیٹ نہیں تھا۔ وہ سرخ کارڈ اس کے دماغ کا پھوڑا بن گیا تھا۔ ایک عورت کو چیلنج کر رہا تھا کہ اب وہ کچھ بھی نہیں رہی اور ایسا توہین آمیز چیلنج کوئی عورت برداشت نہیں کرتی۔ وہ جھنجھلا کر کہنے لگی اب مر جائے گی۔ میں نے پھر اسے سمجھایا۔

''سوئٹی! تم سمجھتی ہو کہ تمہیں کوئی خریدنے آئے تب ہی تمہاری قیمت اور اہمیت واضح ہوگی۔ یہ غلط ہے۔ اپنی قیمت لگانا چھوڑ دو۔ جب کوئی خریدنے آئے اور تم بکنے سے انکار کر دو تو اس کے بعد ہی تمہیں اپنی اہمیت کا اندازہ ہوگا کہ لوگ کس طرح دیوانہ وار تمہاری آرزو کرتے ہیں اور حسرت سے تمہیں دیکھتے رہ جائیں گے کہ تم بکنے والی عورت نہیں ہو''۔

میری بات اس کی سمجھ میں آ گئی۔ اس نے وعدہ کیا کہ اب وہ بکنے کا خیال دل میں نہیں لائے گی۔ میں نے کہا۔

''اب میں پاکستان جانے والا ہوں۔ اگر تم گناہوں سے توبہ کر لو تو میں تمہیں اپنے ساتھ لے جاؤں گا۔ وہاں کسی کو یہ معلوم نہ ہوگا کہ تم کال گرل بن کر زندگی گزار چکی ہو۔ وہاں تمہیں عزت ملے گی۔ میں تمہاری رہائش کا بندوبست کروں گا اور تم میرے سیلون میں جتنا کام کرو گی، اس کا معقول معاوضہ دوں گا''۔

وہ دو دن تک سوچتی رہی، کبھی کبھی پرس کھول کر سرخ کارڈ کو دیکھتی رہی۔ آخر اس نے فیصلہ سنا دیا کہ میرے ساتھ پاکستان جائے گی۔ اس وقت تک میرے دل میں یہی بات تھی کہ میں سوئٹی کو گمراہی سے بچا رہا ہوں۔ جو عزت وہ اپنے وطن میں کھو چکی تھی اسے میں اپنے وطن میں بحال کرنے جا رہا ہوں اور اس کے لیے ایک معقول روزی کا

ذریعہ پیدا کر رہا ہوں لیکن اپنے وطن کی زمین پر پہنچتے ہی ان نیک مقاصد میں میری ذرا سی خودغرضی شامل ہو گئی یعنی وہی دوسروں سے برتر ہونے والا جذبہ میرے دل میں مچلنے لگا۔

میری برادری والے جانتے تھے کہ ثمینہ کا رشتہ نہ ملنے کے باعث میں ضد میں آ کر اپنی حیثیت بلند کرنے گیا ہوں۔ اب لوگ پوچھتے کہ اپنی حیثیت سے اونچے مقام پر میں نے کیا پایا ہے؟ ان کی تسلی کے لیے اور اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے میں نے کہہ دیا ''سوئٹی جیسی خوبصورت میم بیاہ کر لایا ہوں۔ ثمینہ جیسی اب ہزاروں لڑکیاں مجھے مل سکتی ہیں مگر بھائیو! میں نے سوچا اس قوم کی لڑکی بیاہ کر لاؤں جو ہم پر سو سال تک حکومت کر چکی ہے۔ اب میں اس میم پر حکومت کرتا رہوں گا''۔

جھوٹی شان اور اپنا بڑا پن کون نہیں دکھاتا؟ سب ہی اس لعنت میں مبتلا ہیں۔ میں نے ایسی برتری دکھائی ہے جس سے سوئٹی کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا ہے اور نہ ہی اس کے قومی غرور کو ٹھیس پہنچتی ہے۔ اگر پہنچتی تو وہ سرخ کارڈ کے مرحلے تک نہ پہنچتی۔ میں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ ہم ایک کوٹھی میں رہیں گے لیکن ہمارے بیڈروم الگ ہوں گے''۔

باربر ماسٹر رمزی یہ کہہ کر ذرا چپ ہوا۔ پھر میری طرف دیکھ کر بولا۔

''تم سمجھ رہے تھے کہ میں اتنی خوبصورت میم کے ساتھ راتیں گزارتا ہوں، نہیں۔ اب تمہیں یقین آ جانا چاہیے اگر شیطان بہکائے تب بھی بہک کر اس کے پاس نہیں جا سکتا کیونکہ وہ ایک کارڈ یافتہ عورت ہے''۔

میں نے پوچھا ''پھر تم نے اسے اس قدر کیوں مارا کہ کپڑے تک پھاڑ ڈالے؟''

باربر ماسٹر رمزی نے ایک گہری سانس لی۔ پھر دکھے ہوئے دل سے بولا ''سوئٹی نے میرے اعتماد کو ٹھیس پہنچائی ہے۔ کل رات مجھے اس بات کا پتہ چل گیا کہ وہ میرے ساتھ کیوں آئی ہے۔ اس لیے کہ یہاں کسی کال گرل کے پاس شناختی کارڈ نہیں ہوتا، کسی کی اندرونی بیماری کا اشتہار اس کے پرس میں نہیں ہوتا اس لیے وہ بھی یہاں آ کر کارڈ کے بوجھ سے آزاد ہو گئی ہے۔ اس نے لندن چھوڑنے سے پہلے ہی اپنے اس لعنتی کارڈ کے پرزے پرزے کر دیئے تھے اور وہ جو خود وہاں اندر سے پرزے پرزے ہو گئی تھی یہاں آ کر فارن پارٹس کی طرح اسمبل ہو گئی ہے''۔

وہ غصے میں مٹھیاں بھینچ کر بولا ''میں یہ فریب برداشت نہیں کر سکتا۔ کل وہ تمام رات کوٹھی سے غائب رہی۔ صبح واپس آئی تو میں نے اس کی خوب پٹائی کی۔ تب اس نے مجھے بتایا کہ وہ یہاں دکان میں آنے والے گاہکوں کو پھانستی ہے۔ اب سوسائٹی کے ایک بیوٹی پارلر کے مالک نے اسے پھانس لیا ہے، اسے اپنے ہاں کام کرنے کا بہت بڑا آفر دیا ہے لہٰذا وہ مجھے چھوڑ کر جا رہی ہے''۔

باربر ماسٹر رمزی کے چہرے پر غصہ کم اور دکھ کی پرچھائیاں زیادہ تھیں۔ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ ایک گمراہ عورت کو راہ راست پر لا رہا تھا مگر وہ پھر گمراہی کی طرف جا رہی تھی اس کا صدمہ اسے ہونا چاہیے تھا۔ دراصل ہماری اجتماعی زندگی گزارنے کے طور طریقے ہی غلط ہیں۔ ہم غلط ہیں کہ آرائش حسن کے لیے بیوٹی پارلر سجا کر بیٹھتے ہیں، تم غلط ہو کہ تم عورت کو اسی وقت پوجتے ہو جب وہ اپنے حسن و شباب کی ایک ایک نوک پلک درست کر کے بیوٹی پارلر سے باہر آتی ہے۔ جب تک حسن پرستی رہے گی عورت خودنمائی کے طوفان میں اڑتی، بھٹکتی اور گناہوں کی دلدل میں دھنستی رہے گی۔

سوئٹی ماسٹر رمزی کو چھوڑ کر جا رہی تھی۔ وہ اپنی مرضی کی مالک تھی، اسے کوئی نہیں روک سکتا تھا۔ میں نے اسے نظرانداز کر کے ثمینہ کے متعلق پوچھنا چاہا کیونکہ رمزی نے اس کی بات ادھوری چھوڑ دی تھی لیکن ثمینہ کے بارے میں کچھ

پوچھنے سے پہلے ہی بیوٹی پارلر کا دروازہ کھلا اور جمیلہ اندر آ گئی۔ ہم دونوں اپنی جگہ سے اٹھ گئے، میں نے آگے بڑھ کر کہا۔

''آیئے باجی! آپ پورے تین ماہ کے بعد آئی ہیں''۔

وہ رومال سے اپنے چہرے کا پسینہ پونچھتی ہوئی آئینے کے سامنے ایک ریوالونگ چیئر پر بیٹھ گئی۔ تب آئینہ مجھے بتانے لگا کہ وہ بہت زیادہ پریشان ہے۔ میں نے تھریڈنگ کے دوران پوچھا ''باجی! کیا بات ہے آپ پریشان نظر آ رہی ہیں؟''

''آں، ہاں'' وہ تھکی ہوئی آواز میں بولی'' میں بہت پریشان ہوں۔ میرے دن رات کا سکون برباد ہو گیا ہے۔ یہ لوگ میرے بالوں کے پیچھے پڑ گئے ہیں''۔

پہلے تو میڈم فیروزہ میری سہیلی بن گئیں۔ حالانکہ وہ عمر کے لحاظ سے میری ماں بن سکتی ہیں لیکن میں انہیں بوڑھی کہہ کر دکھ نہیں پہچانا چاہتی تھی۔ انہوں نے سہیلی بننے کے بعد مجھے اپنے گھر آنے اور رات کا کھانا اپنے ساتھ کھانے کی دعوت دی۔ پہلے میری سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ مجھ پر اتنی مہربان کیوں ہیں۔ میں میڈم کی کوٹھی پر پہنچی تو ڈائننگ ٹیبل پر پرتکلف کھانے چنے ہوئے تھے۔ مجھ جیسی تنہا لڑکی کے لیے یہ اہتمام کیا گیا تھا۔ کھانے کے دوران انہوں نے پوچھا ''تمہیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو مجھے بتاؤ؟''

میں نے کہا'' آپ نے کھانے کا ایسا انتظام کیا ہے کہ کسی چیز کی ضرورت ہو ہی نہیں سکتی''۔

''میں کھانے کی نہیں، تمہاری دوسری ضرورتوں کی بات کر رہی ہوں۔ مثلاً تمہیں دو، چار، دس ہزار روپے کی ضرورت ہو تو مجھ سے ابھی لے سکتی ہو''۔

میڈم کی بات سن کر میرا ہاتھ کا لقمہ ہاتھ ہی میں رہ گیا۔ میں دو ماہ سے پورے تین ہزار کے لیے بھاگ دوڑ میں لگی ہوئی تھی کیونکہ واجد ٹیکنیکل کالج سے ڈپلومہ حاصل کر چکے ہیں۔ سعودی عرب میں انہیں پانچ ہزار روپے کی ملازمت مل رہی ہے لیکن جو پارٹی انہیں سعودی عرب لے جا رہی ہے جو چھ ہزار روپے کا مطالبہ کر رہی ہے۔ میرے پاس بینک میں دو ہزار روپے ہیں۔ ایک ہزار میں نے اسکول کی ہیڈ مسٹریس سے قرض لیے ہیں۔ باقی تین ہزار کا بندوبست نہ ہو سکا، میڈم نے فراخ دلی دکھائی تو میں نے کہا۔

''آپ واقعی سہیلی بننے کا حق ادا کر رہی ہیں۔ مجھے تین ہزار روپے کی سخت ضرورت ہے، میں دو ماہ کے اندر یہ رقم واپس کر دوں گی''۔

میڈم نے کہا'' واپس کرنے کی ضروت نہیں ہے۔ تم تین ہزار کیا چار ہزار لے جاؤ مگر جمیلہ پلیز اپنے یہ بال تھوڑے سے کاٹ کر دے دو''۔

میں ایک دم سے پریشان ہو کر اس کا منہ تکنے لگی وہ میرے شانے پر بڑی محبت سے ہاتھ رکھ کر بولیں'' ہم آپس میں سہیلیاں ہیں۔ ہمیں ایک دوسرے کے کام آنا چاہیے۔ تمہیں روپے کی ضرورت ہے اور مجھے ان ریشمی زلفوں کی، ہم اسی طرح ایک دوسرے کی ضرورت پوری کر سکتی ہیں''۔

''مگر میں یہ بال نہیں کاٹ سکتی۔ یہ واجد کو بے حد پسند ہیں''۔

''کیا وہ پسند کرنے والا تمہاری تین ہزار روپے کی ضرورت پوری کر سکتا ہے؟''

''میں اپنے واجد کے لیے ہی روپے مانگ رہی ہوں۔ اس رقم سے ان کا مستقبل بن جائے گا''۔

''اچھا تو یوں کہو'' میڈم نے مسکرا کر کہا۔

''تم اپنے محبوب کے لیے دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا رہی ہو۔ دیکھو جمیلہ! جب عورت کسی سے محبت کرتی ہے تو اس پر اپنا سب کچھ قربان کر دیتی ہے۔ کیا تم اپنے واجد کا مستقبل سنوارنے کے لیے اپنے بالوں کی قربانی نہیں دے سکتیں؟''

''میں تو اپنی جان بھی دے سکتی ہوں لیکن واجد مجھے کبھی بال کاٹنے کی اجازت نہیں دیں گے''۔

''صاف کیوں نہیں کہتیں کہ تمہارے پاس ایک یہی بالوں کی خوبصورتی ہے۔ یہ خوبصورتی تمہارے سر سے جھڑ جائے گی تو اپنے محبوب کو دکھانے کے لیے تمہارے پاس کچھ نہیں رہے گا''۔

میڈم نے یہ سب کچھ غصے میں کہا تھا مگر سچ کہا تھا۔ میں خوبصورت نہیں ہوں۔ یہ تو میں بچپن سے جانتی ہوں اور بچپن سے یہ بھی جانتی ہوں کہ میرے بال بہت خوبصورت ہیں۔ اتنے خوبصورت کہ حسین ترین عورتیں بھی یہ زلفیں دیکھ کر احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ جب سے واجد کی نگاہوں نے مجھے پسند کیا ہے تب سے کئی بار میں نے چشم تصور میں اپنے بال کاٹ کر خود کو دیکھا تو پتہ چلا کہ اس طرح واجد کو دکھانے کے لیے میرے پاس کچھ نہیں رہے گا۔ اس لیے میں اپنے بال کبھی نہیں کٹواؤں گی۔ آخر میں بھی ایک عورت ہوں۔ میرے پاس بہت نہ سہی، بال برابر تو خوبصورتی ہو جسے میں اپنے مرد کے سامنے پیش کر سکوں مگر یہ دنیا والے پیار کی خوبصورتی کو نہیں سمجھتے۔ محبت کا سر مونڈنے بیٹھ جاتے ہیں''۔

جمیلہ کی باتیں سن کر میں نے کہا ''ہاں باجی! ہماری اس دنیا میں سب ہی حجام ہیں۔ اپنے مفاد کی خاطر ایک دوسرے کی حجامت بناتے رہتے ہیں۔ اچھا تو پھر آپ نے میڈم کو کیا جواب دیا''۔

میں نے انکار کر دیا۔ وہاں سے اٹھ کر آنے لگی تو میڈم فیروزہ نے غصے سے کہا ''تم اپنے بالوں پر نہ اتراؤ، کسی دن کوئی زبردستی کاٹ کر لے جائے گا تو بھتنی نظر آؤ گی۔ اس وقت میں میڈم کی باتوں کا مطلب نہ سمجھ سکی مگر ایک دن جب میں اسکول سے بچوں کو پڑھا کر واپس آ رہی تھی تو دو بدمعاش میرا پیچھا کرنے لگے۔ میں نے ایک کے ہاتھ میں بڑی سی قینچی دیکھی وہ بار بار اس طرح قینچی چلا رہا تھا جیسے خیال ہی خیال میں میرے بال کاٹ رہا ہو''۔

''اوہ باجی!'' میں نے حیرانی سے کہا ''کہیں ایسا تو نہیں کہ میڈم نے ان بدمعاشوں کو آپ کے پیچھے لگایا ہو؟''

''میں بھی یہی سمجھنے پر مجبور ہوں لیکن میں میڈم کے منہ پر کچھ نہیں کہہ سکتی۔ وہ صاف مکر جائیں گی۔ بہر حال میں نادان بچی نہیں ہوں کہ ان بدمعاشوں سے سہم کر اپنے بال کٹوا دیتی۔ میں نے چلتے چلتے راستہ بدل دیا۔ گھر جانے کی بجائے اس راستے پر چل پڑی جہاں آگے ایک پولیس اسٹیشن تھا۔ ان بدمعاشوں کے قدم سست پڑ گئے۔ جب میں نے پولیس اسٹیشن کے احاطے میں قدم رکھتے ہوئے ان کی طرف دیکھا تو وہ تیزی سے پلٹ کر بھاگتے چلے جا رہے تھے''۔

''یہ آپ نے بڑی عقلمندی کا کام کیا باجی! لڑکیوں کو اس طرح سمجھدار ہونا چاہیے''۔

جمیلہ نے کہا ''اس دن کے بعد وہ بدمعاش دوبارہ نظر نہیں آئے لیکن اس واقعے سے مجھے بڑا دکھ پہنچا ہے۔ میں نے کسی کا کچھ نہیں بگاڑا پھر لوگ میری ذرا سی خوبصورتی کو کاٹ کر پھینکنا چاہتے ہیں۔ کسی کی ناک کاٹ کر، کسی کے منہ پر تیزاب پھینک کر اور کسی کے سر سے بال نوچ کر کیوں بدصورت بنایا جاتا ہے؟ اور دوسروں کو بدصورت بنا کر یہ انسان کیسی غیر انسانی مسرتیں حاصل کرتا ہے۔ ابھی صبح کے وقت میں یہاں آ رہی تھی کہ رئیس احمد قدوی نے میرے قریب اپنی کار روک دی۔ کار کی اگلی سیٹ پر ان کے ساتھ مہ جبیں برقعہ پہنے نقاب الٹائے بیٹھی تھی۔ وہ کھڑکی سے سر نکال کر بولی۔

''جمیلہ باجی! آپ کہاں جا رہی ہیں؟ کار میں آ جائیے ہم آپ کو پہنچا دیں گے''۔

اب بڑے آدمیوں کی مہربانیاں سمجھ میں آجاتی ہیں۔ میں سمجھ گئی کہ یہ چودہ برس کی چھوکری بھی میرے بالوں کے پیچھے پڑ جائے گی۔ میں نے کار میں بیٹھنے سے انکار کیا تو رئیس احمد فدوی بھی التجا کرنے لگے کہ میں مہ جبیں کی بات مان لوں۔ مہ جبیں نے گاڑی سے اتر کر خوشامدانہ انداز میں میرا ہاتھ تھام لیا۔ مجھے مجبوراً بیٹھنا پڑا۔ وہ بھی کار کی پچھلی سیٹ پر میرے پاس آکر بیٹھ گئی اور بیٹھتے ہی بولی۔

''اللہ باجی! آپ کے بال کتنے خوبصورت ہیں۔ انہیں دیکھ کر میں ریشم کو بھول جاتی ہوں''۔

''لیکن میں اپنے بال نہیں کٹواؤں گی''۔

میری صاف گوئی پر پہلے تو وہ دونوں چونک گئے۔ پھر رئیس احمد فدوی نے جلدی سے کہا ''دیٹس آل رائٹ۔ ہم کسی اسنیک بار میں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں گے''۔

''مگر میں نے تو بات ختم کردی ہے''۔

''ٹھیک ہے ہم دوسری بات کریں گے۔ کل میڈم سے مہ جبیں کی ملاقات ہوئی تھی۔ میڈم نے بتایا ہے کہ تمہارا منگیتر سعودی عرب جانا چاہتا ہے شاید تمہیں اور تمہارے منگیتر کو اخبار پڑھنے سے دلچسپی نہیں ہے ورنہ تمہیں اخبار کے ذریعے پتہ چل جاتا کہ کچھ فراڈ پارٹیاں لوگوں سے بڑی بڑی رقمیں لے کر انہیں غیر قانونی طریقے سے لانچ میں لے جاتی ہیں اور کسی ویران صحرا میں لے جا کر چھوڑ دیتی ہیں''۔

میں نے کہا ''ہاں میں نے سنا ہے مگر واجد کہتے ہیں کہ پانچوں انگلیاں برابر نہیں ہوتیں۔ سب ہی فراڈ نہیں ہوتے۔ پھر یہ کہ وہ مرد ہو کر انجانے خطرات سے ڈر جائیں تو کبھی ایک شاندار مستقبل نہیں بنا سکیں گے''۔

''لیکن جمیلہ! اگر میں ایسے انتظامات کردوں کہ خطرات کا شبہ ہی نہ رہے اور ایک پیسہ خرچ کیے بغیر واجد وہاں پہنچ کر سات ہزار روپے ماہوار کمانے لگے تو کیسا ہو؟''

میں نے بڑی بے یقینی سے پوچھا ''سات ہزار روپے ماہوار؟ مم...... مجھے یقین نہیں آتا۔ آپ یہ ملازمت کس طرح دلوائیں گے؟''

رئیس احمد فدوی نے فخریہ انداز میں کہا ''مڈل ایسٹ میں میرا بہت بڑا کاروبار ہے۔ میں یہیں سے تقرری کا لیٹر دوں گا۔ واجد کے یہاں سے جانے کے تمام اخراجات میں برداشت کروں گا۔ تمہاری تسلی کے لیے واپسی کا ٹکٹ بھی اس کے ہاتھ پر رکھ دوں گا۔ اگر وہ ملازمت اس کے مزاج کے خلاف ہو تو وہ کسی وقت بھی بہ آسانی واپس آسکے گا۔ اور کوئی شرط ہو تو بتاؤ؟''

میں بری طرح الجھ کر رہ گئی۔ بچپن سے جن بالوں کو اپنا غرور بناتی آئی تھی، میں انہیں واجد کے لیے اپنے ماتھے پر شکن لائے بغیر کٹوا سکتی ہوں مگر ایک خوف میرے دل میں ہے کہ ان بالوں کے بغیر واجد کو الوداع کہنے ائیر پورٹ پر جاؤں گی تو ملاقات کے آخری لمحے اور جدائی کی پہلی گھڑی میں میرے پاس ایسا کوئی حسن نہیں ہوگا جسے وہ آنکھوں میں سجا کر لے جائیں۔ میں بہت جلد بھولنے والی چیز بن جاؤں گی۔ کوئی عورت نہیں چاہتی کہ اس کا چاہنے والا نظروں سے اوجھل ہوتے ہی اسے بھول جائے۔ میں کیا کروں؟ اپنی محبت کو باندھ کر رکھنے کے لیے میرے پاس صرف زلفوں کی زنجیر ہے۔

''جمیلہ باجی!'' مہ جبیں نے کہا ''آپ گھبراتی کیوں ہیں؟ بال کاٹنے کے بعد دوبارہ بڑھ سکتے ہیں۔ جب

آپ کے واجد صاحب سال دو سال بعد واپس آئیں گے تو آپ کے بالوں میں پھر یہی حسن اور نکھار پیدا ہو چکا ہوگا''۔

''میں اپنی پریشانی کسی کو نہیں سمجھا سکتی۔ ایک شرط پر تمہاری بات مان سکتی ہوں۔ وہ یہ کہ جس دن واجد یہاں سے جائیں گے اس کے دوسرے دن میں تمہیں یہ بال کاٹ کر دے دوں گی''۔

''ڈن'' مہ جبیں نے خوش ہو کر رئیس احمد فدوی سے کہا ''کیوں ڈارلنگ؟''

''یس ہنی! اٹ از ڈن'' رئیس احمد فدوی نے بھی خوشی کا اظہار کیا۔

میں حیرانی سے دونوں کا منہ تکنے لگی، کیونکہ میں انہیں باپ بیٹی سمجھ رہی تھی لیکن وہ ایک دوسرے کو ڈارلنگ اور ہنی کہہ رہے تھے۔ میں نے کہا ''معاف کیجیے کیا میں پوچھ سکتی ہوں کہ آپ دونوں میں رشتہ کیا ہے؟''

''کیوں نہیں۔ یہ میری جان سے زیادہ عزیز شریک حیات ہے''۔

''اور یہ میرے سرتاج ہیں'' مہ جبیں نے کہا۔

میرا منہ حیرت سے کھل گیا۔ چودہ برس کی بیوی، ساٹھ برس کا شوہر۔ دونوں کو دیکھ کر اس رشتے کا یقین نہیں آ رہا تھا مگر سوچ کر یقین کرنا پڑا کہ اتنی کم سن بیوی کو خوش کرنے کے لیے ہی ایک بوڑھا خاوند میرے بالوں کو اتنے مہنگے داموں خرید رہا ہے اور اس قدر ماڈرن ہونے کے باوجود اپنی بیوی کی کم سنی چھپانے کے لیے اسے برقعہ پہنا رہا ہے تاکہ لوگ انہیں باپ بیٹی نہ سمجھیں جبکہ ہم یہی سمجھ رہے تھے''۔

جمیلہ یہ کہہ کر خاموش ہوگئی۔ ہمیں بھی تھوڑی دیر کے لیے چپ سی لگ گئی۔ ہم کہہ بھی کیا سکتے تھے۔ قانون کے مطابق لڑکی سولہ برس سے کم ہو تو نکاح نہیں ہوتا مگر رئیس احمد فدوی جیسے ساٹھ برس کے دولت مند چودہ برس کی تو کیا چار برس کی بچی کو بھی بیوی بنالیں تو ہم ان کا کیا بگاڑ سکتے ہیں؟ جمیلہ اپنی جگہ سے اٹھ کر اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے آئینے میں دیکھنے لگی۔ تھریڈنگ کے بعد اس کی سانولی رنگت نکھر آئی تھی اس نے بل ادا کرتے ہوئے کہا۔

''اگر رئیس احمد فدوی کے وعدے کے مطابق واجد اس ماہ کی پندرہ تاریخ کو سعودی عرب چلے گئے تو میں سولہ تاریخ کو بال کٹوانے آجاؤں گی''۔

وہ سر جھکا کر جانے لگی۔ اس لمحے مجھے یوں لگا جیسے وہ اپنی موت کا دن اور تاریخ مقرر کر کے جارہی ہو۔ باربر ماسٹر رمزی نے پوچھا۔

''باجی آپ سولہ تاریخ کو صبح کو آئیں گی یا شام کو؟''

وہ شام کو آنے کی بات کہہ کر دروازے سے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ماسٹر رمزی نے میرے قریب آکر آہستگی سے کہا۔

''یہاں آنے والی خواتین کے لیے یہ خبر بے حد دلچسپ ہوگی۔ آج سے ہم ہر خاتون کے سامنے گفتگو کے دوران سولہ تاریخ کا ذکر ضرور کریں گے مگر یہ نہیں بتائیں گے کہ جمیلہ صبح آئے گی یا شام کو......''

''ایسا کہنے نہ کہنے سے کیا فرق پڑے گا؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت فرق پڑے گا۔ تم نہیں جانتے یہ بزنس پالیسی ہے، سولہ تاریخ کو دیکھ لینا عورتیں یہاں صبح سے آکر بیٹھ جائیں گی۔ کوئی بال کٹوانے، کوئی بالوں کے اسٹائل میں چینج لانے یا ہیئر کلرنگ کے لیے یا وگ سیٹ کرانے کے بہانے یہاں جمیلہ کو دیکھنے آئیں گی لہٰذا اس روز ہماری چاندی ہوگی''۔

میں سمجھ گیا۔ کچھ خواتین اس لیے آئیں گی کہ انہوں نے جمیلہ کے بالوں کے لیے اونچی اونچی بولیاں دی تھیں اور جمیلہ نے انکار کیا تھا۔ اب وہ طعنے دینے یا چپکے چپکے ہنسنے آئیں گی کہ اسے آخر بکنا پڑا۔ کچھ اس کی صورت دیکھنے آئیں گی کہ وہ بال کٹنے کے بعد کیسی بدصورت لگتی ہے۔ اپنی خوبصورتی پر ناز کرنے کے لیے بے حد ضروری ہے کہ دوسروں کی بدصورتی کا تماشہ دیکھا جائے۔

جب وہ دن گزر گیا اور دکان بند کرنے کا وقت آیا تو ماسٹر رمزی دن بھر کی آمدنی کا حساب کرنے لگا۔ میں نے اس سے کہا۔

''ماسٹر! صبح تمہاری بات ادھوری رہ گئی تھی۔ تم ثمینہ کے متعلق بھی کچھ کہنا چاہتے تھے''۔

ماسٹر رمزی آمدنی کا حساب بھول گیا۔ نوٹ گنتے گنتے ثمینہ کے نام نے گنتی بھلا دی۔ اس نے سر اٹھا کر آئینے میں خود کو دیکھتے ہوئے کہا۔

''ثمینہ ایک تحریک ہے جو محبت کے نام سے میرے اندر پیدا ہوئی ہے۔ اس تحریک نے مجھے فٹ پاتھ سے اٹھا کر اس اونچے مقام تک پہنچا دیا۔ جب میں لندن میں اپنی منزل تک پہنچنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا تو میرے دل میں خیال آیا کہ اب ثمینہ کے والد کو معلوم ہو جانا چاہیے کہ میری حیثیت بدل گئی ہے، میں نے انہیں بڑی عاجزی سے خط لکھا۔ انہیں سمجھایا کہ میں اپنی محنت سے کس مقام پر پہنچ رہا ہوں۔ اگر اشرف المخلوقات بننے کے لیے محنت اور ایمانداری لازمی ہے تو مجھے اشرف اور محنتی سمجھ کر ثمینہ کو انعام کے طور پر میرے نکاح میں دے دیں''۔

اس نے نوٹوں کو سمیٹ کر جیب میں رکھنے کے بعد کہا ''انعام میں یہ کاغذ کے ٹکڑے مل جاتے ہیں مگر محبت نہیں ملتی۔ مجھے امید نہیں تھی کہ میرے خط کا جواب آئے گا۔ اگر آئے گا بھی تو اس میں میرے لیے غصہ بھری گالیاں لکھی ہوں گی مگر خلاف توقع اس کے باپ نے بڑی عاجزی اور نرمی سے لکھا کہ میں اسے رشتہ مانگنے کے لیے خط لکھ کر اس کی بیٹی کو بدنام نہ کروں۔ اس نے اپنے خط میں مجھے بیٹا کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

''بیٹے! ثمینہ جب سے جوان ہوئی تب سے ہم اسے سہاگن بنانے کا خواب دیکھ رہے ہیں۔ خواب اس لیے دیکھ رہے ہیں کہ اپنی برادری سے باہر ہم اس کی شادی نہیں کر سکتے۔ جب میں دولت مند تھا۔ ان دنوں ثمینہ ٹی بی کی مریضہ تھی۔ اس کے باوجود ہماری برادری کے کتنے ہی نوجوانوں کا رشتہ آتا تھا لیکن ہم پہلے اس کا علاج مکمل کرانا چاہتے تھے لہٰذا رشتہ مانگنے والے ثمینہ کی صحت یابی کا انتظار کرنے لگے۔ اسی انتظار میں وہ پچیس برس کی ہوگئی، ہم اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ ہمارا سکہ کھرا ہے پچیس برس کے بعد بھی وہ ہاتھوں ہاتھ لی جائے گی۔

مگر اچانک ہی کاروبار میں ایسا نقصان ہوا کہ گھر کا سامان بکنے لگا۔ ثمینہ تو تندرست ہوگئی مگر غریبی کا روگ لگ گیا۔ اب پتہ چل رہا ہے کہ غریبی اس دنیا کی سب سے گھناؤنی اور چھوت بیماری ہے۔ رشتہ مانگنے والے ثمینہ کی ٹی بی سے نہیں بھاگتے تھے لیکن غریبی سے گھبرا کر بھاگ رہے تھے۔

ایسے وقت تم رشتہ مانگنے آئے تو میں غصہ سے پاگل ہوگیا۔ میں نے تمہیں برتری کے زعم میں گالی دی۔ اس وقت تک یہ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ اپنی ہی برادری والوں کی بے رخی میرے لیے کتنی بڑی گالی بن گئی ہے۔ اسی لیے اب میں تمہیں گالی نہیں دے رہا ہوں۔ ہاتھ جوڑ کر التجا کر رہا ہوں اگر تمہارا خط کسی کے ہاتھ لگ جائے تو ثمینہ خواہ مخواہ بدنام ہو جائے گی۔ اب بھی ہم اسی امید پر جئے جا رہے ہیں کہ کبھی تو ہماری برادری سے کوئی ثمینہ کو اپنی دلہن بنانے کے لیے

آئے گا۔ خدا کے لیے ہمیں اس امید کے سہارے جی لینے دو۔"

ایک بوڑھے باپ کا خط پڑھ کر میں ثمینہ کی عمر کا حساب کرنے لگا۔ ثمینہ مجھ سے ایک برس چھوٹی ہے۔ میں اسے بچپن سے جانتا ہوں۔ میں اکتیس برس کی عمر میں لندن گیا تو وہ تیس برس کی کنواری تھی اور جب لندن سے سات برس بعد اس کے باپ کو خط لکھا تو وہ سینتیس برس کی ہو چکی تھی اور اب دس برس بعد آیا ہوں تو وہ چالیس برس کی کنواری اب تک برادری سسٹم کی مٹھی میں سہاگن بننے کے خواب دیکھ رہی ہے"۔

ماسٹر رمزی پھر ریوالونگ چیئر پر آ کر آرام سے بیٹھ گیا پھر ایک گہری سانس لینے کے بعد بولا "میں نے اپنی برادری والوں میں برتری حاصل کرنے کے لیے جھوٹی شان دکھائی کہ ایک انگریز قوم کی لڑکی بیاہ کر لایا ہوں لیکن اس سے مجھے کچھ حاصل نہ ہوا۔ میری برادری کے لوگ مجھ سے خوش نہیں ہیں۔ سوئی بھی اب جا چکی ہوگی اور ثمینہ رسم و رواج کے اندھے کنویں میں پڑی ہوئی ہے۔ ساری زندگی جدوجہد کرنے کے بعد میں خالی ہاتھ ہوں"۔

میں نے کہا "مے سٹر! اگر تم پہلے ہماری برادری میں کسی لڑکی سے شادی کر لیتے تو یہ ناکامی اور مایوسی نہ ہوتی"۔

"یہ تو وہی بات ہوئی کہ گھر میں روٹی کھا لیتے تو باہر بھوکے نہ مرتے۔ لیکن محبت ایک روٹی کا ٹکڑا نہیں ہوتی کہ گھر کے چولہے پر ہی پک کر پیٹ میں اتر جائے۔ محبت تو کہیں بھی ہو سکتی ہے، کسی سے بھی ہو سکتی ہے۔ کوئی بھی برادری ہو، کوئی بھی مذہب ہو وہ محبت سے خالی نہیں ہوتا۔ جو لوگ اپنا اجلا پن قائم رکھنے کے لیے رسم و رواج کی چار دیواری پر سفیدی پھیرتے رہتے ہیں ان کے گھروں کی بوڑھی کنواریاں اپنے سفید بالوں کو گنتی رہتی ہیں اس کے باوجود میں کہوں گا کہ محبت کی حرارت جوان ہوگی اور مجھے سدا جوان رکھنے کے لیے یہ خیال کافی ہے کہ وہ میرے لیے کنواری بیٹھی ہے"۔

یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ ہم نے تمام بتیاں بجھا دیں۔ تمام آئینے تاریکی میں اندھے ہو گئے۔ جب صبح ہوگی تو پھر انہیں انسانی چہروں کی بصیرت حاصل ہوگی۔ ہم دکان بند کر کے اپنے اپنے گھروں کی طرف چلے گئے۔

O☆O

ہر ماہ کی طرح اس ماہ کی بھی سولہ تاریخ آ گئی۔ اس صبح سب سے پہلے میڈم فیروزہ آئیں اور ماسٹر رمزی سے خوشامدانہ لہجے میں کہنے لگیں۔

"ماسٹر! تم بہت بڑے فن کار ہو اگر چاہو تو جمیلہ کی لانبی زلفوں سے دو وگیں تیار کر سکتے ہو"۔

"مشکل ہے میڈم! جناب رئیس احمد فدوی صاحب نے زلفوں کا پورا لاٹ خرید لیا ہے"۔

"خریدنے سے کیا ہوتا ہے تم ان سے کہنا کہ ایک ہی وگ تیار ہوگی۔ میں تمہیں ابھی پانچ ہزار روپے دیتی ہوں۔ تم ان کے علم میں لائے بغیر دوسری وگ تیار کر کے مجھے دے دو"۔

وہ اپنے پرس سے روپے نکال کر گننے لگی۔ ماسٹر رمزی نے کہا۔

"آپ اور مہ جبیں ہماری مستقل گاہک ہیں اگر مہ جبیں نے آپ کو جمیلہ کے بالوں کی وگ میں دیکھ لیا تو وہ ہم سے ناراض ہو جائے گی"۔

"تم فکر نہ کرو، اگر کبھی اس نے دیکھ لیا تو میں کہہ دوں گی کہ میں نے یہ وگ کسی دوسرے ملک سے منگوائی ہے، کیا اتنی بڑی دنیا میں جمیلہ جیسے بال اور کہیں نہیں پائے جا سکتے ؟"

وہ پانچ ہزار کی رقم ماسٹر کے ہاتھ پر رکھ کر چلی گئی۔ یہ اگرچہ مہ جبیں سے بے ایمانی ہوتی مگر بے ایمانی کہاں

نہیں ہوتی؟ جمیلہ سے کب ایمانداری کا سودا ہوا تھا۔ اپنے بے ایمانی کو جائز اور وقت کا تقاضا ثابت کرنے کے لیے اسی طرح سارے جہاں کی بے ایمانیوں کا حوالہ دیا جاتا ہے۔

شام تک عورتیں آتی رہیں اور جمیلہ کے انتظار میں ہماری آمدنی کا ذریعہ بنتی رہیں۔ شام کو وہ آئی تو اس کے لبوں پر اداس اداس مسکراہٹ تھی۔ اداس اس لیے تھی کہ اس کا واجد جا چکا تھا اور مسکراہٹ اس لیے تھی کہ وہ اپنے محبوب کے لیے قربانی دینے آئی تھی۔ اس کے ساتھ مہ جبیں اور رئیس احمد فدوی بھی تھے۔ ہم نے وقت ضائع نہیں کیا۔ جمیلہ ایک آئینے کے سامنے بیٹھ گئی تو ماسٹر رمزی نے اس کے بالوں کو شانوں کے نیچے ایک فیتے سے باندھ دیا۔ بیوٹی پارلر کی محدود فضا میں گہری خاموشی چھا گئی۔ جہاں ہمیشہ عورتوں کو خوب صورت بنایا جاتا ہے وہاں ایک عورت کو اس کی اکلوتی خوبصورتی سے محروم کر کے بدصورت بنایا جا رہا تھا۔

بندھے ہوئے فیتے کے نیچے بالوں پر قینچی چلنے لگی۔ کرر کرر کی آواز سے قینچی جمیلہ کے ریشمی دل کو کاٹتی جا رہی تھی۔ آئینے میں ماسٹر رمزی، مہ جبیں اور رئیس احمد فدوی جیسے کتنے ہی قاتلوں کے چہرے نظر آ رہے تھے۔ ذرا سی دیر میں کٹے ہوئے گیسو آئینہ کے سامنے اس طرح بچھا کر رکھ دیے گئے جیسے جمیلہ کی لاش رکھی گئی ہو۔ میں نے گھبرا کر آئینے میں اسے دیکھا تو نہ دیکھا گیا۔ جو لڑکی مردہ ہو کر بھی زندہ رہے وہ بڑی بھیانک نظر آتی ہے۔ آپ اپنے مشاہدے کو کام میں لائیں تو یہ حقیقت سمجھ میں آ جائے گی کہ بالوں کو بڑھانے یا گھٹانے سے یا ان کا اسٹائل بدلنے سے چہرے کس طرح بدل جاتے ہیں۔ جمیلہ کا چہرہ وہی تھا مگر چہرے کی جوانی اور تازگی مر گئی تھی۔ اب وہ کم عمر دوشیزہ کی بجائے عمر رسیدہ عورت دکھائی دے رہی تھی۔ گھٹائیں چھٹ جانے کے بعد آسمان ننگا ہو جائے تو دیکھنے کے لیے کچھ نہیں رہ جاتا۔

ایک ایک کر کے سارے تماشائی چلے گئے۔ ماسٹر رمزی نے رئیس احمد فدوی کو سمجھا دیا کہ وگ بنانے کے دوران بہت سے بال ضائع ہو جاتے ہیں لہٰذا اتنے بالوں سے صرف ایک ہی وگ تیار ہو سکے گی۔ مہ جبیں نے اس بحث کو طول نہیں پکڑنے دیا۔ وہ ایک وگ کے لیے راضی ہو گئی کیونکہ ایک وگ سے اس کی ضد پوری ہو رہی تھی۔ وہ اپنے بوڑھے خاوند کو لے کر چلی گئی۔ جمیلہ اس وقت بھی گم صم آئینے کے سامنے بیٹھی خود کو دیکھ رہی تھی، خود کو پہچاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

''باجی!'' میں نے آواز دی تو چونک گئی۔ خالی خالی نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔

''سب چلے گئے؟''

''ہاں باجی! سب چلے گئے''۔

''کسی نے مجھے پہچانا نہیں ہوگا؟''

بڑا ہی زہریلا سوال تھا۔ مطلب نکل جانے کے بعد کون پہچانتا ہے۔ ہم بے بسی سے اس کا منہ تکنے لگے۔ وہ اپنے چہرے پر ہاتھ پھیرتی ہوئی بولی ''اب میرے چہرے سے میری عمر کا پتہ چل رہا ہوگا۔ میں پورے اکتیس برس کی ہوں''۔

یہ کہہ کر اس نے اپنے ہینڈ بیگ سے برقع نکالا پھر اسے پہننے لگی۔ برقع ایسے ہی وقت کام آتا ہے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آیا کہ برقع میں چھپنے والی نے اپنی عمر کیوں نہیں چھپائی اگر وہ نہ بتاتی تو ہم اسے زیادہ سے زیادہ پچیس برس کی کنواری سمجھتے مگر وہ کچھ اور سمجھانے کے لیے اکتیس کا ہندسہ ہمارے ذہن میں چھوڑ گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد میں نے کہا۔

''مے سٹر! یہ اچھا نہیں ہوا۔ جمیلہ کو دیکھ کر یوں لگتا ہے جیسے میرا سر مونڈ دیا گیا ہو بے چاری کو بدصورت بنا کر دنیا والوں کو کیا ملا؟''

''کسی کو بگاڑ کر ایک عجیب طرح کی مسرت حاصل ہوتی ہے۔ کہتے ہیں کہ تہذیب کی ابتدا سے پہلے انسان ہنسنا نہیں جانتا تھا۔ ایک بار ایک شخص نے کسی بات پر دوسرے شخص کے چہرے پر کالک مل دی۔ اس کالک زدہ چہرے کو دیکھ کر سب ہی ہنسنے لگے۔ تب سے یہ بات سمجھ میں آ گئی کہ کسی پر کیچڑ اچھال کر یا بدصورت بنا کر اس کے کپڑے اتار کر یا اسے اپنے مقام سے گرا کر خوب ہنسی آتی ہے۔ آج تک جتنے چٹکلے یا لطیفے گھڑے گئے ہیں ان پر غور کرو تو پتہ چلتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی حماقتوں کی تشہیر کر کے یا اس کی کوئی بدصورتی پیش کر کے یا اس کی توہین کر کے دوسروں کو ہنساتا ہے۔ سب سے قہقہہ آور لطیفے وہ ہوتے ہیں جن میں عورت کی توہین کی جاتی ہے، بے شک ماؤں کے متعلق لطیفے گھڑے گئے ہوں گے مگر وہ قابل اشاعت اس لیے نہیں ہوتے کہ انسان اس سے پیدا ہوتا ہے اور ان کا دودھ پیتا ہے۔ بس اسی مقام پر ہماری خود غرضی کا ثبوت مل جاتا ہے''۔

ماسٹر رمزی بڑے موڈ میں بولتا رہا۔ وہ اس لیے اچھے موڈ میں تھا کہ اس روز توقع سے زیادہ کمائی ہوئی تھی۔ میڈم فیروزہ سے جو پانچ ہزار کی اوپری آمدنی ہوئی تھی اس میں سے مجھے پانچ سو دے کر بولا ''جاؤ موج کرو اور یہ نہ سوچو کہ ایک کو ذبح کرنے سے سب کی بقر عید ہو جاتی ہے''۔

پندرہ دنوں میں دو وگیں تیار ہوئیں۔ رئیس احمد فدوی ایک وگ کی بنوائی کے پانچ سو روپے دے کر اسے اپنی کم سن بیگم کے لیے گھر لے گیا۔ دوسرے دن میڈم فیروزہ آئیں تو ان کے پیچھے پھکرو (فخرو) بھی ویٹنگ روم میں پہنچ گیا۔ پتہ نہیں دل کو دل سے کیسے راہ ہو جاتی ہے۔ وہ چھوکرا اس بوڑھی کے پیچھے کچے دھاگے سے بندھا آتا تھا۔ اس روز میڈم خوشی سے کھلی جا رہی تھی۔ ماسٹر رمزی نے کہا۔

''میڈم! آپ کے لیے وگ تیار ہے مگر ہم یہاں ڈلیوری نہیں دیں گے۔ آپ اپنا پتا بتا دیں۔ میرا آدمی وہاں جا کر آپ کو وگ سیٹ کرنا بتا دے گا''۔

میڈم نے اپنے پرس میں سے ایک کارڈ نکال کر دیتے ہوئے کہا۔

''آج شام کو پانچ بجے تم اپنے آدمی کو بھیج دو۔ اس کے جو پیسے ہوں گے، میں وہیں ادا کر دوں گی''۔

یہ کہہ کر وہ ویٹنگ روم میں چلی گئی کیونکہ فخرو وہاں بیٹھا ہوا تھا۔ ان کا خاموش عشق سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ میڈم کوئی سا انگلش میگزین اٹھا کر ایک صوفے میں بیٹھ جاتی تھی اور بار بار مسکرا کر یوں پہلو بدلتی تھی جیسے ہر پہلو سے اپنی بوڑھی جوانی کی نمائش کر رہی ہو اور فخرو جیسا ناتجربہ کار چھوکرا احساس کمتری میں مبتلا رہتا تھا۔ آخر اس روز میڈم کو ہی ایک قدم آگے بڑھنا پڑا۔

میں نے پارٹیشن کے شیشے کے پار دیکھا۔ جب ویٹنگ روم سے سب چلے گئے تو میڈم اپنی جگہ سے اٹھ کر فخرو کے پاس گئیں۔ اپنا پرس کھول کر ایک کارڈ نکالا پھر اسے فخرو کو دیتے ہوئے کچھ کہا۔ اس کے بعد جواب سنے بغیر وہاں سے چلی گئیں۔ فخرو خوشی سے کانپ رہا تھا، اس کا چہرہ تانبے کی طرح سرخ ہو رہا تھا۔ معلوم ہوتا تھا کہ اسے بہت بڑی دولت مل گئی ہے۔ الو کا پٹھا۔

ماسٹر رمزی کے وعدے کے مطابق میں وگ لے کر میڈم کی کوٹھی میں پہنچا تو ملازم نے مجھے ڈرائنگ روم

میں بٹھایا۔تھوڑی دیر بعد ملازم میرے لیے چائے لے کر آیا۔ میں نے پوچھا۔

''میڈم کیا کر رہی ہیں؟''

''سولہ سنگھار کر رہی ہیں'' اس نے بے زاری سے جواب دیا۔

''تو پھر تم ہی یہاں بیٹھ کر باتیں کرو۔ کچھ تو وقت گزرے گا۔ یہ بتاؤ کیا میڈم اتنی بڑی کوٹھی میں تنہا رہتی ہیں؟ مجھے یہاں کوئی ان کا رشتے دار نظر نہیں آ رہا ہے''۔

ملازم ایک ٹھنڈی سانس لے کر قالین پر بیٹھ گیا، پھر کہنے لگا۔

''میڈم کسی رشتے دار کو یہاں بغیر اجازت آنے نہیں دیتیں۔انہیں تنہا رہنے میں مزہ آتا ہے''۔

''کیا انہوں نے کبھی شادی نہیں کی؟''

''بارہ برس پہلے ان کا ایک شوہر اور ایک بچہ تھا۔شوہر غریب تھا مگر غیرت مند تھا۔وہ میڈم کو منع کرتا تھا وہ کلب وغیرہ نہ جایا کریں۔اس بات پر آئے دن جھگڑے ہوتے رہتے تھے۔وہ ایک غریب شوہر کو حکمران کی حیثیت سے برداشت نہ کر سکیں۔طلاق لے کر انہیں یہاں سے نکال دیا''۔

''اور بچہ؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ بھی اپنے باپ کی گود میں چلا گیا۔ پتہ نہیں وہ باپ بیٹے کہاں چلے گئے۔ بیٹا اب گیارہ برس کا ہو گیا ہوگا مگر میڈم کی آنکھ سے کبھی اس کے لیے آنسو کا ایک قطرہ نہیں نکلا۔یہ دیکھ کر بھی یقین نہیں آتا کہ کوئی ماں ایسی سنگدل بھی ہو سکتی ہے''۔

میں نے چائے کا آخری گھونٹ پی کر پیالی میز پر رکھتے ہوئے کہا۔

''ہو سکتا ہے کہ وہ کبھی تنہائی میں اپنے بچے کو یاد کر کے روتی ہو۔عورت کبھی ممتا سے خالی نہیں ہوتی''۔

''بھئی آپ مجھ سے زیادہ نہیں جانتے۔ جو عورت اس عمر میں بھی سنگھار میز کے سامنے اپنے ہی آپ کو دیکھتی رہتی ہو، وہ کسی عاشق کے بارے میں تو سوچ سکتی ہے کسی بچے کے بارے میں سوچ کر بوڑھی نہیں بن سکتی۔ میں اپنی زبان بند رکھنا چاہتا ہوں۔اگر یہ زبان کھل گئی تو......''

اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی میڈم نے بیڈ روم سے آواز دی کہ مجھے اندر بھیج دیا جائے۔ میں اندر پہنچا تو خواب گاہ تیز قسم کی ولایتی خوشبو سے مہک رہی تھی۔ میڈم نے جوانی کا ہر رنگ اپنے اوپر لیپنے پوتنے کے لیے بڑا گہرا میک اپ کیا تھا۔یعنی بڑھاپے سے جوانی کی طرف آنے کی کوشش کی تھی اور اس کوشش میں نہ ادھر کی رہی تھی نہ ادھر کی۔ان کے ہونٹوں کی لہو رنگ لالی بتا رہی تھی کہ وہ اپنے گیارہ برس کے بچے کا خون چوس کر بیٹھی ہیں۔

میں نے سنگھار میز کے پاس پہنچ کر پلاسٹک کی ڈمی پر کپڑا ہٹایا اور جمیلہ کے بالوں کی وگ ان کے سامنے رکھ دی۔

''اوہ، کتنی خوبصورت وگ ہے'' وہ بالوں پر ہولے سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولیں۔

''اس پلاسٹک کی ڈمی پر یہ بال اتنے خوبصورت لگ رہے ہیں، جانے میرے سر پر کیسا جادو جگائیں گے۔ چلو اسے جلدی سے سیٹ کر دو''۔

اس لمحے میڈم مجھے پلاسٹک کی ڈمی نظر آئیں جو صرف کرائے کی خوبصورتی سے سنواری جاتی ہے۔ میں نے اس وگ کو اٹھا کر ان کے سر پر رکھ دیا۔احتیاط سے سیٹ کرنے لگا۔جمیلہ کے سیاہ بالوں کا کفن پہنانے لگا۔وہ بہت

خوش تھی۔ بار بار آئینے میں خود کو شوخ نظروں سے دیکھ رہی تھیں۔ پھر وہ بڑے اعتماد سے بولیں۔
''آج وہ مجھے دیکھتے ہی دیوانہ ہو جائے گا''۔
''کون؟'' میں نے پوچھا۔
''وہی جو تمہارے سیلون میں آتا ہے۔ آج بھی آیا تھا۔ میں نے اسے چھ بجے آنے کے لیے کہا ہے۔ عجیب بھولا بھالا سا جوان ہے مجھ سے بات کرتے ہوئے شرماتا ہے اسی لیے میں آج تک اس کا نام نہ پوچھ سکی''۔
''اس کا نام پھکرو ہے'' میں نے کہا ''یعنی فخر الدین مگر وہ خود اپنا نام صحیح طور پر ادا نہیں کر سکتا۔ اپنے آپ کو پھکرو کہتا ہے نرا جاہل ہے''۔
میڈم نے آئینے میں سے گھور کر مجھے دیکھا۔ پھر شاید خیال آیا کہ گھور کر دیکھنے سے آنکھوں کا میک اپ بگڑ جائے گا، ابھی ابھی مصنوعی پلکیں لگائی ہیں وہ اپنی جگہ سے ڈھیلی پڑ جائیں گی۔ وہ آہستگی سے بولیں۔
''اگر وہ جاہل ہے تو تمہیں اس کی توہین نہیں کرنی چاہیے۔ میں اسے پڑھاؤں گی، اسے اونچی سوسائٹی کے قابل بناؤں گی۔ جب وہ عمدہ سا سوٹ پہن کر میرے ساتھ کار میں گھومے گا تو ساری دنیا حاسد بن کر ہمیں دیکھتی رہے گی۔ شاید میں اب تک اسی لیے کنواری تھی کہ مجھے فخر الدین جیسا محبوب ملنے والا تھا، بلکہ ملنے والا ہے''۔
مجھے بڑا غصہ آیا، کم بخت ہمیں اندھا سمجھتی تھی کہ ہم اسے کھلی آنکھوں سے دیکھتے نہیں ہیں۔ اس کی عمر اور اس کے جھوٹے کنوارے پن کو نہیں سمجھتے ہیں۔ میں نے بڑے تحمل سے پوچھا۔
''اگر آپ فخر الدین سے شادی کرنا چاہتی ہیں تو میں پیشگی مبارکباد دینا چاہتا ہوں''۔
وہ فوراً ہی بوڑھی اداؤں سے جوان لڑکیوں کی طرح شرمانے لگی۔ میں نے کہا۔
''فخر الدین آپ سے زیادہ شرمیلا ہے۔ اگر آپ بھی شرمائیں گی تو پھر بات آگے نہیں بڑھے گی۔ آپ ہاں یا نہ میں جواب دیں''۔
انہوں نے بدستور شرماتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔ میں نے پھر کہا ''آپ دونوں کا جوڑا بڑا ہی رومانٹک ہے، بڑی اچھی ازدواجی زندگی گزرے گی۔ پھر آپ ایک بچے کی ماں بن جائیں گی''۔
''آں...... بب...... بچہ......'' وہ آگے کچھ نہ کہہ سکیں، اچانک ہی گیارہ برس پہلے کا پھندا ان کے گلے میں پڑ گیا۔ اگر کوئی سنگدل ماں ہو، اس کے دل میں بچے کی یاد اور آنکھوں میں آنسو نہ ہوں، تب بھی زندگی کے کسی موڑ پر ایک لمحے کے لیے اس کی کوکھ میں درد ضرور اٹھتا ہے۔ صرف ایک لمحے کے لیے میڈم کا چہرہ دھواں دھواں سا ہوا تھا۔ دوسرے ہی لمحے وہ سنبھل کر مسکرانے لگیں۔ اسی وقت ملازم نے آکر بتایا کہ کوئی پکھر الدین نام کا لڑکا ملنے آیا ہے۔ وگ ان کے سر پر سیٹ ہو چکی تھی وہ دائیں بائیں گھوم کر آئینہ میں دیکھتے ہوئے بولیں۔
''ونڈرفل۔ میں کتنی بدل گئی ہوں۔ خود پر مرمٹنے کو جی چاہ رہا ہے۔ اب تم ڈرائنگ روم میں بیٹھو، اگر سیٹنگ دوبارہ گڑبڑ ہوئی تو میں تمہیں بلاؤں گی، فکر نہ کرو، تمہیں نقصان نہیں ہوگا میں ڈبل معاوضہ دوں گی''۔
میں نے ڈرائنگ روم کی طرف جاتے ہوئے دیکھا۔ ملازم فخرو کو خواب گاہ کی طرف لے جا رہا تھا۔ میں عمر کا حساب لگایا۔ وہ بیس بائیس برس کا جوان ہوگا۔ میڈم کی آدھی عمر سے بھی کچھ کم ہوگا۔ مگر اس وقت یہ ثابت ہو رہا تھی کہ عشق دماغی طور سے اندھا ہوتا ہے۔

ملازم نے آ کر مجھ سے چائے کے لیے پوچھا تو میں نے انکار کر دیا۔ وہ کسی کام سے کوٹھی کے باہر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد کوٹھی کی ویرانی اور سناٹے میں یہ تجسس بڑھنے لگا کہ میڈم کی خواب گاہ میں کیا ہو رہا تھا؟ مجھے وہ تماشہ دیکھنا چاہیے، اگرچہ یہ غیر اخلاقی حرکت ہوگی لیکن خواب گاہ میں کون سے اخلاق کا مظاہرہ کیا جا رہا ہوگا؟ تھوڑی دیر تک میں نے خود کو اس حرکت سے باز رکھنے کی کوشش کی پھر ناکام ہو کر اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔ ڈرائنگ روم اور بیڈ روم کے درمیان ایک کاریڈور تھا۔ جب میں کاریڈور میں پہنچا تو خواب گاہ کا دروازہ بند نظر آیا۔ مگر کھڑکی کھلی ہوئی تھی اور وہاں سے میڈم کی آواز منتشر ہو رہی تھی۔

''تم بہت شرمیلے ہو۔ میں چار ماہ سے انتظار کر رہی تھی کہ تم آگے بڑھو گے، کچھ بولو گے۔ آخر میں نے تمہیں بلایا ہے تو تم یہاں تک آئے ہو۔ کیا مجھ سے ڈر لگتا ہے؟''

میں نے آگے بڑھ کر کھڑکی کے پردے کی آڑ سے دیکھا سامنے ہی ایک صوفے پر میڈم، فخرو کے ساتھ پھیل کر بیٹھی ہوئی تھی اور فخرو بالکل سمٹا ہوا سا کہہ رہا تھا۔

''آں ہاں ڈر لگتا ہے کیونکہ میں گریب ہوں اور آپ......''

میڈم نے فوراً ہی بات کاٹ کر اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا ''ایسی بات نہ کرو اگر تم غریب ہو تو میں غریب پرور ہوں۔ میں تمہیں اچھی طرح بولنا سکھاؤں گی۔ تمہیں ایک سے ایک عمدہ لباس پہناؤں گی، میری دولت تمہاری ہوگی۔ میں بھی تمہاری ہوں گی، تم اپنے آپ کو چھوٹا سمجھنا چھوڑ دو''۔

''چھوڑ دوں گا، میں کیا کروں۔ بچپن سے مجھے محبت نہیں ملی۔ میرا باپ شرابی، جواری تھا۔ وہ میری بیمار ماں پر جلم کرتا تھا۔ جلم کی بھی ایک انتہا ہوتی ہے وہ برداشت نہ کر سکی۔ جب میں پندرہ برس کا تھا تو وہ مر گئی۔ اس کے بعد میں گھر سے بھاگ گیا محبت کی تلاش میں......''

وہ فخرو کا ہاتھ محبت سے اپنے ہاتھ میں لے کر بولی ''تم بہت دکھی ہو، میں تمہارے دکھ سمیٹ لوں گی''۔

''آپ بڑی مہربان ہیں۔ پہلے ہی دن آپ کو دیکھا تو ایک دم سے اپنی امی کا چہرہ سامنے آ گیا مگر میں ڈرتا تھا کہ میں گریب ہوں اور آپ......''

میڈم گھبرا کر بولیں ''یہ تم کیسی بکواس کر رہے ہو؟''

''اب میں بکواس نہیں کروں گا۔ خود کو چھوٹا نہیں سمجھوں گا۔ مجھے اپنے سینے سے لگا لیجیے امی......''

تڑاخ کی زوردار آواز کے ساتھ فخرو کے منہ پر طمانچہ پڑا۔

''سور کے بچے! مجھے امی کہتا ہے۔ کیا میں تجھے بوڑھی نظر آتی ہوں؟ ذلیل کتے! میں تیرا منہ نوچ لوں گی، تیری زبان جلا ڈالوں گی''۔

وہ غصے کی شدت سے سچ مچ اس کا منہ نوچنے لگیں۔ اس کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر جھٹکے دینے لگیں۔ وہ اپنے بچاؤ کے لیے اِدھر اُدھر یوں ہی ہاتھ چلا رہا تھا کہ ہاتھوں کی زد میں آ کر جمیلہ کے بالوں کی وگ گر پڑی تھی، ململ کا باریک کرتہ پھٹ رہا تھا، چہرے سے میک اپ کا پلاسٹر اکھڑ رہا تھا مگر میڈم کو ہوش نہیں تھا۔ وہ پاگل ہو رہی تھی۔

''دو ٹکے کا چھوکرا باتیں کرنے کی تمیز نہیں ہے۔ اپنی حیثیت سے اونچا اڑنے آیا ہے۔ کتے کمینے۔ اتنے دنوں سے تو مجھے ماں سمجھ کر دیکھ رہا تھا۔ میں تیری آنکھیں پھوڑ دوں گی''۔

ماں کی گالی سے بڑی اور کوئی گالی نہیں ہوتی۔ فخرو کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اس نے ماں کہہ کر کون سی گالی دے دی ہے۔ اگر اسے اتنی ہی عقل ہوتی تو وہ ایک دولت مند، فیشن زدہ عورت کے چہرے پر اپنی ماں کا چہرہ نہ دیکھتا۔ ماں سے مشابہت رکھنے والا چہرہ غریبوں کی بستی میں تلاش کرتا۔ بہت دیر تک مار کھانے کے بعد آخر اس نے بوکھلا کر میڈم کو دھکا دیا۔ وہ صوفے پر گر پڑیں۔ وہ بھاگتا ہوا خواب گاہ سے باہر کاریڈور میں آیا۔ مجھے دیکھ کر ایک ذرا ٹھٹک گیا۔ اس کی سہمی ہوئی آنکھیں آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھیں۔ چہرے پر لانبے ناخنوں کی خراشیں پڑ گئی تھیں۔

اس کے گالوں اور ہونٹوں پر جابجا خون کے ننھے دھبے نظر آرہے تھے۔ وہاں سرخ لہو کی بجائے سرخ لبوں کے بوسے نظر آسکتے تھے اگر وہ صرف ماں نہ کہتا، محبوب کہہ دیتا۔

وہ اپنے چہرے کو پونچھتا ہوا وہاں سے بھاگ گیا۔ میں پلٹ کر کھڑکی کے پار دیکھنے لگا۔ وہ صوفے پر جس انداز میں گری تھی، اسی طرح پڑی ہوئی دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رو رہی تھی۔ دور ایک ریکارڈ پلیئر سے انگریزی گانے کی دھیمی دھیمی سی آواز ابھر کر میڈم کی سسکیوں سے ہم آہنگ ہو رہی تھی۔ ان کے پیچھے دیوار پر ایک نیم عریاں حسین عورت عمر خیام کے زانو پر سر رکھے لیٹی ہوئی شراب کے بھرے ہوئے جام کی طرح چھلک رہی تھی اور صوفے پر جوانی کے خالی جام سے آنسو چھلک رہے تھے۔

تب ریکارڈ پلیئر سے ایک خاص میوزک کی ترتیب کے ساتھ قہقہے سنائی دینے لگے۔ میڈم بوکھلا کر چاروں طرف یوں دیکھنے لگیں جیسے دنیا والے ان پر ہنس رہے ہوں۔ اس وقت صاف طور پر ان کا چہرہ نظر آیا۔ آنسوؤں سے کاجل ڈھل کر رخساروں پر کالک پھیلا رہا تھا۔ مصنوعی پلکیں جھڑ گئی تھیں آنکھوں کا شاعرانہ حسن مر گیا تھا۔ ہونٹوں کی سرخی پھیل گئی تھی۔ چہرے کے نقوش ٹیڑھے میڑھے ہو گئے تھے جمیلہ کے بال سر سے اڑ گئے تھے۔ کسی سے بھیک مانگ کر خوب صورتی لاؤ یا بیوٹی پارلر سے خریدو، وہ زیادہ دیر تک ساتھ نہیں دیتی۔ جو اصل چہرہ ہے وہ بہت جلد بے نقاب ہو جاتا ہے۔

اچانک ہی وہ اپنے خضاب رسیدہ بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر قہقہے لگانے لگیں۔ ریکارڈ پلیئر کی موسیقی سے ابھرنے والے قہقہوں کے پیش منظر میں وہ ایک چڑیل کی طرح ہی ہی ہی ہنستی جا رہی تھی "ہی ہی ہی...... یہ جوانی جاتی ہے تو پھر آتی کیوں نہیں" ہی ہی ہی...... اور جب آتی نہیں ہے تو پھر جاتی کیوں ہے۔ ہی ہی ہی...... میں نے اپنے بچے کی محبت کا گلا گھونٹ دیا تاکہ مجھے کوئی بچے والی نہ سمجھے۔ ہی ہی ہی...... میں نے شوہر کو چھوڑ دیا تاکہ کنواری نظر آؤں۔ میں بیوی ہوں، شوہر سے خالی۔ ہی ہی ہی...... میں ماں ہوں بچے سے خالی۔ میں کنواری ہوں، جوانی سے خالی۔ ہی ہی ہی...... اری او حرام زادی جوانی! میری دولت لے کر ایک بار ایک لمحے کے لیے آجا۔ نہیں تو چھوکرے ماں کہہ کر گالی دیتے رہیں گے"۔

میڈم کی حالت دیکھ کر میں نے سوچا۔ اب اپنی محنت کا معاوضہ نہیں ملے گا۔ میں ان سے معاوضہ مانگوں گا تو وہ مجھ سے جوانی مانگیں گی جبکہ ہم بیوٹی پارلر میں بیٹھ کر مصنوعی جوانی فروخت کرتے ہیں۔ یہ اس لیے کرتے ہیں کہ عارضی طور پر کسی کو جوان بنا کر اس کے بڑھاپے کا غم ہلکا کر دیں مگر غم ہلکا کہاں ہوتا ہے، وہ تو بوجھ بنتے بنتے پاگل بنا دیتا ہے۔ میں اس پاگل عورت کو اس کے حال پر چھوڑ کر چلا آیا۔

اس دن کے بعد میڈم نے ہماری دکان میں آنا چھوڑ دیا۔ شاید اس خیال سے کہ وہاں فخرو سے سامنا ہو گا۔ فخرو بھی میڈم کے ڈر سے ہماری دکان کا راستہ بھول گیا۔ ہمیں گاہکوں کے چھوٹنے کا زیادہ افسوس نہیں ہوتا۔ اس لیے

کہ پرانے جاتے ہیں تو نئے آتے رہتے ہیں۔ نئے گاہک اپنے جلو میں نئی داستانیں لے کر آتے ہیں۔ کیونکہ بیوٹی پارلر اور ہیئر ڈریسنگ سیلون ایسی جگہ ہے جہاں مرد، عورتیں اپنا کوئی عیب، اپنی کوئی بدصورتی یا اپنی عمر چھپانے آتے ہیں۔ بہرحال مجھے موجودہ داستان سے نمٹنے دیجیے۔

اچھے اور خوبصورت کردار ہمیشہ یاد رہتے ہیں۔ جمیلہ مجھے ہمیشہ یاد آتی تھی۔ اس کے بغیر مجھے یوں لگتا تھا جیسے میں اپنے خون کے رشتے سے کٹ گیا ہوں۔ میں ہر روز اس کا انتظار کرتا تھا۔ وہ ہم سے ناراض نہیں ہوسکتی تھی کیونکہ ہم نے اس کی رضامندی سے اس کے بال کاٹے تھے۔ دو ماہ گزر گئے پھر چار ماہ گزر گئے۔ وہ نہیں آئی۔ مہ جبیں اکثر آتی تھی میں نے اس سے پوچھا۔

''باجی! کیا آپ بتاسکتی ہیں کہ جمیلہ باجی آج کل کہاں رہتی ہیں؟''

یہ سوال کرتے وقت میں آئینے میں دیکھ رہا تھا کیونکہ بلجیم کے آئینے اتنے صاف اور شفاف ہوتے ہیں کہ جواب دینے والا اپنے چہرے کے تاثرات کو چھپانا چاہے تو نہیں چھپا سکتا۔ وہ جمیلہ کا نام سن کر بہت ہولے سے چونک گئی۔ پھر بہت جلد سنبھل کر تجاہل عارفانہ سے پوچھا۔

''کون جمیلہ؟''

اس سوال میں کتنا غرور تھا، ایک دولت مند لڑکی کے لیے جمیلہ یاد رکھی جانے والی لڑکی نہیں تھی۔ میں نے کہا۔

''وہی جمیلہ باجی جن کے بالوں کی وگ آپ اکثر......''

''اوہ اچھا اس کالی کلوٹی بدصورت سی لڑکی...... کو پوچھ رہے ہو۔ کیا میں نے ایسی لڑکیوں کا ٹھیکہ لے رکھا ہے؟ مجھ سے کیوں پوچھ رہے ہو؟ اپنا کام کرو''۔

میں چپ چاپ اس لڑکی کے بال سیٹ کرنے لگا۔ جی چاہتا تھا کہ اس کا گلا دبادوں مگر اس کے گلے میں ہیرے کا نیکلس تھا۔ ہماری کمزور انگلیاں اتنی قیمتی گردن کو نہیں دبوچ سکتیں لہٰذا صبر کرنا پڑتا ہے لیکن مہ جبین نے جس طرح جھنجھلا کر جواب دیا تھا اس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ ایک بدصورت لڑکی سے تھوڑی سی خوبصورتی ادھار لے کر احساس کمتری کا شکار ہوگئی ہے۔

تقریباً دس ماہ بعد ایک دن اچانک ہی جمیلہ آگئی۔ میں اسے دیکھتے ہی خوشی سے اچھل پڑا۔ ماسٹر رمزی نے اسی وقت دکان کھولی تھی۔ اس لیے کوئی گاہک نہیں تھا۔ صرف وہ تھی اور ہم تھے۔ دوسرے گاہکوں کے آنے تک اطمینان سے باتیں کرسکتے تھے۔ میں نے آئینے کے سامنے ایک ریوالونگ چیئر کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''آیئے باجی! آپ ایک مدت کے بعد آئی ہیں''۔

''ہاں۔ ایک مدت تک مجھے تھریڈنگ کی ضرورت نہیں پڑی۔ کوئی مجھے دیکھنے والا نہ تھا''۔

وہ کرسی پر آئینے کے سامنے اپنے روبرو بیٹھ گئی۔ بیٹھنے سے پہلے میں نے اس کے بالوں کو دیکھا۔ اس کی زلفیں بڑھتی ہوئی کمر تک پہنچ گئی تھیں۔ ان میں وہی حسن اور ریشم جیسی ملائمت تھی۔ میں نے پوچھا۔

''کیا آپ کے واجد صاحب واپس آگئے؟''

''وہ گئے کب تھے''۔

''کیا مطلب۔ کیا وہ سعودی عرب نہیں گئے تھے؟''

"ہاں گئے تھے مگر ایک ہفتے میں واپس آ گئے۔ انہوں نے مجھ بال کٹی کو دیکھا تو بد دل ہو گئے۔ ناراض ہو گئے کہ میں نے بال کیوں کٹوائے حالانکہ وہ سب کچھ جانتے تھے۔ میں نے پوچھا۔ آپ اتنی جلدی کیوں آ گئے۔ انہوں نے کوئی معقول جواب نہیں دیا۔ یہ کہہ کر چلے گئے کہ واپس آ کر اطمینان سے جواب دیں گے۔

مگر وہ پندرہ دن تک غائب رہے۔ میرا دل بیٹھنے لگا۔ میں ان کے گھر گئی تو دروازے پر تالا پڑا ہوا تھا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر انہیں کیا پریشانی ہے؟ مجھے کیوں نہیں بتاتے؟ میں تو ہمیشہ آڑے وقت میں ان کے کام آتی رہی۔ اگر رئیس احمد فدوی نے ملازمت کا فریب دیا تھا تو مجھے بتانا چاہیے تھا۔ میں ان سے نمٹ لیتی لیکن کوئی ایسی بات نہیں تھی ایک دن میں نے......"

کہتے کہتے اس کے حلق میں آواز اٹک گئی "ایک دن میں نے واجد کو مہ جبیں کے ساتھ شاپنگ کرتے دیکھا"۔

"مہ جبیں کے ساتھ؟" میں نے اور ماسٹر رمزی نے ایک ساتھ حیرانی سے کہا۔

"ہاں شاپنگ سینٹر کے باہر رئیس احمد فدوی کار کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ واجد اور مہ جبیں ہنستے ہوئے باتیں کرتے ہوئے دکان سے باہر آئے اور کار کی پچھلی سیٹ پر بیٹھ گئے۔ واجد اتنا قیمتی سوٹ پہنے ہوئے تھا جیسے واقعی سات ہزار ماہوار کما رہا ہو، کار میں بیٹھنے سے پہلے انہوں نے مجھے دیکھا مگر انجان بن گئے۔ میں گم صم کھڑی رہ گئی۔ میں نے بیچ بازار میں اپنے آنسو کیسے ضبط کیے، یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔ گھر آ کر اتنا روئی کہ واجد نے کبھی ہنسایا بھی نہ ہو گا"۔

"یہ آپ پر بڑا ظلم ہوا ہے باجی! واجد صاحب کو شرم آنا چاہیے"۔

"ہاں انہیں شرم آئی تھی۔ اسی لیے وہ اپنی صفائی پیش کرنے دوسری صبح میرے پاس آئے اور سر جھکا کر کہنے لگے "تمہیں معلوم ہے جمیلہ! جب تم مجھے الوداع کہنے ائیر پورٹ آئی تھیں تو رئیس احمد فدوی اور مہ جبیں بھی وہاں موجود تھے۔ مہ جبیں مجھ سے بڑی لگاوٹ کی باتیں کر رہی تھی۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا "مائی گڈنس جمیلہ نے ہمیں کبھی یہ نہیں بتایا کہ تم اتنے ہینڈسم ہو"۔

میں نے مسکرا کہا "یہ آپ کا حسن نظر ہے"۔

وہ بڑی بے باکی سے کہنے لگی "مگر تمہارے پاس حسن نظر کی کمی ہے اسی لیے تو جمیلہ پر مرمٹے ہو۔ اگر میں تمہیں یہاں اچھی ملازمت دلا دوں تو کرو گے؟ یہاں میرے ساتھ تمہارا اچھا وقت گزرے گا۔ تم اونچی سوسائٹی میں پہنچ جاؤ گے"۔

"محترمہ! ہر شخص اونچا اڑنا چاہتا ہے"۔

میں مہ جبیں سے کھل کر باتیں نہ کر سکا کیونکہ جمیلہ تم آ گئی تھیں۔ اسی روز میں فلائٹ کے ذریعے جدہ چلا گیا۔ تیسرے دن مہ جبیں اپنے بوڑھے شوہر کے ساتھ وہاں پہنچ گئی تو میں یہی سمجھا کہ رئیس احمد فدوی اپنے کاروبار کے سلسلے میں آئے ہیں کیونکہ وہ آتے ہی جنرل منیجر کے کمرے میں چلے گئے۔ میں آؤٹ ڈور لوکیشن میں بجلی کی زیر زمین وائرنگ کے نقشے کو سمجھنے میں مصروف تھا کہ مہ جبیں وہاں پہنچ گئی۔ اس نے نقشے کو میرے سامنے سے ہٹاتے ہوئے کہا۔

"کیا جانوروں کی طرح دھوپ میں کام کر رہے ہو، چلو میں تمہیں انسان بننا سکھاتی ہوں"۔

وہاں سینکڑوں لوگ دھوپ میں کام کر رہے تھے، مہ جبیں کی نظروں میں کوئی بھی انسان نہیں تھا۔ وہ میرے باس کی بیوی تھی اس لیے مجھے کام چھوڑ کر اس کے ساتھ جانا پڑا۔ وہ ایک کار میں بٹھا کر ایک چھوٹی سی شاندار کوٹھی میں لے گئی۔ اس کار کو ڈرائیور چلا رہا تھا اور وہ میرے ساتھ پچھلی سیٹ پر بیٹھی انگریزی میں باتیں کر رہی تھی تاکہ ڈرائیور نہ

سمجھ سکے۔اس کی باتوں اور حرکتوں سے میں نے اندازہ لگایا کہ وہ میری بھوکی ہے اور محض میری خاطر وہاں تک آئی ہے۔

کوٹھی میں کوئی نہیں تھا۔اس نے بیرونی دروازے کو اندر سے بند کرلیا۔ میں نے پریشان ہوکر کہا ''آپ کی بے تکلفی مجھے مہنگی پڑے گی۔ میری ملازمت خطرے میں پڑ جائے گی''۔

جمیلہ! تم نے اسے دیکھا ہے وہ چھوٹے سے قد کی لڑکی ہے تمہاری طرح میرے کاندھے تک نہیں آتی۔ اس نے ایک اسٹول پر کھڑے ہوکر کہا ''یہاں آؤ'' میں قریب گیا تو وہ میری گردن میں بانہیں ڈال کر بولی ''ملازمت کی تم فکر نہ کرو۔ یہ ملازمت بھی میں نے دلوائی ہے۔ وہ بڈھا رئیس احمد فدوی میرے اشاروں پر ناچتا ہے، تم میرا ساتھ دو گے تو ہم دونوں مل کر اسے نچائیں گے''۔

ہم تقریباً چھ گھنٹے تک اس کوٹھی میں بند رہے۔ کیسٹ ریکارڈر سے ڈانس کے لیے فاسٹ ٹمپو کا آرکسٹرا ابھرتا رہا اور ہم اس بڈھے کو نچانے سے پہلے خود ناچتے رہے۔ مہ جبیں خوشی سے پاگل ہو رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ بوڑھا فدوی ڈانس نہیں کرسکتا ہے۔ دو چار اسٹیپنگ کے بعد ہی ہانپنے لگتا ہے۔ زندگی میں اور ہے کیا؟ ایک نوجوان خوبرو پارٹنر اور اس کے بعد ڈانس اینڈ بی میری......''

شام کو رئیس احمد فدوی ورکنگ لوکیشن سے واپس آیا تو مہ جبیں نے دروازہ کھول دیا۔ وہ چپ چاپ اپنے بیڈروم میں چلا گیا۔ ایک گھنٹے تک مہ جبیں مجھ سے دور رہی پھر رئیس احمد فدوی نے مجھے اپنے بیڈروم میں بلایا۔ میں کمرے میں پہنچا تو مہ جبیں اس کے ساتھ ایک صوفے پر بیٹھی ہوئی تھی، میں دوسرے صوفے پر بیٹھ گیا۔ رئیس احمد فدوی نے کہا۔

''مسٹر واجد! آج میں نے اپنے جنرل مینجر سے تمہارے متعلق بات کی ہے اس نے کہا ہے کہ یہاں کام زیادہ نہیں ہے اس لیے تمہاری یہاں ضرورت نہیں ہے، گھبرانے کی بات نہیں، ہم نے جمیلہ سے جو وعدہ کیا ہے وہ پورا کریں گے''۔

مہ جبیں نے کہا ''ڈارلنگ! تم جمیلہ سے کیا ہوا وعدہ نہیں بلکہ میری خواہش کے مطابق ایسا کر رہے ہو۔ اپنے الفاظ واپس لو ورنہ میں ابھی چلی جاؤں گی''۔

وہ جانے کے لیے اٹھ گئی۔ بڈھے نے جلدی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا ''سوری، مجھے معاف کردو۔ تم تو جانتی ہو کہ میں تمہاری مرضی کے بغیر کوئی کام نہیں کرتا۔ میں تمہارے حکم کے مطابق واجد کو اپنے ساتھ واپس لے جاؤں گا''۔

مہ جبیں نے اپنی بات منوالی اور میں ایک ہفتے کے اندر اس کے ساتھ یہاں واپس آگیا۔ یہاں میں رئیس احمد فدوی کا سیکرٹری ہوں لیکن حقیقتاً مہ جبیں کا بوائے فرینڈ ہوں۔ وہ بوڑھا ہوس پرست، دولت مند اپنی حسین اور کم سن بیوی کو کھونا نہیں چاہتا۔ سوچتا ہے کہ وہ کسی کے ساتھ بھاگ جائے گی تو دنیا یہی کہے گی کہ بوڑھا تھا اس لیے جوان بیوی پر لگام نہ ڈال سکا۔ وہ یہ بے عزتی برداشت نہیں کرسکتا لہٰذا اس نے مجھے اپنا سیکرٹری بنا کر لگام ڈال دی ہے''۔

واجد اپنی آپ بیتی سنا رہے تھے اور میں چپ چاپ سن رہی تھی۔ میں کہہ بھی کیا سکتی تھی۔ جنہیں میں نے ٹوٹ کر چاہا اور جن کے لیے اپنی ایک خوبصورتی کو توڑ کر بدصورت بن گئی، جب انہوں نے خود ایک الگ راستہ چن لیا تو میں کیا بول سکتی تھی۔ انہوں نے مجھے خاموش دیکھ کر کہا۔

''تم بولتی کیوں نہیں؟ کچھ بولو، مجھے جتنی باتیں سنا سکتی ہو سناؤ۔ میں صرف بے وفا نہیں، احسان فراموش بھی ہوں مگر کچھ کہنے سے پہلے یہ سمجھ لینا کہ فی زمانہ یہی ہوتا ہے۔ آگے بڑھتے وقت پیچھے نہیں دیکھا جاتا، اوپر چڑھتے وقت

نیچے گرنے والوں کو نہیں پوچھا جاتا۔ اس کے باوجود میں تم سے ملنے آ گیا ہوں"۔

"آپ نے بڑا احسان کیا مگر اخلاقی قدروں کو بھلا کر یہاں نہ آتے تو اچھا ہوتا"۔

"اخلاق اور انسانیت کا معیار دولت والے ہی بناتے ہیں۔ یہ بات تمہاری سمجھ میں نہیں آئے گی۔ میں یہ کہنے آیا ہوں کہ میں تمہارا احسان کبھی نہیں بھول سکتا۔ میں تم سے شادی کروں گا۔ شادی سے پہلے گھر جائیداد اور دولت کے ذرائع کس طرح پیدا کرنے چاہیے یہ میں جانتا ہوں۔ اس لیے تم میری بیوی بن کر رہو گی اور مہ جبیں گرل فرینڈ بن کر رہا کرے گی"۔

میں نے غصے سے چیخ کر کہا "چلے جاؤ یہاں سے اگر لوگ ایسے ہی جیتے ہیں تو میں تمہاری اس دنیا میں جینے سے انکار کر دوں گی۔ میں مر جاؤں گی مگر تمہارے ساتھ کھڑے ہو کر سانس لینا بھی گوارا نہ کروں گی۔ گیٹ آؤٹ......"

مرد ہزار بار گیٹ آؤٹ کہہ دے تب بھی عورت اس کے قدموں سے نہیں جاتی۔ میں نے ایک بار کہا تو وہ چلے گئے۔ اس لیے کہ گیٹ کے باہر دولت اور خوش حالی ہاتھ پھیلائے کھڑی تھی۔ کہتے ہیں زلفوں کی زنجیر بڑی مضبوط ہوتی ہے مگر میں نے وہ بھی اس کے لیے کاٹ ڈالی......"

وہ ڈبڈبائی ہوئی آنکھوں سے آئینے کو دیکھنے لگی۔ یقیناً آئینہ دھندلا رہا ہوگا۔ ماسٹر رمزی نے کہا "اسے بھول جایئے کب تک روتی رہیں گی"۔

وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی "میں صرف اپنے لیے نہیں اس کے لیے بھی رو رہی ہوں کہ اب وہ اس دنیا کے چکلے میں اپنی جوانی کے دوران بکتا رہے گا"۔

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ آئینہ خانہ خالی ہو گیا۔

چور رشتہ

ہماری مہذب سوسائٹی میں جب
وہ رشتہ قائم کرنے کی اجازت
نہیں ملتی تب آدمی تہذیب کے
چور دروازے سے ایک چور کی طرح
اسی رشتے تک پہنچتا ہے۔

انسان کی خواہش ہر لمحے جتنے بچے دیتی ہے ان کا شمار کوئی نہیں کرسکتا۔ ایک خواہش کے بعد دوسری، دوسری کے بعد تیسری، خواہشات سینکڑوں اور ہزاروں کی تعداد میں نوزائیدہ کیڑوں کی طرح کلبلاتی ہوئی دیکھتے ہی دیکھتے جوان ہو جاتی ہیں۔ اس نکتے کے پیش نظر کہا جاتا ہے کہ "ہزاروں خواہشیں ایسی کہ ہر خواہش پر دم نکلے"۔

میرا بھی دم نکل رہا تھا کہ ایک حسین و جمیل محبوبہ کو حاصل کرنے کی خواہش پوری نہیں ہو رہی تھی حالانکہ گھر میں ایک بیوی موجود تھی۔ وہ بیوی پہلے محبوبہ کی حیثیت میں میری زندگی میں آئی تھی لیکن نادان محبوبائیں نہیں سمجھتیں ہیں کہ وہ بیوی بن کر ایک رات گزارنے کے بعد سیکنڈ ہینڈ ہو جاتی ہیں۔ مرد کے لیے پھر ان میں وہ چارم اور پہلے جیسی کشش نہیں رہتی۔ میں ایک عام سی حقیقت بیان کر رہا ہوں، ویسے یہ بھی ایک حقیقت ہے کہ بیوی بنا لینے کے بعد اپنی آخری سانس تک یا بیوی کی آخری سانس تک اس سے محبت کرنی پڑتی ہے اور ہر سانس کے ساتھ یہ خواہش سر ابھارتی ہے کہ بیوی کی سانسیں جلدی پوری ہو جائیں۔

میری ایک بیمار بیوی ہے۔ وہ شادی سے پہلے بھی بیمار رہی تھی۔ دلہن بن کر آئی تو کھانسی اور بخار اپنے جہیز میں لے کر آئی۔ اس کے باوجود میں اس سے محبت کرتا ہوں کیونکہ وہ میرے چار عدد پیارے پیارے پھول جیسے بچوں کی ماں ہے۔ میرا بڑا لڑکا پندرہ برس کا ہے اس حساب سے تقریباً سولہ برس سے اپنی بیوی کے ساتھ شرعی محبت کر رہا ہوں لیکن میری داستان کا موضوع تفریحی محبت ہے۔

میں ایک بہت بڑا ناشر ہوں۔ رومانی ناولیں شائع کرتا ہوں۔ اب تک سینکڑوں ناولیں شائع کر چکا ہوں اور ان رومانی ناولوں کو پڑھتے پڑھتے خود رومانس کی طرف مائل ہو گیا ہوں۔ ہر وقت چشم تصور میں کوئی البیلی سی حسینہ مجھے اپنی طرف بلاتی رہتی ہے اور میں اس کے ساتھ ذرا بے نیازی سے پیش آتا ہوں۔ سنا ہے کہ عورت کے سامنے ذرا

بے نیازی برتو تو وہ نیاز مند بن کر پیچھے پیچھے چلی آتی ہے مگر یہ سب میری جاگتی آنکھوں کا خواب ہے اگر سچ مچ کوئی حسینہ میری طرف مائل ہو تو میں اسے مایوس نہیں کروں گا۔ ''دوسروں کو مایوس کرنا گناہ عظیم ہے''۔ شاید یہ بات حسین لڑکیوں کے سلسلے میں ہی کہی گئی ہے۔

پہلے تو میں انتظار میں رہا کہ کوئی ضرورت مند خود ہی چل کر میرے پاس آئے گی کیونکہ آئینہ مجھے سمجھاتا تھا کہ میں ایک خوبرو اور اسمارٹ نوجوان ہوں۔ مگر آئینے تو بدصورت بوڑھوں کو بھی یہی سمجھاتے ہیں۔ میں شیو کرنے کے بعد اور بہترین سوٹ پہننے کے بعد اپنی بیوی سے پوچھتا تھا کہ میں کیسا لگتا ہوں وہ نیک بخت جواب دیتی۔

''اللہ بہت اسمارٹ لگ رہے ہیں۔ دیکھ دیکھ کر جی نہیں بھرتا۔ میں تو خاموش نظروں سے آپ کی نظر اتار دیتی ہوں''۔

کچھ عرصے بعد پتہ چلا کہ ہر فرمانبردار بیوی اسی طرح اپنے شوہروں کی نظریں اتارتی ہے۔ ان کی نظروں میں خوبصورتی یہ ہے کہ دنیا کا سب سے خوبصورت مرد مجازی خدا ہوتا ہے۔ میرے پاس ایک ایئرکنڈیشنڈ امپالا ہے۔ وقتاً فوقتاً جب سرراہ جب کوئی لڑکی لفٹ مانگتی تھی تو مجھے اپنی خوبروئی کا یقین ہو جاتا تھا۔ آخر عورتوں کو اپنی طرح مائل کرنے والی مجھ میں کوئی خاص بات ہے۔ مگر لفٹ مانگنے والیاں دوبارہ نظر نہیں آتی تھیں۔ بعد میں پتہ چلا کہ مجھ سے زیادہ میری ایئرکنڈیشنڈ امپالا خوبصورت ہے۔ پھر بھی میں احساس کمتری کا شکار نہیں ہوں۔ یہ خیال تقویت پہنچاتا ہے کہ لڑکیاں بدذوق ہیں جو مجھ جیسے باذوق انسان کی قدر کرنا نہیں جانتیں۔

اس طرح اپنے دل کو سمجھاتے سمجھاتے کئی برس گزر گئے۔ آخر پے در پے ناکامیوں نے مجھے سمجھایا کہ مانگنے سے کچھ نہ ملے تو مہذب انداز میں بڑے سلیقے سے چھین لینا چاہیے۔ یہ سوچ کر میں نے اخبار میں اشتہار دیا۔ اشتہار کا مضمون کچھ یوں تھا۔

''پبلشرز صادق علی اینڈ سنز کے ادارے میں ناولوں کی پروف ریڈنگ کے لیے ایک نوجوان تعلیم یافتہ لڑکی کی ضرورت ہے۔ تعلیمی صلاحیت کچھ بھی ہو مگر رومانی ناول پڑھنے سے دلچسپی رکھتی ہو''۔

اشتہار میں یہ آخری فقرہ میں نے اس لیے لکھوایا تھا کہ رومانی ناول پڑھنے والی لڑکیاں ناول کے اوراق سے بھٹکتی ہوئی خیالوں ہی خیالوں میں کسی ہیرو کا سراپا تراشنے لگتی ہیں۔ ہوسکتا ہے کہ ناول کی کتابت کی تصحیح کرنے والی لڑکی میری خواہشات کی بھی تصحیح فرمانا شروع کر دے۔ میرے ادارے میں ناول نگاری، پروف ریڈنگ اور کاروباری تعلقات قائم رکھنے کے کئی شعبے ہیں۔ ہر شعبے میں مرد کام کرتے ہیں۔ لیکن جب یہ خبر پھیلی کہ پہلی بار اس ادارے میں ایک لڑکی ملازم رکھی جائے گی تو سبھی کے چہرے کھل اٹھے۔ اس خشک گلستان میں پہلی بار بہار کا ایک جھونکا آ رہا تھا۔

جس روز درجنوں لڑکیاں انٹرویو کے لیے آئیں، اس روز ادارے کے سبھی لوگوں کے چہروں پر جھاڑو پھر گئی تھی یعنی سب کلین شیو تھے۔ جن کی مونچھوں کے بال کہیں کہیں سے سفید ہو رہے تھے انہوں نے خضاب کا سہارا لیا تھا یا پھر اپنی مونچھیں منڈوا دی تھیں کیونکہ لڑکی مستقل طور سے آنے والی تھی بار بار خضاب لگانے کی زحمت کون گوارا کرتا۔

عورت بڑی ظالم شے ہے جہاں پہنچتی ہے وہاں کا نقشہ بدل دیتی ہے بلکہ وہاں کے لوگوں کے سوچنے کے انداز بھی بدل دیتی ہے۔ میں اپنے دفتر کے ملازموں کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ ایک باس کی حیثیت سے ان کے مسائل کو بھی سمجھتا ہوں۔ محدود تنخواہ پانے والے ملازموں کو موجودہ مہنگائی اتنی اجازت نہیں دیتی کہ وہ کسی دل پسند لڑکی کو اپنی

فرینڈ بنا سکیں۔ کسی لڑکی کی دوستی سے زیادہ روٹی، کپڑے اور مکان کی دوستی عزیز ہوتی ہے لیکن میرے دفتر میں جو لڑکی آنے والی تھی اس کی قربت مفت حاصل ہو سکتی تھی۔ اتنے کانٹوں کے بیچ ایک پھول کھلے اور اس کے بعد وہ کسی کے حصے میں آئے یا نہ آئے مگر نظروں کی پیاس بجھتی رہتی ہے۔ گھر میں ایک ہی بیوی کی آواز سنتے سنتے کان دکھنے لگتے ہیں۔ دفتر میں ایک رس بھری آواز تو سنائی دے سکتی ہے، پھول کے قریب جا کر اسے چھو لینا ہی ضروری نہیں۔ ایک ذرا فاصلے سے پھول کا حسن نظروں کو گرماتا ہے۔ اپنی خوشبو سے آشنا کرتا ہے۔ اپنے رنگین پیراہن سے مرجھائی ہوئی آنکھوں میں رنگ برنگے خواب سجاتا ہے۔ آپ اسے تسلیم کریں یا نہ کریں مگر یہ حقیقت ہے کہ ہم جیسے بھوکے پیاسے مہذب جانوروں کے سامنے وہ اپنے حسن کا چارہ ڈالنے آ رہی تھیں۔

انٹرویو کے لیے آنے والی لڑکیاں کالی بھی تھیں گوری بھی۔ صحت مند بھی تھیں اور سوکھی سڑی بھی تھیں۔ ان کی بیرونی ساخت اور ان کے چہرے یہ بتا رہے تھے کہ کون میرے کام کی لڑکی ہو سکتی ہے۔ میں اپنے دفتر کے پرائیویٹ کمرے میں انہیں یکے بعد دیگرے بلا کر باتیں کرتا تھا پھر انہیں رخصت کر دیتا تھا۔ آخر میں وہ آئی جسے میں دیکھتا کا دیکھتا رہ گیا۔

درمیانہ قد، چمپئی رنگت، اماوس کی سیاہ راتوں کا اندھیرا سمیٹے لمبی لمبی ریشمی زلفیں جو زنجیروں کی صورت میں گندھی ہوئی تھیں اور جو شانوں پر آ کر سانسوں کی اٹھان پر لرز رہی تھیں۔ اسے دیکھتے ہی میری سانسیں گڑبڑا گئیں۔ گلابی رنگ کا فلیپر اور شرٹ اس کے بھرے بھرے بدن سے یوں چپکا ہوا تھا جیسے وہ لباس اس کے جسم کے نشیب فراز پر رکھ کر تراشا گیا ہو۔ مجھے یوں لگا کہ وہ ذرا زور سے سانس لے گی تو لباس کی گلابیاں جگہ جگہ سے چیخ جائیں گی۔ سیاہ کاجل نے اس کی آنکھوں کو بادام کی صورت میں تراشا تھا۔ ایسی بڑی بڑی پھیلی پھیلی سی آنکھیں تھیں کہ میرے حواس پر پھیل گئی تھیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ وہ اپنی ذہین آنکھوں سے چپ چاپ میرا انٹرویو لے رہی ہے اور مجھے سمجھ رہی ہے۔ یقیناً وہ سمجھدار تھی اسی لیے تو ملازمت کرنے کے لیے آنکھوں میں کاجل لگا کر آئی تھی۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ مرد کو سب سے پہلے عورت کی ایک چنکی بھر نگاہ مارتی ہے۔ تیر بھی ایک چنکی سے چھوٹ کر چلتا ہے اسی لمحے وہ تیر کی طرح میرے دل میں ترازو ہو گئی۔

''کیا میں بیٹھ سکتی ہوں''۔

''آں...... ہاں، ضرور'' میں ایک دم سے بوکھلا گیا جیسے وہ مجھے کوئی حکم دے رہی ہو۔ حالانکہ میں حاکم تھا۔ ہر ماہ چند سو روپے دے کر اس پر حکومت کرنے والا تھا مگر میں کیا بتاؤں؟ سولہ برس تک صرف ایک ہی بیوی کا چہرہ دیکھتے رہنے کے بعد پہلی بار آزادی سے ایک حسین دوشیزہ کو قریب سے دیکھ رہا تھا اس لیے ذرا گڑبڑا سا گیا تھا۔ میں نے جلدی سے کہا۔

''بیٹھو! تمہارا نام؟''

''شہناز دُرّانی''

''یہ درانی صاحب کون ہیں؟''

وہ نظریں جھکا کر ذرا شرماتی، ذرا مسکراتی ہوئی بولی۔

''میرے ڈیڈی ہیں''۔

میں نے اسے تعجب سے دیکھا بھلا ڈیڈی کا ذکر کرتے وقت اسے شرمانے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ لڑکیاں بھی عجیب ہوتی ہیں۔ نہ شرمانے والی بات پر شرماتی ہیں اور شرمانے والی بات پر کھلکھلا کر ہنس دیتی ہیں۔ میں نے اس سے کہا۔

''ہمارے یہاں جب ناول چھپنے کے لیے پریس میں جاتا ہے تو دفتر میں رات کو دیر تک کام ہوتا ہے۔ کیا ایسے وقت تمہارے ڈیڈی تمہیں اوور ٹائم کی اجازت دیں گے؟''

''جی ہاں! مجھے گھر والوں کی طرف سے پوری آزادی ہے۔ میری ہی محنت سے گھر کے اخراجات پورے ہوتے ہیں۔ آپ سمجھ سکتے ہیں کہ جو ہاتھ پیسے دیتے ہیں ان ہاتھوں کو کوئی نہیں پکڑتا، کوئی نہیں پوچھتا کہ ایک نوجوان لڑکی کے ہاتھ کتنی دیر تک اور کتنی دور تک کہاں جاتے ہیں؟''

''معلوم ہوتا ہے آپ نے چھوٹی سی عمر میں بہت سے تلخ تجربات کیے ہیں''۔

میں نے چھوٹی سی عمر اس لیے کہا کہ وہ خوش ہو جائے حالانکہ وہ ایسی کم عمر نہیں تھی۔ ایک دم پکے ہوئے پھل کی طرح تھی۔ عورت کو خوش کرنے کا موقع آئے تو وہ موقع ہاتھ سے جانے نہیں دینا چاہیے۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''ہاں اب بھی زندگی میں تلخیاں ہیں اسی لیے تو ملازمت کرنے نکلی ہوں۔ یہاں آتے وقت ذہن الجھا ہوا تھا کہ نہ جانے یہ ملازمت ملے گی یا بھی نہیں؟ اگر ملے گی تو تنخواہ کتنی ملے گی؟''

میں نے کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر اسے خوش خبری سنائی۔

''تمہاری ملازمت پکی ہے تنخواہ پانچ سو روپے ماہانہ ملا کرے گی''۔

اس کام کے لیے پانچ سو روپے بہت زیادہ ہوتے ہیں مگر اس نے کچھ زیادہ خوشی کا اظہار نہیں کیا، مجھے خطرہ محسوس ہوا کہ ہاتھ سے نکل جائے گی۔ میں نے جلدی سے کہا۔

''اوور ٹائم کرو گی تو زیادہ پیسے ملیں گے''۔

اس نے پوچھا۔

''یعنی فاضل وقت میں کیا کام کرنا ہوگا؟''

میں نے جواب دیا۔

''میری کوٹھی میں بہت سے غیر مطبوعہ ناولوں کے مسودے پڑے رہتے ہیں۔ تم وہاں آ کر انہیں پڑھو گی اور ان مسودوں پر اپنی رائے دینے کے لیے نوٹس لکھو گی''۔

''کیا مسودہ پڑھنے کے لیے آپ کی کوٹھی میں آنا ضروری ہے؟ وہ تو دفتر میں بھی پڑھے جا سکتے ہیں''۔

کمبخت اشارہ نہیں سمجھ رہی تھی۔ یہ لڑکیوں کی بہت بری عادت ہے۔ سمجھتی بھی ہیں تو تجاہل عارفانہ سے کام لیتی ہیں۔ پہلی ملاقات میں اسے سمجھنا مشکل تھا۔ میں نے اپنی بات پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ہاں غیر مطبوعہ مسودے راز میں رکھے جاتے ہیں تاکہ دوسرے پبلشروں تک ان کی بھنک نہ پہنچے اس لیے میں انہیں دفتر نہیں لاتا ہوں اگر تم کوٹھی میں آ کر انہیں پڑھو گی تو پڑھنے کے تین سو روپے الگ سے ملیں گے۔ اس طرح تم ماہانہ آٹھ سو روپے حاصل کر سکو گی''۔

وہ ہولے سے مسکرائی جیسے آٹھ سو روپے بھی کچھ یوں ہی سے ہوں لیکن آنکھوں کی مسرت آمیز چمک کو نہ چھپا سکی۔ اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ آٹھ سو روپے اس کی توقع سے زیادہ ہیں۔ اس نے ذرا بے نیازی سے کہا۔

''میں یہ ملازمت کروں گی مگر کوٹھی میں جانے والی بات ایسی ہے کہ ذرا سوچ کر جواب دوں گی''۔
''یہ تمہاری مرضی ہے میں نے تو تمہاری پریشانیاں دور کرنے کے لیے اضافی آمدنی کا راستہ دکھایا ہے۔ بہر حال کل سے تم ڈیوٹی پر آجاؤ''۔
وہ اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولیں ''آپ کا بہت بہت شکریہ۔ آپ بہت مخلص اور مہربان ہیں، میں آپ کی پیشکش پر غور کروں گی''۔ وہ مسکراتی ہوئی وہاں سے گھوم کر میرے کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد میری آنکھوں کے سامنے پھولوں سے لدی ہوئی شاخ لچکتی رہی۔ ہر نئی چیز سونے کی طرح چمکتی ہے۔ اس سنہری چمک کے سامنے اور کچھ نظر نہیں آتا۔ وہ جو سامنے سے چلی گئی تھی بس وہی بار بار نگاہوں کے سامنے لچک رہی تھی۔ میں سوچنے لگا کہ اسے کس طرح موم کیا جاسکتا ہے۔ میں ایک مدت سے ایسی ہی کسی حسینہ کا منتظر تھا۔ بڑے صبر سے انتظار کر رہا تھا اب وہ آگئی تھی تو صبر نہیں ہو رہا تھا۔ نت نئے ہتھکنڈے سوچ رہا تھا کہ کسی بھی ترکیب سے وہ میرے عشق میں مبتلا ہو جائے۔
اسی وقت فون کی گھنٹی نے مجھے چونکا دیا۔ اس کی آواز ایسی کرخت تھی کہ شیشے کی شہناز چکنا چور ہو گئی۔ میں نے بڑی ناگواری سے ٹیلی فون کی طرف دیکھا۔ کوئی کاروباری کال ہو سکتی تھی۔ وہ ایک کال ہزاروں روپے کا منافع پیش کر سکتی تھی مگر اس وقت مجھے منافع کا بھی لالچ نہیں تھا۔ صرف شہناز کی تمنا تھی لیکن دفتر میں بیٹھ کر کتنے فرائض سے منہ موڑ سکتا تھا۔ مجبوراً مجھے ریسیور اٹھانا پڑا۔ دوسری طرف سے ایک لیڈی ڈاکٹر کی آواز آئی۔
''ہیلو۔ میں ڈاکٹر شازیہ بول رہی ہوں۔ کیا صادق صاحب موجود ہیں؟''
''میں صادق ہوں۔ میری بیگم کا کیا حال ہے؟''
''بہت سیریس کیس ہے۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ زچگی کے وقت زچہ کی جان کا خطرہ ہے۔ آپ فوراً یہاں آجائیں''۔
دوسری طرف سے ریسیور رکھ دیا گیا۔ میں نے بھی جھنجلا کر ریسیور کو کریڈل پر پٹخ دیا۔ کیسی خوابوں کی محفل بجی ہوئی تھی اور کیسے یہ زندگی مجھے پتھر مار رہی تھی۔ کہاں شہناز اور کہاں میری رئیسہ بیگم۔ ایک آمد بہار تھی تو دوسری رخصت بہار۔ اب شوہر کا فرض نبھانے کے لیے میٹرنٹی ہوم تک جانا ضروری تھا لہٰذا میں اسی وقت دفتر سے اٹھ گیا۔
میٹرنٹی ہوم کی طرف جاتے وقت میری آنکھیں کار کی ونڈ اسکرین کے پار دیکھ رہی تھیں اور دماغ دیوار گھڑی کی طرح ٹک ٹک کرتا ہوا کبھی شہناز کی طرف اور کبھی رئیسہ بیگم کی طرف ہو رہا تھا۔ لیڈی ڈاکٹر نے کہا تھا کہ رئیسہ بیگم کی جان کو خطرہ ہے۔ یہ سن کر نہ جانے کیوں میں ذرا بھی پریشان نہ ہوا۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ ایک زنگ آلود چراغ بجھ رہا تھا اور ایک نئی جگمگاتی ہوئی شمع روشن ہو رہی تھی۔ میں بے ایمانی کی باتیں دل میں چھپا کر نہیں رکھتا۔ صاف کہتا ہوں کہ رئیسہ بیگم کو رخصت ہو ہی جانا چاہیے۔ آدمی پرانا لباس کب تک پہن سکتا ہے اگر وہ لباس کسی پرانے رشتے کی یاد دلاتا ہو تو اسے زیادہ سے زیادہ اسٹور میں رکھا جاسکتا ہے۔ کبھی کبھی پرانی یادوں کو تازہ کرنے کے لیے اسٹور میں جھانک کر دیکھا جاسکتا ہے۔ گھر میں رئیسہ بیگم کی یاد دلانے کی بہت سی چیزیں تھیں پھر رئیسہ بیگم کی کیا ضرورت تھی؟
آپ کہیں گے میں انسان نہیں شیطان ہوں۔ ایک وفادار اور خدمت گزار بیوی کی موت کی تمنا کر رہا ہوں۔ بظاہر آپ کی بات درست ہوگی مگر ایمان سے کہیں کہ کرنسی نوٹ کسے عزیز نہیں ہوتے؟ رئیسہ بیگم بھی مجھے اسی طرح عزیز ہے۔ مگر انگلیوں نے اس نوٹ کو چھوتے چھوتے میلا کر دیا تھا اور وہ جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا۔ کیا آپ کسی

بینک کے کاؤنٹر پر جا کر ایک پرانا نوٹ پھینک کر اس کی جگہ نیا نوٹ حاصل نہیں کرتے؟ یہ کون نہیں چاہتا کہ پرانی چیز کے بدلے نئی چیز مل جائے۔ اگر میں چاہ رہا تھا تو کون سا گناہ کر رہا تھا۔

میٹرنٹی ہوم تک پہنچتے پہنچتے میرے دماغ میں مثبت اور منفی سوچیں آپس میں لڑتی رہیں۔ مثبت سوچ مجھے اخلاق اور مروت سکھاتی رہی کہ دنیا میں ایسے بھی لوگ ہیں جو بڑی شرافت سے ایک ہی بیوی پر اکتفا کرتے ہیں لیکن میں نے ایسے لوگوں کو نہیں دیکھا۔ اگر دیکھا بھی ہے تو وہ لوگ اپنے حالات سے مجبور ہوتے ہیں یا اپنی شرافت کا بھرم قائم رکھنے کے لیے اپنے من کو مارتے ہیں ورنہ یہ بڑی تلخ حقیقت ہے کہ آج بھی اگر کوئی حوا زادی مسکرا کر ایک نجیب الطرفین آدم زاد کو دیکھ لے تو وہ خوف خدا کے باوجود اسکا ہاتھ تھام کر تہذیب کی جنت میں نکل جاتا ہے۔

اسپتال پہنچ کر معلوم ہوا کہ رئیسہ بیگم مرتے مرتے بچ گئی ہیں۔ زچہ اور بچہ دونوں خیریت سے ہیں۔ میں نے رئیسہ کے بیڈ پر پہنچ کر اسے دیکھا۔ وہ بالکل ہڈیوں کا ڈھانچہ نظر آ رہی تھی۔ اس ڈھانچے پر جو کھال منڈھی ہوئی تھی وہ سادہ ورق کی طرح بالکل سفید تھی۔ سارا خون بچے نے نچوڑ لیا تھا لیکن لیڈی ڈاکٹر کہہ رہی تھی کہ میں نے اس کا خون نچوڑ لیا ہے۔ آج سے پہلے شہناز میری زندگی میں نہیں آئی تھی۔ اس کے باوجود میں نادانستگی میں یا غیر شعوری طور پر رئیسہ بیگم کو آہستہ آہستہ قتل کرتا آ رہا تھا۔

لیڈی ڈاکٹر مجھے اپنے کمرے میں بلا کر ڈانٹنے لگی۔

''دیکھیے صادق آپ جیسے پڑھے لکھے ذہین لوگ خاندانی منصوبہ بندی پر عمل نہ کریں تو یہ بڑے افسوس کا مقام ہے۔ میں نے رئیسہ بیگم کی پچھلی زچگی میں ہی آپ سے کہہ دیا تھا کہ اس عورت میں اب جان نہیں رہی۔ خدا کے لیے اسے بخش دیجیے لیکن پتہ نہیں آپ کتنے بچوں کے باپ بن کر ٹرافی حاصل کرنا چاہتے ہیں''۔

میں نے اسے جواب دیا۔

''بچے خدا کی دین ہوتے ہیں۔ اگر ہم انہیں وجود میں آنے سے روکتے ہیں تو دوسرے لفظوں میں ان بچوں کے قاتل بن جاتے ہیں''۔

''اسی لیے آپ اپنی بیوی کے قاتل بن رہے ہیں'' لیڈی ڈاکٹر نے تلخ لہجے میں کہا۔ ''ایک عورت جو آپ کے گھر کو جنت بناتی ہے جو آپ کی آئندہ نسل کو اپنی گود میں پالتی ہے، آپ اس عورت سے محبت کیوں نہیں کرتے؟ جو آپ کی اولاد کو دودھ پلاتی ہے آپ اسے قطرہ قطرہ زہر دیتے ہیں۔ کیا یہ شرم کی بات نہیں؟''

میں نے غصے سے کہا۔

''ڈاکٹر میں کوئی معمولی آدمی نہیں ہوں کہ آپ اس انداز میں گفتگو کر رہی ہیں۔ آپ اپنا رویہ درست کریں''۔

لیڈی ڈاکٹر کو ہوش آ گیا کہ وہ جوش میں باتیں کر رہی ہے۔ وہ ایک گہری سانس چھوڑتی ہوئی بولی ''سوری مجھے آپ کے ذاتی معاملات میں نہیں بولنا چاہیے۔ صرف ایک ڈاکٹر کی حیثیت سے سمجھانا چاہیے مگر آپ سمجھنا نہیں چاہتے۔ بہرحال آئندہ آپ اپنی بیگم یہاں نہ لائیں۔ اس شہر میں اور بھی سینکڑوں میٹرنٹی ہوم ہیں''۔

''آپ کی اطلاع کا شکریہ''۔

میں اٹھ کر جانے لگا۔ لیڈی ڈاکٹر نے آواز دے کر کہا۔

''ایک بات سنتے جائیں۔ بچے کی ولادت ہمارے لیے پرابلم بن گئی تھی۔ میجر آپریشن کے ذریعے آپ کا

یہ بچہ وجود میں آیا ہے۔ زچہ کے اندر کیا خرابی پیدا ہوگئی ہے یہ میں آپ کو نہیں بتا سکتی۔ یہ آپ اپنی بیگم سے پوچھ سکتے ہیں۔ میری طرف سے یہ وارننگ ہے کہ اب اگر رئیسہ بیگم حاملہ ہوں گی تو انہیں کوئی ڈاکٹر نہیں بچا سکے گا۔ اب آپ خود سوچ لیں کہ کسے قتل کرنا چاہتے بیوی کو یا اس بچے کو جو وجود میں نہیں آیا ہے۔ میں آپ کو یہ نکتہ سمجھا دوں کہ قتل اسی کا ہوتا ہے جس کا کوئی وجود ہوتا ہے۔ اس کے سمجھنے کے لیے آپ کے پاس عقل ہے''۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی میں کوئی جواب دیئے بغیر دروازے کو ایک جھٹکے سے کھول کر اس کمرے سے نکل آیا۔ مجھے بہت غصہ آرہا تھا۔ چہرے سے نقاب اتر جائے تو لازمی طور سے غصہ آتا ہے۔ وہ کمبخت لیڈی ڈاکٹر مجھے قاتل کہہ رہی تھی مگر قاتل کسے کہتے ہیں؟ کسی کو چھرا گھونپ کر، کسی کا گلا دبا کر شدید زخم پہنچا کر مار ڈالنا قتل ہے لیکن میں نے تو کوئی ایسی حرکت نہیں کی تھی۔ اگر میں اپنی بیوی کو محبت سے آغوش میں لیتا ہوں اور اس کی سیج کا ہم سفر بنتا ہوں اور ایسے میں وہ موت کی طرف جاتی ہے تو میں کیسے قاتل کہلاؤں گا؟ اگر ہم سب کی ازدواجی زندگی میں اور سماجی زندگی میں کوئی محبت سے دھیرے دھیرے مرتی ہے یا مرتا ہے تو یہ واقعہ قتل کے زمرے میں نہیں آتا۔ قانون کے کسی زمرے میں نہیں آتا۔ اگر آتا ہو تو کوئی مجھے گرفتار کرلے۔

میں نے رئیسہ کے پاس پہنچ کر اسے بتایا کہ وہ نک چڑھی لیڈی ڈاکٹر کس طرح ہماری پاکیزہ محبت کو مجرمانہ قرار دے رہی ہے اور کہتی ہے کہ ہم آئندہ بچے پیدا نہیں کریں۔ میں اس معاملے میں خوش نصیب ہوں کہ میری بیوی کٹر مذہبی قسم کی عورت ہے۔ وہ بھی عام عورتوں کی طرح بچوں کو خدا کی دین سمجھتی ہے اور شوہر کے کرتوت بھول جاتی ہے۔ وہ بھی آنے والے بچے سے دشمنی نہیں کرنا چاہتی تھی مگر اپنی کمزوری اور بیماری کے پیش نظر دوسرا راستہ اختیار کرتی تھی یعنی مجھ سے دور ہی دور رہنے کی کوشش کرتی تھی۔ اس نے مجھ سے کہا۔

''آپ ناراض نہ ہوں۔ لیڈی ڈاکٹر میری بھلائی کے لیے کہتی ہے اس بار آپ میری ایک بات مان لیں''۔

''وہ کیا؟'' میں نے پوچھا۔

''آپ سال چھ مہینے کے لیے مجھے میرے میکے چھوڑ دیں۔ میں ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی ہوں۔ میکے میں رہوں گی تو شاید کچھ صحت بن جائے''۔

وہ خود ہی میرے راستے سے ہٹنا چاہتی تھی۔ میں بھی یہی چاہتا تھا۔ مجھے معلوم تھا کہ شہناز اپنی ماہانہ آمدنی بڑھانے کی خاطر مسودے پڑھنے کے لیے میری کوٹھی میں آئے گی۔ اگر رئیسہ کچھ عرصے کے لیے چلی جاتی تو اس سے اچھی اور کیا بات ہوسکتی تھی لیکن میں فوراً ہی راضی نہ ہوا۔ بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام کر جذباتی انداز میں کہنے لگا۔

''تم نے مجھے اپنا عادی بنا دیا ہے۔ تمہارے بغیر میں کیسے وقت گزاروں گا۔ جانے سے پہلے ایک اور تصویر اتروا لینا۔ میں رات کو سرہانے رکھ کر دیکھا کروں گا''۔

میری باتوں سے وہ پگھل پگھل جاتی تھی۔ میں کچھ دیر تک اسے اس کی اہمیت کا احساس دلاتا رہا پھر اس کے ہاتھ چوم کر اس سے رخصت ہوگیا۔ چومتے وقت میرے ہونٹ اس کے ہاتھ کی ہڈیوں سے ٹکرائے۔ بیچاری!

دوسرے دن سے شہناز ڈیوٹی پر آنے لگی۔ کچھ روز تک میں اچھی طرح اس کی صورت نہ دیکھ سکا۔ اس کے بیٹھنے کے لیے دوسرے کمرے میں ایک میز اور کرسی مخصوص کردی گئی تھی۔ بعد میں پتہ چلا کہ دفتر کے سبھی لوگ اسے پروف ریڈنگ سکھانے کے لیے اس طرح اس کا طواف کرتے رہتے ہیں کہ صبح سے شام ہو جاتی ہے۔ پہلے تو میرے ادارے

کے مینجر نے انہیں مکھیوں کی طرح ہنکایا پھر شہناز کی میز اپنی میز کے قریب کھینچ لایا تا کہ اسے کوئی ڈسٹرب نہ کرے۔

جب مجھے پتہ چلا کہ مینجر صاحب اپنا کام چھوڑ کر خود ہی اس کے حصے کی پروف ریڈنگ کرتے ہیں تو میں نے شہناز کی میز اور کرسی اپنے کمرے میں منگوالی۔ شہناز میرے کمرے میں آئی تو میرا کام رکنے لگا۔ وہ کتابت شدہ مسودہ اٹھا کر میرے پاس آ کر کھڑی ہو جاتی۔

''پلیز ذرا یہ بتا دیں۔ یہاں مسودے میں لکھا کہ سلیم انار کلی سے محبت کر رہا تھا مگر محبت تو کی نہیں جاتی ہو جاتی ہے۔ کیا مصنف نے یہاں غلط نہیں لکھا؟''

میں نے اسے سمجھایا۔

''بعض حالات میں محبت نہ ہو تو کوشش کرنے کے بعد محبت ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے یہ درست ہے محبت کی بھی جاتی ہے۔ بے تکلفی معاف، کیا تم نے اپنی زندگی میں ایسا کوئی تجربہ نہیں کیا؟''

وہ ذرا جھجکنے لگی۔ پھر ہچکچاتے ہوئے بولی۔

''تجربہ تو نہیں مشاہدہ کیا ہے۔ آپ کے سمجھانے سے مجھے یاد آیا۔ بہت سی عورتیں شادی کے بعد اپنے شوہر سے محبت کرتی ہیں۔ اس طرح انہیں محبت ہو جاتی ہے''۔

''تم بیاہتا عورتوں کی باتیں کر رہی ہو لیکن انار کلی بیاہتا نہیں تھی، سلیم بھی کنوارا تھا۔ تم بھی کنواری ہو مگر تم تو کہتی ہو کہ کوئی تجربہ نہیں ہوا''۔

وہ میری باتوں سے جھینپ رہی تھی۔ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''میرا مشورہ ہے کہ تم کسی سے محبت کرو جب کرنے کے بعد محبت ہو جائے گی تو ناول کا یہ فقرہ تمہاری سمجھ میں آ جائے گا''۔

وہ جلدی سے مسودہ اٹھا کر اپنی میز پر چلی گئی۔ مگر کتنی دور جا سکتی تھی، میز تو میرے ہی کمرے میں تھی اور ذرا فاصلے پر آمنے سامنے تھی لہٰذا وہ شرماتے ہوئے خود کو مجھ سے نہیں چھپا سکتی تھی۔ وہ اپنی میز پر پہنچ کر مسودے پر سر جھکا کر بیٹھ گئی۔ اپنے جذبات کو چھپانے میں عورتوں کو کمال حاصل ہوتا ہے۔ میں اتنے فاصلے سے اس کے چہرے کو اچھی طرح نہ پڑھ سکا۔ عینک لگانے کی ضرورت تھی لیکن میں عینک لگا کر اپنی عمر ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

دوسرے دن اس نے اپنی پریشانیوں کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ وہ پارٹ ٹائم کام کرے گی کیونکہ دفتر آنے جانے اور یہاں لنچ کرنے میں کافی پیسے خرچ ہو جاتے تھے ان اخراجات کو سنبھالنے کے لیے مزید آمدنی کی ضرورت تھی۔ میں نے اس سے کہا۔

''میری کوٹھی سوسائٹی میں ہے وہاں آنے جانے سے مزید اخراجات بڑھیں گے۔ اگر تم چاہو تو میں شام کو دفتر سے جاتے وقت تمہیں اپنی کار میں لے جاؤں گا۔ کوٹھی میں تم جتنی دیر چاہو پڑھتی رہنا وہاں سے میں تمہیں گھر پہنچا دیا کروں گا''۔

میں اس کے لیے آنے جانے کی سہولت فراہم کر رہا تھا۔ کراچی شہر میں جسے یہ سہولتیں مل جائیں وہ بہت خوش نصیب سمجھا جاتا ہے۔ شہناز نے پہلے تو مجھے احسان مندی سے دیکھا۔ پھر مجھ سے نظریں ملیں تو سر جھکا کر بولی۔

''آپ میرا بہت خیال رکھتے ہیں۔ مگر میں آپ کی گاڑی میں جاؤں گی تو لوگ کیا کہیں گے؟''

''یہ میں نہیں کہہ سکتا کہ لوگ پیٹھ پیچھے کیا کہیں گے۔ اتنا جانتا ہوں کہ منہ پر کوئی کچھ نہیں کہہ سکے گا کیونکہ یہاں سب میرے دست نگر ہیں۔ اونچی آواز میں کوئی بول نہیں سکتا اور نیچی آوازیں سنائی نہیں دیتیں۔ اس ادارے سے باہر جو کہنے والے لوگ ہیں ان کی فکر نہ کرو۔ انہیں کچھ کہنے کے لیے جتنی دیر لگے گی اتنی دیر میں ہماری کار کئی فرلانگ آگے نکل جائے گی۔ بدنامی کے پاؤں آج تک کسی دولت مند کا پیچھا نہیں کر سکے''۔

میں نے سمجھایا۔ وہ سمجھ گئی۔ اپنی اس دنیا کو سمجھنے کے لیے غیر معمولی بصیرت اور دانائی کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ عقل اتنا نہیں سمجھاتی جتنا کہ دل کے زخم سمجھا دیتے ہیں۔ شاید وہ بھی کہیں سے زخمی تھی اسی لیے اچھی طرح سمجھ کر شام کو میری کار میں آکر بیٹھ گئی۔

ہم اگلی سیٹ پر پہلی بار ایک دوسرے کے قریب بیٹھے تھے۔ میں سمجھ نہیں سکتا تھا کہ اس پر اس قربت کا ردعمل کیا ہو رہا ہے کیونکہ وہ دوسری طرف کھڑکی کے باہر گزرتے ہوئے مناظر کو دیکھ رہی تھی لیکن میں اس سے بے نیاز نہیں تھا۔ دو بالشت کے فاصلے سے اس کے بدن کی آنچ مجھ تک پہنچ رہی تھی اور معلومات میں اضافہ ہو رہا تھا کہ ایسے چور آتش دان بھی ہوتے ہیں جہاں سے آنچ آتی ہے۔ آگ نظر نہیں آتی۔ میں نے پھر اس پر ایک نظر ڈالی۔ خاموشی بوجھ بن گئی تھی۔ آخر مجھے ہی بولنا پڑا۔

''باہر کیا دیکھ رہی ہو یا کچھ سوچ رہی ہو؟''

وہ کھڑکی سے نظریں پھیر کر ونڈ اسکرین پر دیکھنے لگی پھر سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر کہنے لگی۔

''دیکھ بھی رہی ہوں اور سوچتی بھی جا رہی ہوں۔ جب میں فٹ پاتھ پر چلتی ہوں تو کار والے بہت اونچے اور بہت ظالم نظر آتے ہیں۔ ہم پر کیچڑ اچھال کر گزر جاتے ہیں۔ انہیں احساس تک نہیں ہوتا کہ وہ دوسرے انسان کا مذاق اڑاتے ہوئے گئے ہیں۔ اب کار میں بیٹھ کر دیکھ رہی ہوں تو یہ فٹ پاتھ پر چلنے والے بہت چھوٹے اور حقیر نظر آرہے ہیں۔ یہ کیڑے مکوڑوں کی طرح رینگنے والی زندگی کیسے گزار لیتے ہیں؟ پیدل چلتے ہیں، دھوپ میں چلتے ہیں اور گھنٹوں بس اور منی بسوں کا انتظار کرتے ہیں۔ میں نے حساب لگایا ہے کہ اگر وہ پچاس برس زندگی گزارتے ہیں تو زندگی کے ساڑھے بارہ برس کراچی کے بس اسٹینڈ پر کھڑے ہو کر گزار دیتے ہیں''۔

''تم ایک اچھی اکاؤنٹنٹ بن سکتی ہو لیکن فٹ پاتھ پر چلنے والوں کی تقدیریں نہیں بدل سکتیں''۔

''میں صرف اپنی تقدیر بدلنے نکلی ہوں۔ حالات نے مجھے سکھایا ہے کہ ایک زینہ اوپر چڑھنے کا موقع آئے تو گھبرا کر نیچے نہیں اترنا چاہیے۔ آپ نے پانچ سو کے بعد مزید تین سو کی آفر دی تو میں نے قبول کر لی۔ آپ مجھے فٹ پاتھ کی دھوپ سے بچا کر ائیر کنڈیشنڈ کار میں لے آئے تو میں نہیں گھبرائی۔ اب سے پہلے میں کئی بار گھبرا کر پیچھے رہ گئی۔ اب ایسی غلطی نہیں کرنا چاہتی۔ میرے ساتھ کی لڑکیاں مجھ سے بہت آگے نکل چکی ہیں۔ ان کے پاس کار ہے، کوٹھی ہے اور بڑھاپا گزارنے والا بینک بیلنس ہے اور میرا پرس ابھی خالی ہے''۔

''ویری انٹرسٹنگ'' میری دلچسپی بڑھ گئی۔ میں نے پوچھا ''تمہارے ساتھ کی لڑکیاں کیا کرتی ہیں؟''

شہناز نے ایک حسرت بھری سانس لینے کے بعد کہا۔

''ان لڑکیوں کے موجودہ شوہر شادی سے پہلے دفتروں میں ان کے باس تھے اور ان کی پرورش کرتے تھے۔ اب شادی کے بعد وہ اپنے دولت مند شوہروں کی پرورش کرتی ہیں''۔

اس کی باتوں سے مجھ میں کافی حوصلہ پیدا ہو گیا۔ میں نے مسکرا کر کہا۔

''میں نہیں چاہتا کہ تمہارا پرس خالی رہے لاؤ اپنا پرس مجھے دو''۔

اس نے جلدی سے اپنے پرس کو اپنے سینے سے لگا لیا۔

''یہ میری عزت ہے میں سستی خواہشات کے عوض اسے بھرنا نہیں چاہتی۔ اس سے تو بہتر ہے کہ یہ خالی رہے۔ میں نے اپنی جن سہیلیوں کی مثال دی ہے وہ بازاری نہیں تھیں۔ نہ ہی میں ایسی ہوں۔ ہم عورتیں ایک سہانے مستقبل کے خواب دیکھ کر ملازمت کرنے گھر سے نکلتی ہیں۔ میرا پرس صرف ایک شخص کے آگے کھلے گا''۔

''وہ خوش نصیب کون ہے؟''

''وہ ہے جو مجھے ایک خوشگوار مستقبل کی ضمانت دے گا''۔

میں سمجھ رہا تھا کہ وہ آسانی سے ہاتھ آ جائے گی مگر اس کی باتوں نے سمجھا دیا کہ وہ سستی لڑکی نہیں ہے ایک باعزت اور معیاری زندگی کی متلاشی ہے۔ بہر حال وہ کیا ہے اور کیا نہیں ہے؟ یہ تو وقت رفتہ رفتہ سمجھانے والا تھا مگر یہ انسان کی فطرت ہے کہ جو چیز ہاتھ آتے آتے ذرا اور سرک جاتی ہے وہ اسی کے حصول کا دیوانہ بن جاتا ہے اس طرح میرے دل میں بھی شہناز کی تمنا اور بڑھ گئی۔

''میں تمہیں ایک خوشگوار مستقبل کی ضمانت دوں گا۔ بولو کیا چاہتی ہو؟''

''کچھ چاہنے سے پہلے آپ کو سمجھنا چاہتی ہوں کہ آپ کتنی سنجیدگی سے میرا مستقبل سنوارنا چاہتے ہیں''۔

''مجھے سمجھنے کے لیے کتنا وقت لگے گا؟''

''کچھ آپ سمجھاتے رہیں گے کچھ میں اپنے طور پر سمجھنے کی کوشش کرتی رہوں گی۔ جب ہمارے درمیان چاہت کے جذبات ہوں گے تو وقت گزرنے کا احساس نہیں ہوگا۔ آپ وقت کا حساب نہ کریں''۔

وہ میری توقع سے زیادہ سمجھدار نکلی۔ اس معاملے میں لڑکیاں قدرتی طور پر اپنی عمر سے زیادہ ذہین ہوتی ہیں جوان ہوتے ہی نجانے کس طرح اپنے بچاؤ کے ہتھکنڈے سیکھ لیتی ہیں۔ یہ بات اس طرح سمجھ میں آتی ہے کہ بہت زیادہ دولت ہو اور وہ تھوڑی سی چرا لی جائے تو دولت مند پر اس کا خاص اثر نہیں پڑتا لیکن جس کے پاس شباب کی تجوری میں ایک عزت کی ہی پونجی ہو اور وہ لٹ جائے تو سہانے مستقبل کا جوا کھیلنے کے لیے کچھ باقی نہیں بچتا۔ اسی لیے ذہین لڑکیاں ابتدا ہی میں سمجھ لیتی ہیں کہ آج کل عشق کے قمار خانے میں دور ہی دور سے پونجی دکھا کر چالیں چلی جاتی ہیں۔

میری کوٹھی خالی تھی۔ میں نے دو دن پہلے ہی رئیسہ کو بچے کے ساتھ اس کے میکے بھیج دیا تھا۔ شہناز میری شاندار کوٹھی میں داخل ہوئی...... تو وہاں کی شاندار سجاوٹ کو دیر تک دیکھتی رہ گئی۔ وہاں ایک عورت کے کون سے خواب کی تعبیر نہیں تھی وہاں جتنے کمرے تھے اتنے ہی کلر ٹی وی، ریڈیو گرام، ریکارڈ پلیئر اور کیسٹ ریکارڈر تھے۔ رومانی جذبوں کو ابھارنے کے لیے رنگین نظاروں اور سر سنگیت کا مکمل اہتمام تھا۔ جدید طرز کے صوفے تھے جن پر بیٹھنے والے اٹھنا بھول جاتے تھے۔ سہ طرفہ آئینوں کی سنگھار میز پر حسن و شباب کی سلامتی اور شگفتگی کے لیے میکس فیکٹری کی تمام مصنوعات موجود تھیں جنہیں میری بیمار بیوی اب استعمال نہیں کر سکتی تھی۔ ایئر کنڈیشنڈ بیڈ روم کے فرش پر پھولدار قالین ملائم اور دبیز تھا۔ چلتے وقت اس میں پاؤں اتنے پیار سے دھنستے تھے جیسے ایک جذبہ دوسرے جذبے میں دھنستا ہے اور ہولے ہولے گدگداتا ہے ویسے ہی پاؤں کے تلووں میں ریشمی سرسراہٹ سی ہوتی تھی۔

میں نے صاف طور سے شہناز کو سنبھل سنبھل کر چلتے دیکھا۔ وہ دھنسنا نہیں چاہتی تھی اور نہ مجھ پر اپنی کوئی کمزوری ظاہر کرنا چاہتی تھی مگر اس کی کٹورا جیسی کاجل رچائی آنکھیں خواب ناک ہوگئی تھیں۔ اس کی نگاہوں کے سامنے بہت ہی خوبصورت پلنگ تھا۔ فوم کی لچکیلی سیج پر ہفت رنگ فانوس کے کتنے ہی رنگ پھسل رہے تھے۔ ایسے بستر پر خواب پیچھے رہ جاتے ہیں اور تعبیریں پھسل کر سامنے آجاتی ہیں۔ وہ فوراً ہی پلٹ کر تیزی سے چلتی ہوئی میرے بیڈ روم سے باہر آگئی۔

''آپ......آپ کی بیگم اور بچے کہاں ہیں؟'' اس کے منہ سے الفاظ نکلتے وقت ہانپ رہے تھے۔

''وہ بچوں کے ساتھ اپنے میکے میں رہتی ہیں''۔

میرے حلق میں آواز اٹکنے لگی۔ اس نے بڑی سادگی سے رئیسہ بیگم کا پوچھا تھا مگر مجھے اس کا سوال طنز آمیز محسوس ہوا کہ آپ کے پاس تو بیگم ہے پھر دگی تگی کی کیا ضرورت ہے؟ ''بیگم کی موجودگی کے باوجود میں ایک مجرد کی زندگی گزار رہا ہوں'' میں وضاحت کرنے لگا کہ رئیسہ سدا کی بیمار ہے اور ہمیشہ مجھ سے دور رہتی ہے۔ شہناز کو متاثر کرنے کے لیے میں نے ایک رومانی ناول کا مکالمہ ادا کیا۔

''شہناز میں وہ بدنصیب ہوں جس کی زندگی میں کبھی بہار کا ایک جھونکا نہیں آیا۔ میں اس شاندار کوٹھی کے کھنڈر میں ایک زندہ لاش کی طرح رہتا تھا۔ تمہیں پہلی بار دیکھتے ہی مجھ میں از سر نو جینے کی لگن پیدا ہوگئی۔ کیا تم مجھے ایک نئی زندگی دو گی؟ کیا تم میرے دل کی اور میرے گھر کی ملکہ بن کر رہنا پسند کرو گی؟ بولو شہناز بولو......''

مکالمے کی اٹھان پر میں نے ڈرامائی انداز میں اس کا ہاتھ تھام لیا۔ اس نے اپنا ہاتھ چھڑانے کے لیے رسمی طور پر کمزور سی جدوجہد کی۔ میں نے نہیں چھوڑا۔ اس نے جلد ہی ہار مان لی کیونکہ میں صرف دل کی ملکہ نہیں بلکہ اسے شاندار کوٹھی کی ملکہ بنانے کی بات کر چکا تھا۔ مناسب وقت پر مناسب بات کی جائے تو اس کا اثر ہوتا ہے۔ وہ متاثر ہو کر بولی۔

''میں نہیں جانتی تھی کہ آپ اندر سے اتنے دکھی ہیں۔ میں آپ کے تمام دکھ سمیٹ لوں گی''۔

میں نے آگے بڑھ کر اسے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا۔

''پلیز!'' وہ منت سماجت کرنے لگی ''میرا مطلب یہ نہیں تھا۔ ابھی یہ مناسب نہیں ہے۔ اگر آپ حد سے بڑھیں گے تو میں اپنی ہی نظروں میں گر جاؤں گی۔ پلیز مجھے چھوڑ دیجیے''۔

زبردستی کا سودا اچھا نہیں ہوتا۔ میں نے اسے چھوڑ دیا۔ مگر جتنی دیر وہ میرے بازوؤں میں سمٹی رہی (وہ لمحات بہت مختصر تھے) اتنی ہی دیر میں اس کے بدن نے ادھر ادھر سے سمجھا دیا کہ یہ عورت رئیسہ بیگم کی طرح ہڈیوں کا مجسمہ نہیں ہے۔ گوشت پوست کے بلوری بدن میں چھلکتا ہوا جام ہے۔ سر سے پاؤں تک سانس لیتے ہوئے گل بوٹے اور زردوزی کا کام ہے۔ ایسا ریشمی کامدار بدن مختصر سے لمحات میں اپنا ذائقہ بتا کر پرے ہٹ گیا۔ میں اسے حسرت سے دیکھنے لگا۔ میری آغوش خالی ہوگئی تھی۔ اس کا پرس بھی خالی تھا۔

ہم دونوں تھوڑی دیر تک خالی خالی کھڑے رہے پھر میں نے اسے اپنی شرافت کا احساس دلایا۔

''تم مجھے سمجھنا چاہتی ہو، اب سمجھ لو، میں تمہارے سامنے ہوں۔ ایک شریف آدمی کی طرح میں نے تنہائی سے اور تمہاری کسی کمزوری سے فائدہ نہیں اٹھایا۔ کیا اب بھی مجھے سمجھنے کے لیے کچھ رہ گیا ہے؟''

''ہاں ابھی کچھ باقی ہے کیا آپ میرے گھر تک چلنے کی زحمت گوارا کریں گے؟''

''ضرور چلوں گا۔کوئی خاص بات ہے کیا؟''
''جی ہاں۔آپ نے مجھے اپنا گھر دکھایا ہے۔اب میں اپنا گھر دکھانا چاہتی ہوں۔گھر دیکھ کر گھر والے سمجھ میں آجاتے ہیں''۔
''تو پھر نیک کام میں دیر نہیں کرنی چاہیے۔ابھی چلو مسودے کل سے پڑھنا'' وہ کوٹھی سے باہر جانے لگی تو میں نے کہا''ہم بالکل ہی اجنبی نہیں ہیں۔میں کوٹھی کے باہر تک تمہارا ہاتھ پکڑ کر چل سکتا ہوں۔اتنی آس تو دلاؤ کہ یہ ہاتھ ہمیشہ کے لیے میرے ہاتھ میں آنے والا ہے''۔
میں نے چلتے چلتے اس کا ہاتھ تھام لیا۔وہ چلتے چلتے ذرا بل کھائی، ذرا شرمائی مگر اس بار اپنا ہاتھ میرے پاس چھوڑ دیا۔میں نے کوٹھی سے باہر جانے کا راستہ بدل دیا۔اس کی دانست میں، گھوم گھوم کر تمام مقفل دروازوں کو چیک کر رہا تھا اور میں اپنی دانست میں اس کے گورے گورے پھسلتے ہوئے ہاتھ کو دیر تک اپنے ہاتھوں میں مقفل رکھ رہا تھا۔پتہ نہیں ایسا موقع بار بار ملتا یا نہیں، جو موقع مل گیا تھا اسی کو غنیمت جان کر زیادہ سے زیادہ وقت صرف کر رہا تھا۔
شاید وہ میری نیت کو سمجھ رہی تھی چونکہ میں صرف ایک ہاتھ کو تھام کر اسے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا تھا لہٰذا وہ مجھے ڈھیل دے رہی تھی مگر قرض مانگی ہوئی کوئی بھی چیز ہو اسے واپس کرنا پڑتا ہے۔کوٹھی کے باہر کار کا دروازہ کھولتے وقت میں نے وہ قرض حسنہ واپس کر دیا۔وہ پہلے کی طرح پھر اگلی سیٹ پر میرے قریب بیٹھ گئی اور اپنے مکان کا پتہ بتانے لگی۔
فیڈرل بی ایریا میں تین کمروں کا ایک چھوٹا سا مکان تھا۔مکان کے دروازے پر نعیم درانی کے نام کی چھوٹی سی تختی لگی ہوئی تھی۔شہناز نے انٹرویو کے دن بتایا تھا کہ درانی اس کے باپ کا نام ہے۔میں نے پورا نام نہیں پوچھا اس نے بھی نہیں بتایا تھا۔نیم پلیٹ پڑھ کر پہلی بار پورا نام معلوم ہوا۔وہ کار سے اتر کر پہلے گھر میں گئی پھر مجھے بلایا۔
میں نے گھر میں جانے سے پہلے کار کے عقب نما آئینے میں اپنا جائزہ لیا کہ کہیں سے بڑھاپا تو نہیں جھلک رہا ہے۔میری آنکھیں مجھے آئینے میں ایک گبرو جوان بنا کر پیش کر رہی تھیں اگر یہ جھوٹ ہوتا تب بھی مجھے اس بات کا یقین تھا کہ شہناز کا باپ بوڑھا ہوگا۔بوڑھے کی آنکھیں کمزور ہوں گی۔آٹے میں نمک کے برابر جو مجھ میں بڑھاپا ہے وہ اس بوڑھے کو نظر نہیں آئے گا لہٰذا وہ مجھے ہونے والے سسر کی شفقت سے دیکھے گا۔
شہناز مجھے سامنے والے کمرے میں بٹھانے کی بجائے مکان کے آخری کمرے میں لے گئی۔جہاں نعیم درانی ایک بستر پر لیٹا ہوا تھا۔اس کے جسم پر پاؤں سے کمر تک ایک چادر پڑی ہوئی تھی۔اس کا چہرہ بتا رہا تھا کہ وہ بوڑھا نہیں ہے آنکھوں کی گہرائی بتا رہی تھی کہ زندگی کے مصائب نے اسے بوڑھا بنا دیا ہے۔اس نے لیٹے ہی لیٹے مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔
''میں نادم ہوں۔آپ کے استقبال کے لیے اٹھ نہیں سکتا۔میرے دونوں پاؤں فالج زدہ ہیں''۔
میں نے مصافحہ کرنے کے بعد کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔
''یہ سن کر افسوس ہو رہا ہے کہ آپ دونوں پاؤں سے معذور ہیں۔یہ معذوری کب سے ہے؟''
''تقریباً پانچ سال سے بستر پر پڑا ہوں۔شہناز سے شادی کرنے کے چھ ماہ بعد ہی میری ٹانگوں پر فالج گرا تھا''۔
میرے ذہن کو ایک شدید جھٹکا لگا۔شہناز سے نعیم درانی کی شادی؟ کہیں میں غلط تو نہیں سن رہا ہوں۔میں نے نظریں اٹھا کر شہناز کو دیکھا تو وہ نظریں جھکا کر یہ کہتی ہوئی چلی گئی کہ ابھی چائے لے کر آرہی ہوں۔اس کی جھکی

ہوئی نظروں نے اور کترا کر وہاں سے چلے جانے کے انداز نے یقین دلایا کہ وہ اچھوتی دوشیزہ نہیں ہے شادی شدہ ہے اور اس کے نام کے ساتھ جو درانی آتا ہے وہ اس کے شوہر کا نام ہے۔

اس کا شوہر نعیم درانی کچھ کہہ رہا تھا۔ میرے کان سن رہے تھے مگر دماغ نہیں سمجھ رہا تھا۔ میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے کس قدر اپنی توہین کا احساس ہو رہا تھا یوں لگ رہا تھا جیسے شہناز مجھے اپنے گھر میں ایک طمانچہ مارنے لائی تھی۔ یہ بات تو وہ مجھے میری کوٹھی میں بھی بتا سکتی تھی۔ انٹرویو کے دن بھی بتا سکتی تھی۔ یہ کیسی ذلالت تھی کہ شوہر کا نام استعمال کرتی تھی اور باپ کا رشتہ بتاتی تھی۔ یہ ہماری دنیا میں کیسے کیسے تماشے ہوتے ہیں؟ جانوروں کے سماجی اور خونی رشتے سمجھ میں نہیں آتے۔ فریب کا پردہ چاک کیا جائے تو انسانی رشتے کب سمجھ میں آتے ہیں؟

اس وقت میری سب سے بڑی خواہش یہی تھی کہ کسی بہانے وہاں سے بھاگ جاؤں۔ اس ماحول میں دم گھٹ رہا تھا۔ فالج زدہ نعیم کو دیکھ کر یہ بھی خیال آ رہا تھا کہ میں کسی بھی بہانے سے فوراً واپس جانے کا ارادہ ظاہر کر دوں تو وہ نہ جانے کیا سوچے گا۔ میرے کچھ سمجھنے سے پہلے اس نے بڑے دکھ سے کہا۔

''آدمی کے دونوں پاؤں بے کار ہو جائیں تو اس کا باقی جسم بھی بیکار ہو جاتا ہے۔ میں فالج زدہ پیروں پر جسم کا باقی بوجھ اٹھا کر کھڑا بھی نہیں ہو سکتا۔ چلنا تو دور کی بات ہے میرے سامنے اس دنیا کے تمام راستے بند ہو گئے ہیں صرف ایک ہی راستہ ہے زندگی کی معیاد پوری کرنے کے بعد اس بستر سے اٹھ کر قبرستان کے راستے پر چلا جاؤں گا۔ چار کاندھوں پر۔ نہ جانے اس کوٹھری سے نکل کر اس راستے پر جانے کے لیے اور کتنا انتظار کرنا ہو گا؟''

وہ ایک لاش کی طرح بستر پر پڑا ہوا تھا مگر اس کے اندر زندگی کی جو امنگ تھی۔ اٹھنے بیٹھنے اور دوڑ کر بھاگ کر اپنی محبوبہ بیوی کو بازوؤں میں اٹھا لینے کی جو خواہشات تھیں وہ سب اس کی گفتگو کے الفاظ میں، آواز کے درد میں بین کرتی ہوئی محسوس ہو رہی تھیں۔ اس نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''میرے پاؤں آپ کی طرف نہیں جا سکتے مگر آپ کے پاؤں مجھ غریب کی طرف آ گئے ہیں، میں بیان نہیں کر سکتا کہ مجھے کتنی خوشی ہو رہی ہے۔ باہر کی دنیا سے کوئی تو ایسا ہے جو میری عیادت کے لیے آیا ہے''۔

میں نے اس سے متاثر ہو کر کہا۔

''آپ مایوس نہ ہوں مجھے جب بھی فرصت ملے گی میں آپ سے ملنے آیا کروں گا''۔

''صادق صاحب!'' اس نے کہا ''دنیا والے صرف ایسے ہی لوگوں سے ملتے ہیں جن سے ان کی کوئی ضرورت ہوتی ہے۔ آپ پہلے شخص ہیں جو میری دلجوئی کے لیے آئیں گے''۔

اسے کیا معلوم تھا کہ میں بھی اپنی ضرورت پوری کرنے یعنی اس کی بیوی کو حاصل کرنے کے لالچ میں وہاں گیا تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ میں شہناز کو کسی کی بیوی کی حیثیت سے نہیں جانتا تھا۔ اب جان کر غصہ آ رہا تھا ایسے ہی غصے کے وقت وہ چائے لے کر آ گئی۔ میں نے اس کی طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ پیالی اٹھا کر گرم چائے کو پھونک پھونک کر جلدی جلدی پینے لگا۔ چائے کی گرمی سے زبان جل رہی تھی۔ شہناز کی موجودگی سے دل جل رہا تھا۔ نفرت سے میرا سینہ پھٹا جا رہا تھا۔ میں نے پیالی خالی کر کے ٹرے میں رکھ دی پھر واپسی کے لیے اٹھ گیا۔ شہناز نے مجھے نہیں روکا۔ وہ کس منہ سے مجھے روکتی؟ اس کے شوہر نے مجھے دوبارہ آنے کے لیے کہا۔ میں جھوٹا وعدہ کر کے اس دم گھٹنے والے ماحول سے نکل گیا۔

اپنی کوٹھی پر پہنچا تو وہ ایسی خالی خالی سی تھی کہ وہاں کا ہر کمرہ منہ کھولے مجھے نگلنے کو تیار تھا۔ ایک گھنٹہ پہلے وہ اسی جگہ آئی تھی اور اپنے مہکتے ہوئے وجود سے ایک رومانی فضا پیدا کی تھی۔ میں اسے اچھوتی دوشیزہ سمجھ کر اس کے متعلق کتنی دور تک چلا گیا تھا جہاں ہر وقت میری بیوی کی کھانسیاں کسی بدروح کی طرح بھٹکتی رہتی تھیں وہاں میں نے اس کی کنواری سانسوں کی سرگوشی سنی تھی۔ اب وہ لمحاتی جنت پھر جہنم میں بدل گئی تھی۔

رات کو بہت دیر تک نیند نہیں آئی۔ میں ہر کروٹ پر اس کو کوستا رہا۔ اسے بازاری عورت اور سوسائٹی گرل سمجھ کر اپنے ذہن سے دور جھٹکتا رہا۔ ایسی عورت کا کیا بھروسہ جو اپنے خاوند کے اعتماد کو ٹھیس پہنچا کر میرے پاس ایک سنہرے مستقبل کا خواب دیکھتی ہوئی آئی تھی۔ کبھی وہ میرے برے وقت میں مجھے بھی دھوکہ دے سکتی ہے۔ عورت ذات پر بھروسہ کرنا ہی نہیں چاہیے۔ عورت کو گالیاں دے کر، اسے کمتر اور ذلیل بنا کر بڑا سکون ملتا ہے جب یہ سوچ کر میرے دل کو اطمینان ہوا کہ بحیثیت ایک مرد ایسی عورتوں سے افضل ہوں تو مجھے نیند آ گئی۔ یہ غور کرنے اور سمجھنے کے لیے اہم نکتہ ہے کہ ہم اپنی کمینگی کے باوجود جب تک ایک کمینی عورت سے خود کو برتر نہ سمجھیں اس وقت تک نہ تو کھانا ہضم ہوتا ہے اور نہ ہی سکون سے نیند آتی ہے۔

دوسرے دن میں دیر تک سوتا رہا۔ اس لیے دیر سے دفتر پہنچا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ اب منہ نہ دکھائے گی مگر وہ اپنی میز پر سر جھکائے پروف ریڈنگ میں مصروف تھی۔ میرے جی میں آیا اسی وقت اسے ملازمت سے الگ کر دوں۔ مگر ذاتی کشیدگی کے باعث کسی کے پیٹ پر لات مارنا اچھی بات نہیں ہے اس لیے میں نے اسے برداشت کر لیا۔ تمام دن مجھ سے کام نہ ہو سکا کیونکہ وہ سامنے میز پر بیٹھی ہوئی تھی۔ بار بار میری نگاہیں اس طرح بھٹک جاتی تھیں۔ الو کی پٹھی ایسی جاذب نظر تھی کہ نظروں کو جذب کر لیتی تھی۔ اس کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں مگر اٹھی ہوئی نگاہوں کی حشر سامانی مجھے یاد آ رہی تھی۔ وہ مجھے نہیں دیکھ رہی تھی لیکن جب دیکھا کرتی تھی اس وقت خواہ مخواہ اس بات کا یقین ہو جاتا تھا کہ وہ خوب صورت آنکھیں صرف مجھے دیکھنے کے لیے بنائی گئی ہیں۔

میں ٹھہر ٹھہر کر اسے دیکھ رہا تھا اور اس کے چہرے کا ایک ایک نقش مجھے سمجھا رہا تھا کہ ایسی حسین عورت کسی نصیب والے کے حصے میں آتی ہے۔ پہلے اسے ہمیشہ کے لیے میں اپنانا چاہتا تھا اب یہ کوئی ضروری نہیں تھا۔ ایسی حسین اور دلنشین عورت کے ساتھ صرف رنگین لمحات گزارے جا سکتے ہیں، سنجیدگی سے محبت کرنا حماقت ہے۔ میں نے اپنے آپ کو ٹٹولا تو یہ بات بھی سمجھ میں آ گئی کہ گھر میں بیوی تو موجود ہے، ایک محبوبہ نہیں تھی۔ دراصل میں ایک محبوبہ یا دوسرے لفظوں میں ایک داشتہ کا خواہش مند تھا۔ میں نے پھر ایک بار نظریں اٹھا کر شہناز کو دیکھا تو اس کے لیے میرے خیالات یکسر بدل گئے۔ اب وہ ایسا کھلونا نظر آ رہی تھی جو اپنی عمر کی چابی سے جوانی کی مدت تک چلتا ہے پھر وہ مرد کے لیے بیکار ہو جاتی ہے۔ میری بیوی بیکار ہونے کے باوجود بیکار نہیں ہوئی تھی کیونکہ وہ میری بیوی تھی۔

دوپہر کو لنچ کے بعد وہ میرے پاس میز کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔ اس سے یہ طویل خاموشی برداشت نہیں ہو سکی تھی۔ وہ مسودہ لے کر پوچھنے کے بہانے سے چلی آئی۔ اس طرح بے اعتنائی برتی جائے تو عورت پیچھے پیچھے چلی آتی ہے۔ میں نے پھر بڑی بے نیازی سے کہا۔

"مسودہ منیجر کے پاس لے جاؤ اور جو کچھ پوچھنا ہے اس سے پوچھ لو......"

وہ جانے کے لیے میرے قریب نہیں آئی تھی ایک کرسی کھینچ کر بیٹھ گئی پھر آہستگی سے بولی۔

''میرے والد کا نام شہاب دُرّانی ہے۔ اپنے باپ کے نام کی مناسبت سے میرا نام شہناز درانی ہے۔ جب سے میں پیدا ہوئی باپ کا یہ نام میرے نام کے ساتھ چلا آرہا ہے اسی لیے انٹرویو کے دن میں نے صرف اپنے باپ کا ہی ذکر کیا تھا''۔

میں نے نفرت سے منہ بنا کر کہا۔

''تم باتیں بنا کر اپنی غلطی کو نہ چھپاؤ۔ شادی کے بعد عورت باپ کا نہیں، شوہر کا نام لیتی ہے''۔

''آپ درست کہتے ہیں مگر میں شادہ شدی ہونے کے باوجود خود کو کسی کی بیوی نہیں سمجھتی۔ کیا نعیم نے آپ کو یہ نہیں بتایا کہ شادی کے چھ ماہ بعد ہی اس کی دونوں ٹانگوں پر فالج گرا تھا۔ دنیا والوں کی نظروں میں میری شادی ہو چکی ہے لیکن میرے اندر کوئی جھانک کر نہیں دیکھ سکتا کہ کس طرح میں اپنے سہاگ کا سوگ منا رہی ہوں۔ میں خود کو کیا کہوں؟ بدنصیب کنواری یا سہاگن بیوہ؟''

میری ساری نفرت ڈھل گئی۔ میں اسے دیکھتے ہوئے سوچنے لگا کہ واقعی اسے کیا کہا جا سکتا ہے۔ میں نے اس پہلو پر غور نہیں کیا تھا کہ نعیم فالج زدہ ہے اور شہناز پر کیا بیت رہی ہوگی اور وہ اپنی عمر کے سہانے شب و روز کیسے گزار رہی ہوگی۔ میں نے اس سے کہا۔

''ایسی بات ہے تو تمہیں نعیم سے قطع تعلق کر لینا چاہیے''۔

''کھانا باسی یا خراب ہو تو اسے پھینکا جا سکتا ہے۔ انسان کو نہ پھینکا جا سکتا ہے نہ اس کے برے وقت میں اس کا ساتھ چھوڑا جا سکتا ہے۔ آخر محبت اور مروت بھی تو کوئی چیز ہے۔ آپ کی بیگم دائمی مریضہ ہیں۔ کیا آپ ان کا ساتھ چھوڑ سکتے ہیں؟''

میں نے اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھا تو پتہ چلا کہ پچھلی محبتوں سے قطع تعلق نہیں کیا جا سکتا۔ اگر میں اپنی بیمار بیوی کو چھوڑ دوں تو انسانوں کی دنیا میں انسان کیسے کہلاؤں گا اور شہناز جیسی عورتیں تو ہمیشہ بدنامی کے گڑھے کے پاس کھڑی رہتی ہیں۔ جہاں ان سے ذرا بھول چوک ہوئی، جہاں انہوں نے مجازی خدا کی ذرا سی برائی کی، وہاں ان پر نفرت کے پتھر برسنے لگتے ہیں۔ دوسری شادی کرنے کے باوجود بدنامی کے گڑھے سے نہیں نکل سکتیں۔ ان کا دوسرا شوہر بھی بے وفائی کے طعنے ضرور دیتا ہے۔ مجھے خاموش دیکھ کر وہ پھر مدھم لہجے میں بولی۔

''میں دن میں اپنی ذہنی الجھنوں میں گرفتار رہتی ہوں۔ نعیم بہت مجبور ہے۔ میں اس مجبور کا ساتھ نہیں چھوڑ سکتی۔ اس کے باوجود سوچتی ہوں کہ زندگی کی تمام خواہشیں کیا اسی طرح خاموشی سے دم توڑتی رہیں گی۔ کوئی تو ایسا راستہ ملے، کوئی تو ایسی صورت نکلے کہ میں بے وفا اور نہ بے مروت نہ کہلاؤں اور زندگی کی ساری مسرتیں میرے دامن میں سمٹ کر آ جائیں''۔

''ہاں میں بھی کچھ ایسا ہی سوچتا ہوں کہ بیوی گھر کی چار دیواری میں قید رہے اور گھر سے باہر زندگی کی ساری مسرتیں اور خواہشیں تمہارے روپ میں مل جائیں۔ انسان قناعت پسند نہیں ہے۔ ہم جس محرومی کی آگ میں جل رہے ہیں وہاں قناعت پسندی ہم سے پہلے جل کر راکھ ہو جاتی ہے''۔

میں اپنی بات کہہ کر اس کا منہ تکنے لگا۔ جو بات میں نے کہی، وہی بات اس کے دل میں تھی۔ شرافت سے اور تہذیبی اصولوں سے کوئی صورت نہیں نکلتی کہ محرومی کی آگ کو کس طرح بجھائے، جب کوئی راستہ نہیں ملتا تو بہت ٹیڑھے

میٹر ھے راستے نکل آتے ہیں اور انسان سہم سہم کر ان راستوں پر قدم رکھنا شروع کر دیتا ہے۔ میں نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''اگر ہم اس طرح ملتے رہیں تو یہ کوئی بری بات تو نہ ہوگی؟''

''ہاں! مرد کے لیے کوئی بات بری نہیں ہوتی۔ پہلے میں نے سوچا تھا کہ گھر کی چار دیواری سے باہر کوئی ساتھی ہو۔ اتنی بڑی دنیا کے اتنے لمبے لمبے راستوں پر کوئی کب تک اکیلا چل سکتا ہے۔ اگر میں کسی نوجوان کا ساتھ تلاش کرتی تو راستے کے کسی موڑ پر وہ یہ کہہ کر میرا ساتھ چھوڑ سکتا تھا کہ میں کسی فالج زدہ کو ٹھیس پہنچا کر آئی ہوں۔ کئی برس کے بعد کل میرے دل میں آپ کے لیے جگہ پیدا ہوئی۔ یہ سوچ کر کہ آپ مجھے طعنہ نہیں دیں گے کیونکہ آپ بھی کسی مریضہ کے دل کو ٹھیس پہنچا کر میری طرف بڑھ رہے ہیں اور اس حقیقت سے اچھی طرح واقف ہیں کہ اتنے لمبے لمبے راستوں پر نہ کوئی اکیلا چل سکتا ہے نہ کوئی اکیلی چل سکتی ہے۔ ان حالات میں کیا ہوتا ہے، کیا آپ بتا سکتے ہیں؟''

''ہاں ان حالات میں چور رشتے قائم ہوتے ہیں۔ اوپر سے تہذیب اور شرافت کا خول چڑھا رہتا ہے اندر سے خواہشات کی آگ سلگتی رہتی ہے۔ آج تک اس دنیا کا کوئی تہذیبی اصول اس بارود کو نہیں بجھا سکا۔ ہم اپنے جیسے انسانوں کے اندر جھانک کر دیکھیں تو کتنی ہی جگہ اس بارود کے دھماکے سے تہذیب کی دھجیاں اڑتی نظر آتی ہیں۔ مشکل یہ ہے کہ ہم سے کوئی کھل کر اس چور رشتے کا اظہار نہیں کرنا چاہتا۔ پہلے نالیاں زمین کی سطح پر بہتی تھیں اب زمین کی تہہ میں بہتی ہیں اور اوپر سے اجلے لباس کا ڈھکنا چڑھا دیتے ہیں''۔

شہناز نے مایوسی سے کہا۔

''یہ تو تقریر ہوگئی۔ ایسی تقریریں سماج کے مصلحین اور لیڈروں تک یا مصنفین کے قلم تک اچھی لگتی ہیں۔ اگر یہ باتیں قلم کی نوک سے باہر آجائیں تو اپنے اندر تھوک کا ذخیرہ رکھنے والے دوسروں پر تھوتھو کرتے ہیں، مگر ہم کیا کریں گے؟''

''وہی کریں گے جو حالات کا تقاضا ہے اگر نہیں کر سکیں گے تو تسبیح لے کر ایک گوشے میں بیٹھ جائیں گے کیونکہ ایک گوشے میں بیٹھ کر دنیا بھر کی ضروریات اور خواہشات سے پیچھا چھڑایا جا سکتا ہے''۔

''وہ جھجکتے ہوئے بولی۔

''مگر یہ چور رشتہ بدنام کر دے گا، دستور کے مطابق آپ کا کچھ نہیں بگڑے گا۔ کبھی کبھی سوچتی ہوں کہ ہم جیسی عورتوں کے سماجی رشتوں میں لچک کیوں نہیں پیدا ہوتی۔ یہ درست ہے کہ مذہبی اور قانونی اصولوں کے تحت عورت ایک فالج زدہ شوہر سے قطع تعلق کر سکتی ہے لیکن انسانی ہمدردی کا تقاضہ ہے کہ ان حالات میں ایسے مجبور خاوند کا ساتھ نہ چھوڑا جائے۔ وفا بھی تو کوئی چیز ہے۔ پیار بھی تو کسی جذبے کا نام ہے۔ آپ یقین کریں جب میں نعیم کو بستر پر بے یار و مددگار پڑا دیکھتی ہوں تو میرا دل محبت اور ہمدردی کے جذبے سے بھر جاتا ہے اور جب میں اپنے بستر پر تنہا لیٹی رہتی ہوں تو میرے اپنے جذبات اور خواہشات میری انسانی ہمدردی کے باوجود بغاوت کرنے لگتے ہیں۔ میرے ندر پلنے والے دکھ سے کوئی واقف نہیں۔ میں فیصلہ نہیں کر سکتی کہ مجھے کیا کرنا چاہیے''۔

''تو پھر آپ وعدہ کریں کہ کوئی حتمی فیصلہ کرنے سے پہلے ہم اس نئے راستے پر کوئی غلطی نہیں کریں گے''۔

''میں وعدہ کرتا ہوں''۔

مین نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ اس نے میرے ہاتھ پر اپنا نازک سا ہاتھ رکھ دیا۔ جس کسی بات کا عہد کیا جاتا ہے اس عہد کو مستحکم بنانے کے لیے ہم آپس میں ہاتھ ملاتے ہیں۔ ہم نے بھی ایک دوسرے کا ہاتھ تھام لیا کہ کوئی غلطی

نہیں کریں گے مگر اس کا ہاتھ تو میرے ہاتھ میں آ ہی گیا تھا۔ اس کے ہاتھ آنے میں کتنی دیر لگتی؟ غلطی کی ابتدا ہو چکی تھی یوں دیکھا جائے تو ہم نے ہاتھ ملا کر ایک دوسرے کو غیر شعوری طور پر چھونے کا بہانہ تلاش کر لیا تھا۔ اکثر غلطی کا آغاز شعوری طور پر نہیں ہوتا۔

دیکھتے ہی دیکھتے ہماری دنیا بدل گئی۔ شہناز سے پہلے یہ دنیا بلیک اینڈ وہائٹ نظر آتی تھی اب وہ میرے قریب آئی تو رنگوں کا اک ہجوم لے کر آئی۔ اب میں جہاں سے گزرتا مجھے عمارتوں کے، باغیچوں کے پھولوں کے اور گزرنے والی کاروں کے رنگ الگ الگ واضح طور سے نظر آتے اگر عورت کا وجود نہ ہوتا تو مرد کو رنگوں کی پہچان نہ ہوتی۔ شہناز کے احساسات بھی کچھ ایسے ہی تھے۔ وہ اکثر کہتی تھی۔

''اب میری زندگی میں دور دور تک مایوسی کے سائے نہیں ہیں۔ آپ کو پا کر ایک مضبوط سہارے کا یقین ہوتا ہے کیونکہ عورت کسی قابل اعتماد سہارے کے بغیر رشتوں کے ہجوم میں بھی تنہا رہتی ہے۔ اب میں نعیم کے پاس جاتی ہوں تو خیال مجھے پریشان نہیں کرتا کہ میں ایک ٹوٹی ہوئی عورت ہوں بلکہ اب میں پہلے سے زیادہ نعیم کی خدمت کرتی ہوں۔ آپ میری محبت ہیں لیکن وہ میرا فرض ہے اور کوئی عورت بھی فرض کو بھول کر سچائی سے محبت نہیں کرتی۔ کاش کہ ایسا نکاح بھی پڑھایا جا سکتا کہ جو نعیم جیسے شوہر کے لیے فرض تک محدود ہوتا اور ایسی محبت کا اجازت نامہ حاصل ہوتا جس کے تحت میں آپ کی دنیا کو جنت بنا دیتی''۔

''ایسا کبھی نہیں ہوگا شہناز، ایسا اسی وقت ہوگا جب قیامت سے پہلے اولاد ماؤں کے ناموں سے پکاری جائے گی۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا صرف ویسا ہوگا جیسا کہ میں پہلے کہہ چکا ہوں یعنی چور رشتے......''

میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ وہ میرے بیڈ روم میں ایک صوفے پر میرے قریب بیٹھی ہوئی تھی۔ ہماری ملاقات کو چھ ماہ گزر چکے تھے۔ اتنی مدت میں، میں صرف اس کے ہاتھ کو پکڑتا آیا تھا۔ اس روز میں نے اپنا دوسرا ہاتھ اس کی پشت پر سے لے جا کر اس کے شانے پر رکھا۔ وہ ذرا کسمسائی مگر جدوجہد نہیں کی۔ میں نے حوصلہ پا کر اسے اپنے بازوؤں کے حصار میں لے لیا۔ تب اس نے اعتراض کیا۔

''نہیں، ہم کوئی غلطی نہیں کریں گے''۔

''ہاں غلطی نہیں کریں گے''۔ میں نے اس کے کان کے قریب جذبات سے ہانپتی ہوئی سرگوشی کی ''لیکن پیار کرنا تو کوئی غلطی نہیں ہے''۔

اس نے کچھ کہنے کے لیے لب کھولے، لبوں کی کلیاں کھلیں پھر کچھ کہنے سے پہلے ہی میں نے اپنے ہونٹ ان پیاسی کلیوں پر رکھ دیئے۔ مدت سے بہار کا جھونکا نہیں آیا تھا۔ رات کی کوکھ سے صبح بہاراں کی شبنم نہیں ٹپکی تھی پہلی بار میرے ہونٹوں کی نمی نے پھول کی پنکھڑیوں کو تر بتر کیا تو اس کے حلق سے ایک لطیف سی کراہ نکلی۔ وہ جدوجہد کرنا بھول گئی۔ جب سانس لینا دوبھر ہو گیا تو میں نے ذرا الگ ہو کر دیکھا۔ پنکھڑیوں کی گلابی رنگت سرخ ہو گئی تھی۔ رخسار آنچ دے رہے تھے اور آنکھیں بھیگ رہی تھیں وہ میرے سینے پر سر رکھ کر سسکیاں لینے لگی۔

''میں کیا کروں؟ میری سمجھ میں نہیں آتا مجھے ڈر لگتا ہے، بہت ڈر لگتا ہے''۔

میں نے تسلیاں دینے کے بہانے اپنا ہاتھ ادھر سے ادھر پھیرتے ہوئے اسے سمجھایا۔

''ایک ڈر کے بعد دوسرا اور دوسرے کے بعد تیسرا ڈر پیدا ہوتا چلا جاتا ہے۔ تم ڈرتی رہو گی تو ایک دن اپنی

جوانی کا ماتم کرنے کے لیے بوڑھی ہو جاؤ گی۔ کوئی اس المناک حادثے کو نہیں سمجھ سکے گا کہ تمہاری جوانی کو خوف اور شرم کی دیمکوں نے کس طرح کھالیا ہے۔ تمہارے بڑھاپے کو دیکھ کر کوئی یہ سمجھنے کی زحمت گوارا نہیں کرے گا کیونکہ بڑھاپا ایک لعنت ہے اور سمجھنے کے لیے ہمارے اطراف جوان عورتوں کا میلہ لگا رہتا ہے۔ ایسے میں کسے فرصت ملے گی کہ وہ تمہارے بارے میں سوچے اگر تم صحیح معنوں میں زندہ رہنا چاہتی ہو تو دوسروں کو اپنے متعلق سوچنے پر مجبور کرو"۔

ایسے مرحلے پر زیادہ سمجھنے اور سمجھانے کی ضرورت نہیں پڑتی کیونکہ وہ سہاگن بیوہ سہاگ کی خوشیوں کی تلاش میں بھٹکتی ہوئی اس مقام تک پہنچ گئی تھی لہٰذا میں اِسے اس مقام سے آگے لے جانے لگا تو وہ گھبرا کر بولی۔

"میں بدنام ہو جاؤں گی"۔

میں نے اسے سمجھا دیا کہ بدنامی کا اندیشہ نہیں ہے خاندانی منصوبہ بندی بڑی اچھی چیز ہے (ہاں میں وہی ہوں جو اپنی بیگم کے معاملے میں خاندانی منصوبہ بندی کو برا سمجھتا ہوں) وقت وقت کی بات ہوتی ہے۔ ایک وقت میں جو چیز نقصان دہ ہوتی ہے دوسرے کسی وقت میں فائدہ مند ثابت ہوتی ہے۔ پہلے ہتھیار ایک اچھے مقصد کے لیے اپنی حفاظت کے لیے بنائے گئے تھے پھر ہم اپنے مفاد کے لیے اس ہتھیار سے اپنی برائیوں کو قتل کرنے لگے۔ خاندانی منصوبہ بندی ایک صحت مند معاشرے کے لیے عمل میں آئی ہے مگر ہمارے یہاں تو ایک گھناؤنے معاشرے کے مفاد کے بھی کام آتی ہے۔ ایسی دنیا میں یہی ہوتا ہے کہ کوئی ایک راستے کے روشن کنارے پر چلتا ہے کوئی تاریک کنارے پر۔

خواب گاہ خاموش تھی ہم خاموش تھے، تنہائی سانسیں لیتی ہوئی بول رہی تھی۔ بستر کے سرہانے والی میز پر شہناز کا پرس رکھا ہوا تھا۔ پہلی بار جب وہ میرے ساتھ میری کار میں بیٹھ کر میری کوٹھی میں آرہی تھی اور اس نے اپنی سہیلیوں کی باتیں کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کا پرس خالی ہے تو میں نے اس کے پرس کے خلا کو پر کرنا چاہا تھا۔ وہ منظر مجھے اچھی طرح یاد ہے۔ اس نے فوراً ہی انکار کرتے ہوئے پرس کو سینے سے لگایا تھا جیسے وہ اپنی عزت کو کلیجے سے لگا رہی ہو۔ وہ عزت نما پرس میری خواب گاہ میں پڑا ہوا تھا۔ وہ بہت ہی خوبصورت پرس تھا۔ اس کے بدن پر رنگ برنگے موتی جڑے ہوئے تھے۔

وہ قیمتی موتی کہیں سے ابھرے ہوئے کہیں سے ڈوبے ہوئے تھے۔ میں ایک ایک موتی کو چھو کر اس کے حسن کو سمجھ رہا تھا۔

مرد کا بٹوہ ہو یا عورت کا پرس۔ وہ ہماری سماجی زندگی کی عکاسی کرتا ہے۔ وہ ایک دولت مند کی طرح مالا مال ہوتا ہے یا پھر غریب کی جیب کی طرح خالی رہتا ہے۔ وہ حاملہ عورت کے پیٹ کی طرح پھولا ہوتا ہے یا رئیسہ بیگم کی طرح پچک جاتا ہے اور شہناز کے وجود کی طرح ملائم اور لچک دار بھی ہوتا ہے۔ میں نے اس ملائم پرس کی زپ کھول دی اور اس کی ضروریات اور خواہشات کے ایک ایک سکے سے پہلی بار اس کے پرس کی گود بھر دی۔

پہلے ہم ایک دوسرے کی آرزو تھے اب ایک دوسرے کی ضرورت بن گئے تھے۔ اب وہ شام کو کوٹھی میں آکر مسودے نہیں پڑھتی تھی کیونکہ میں اس کی زندگی کے مسودے پڑھتا رہتا تھا۔ اس کی تنخواہ اتنی ہی تھی محبت کا کمیشن بڑھ گیا تھا۔ میں ہر دوسرے تیسرے دن اسے ہزاروں روپے کی شاپنگ کراتا تھا۔ اس کے نام سے ایک بینک میں اکاؤنٹ بھی کھول دیا تھا اور وہ اکاؤنٹ بڑھتا جا رہا تھا۔ اگر سطحی طور پر دیکھا جائے تو یہ ایک کاروباری رشتہ تھا میں شاپنگ اور بینک اکاؤنٹ کے ذریعے اس کی جوانی کے لمحات خرید رہا تھا لیکن مجھ سے پوچھا جائے تو میں اسے اپنے

دل کی بات کہوں گا کہ وہ دن بدن میرے دل میں سماتی جا رہی تھی۔ میں اسے خرید نہیں رہا تھا بلکہ محبت اور خلوص سے اس کے کام آرہا تھا۔ جیسے جیسے دن گزرتے جا رہے تھے وہ میرے لیے زیادہ سے زیادہ پرکشش بنتی جا رہی تھی اس کی وجہ یہ تھی کہ جو چیز ضرورت کے وقت فوراً ہی آسانی سے حاصل ہو جائے اس کے لیے اتنی کشش نہیں رہتی اور جو چیز دنیا والوں کے خوف سے چوری چوری حاصل ہو اس کی جاذبیت اور کشش ہمیشہ قائم رہتی ہے۔ اسی لیے بیوی سے زیادہ محبوبہ حسین نظر آتی ہے۔

مگر اس حسین زندگی کو پھر گہن لگنے لگا۔ میری رئیسہ بیگم میکے سے واپس آگئی تھی۔ آٹھ ماہ کا عرصہ کچھ کم نہیں ہوتا۔ اس دوران میں کتنے ہی بہانوں سے اپنی بیگم کو اس کے میکے میں روکتا رہا تھا۔ کبھی مہینے میں دو چار دن کے لیے لاہور چلا جاتا تھا اور اسے سمجھاتا تھا کہ لاہور کی آب و ہوا اسے صحت مند اور شگفتہ بنا رہی ہے۔ کراچی کی آب و ہوا اسے پھر بیمار کر دے گی۔ میں اسے آغوش میں لے کر اس خوش فہمی میں مبتلا کرتا رہتا تھا کہ اب وہ میرے لیے صحت مند اور پرکشش ہو گئی ہے اور میں کراچی جا کر اس کی قربت کے لمحات کو نہیں بھولتا ہوں (قربت کے لمحات میں، میں خاندانی منصوبہ بندی کو برا کہتا تھا) نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ ماہ کے بعد وہ اپنے بھاری پاؤں لے کر کراچی پہنچ گئی۔

لیڈی ڈاکٹر نے پورے یقین کے ساتھ فیصلہ سنا دیا تھا کہ اس بار وہ زچگی کے دوران زندہ نہیں بچے گی۔ میں اس کا مٹکا سا پیٹ دیکھ کر فکر مند ہو گیا۔ شہناز کے لیے میں نے دو بیڈروم کا ایک مکان اور لے لیا تھا وہاں ہماری ملاقاتیں ہوا کرتی تھیں اس نے مجھے فکر مند دیکھ کر پوچھا۔

''کیا بات ہے آپ اداس نظر آرہے ہیں؟''

''ہاں! رئیسہ پھر ماں بننے والی ہے اس بار وہ نہیں بچے گی''۔

شہناز کی آنکھوں میں چمک سی پیدا ہوئی پھر وہ جلدی سے نظریں جھکاتی یا نظریں چراتی ہوئی بولی۔

''خداوند کریم آپ کی بیگم کو سلامت رکھے۔ آپ ایسی باتیں کیوں کرتے ہیں؟''

''یہ باتیں میں نہیں کہتا۔ ڈاکٹر کہتے ہیں۔ تین سال پہلے رئیسہ کی زچگی کے وقت ایک ڈاکٹر نے صاف طور سے کہہ دیا تھا کہ اپنی بیوی کا پیچھا چھوڑ دو نہیں تو یہ مر جائے گی مگر ہمارے خاندان میں خاندانی منصوبہ بندی کو سبھی برا سمجھتے ہیں اور یہ درست بھی ہے کہ وجود میں آنے والے بچے کو قتل کرنا ایک بہت بڑا گناہ ہے''۔

شہناز نے بڑے کمزور لہجے میں تائید کی۔

''ہاں یہ گناہ ہے۔ اللہ کی دین سے انکار نہیں کرنا چاہیے''۔

''خاندانی منصوبہ بندی کے ادارے میں فیلڈ ورک کرنے والی عورتیں ہر دوسرے تیسرے ماہ رئیسہ کے پاس آتی ہیں اور منصوبہ بندی کے لیے پی سی ٹیبلٹ وغیرہ دے کر چلی جاتی ہیں۔ رئیسہ پہلے وہ چیزیں پھینک دیا کرتی تھی اب میں وہ تمہیں لا کر دیتا ہوں۔ ہر چیز اپنے صحیح مقام پر اچھی لگتی ہے۔ ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ ڈاکٹر کے مشورے کے مطابق رئیسہ مجھ سے دور رہنے لگی مگر ہم ازدواجی زندگی کی ڈور کے دوسروں پر بندھے ہوئے ہیں۔ ایک دوسرے سے کتنی دور بھاگ سکتے ہیں؟ پچھلے برس وہ میٹرنٹی ہوم پہنچ گئی۔ پچھلے برس اس کی حالت بہت ہی نازک تھی۔ بدن میں نام کو خون نہیں تھا۔ ہڈیوں کا ڈھانچہ بنی ہوئی تھی۔ لیڈی ڈاکٹر نے مجھے سخت لہجے میں سمجھایا کہ میں اپنی بیوی کو محبت سے قتل نہ کروں۔ لیکن محبت قاتل ہوتی ہے۔ یہ میں نے کبھی نہیں سنا۔ میں اپنی بیوی کو دل و جان سے چاہتا ہوں۔ اب

اس میں میرا کیا قصور ہے کہ محبت کے نتیجے میں وہ پھر میٹرنٹی ہوم جانے کو تیار بیٹھی ہے۔

''ہاں آپ کا کوئی قصور نہیں ہے۔آپ خواہ مخواہ کیوں پریشان ہوتے ہیں''۔

اس کے سمجھانے سے میں سمجھ گیا کہ مجھے پریشان نہیں ہونا چاہیے مگر میرے اندر ضمیر نام کی کوئی چیز کھٹکتی رہتی تھی جو مجھ سے چور سرگوشیوں میں کہتی تھی کہ تم غیر شعوری طور پر رئیسہ کو ہٹا کر اس کی جگہ شہناز کو لانا چاہتے ہو۔نہیں یہ جھوٹ ہے۔میں جھلا کر اپنے اندر چیخنے لگتا تھا۔اچھے خاصے چھپے ہوئے جرم کا اقرار کوئی مجرم نہیں کرتا۔میں اعتراف نہیں کرتا تھا مگر پریشان رہتا تھا۔شہناز کے سمجھانے سے بھی پریشانی کم نہیں ہوتی تھی اور رئیسہ نہ سلیقے سے جیتی تھی نہ مرتی تھی کہ مجھے اندر سے سکون حاصل ہوتا۔ایک روز میں نے شہناز کے سامنے اعتراف کیا۔

''شہناز! میرے اور تمہارے درمیان اب کوئی پردہ نہیں ہے جب ہم دونوں ایک دوسرے سے ہر بات کہتے ہیں تو میں یہ بات چھپانا بھی نہیں چاہتا تھا کہ رئیسہ میری وجہ سے موت کے منہ میں جا رہی ہے''۔

شہناز نے مجھے چونک کر دیکھا۔اسے توقع نہیں تھی کہ میں اس حقیقت کا اعتراف کروں گا۔میں نے کہا۔

''تم میری رازدار ہو اس لیے کہہ رہا ہوں کہ میں دنیا والوں کے سامنے اور تمہارے سامنے بھی خود کو ایک فرض شناس شوہر ثابت کرتا ہوں کیونکہ ہزار محرومیوں کے باوجود یہ کہنا پڑتا ہے کہ مجھے اپنی بیوی سے بے حد محبت ہے مگر تمہارے وجود سے زندگی کی مسرتیں حاصل کرتے وقت رئیسہ دماغ کا پھوڑا بن جاتی ہے چپکے چپکے یہ بات دل میں آتی ہے کہ کسی طرح اس سے پیچھا چھوٹ جائے۔نہ وہ ہمیشہ کے لیے میکے میں بیٹھتی ہے اور نہ ہی جلدی سے مرتی ہے تو ایسے میں جھلاہٹ طاری ہو جاتی ہے''۔

''ہاں ایسے میں جھلاہٹ طاری ہو جاتی ہے۔بس یہی تمنا ہوتی ہے کہ راستے کی دیوار گر جائے''۔

یہ کہتے ہی وہ کانپ سی گئی۔بے خیالی میں وہ ایسی بات کہہ گئی جو مرد کو زیب دیتی ہے مگر عورت کو بے حیا اور بے وفا بنا دیتی ہے۔وہ جلدی سے سنبھل کر بولی۔

''مم...... میں نعیم کو بہت چاہتی ہوں۔میں آپ کی طرح نہیں سوچ سکتی کبھی نہیں سوچ سکتی''۔

اچانک ہی وہ دونوں ہتھیلیوں میں منہ چھپا کر رونے لگی۔ہائے ری عورت! منہ چھپانے سے کیا خواہشات چھپ جاتی ہیں؟ اس انسانی نفسیات سے کون انکار کر سکتا ہے کہ مرد ہو یا عورت ہر ایک کے دماغ میں مثبت اور منفی دو سوچیں ہوتی ہیں۔عورت کسی کو قتل کرنے کے لیے منفی انداز میں کبھی نہیں سوچتی مگر حالات کے تحت وہ سوچ اس کی مرضی کے خلاف ضرور کبھی کبھی سر اٹھاتی ہے۔جب وہ سر اٹھاتی ہے اور جب عورت اس ذلیل سوچ کو روک نہیں سکتی تو وہ اپنے ہی اندر مرتی ہے اور ۔ ۔منہ چھپا کر رونے لگتی ہے اور وہ رو رہی تھی مگر میں مرد ہوں میرے پاس آنسو نہیں تھے۔

''میں مر [illegible] وں گی'' وہ سسکیوں کی تال پر کہنے لگی ''ایسا کیوں ہوتا ہے۔اپنا دماغ اپنے بس میں کیوں نہیں رہتا؟ ایسی بات دماغ میں کیوں آتی ہے جو عورت کو زیب نہیں دیتی۔نعیم نے میرا کیا بگاڑا ہے وہ تو اپنی آنکھوں میں سہانے خواب سجا کر مجھے اپنی دلہن بنا کر لایا تھا۔بدنصیبی نے اسے توڑ کر رکھ دیا۔وہ مجبور ہے، معذور ہے میرے سہارے کا محتاج ہے۔وہ مجھے ازدواجی مسرتیں نہیں دے سکتا مگر میں تو اپنی محبت اور توجہ دے سکتا ہوں۔عورت ہر جگہ کاروبار تو نہیں کرتی کہ مرد سے کچھ ملے تو معاوضے میں اپنی خدمت گزاری پیش کرے ورنہ منہ پھیر لے۔مگر میں منہ نہیں پھیروں گی۔میں اپنے گھر سے باہر جو کچھ بھی ہوں لیکن اپنے گھر کی چار دیواری کے اندر نعیم کی آخری سانس تک

اس کے فالج زدہ وجود سے لپٹی رہوں گی۔ اس کے لیے کھانا پکاتی رہوں گی، اس کے میلے کپڑوں سے اس کے پسینے کی بو سونگھ کر انہیں دھوتی رہوں گی۔ میں اس کے نصیب کو اجلا نہیں کر سکتی، اس کے لباس کو دھو کر تو اجلا کر سکتی ہوں۔ انسان ایسا بے مروت تو نہ ہو کہ مرتے کو اور مار کر ظلم کرے یہ مجھ سے کبھی نہیں ہو سکے گا۔ اب اگر نعیم کے خلاف میرے دل میں کوئی بات آئی تو میں زہر کھا کر مر جاؤں گی''۔

میں بڑی خاموشی سے اس کی باتیں سن رہا تھا اور دل ہی دل میں اس کی شوہر پرستی پر کڑھ رہا تھا۔ میں یہ تسلیم کرتا ہوں کہ محبت تقسیم ہوتی ہے۔ میں اپنی بیوی کی محبت کو تقسیم کر کے اس کا زیادہ حصہ شہناز کو دے رہا تھا۔ شہناز بھی میری طرح یہی کر رہی تھی لیکن اعتراض کی بات یہ تھی کہ میں بیوی پرست نہیں تھا۔ وہ شوہر پرست بن رہی تھی اگر یہی اس کے سوچنے کاانداز رہا تو وہ میری بیوی کے مرنے کے بعد اپنے شوہر کو نہیں چھوڑے گی؟

''شہناز تم نے کہا تھا کہ تمہاری سہیلیاں بہت دولت مند گھرانوں میں بیاہی گئی ہیں۔ ان کے پاس کوٹھیاں ہیں، کاریں ہیں اور بڑھاپا گزارنے کے لیے بھاری بینک بیلنس ہے۔ تم بھی یہی چاہتی تھیں، یہی خواہشیں تمہیں میرے قریب لے آئیں لیکن مجھ سے شادی نہیں کرو گی تو یہ خواہشیں کس طرح پوری ہوں گی۔ میں یہ سب کچھ تمہیں بیوی بنا کر ہی دے سکتا ہوں، گرل فرینڈ کو تو صرف شاپنگ کرائی جا سکتی ہے''۔

وہ ایک سرد آہ بھر کر بولی،

''اپنی سہیلیوں کی طرح خواب دیکھتے وقت میں نعیم کو بھول گئی تھی جس طرح محلوں کے خواب دیکھتے وقت ہم اپنی جھونپڑیوں کو بھول جاتے ہیں۔ خواب دیکھتے وقت ہوش نہیں رہتا کہ ہم زمین کی پستی سے بندھے ہوئے ہیں اور آسمان کی بلندیوں پر اڑ رہے ہیں۔ اب ہوش آیا تو الجھن میں پڑ گئی ہوں۔ میں آپ سے دور نہیں رہ سکتی اور نعیم کو چھوڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسے چھوڑنے کے خیال سے میرے اندر کی عورت دم توڑنے لگتی ہے''۔

مجھے اس کی باتیں سن کر بڑا غصہ آیا مگر میں نے غصے کا اظہار نہیں کیا۔ میں نے سوچا ''تمہاری شوہر پرستی کی ایسی کی تیسی۔ تم جہنم میں جاؤ مگر میری جنت میں آتی رہا کرو'' اس وقت میں نے اپنے دل کو سمجھایا مگر رفتہ رفتہ میرے دل میں یہ خلش بڑھتی رہی کہ وہ میرے علاوہ کسی دوسرے شخص کو بھی چاہتی ہے۔ دوسرا شخص خواہ اس کا شوہر ہی کیوں نہ ہو، عورت کی یہ دوطرفہ محبت برداشت نہیں ہوتی۔ ہم جس پر پیسے خرچ کرتے ہیں چاہتے ہیں کہ وہ ہماری ملکیت بن جائے۔ کوئی دوسرا ہاتھ ہماری جائیداد کو میلا نہ کرے۔

ملکیت بنانے کی خواہش نے عورت کو بیوی بنایا۔ یہ بدذات ایسی ہوتی ہے کہ بیوی بنائے بغیر قابو میں نہیں آتی۔ شہناز کو صرف اپنے نام سے وابستہ کرنے کے لیے یا صرف اپنے لیے ریزرو رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ میں اسے بیوی بناؤں۔ توبہ توبہ کیسی بری بات ہے کہ کوئی دوسرا بھی اسی پلیٹ میں کھانے بیٹھے۔ بے شک میں گناہ گار ہوں لیکن جب عورت کی بات ہوتی ہے تو مرد کسی دوسرے کو اس گناہ میں شریک نہیں کرتا۔

میں بعض اوقات جھنجلا جاتا۔ ایک تو رئیسہ اسپتال پہنچ گئی تھی اور وہاں کے ڈاکٹر اور لیڈی ڈاکٹر مجھے کھا جانے والی نظروں سے دیکھتے تھے کیونکہ میں اپنی بیوی کی زندگی کو تقریباً کھا چکا تھا۔ دوسری طرف شہناز نے الجھا رکھا تھا۔ ایک دن میں نے اسے صاف طور سے کہہ دیا۔

''رئیسہ اب چند دنوں کی مہمان ہے جس روز زچگی ہوگی اس روز میرے راستے کی دیوار گر جائے گی۔ مگر

تمہارا راستہ رکا ہوا ہے‘‘۔

وہ سر جھکا کر بولی۔

’’میں نعیم کو رکاوٹ نہیں سمجھتی۔ میں نے کوٹھی، کار اور بھاری بینک بیلنس کے خواب دیکھنے چھوڑ دیئے ہیں‘‘۔

’’اس کا مطلب ہے تم مجھ سے شادی نہیں کرو گی۔ تم جھوٹی محبت کا فریب دے کر اب تک مجھے بے وقوف بنا رہی تھیں‘‘۔

میرے غصے اور نفرت کو اس نے محسوس کیا تو ایک دم سے پریشان ہوگئی اور لرزتی ہوئی آواز میں بولی ’’آپ...... آپ مجھ سے بدگمان نہ ہوں۔ میں آپ کو اتنی شدت سے چاہتی ہوں کہ کبھی دھوکہ دینے کا تصور نہیں کر سکتی‘‘۔

میں نے جھڑک کر کہا۔

’’بکواس مت کرو۔ یہ کیسی چاہت ہے کہ بیک وقت دو مردوں کو چاہتی ہو۔ یہ محبت نہیں مکاری ہے۔ میں اچھی طرح سمجھ گیا ہوں۔ جو عورت اپنے شوہر کو دھوکا دے سکتی ہے وہ کسی دوسرے مرد سے بھی وفا نہیں کر سکتی‘‘۔

وہ ایک دم سے سکتے میں آ گئی۔ اس کے چہرے کا رنگ اڑ گیا۔ اسے یہ توقع نہیں تھی کہ میں اسے بے وفائی کا طعنہ دوں گا۔ اس نے بڑے کرب سے پوچھا۔

’’بے حیائی اور بے وفائی کی بات صرف عورت کے لیے کیوں کہی جاتی ہے آپ جیسے کتنے مرد بیویوں کو دھوکہ دیتے ہیں اور مجھ جیسی کتنی ہی شہنازوں کو اپنی وفا کا یقین دلاتے ہیں۔ میں نے تو آپ سے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ آپ اپنی ایک مجبور بیوی کو دھوکہ دے کر آئے ہیں تو مجھ سے کب تک وفا کریں گے‘‘۔

میں نے غصے میں اٹھتے ہوئے کہا۔

’’ہاں میں وفا نہیں کروں گا اور تم جیسی عورت سے وفاداری کی توقع بھی نہیں کروں گا۔ تم جاؤ اپنے اپاہج شوہر کے پاس۔ تمہارے بعد مجھے تم سے بھی زیادہ حسین لڑکیاں مل جائیں گی۔ میں رئیسہ کے سانس لینے تک تمہارا انتظار کروں گا اگر تم میری شریک حیات بننے کے لیے نہیں آؤ گی تو ہمیشہ کے لیے چور رشتہ ٹوٹ جائے گا‘‘۔

وہ بالکل ہی نڈھال ہو کر صوفے کی پشت سے ٹک گئی۔ میرے اس فیصلے نے اسے اچانک ہی توڑ کر رکھ دیا تھا۔ اس وقت مجھے اس کی ذہنی اذیتوں کا ذرا بھی احساس نہ ہوا۔ اس وقت وہ دو بلندیوں کے درمیان پستی میں گری ہوئی تھی۔ ایک طرف کی بلندی پر میں تھا جو اسے ایک روشن مستقبل کی طرف بلا رہا تھا۔ دوسری طرف کی بلندی پر نعیم تھا جو اسے شوہر کی خدمت گزاری اور ایک مشرقی عورت کی نیک نامی کی طرف بلا رہا تھا۔ وہ پستی میں گر کر رونے لگی۔ میں نے ذرا تلخ لہجے میں کہا۔

’’تم اپنے من کو مار کر زندہ نہیں رہ سکتی ہو، جھوٹی شوہر پرستی کو اپنے دماغ سے نکال دو۔ وہ جو تمہارے دماغ میں ایک منفی سوچ ابھرتی رہتی ہے کہ تمہیں نعیم سے نجات حاصل کر لینا چاہیے، دراصل وہ منفی نہیں بلکہ مثبت اور صحت مند سوچ ہے۔ مرد ہو یا عورت ایسے حالات میں سبھی اپنے راستے کا پتھر ہٹا دیتے ہیں اگر تم نہیں ہٹاؤ گی تو مجھے ہمیشہ کے لیے کھو دو گی۔ میں جا رہا ہوں تم اچھی طرح سوچ لو......‘‘

میں اسے سوچتے رہنے کے لیے چھوڑ کر چلا گیا۔ اس دن کے بعد وہ بالکل ہی بدل گئی۔ دوسرے دن آفس آئی تو اجڑی اجڑی سی تھی۔ ویران سے چہرے پر میک اپ ایسا نظر آ رہا تھا جیسے کسی کھنڈر کی شکستہ دیوار پر رنگ و روغن

چڑھانے کی کوشش کی گئی ہو۔ اس شام میں اس کے ساتھ اس پرائیویٹ کوٹھی میں نہیں گیا تھا جو میں نے اس کے لیے خریدی تھی۔ اس سے دور رہنا ہی مناسب تھا تا کہ وہ میری کمی محسوس کرے اور میری کمی کے وقت نعیم اس کے دماغ کا بوجھ بنا رہے۔ جب ہاتھ آئی ہوئی مسرتیں ہاتھوں سے پھسلنے لگتی ہیں اور زندگی کا معذور اپاہج اور بھیانک چہرہ سامنے آتا ہے تب اس شخص کی اہمیت کا احساس ہوتا ہے جو مسرتیں مہیا کرتا ہے۔ شہناز کو بھی اسی طرح میری اہمیت کا احساس ہو سکتا ہے۔

میں روزانہ اسپتال جاتا تھا۔ رئیسہ کی حالت ایسی ہوگئی تھی کہ اسے دنیا کا کوئی ڈاکٹر بچا نہیں سکتا تھا۔ اسے خون دیا گیا تھا اور دوسری مہنگی دواؤں کے ذریعے اس کی جان بچانے کی کوشش کی جا رہی تھی مگر اس کا معدہ اچھی دوا اور اچھی خوراک کو قبول نہیں کرتا تھا۔ کوئی اسے کس طرح بچا سکتا تھا وہ ایسی کھنڈر بن گئی تھی کہ اس کے قریب بیٹھتے ہوئے الجھن سی ہوتی تھی۔ میں یہی کوشش کرتا تھا کہ کھڑے کھڑے اسے تسلیاں دے کر چلا آؤں اور ڈاکٹروں کا بھی سامنا نہ ہو کیونکہ وہ مجھے نفرت سے دیکھتے ہیں اور سیدھے منہ سے بات نہیں کرتے تھے۔

دوسری طرف شہناز کے سامنے اب میں اپنی بیوی کا ذکر زیادہ کرنے لگا تھا۔ وہ اپنی شوہر پرستی دکھا چکی تھی۔ اب میں رئیسہ کے ساتھ اپنی وفاداری ظاہر کرتا تھا۔ دو دن سے میں اس کے ساتھ پرائیویٹ کوٹھی میں نہیں گیا تھا۔ دفتر میں کبھی وہ کوئی بات چھیڑنا چاہتی تو میں فوراً ہی کہہ دیتا۔

''میں بہت پریشان ہوں۔ میری رئیسہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن گئی ہے۔ کبھی کبھی اس کی سانسیں رکنے لگتی ہیں۔ ابھی سے یہ حالت ہے تو زچگی کے وقت کیا ہوگا۔ میں تمام رات اس کے لیے دعائیں کرتا رہتا ہوں''۔

''جینے کی یا مرنے کی؟''

شہناز نے میری آنکھوں میں جھانک کر پوچھا۔ میں گڑبڑا سا گیا پھر جلدی سے بولا۔

''میں اس کی درازی عمر کے لیے دعا کرتا ہوں۔ وہ میری بیوی ہے وہی آخر دم تک میرا ساتھ دے گی۔ تمہاری طرح اس کے راستے میں کوئی دیوار نہیں ہے''۔

وہ بڑے دکھ بھرے لہجے میں بولی۔

''کیا آپ مجھے اسی طرح طعنے دیتے رہیں گے۔ جب آپ پہلی بار میری طرف بڑھے تو آپ کو علم ہو چکا تھا کہ میرے راستے میں دیوار ہے مگر اس وقت آپ نے اس دیوار کو نظر انداز کر دیا۔ کیونکہ اس وقت میں ایک انمول خزانہ تھی۔ آپ کے دل میں بے چینی تھی کہ یہ خزانہ حاصل ہو سکے گا یا نہیں؟ اب وہ بے چینی دور ہو چکی ہے۔ میں نے آپ کو حصول کا موقع دے کر اپنی اہمیت کھو دی ہے۔ اب میں بے شرم تو بن چکی ہوں، آپ مجھے نعیم کی طرف سے بھی بے وفا بنا دینا چاہتے ہیں۔ یہ کہاں کا انصاف ہے؟''

''اس دنیا کا ہر شخص صرف اپنے حق میں انصاف کرتا ہے اس لیے میں تمہیں اپنا حق سمجھ کر تمہیں اپنے لیے مخصوص کرنا چاہتا ہوں ورنہ یہ چور رشتہ کب تک قائم رہے گا؟''

''میرے مرتے دم تک چلتا رہے گا۔ اس چور رشتے کی جڑیں بہت گہرائی تک اتر گئی ہیں۔ ایک عورت کے لیے اس رشتے کو توڑنا ممکن نہیں''۔

''میں خود بھی نہیں توڑنا چاہتا۔ تم میری خواہش کو سمجھنے کی کوشش کرو۔ میری یہ شدید خواہش ہے کہ تم صرف میری بن کر رہو، اس بات سے اپنے والہانہ پن کا اظہار نہیں ہوتا ہے؟''

''میں آپ کی دیوانگی کو سمجھتی ہوں جو صرف میرے لیے ہے جب میں سوچتی ہوں کہ آپ مجھے اپنا بنانے کے لیے مجھ اپنا سمجھ کر غصہ کرتے ہیں تو دل میں ایک عجیب طرح کی خوشی ہوتی ہے، بڑی اپنائیت کا احساس ہوتا ہے۔ عورت یہ چاہتی ہے کہ کوئی اسے غصہ دکھانے والا اور کوئی ڈانٹنے والا بھی ہو جب میں آپ کی طرف سوچتی چلی جاتی ہوں تو بار بار نعیم کی طرف سے کمزور پڑ جاتی ہوں۔ میں بیان نہیں کر سکتی کہ ان دو دنوں کے اندر میرے دماغ میں کتنے برے برے خیالات آتے رہے ہیں۔ خدا کے لیے میرے سامنے ایسی کوئی شرط پیش نہ کریں کہ میرا دماغ نعیم کو بوجھ سمجھنے لگے۔ یہ اچھی بات نہیں ہے۔ خدا کے لیے ایک عورت کا مان رکھ لیجیے''۔

میں فوراً ہی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میں اس کے حسب منشا کوئی تسلی بخش جواب نہیں دینا چاہتا تھا۔ میں نے رسٹ واچ دیکھتے ہوئے کہا۔

''مجھے رئیسہ کی فکر ہے۔ میں اسپتال جا رہا ہوں اگر تم چاہتی ہو کہ میں تمہاری فکر ہی کروں تو پھر فیصلے پر عمل کرو۔ اس کے بغیر تم مجھ سے دور ہوتی چلی جاؤ گی''۔

میں وہاں سے جانے لگا تو اس نے میرا بازو تھام کر پوچھا۔

''کیا یہ آپ کا آخری فیصلہ ہے؟''

''ہاں! مرد کے فیصلے نہیں بدلتے''۔

''اچھی بات ہے آپ شام کو کوٹھی میں آئیں میں بھی اپنا آخری فیصلہ سناؤں گی''۔

اس نے میرا بازو چھوڑ دیا۔ میں اس کی طرف دیکھے بغیر تیر کی طرح دفتر سے نکل گیا۔ اسپتال کی طرف جاتے وقت مجھے کسی حد تک یقین تھا کہ وہ میرے حق میں فیصلہ کرے گی۔ شہناز جیسی کوئی بھی حسین اور نوجوان عورت ایک اپاہج کے ساتھ ساری زندگی نہیں گزار سکتی۔ اس کی اپنی عمر کے کچھ تقاضے ہیں، جسم کی کچھ مانگ ہے۔ اس کی اپنی کچھ چور خواہشات ہیں جو اسے میری طرف آنے پر مجبور کر رہی ہیں۔ اگر وہ ایک مشرقی عورت کی طرح نادانی میں فیصلہ کرے گی تو میں نے اس شہر میں ایک ایسی عورت کو بھی دیکھا ہے جو پھٹے پرانے کپڑے پہن کر اپنے اپاہج شوہر کو دو پہیوں کی ایک ٹوٹی پھوٹی گاڑی میں بٹھا کر اس گاڑی کو کھینچتی رہتی اور اللہ کے نام پر بھیک مانگتی رہتی ہے۔ شہناز کا انجام کچھ ایسا ہی عبرتناک ہوگا۔

میں اسپتال پہنچا تو وہاں رئیسہ کو اٹینڈ کرنے والی ایک نرس کو بہت پریشان دیکھا۔ وہ ایک بار کسی کام سے زچہ خانے سے باہر آئی تو میں نے اس سے رئیسہ کی خیریت پوچھی تو اس نے مجھے گھور کر نفرت سے دیکھا اور یہ کہتی ہوئی چلی گئی۔

''اگر وہ عورت مر جائے گی تو آپ کے لیے کیا فرق پڑے گا اور وہ مر رہی ہے اور ہمارے تجربات اسے بچا نہیں سکتے''۔

اس کی باتیں سن کر مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے اس وقت اپنے دل کو ٹٹولا تو یہی بات سمجھ میں آئی کہ میں نفرت کے قابل ہوں۔ جو میرے رحم و کرم پر زندگی گزارنے کے لیے دلہن بن کر آئی تھی اب میں اسے تقریباً قتل کر چکا ہوں مگر یہ بھی اطمینان تھا کہ اس دنیا کا کوئی قانون مجھے قاتل ثابت نہیں کر سکے گا کیونکہ محبت سے قتل کرنا کوئی جرم نہیں ہے اگر جرم ہوتا تو مجھ جیسے شوہر کم از کم سوسائٹی میں شریف زادے نہ کہلاتے۔

دوسری بار وہ نرس زچہ خانہ سے باہر نکلی تو اس نے میری طرف دیکھنا بھی گوارا نہیں کیا۔ خود ہی بڑبڑاتی ہوئی چلی گئی۔

''اور کیا ہوگا۔ اسے تو مرنا ہی تھا مر گئی بیچاری......''

میرے ذہن کو ایک جھٹکا سا لگا۔ وہ مر گئی۔ میں اسے مارنا چاہتا تھا۔ خاندانی منصوبہ بندی کے خلاف تقریریں کرتا تھا لیکن جب وہ مر گئی تو مجھے یوں لگا کہ سکڑ کر بوڑھا ہو گیا ہوں۔ میری کمر جھک گئی ہے۔ میرے گھٹنے کانپ رہے ہیں۔ کھڑا نہ رہ سکا، قریب ہی اسپتال کی ایک بینچ پر بیٹھ گیا۔ اب نادم ہونے اور پچھتانے کا وقت تھا۔ جب اسے زچہ خانے سے اسٹریچر پر ڈال کر زنانہ وارڈ کے ایک کمرے میں لے جانے لگے تو میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ایسے وقت ہر شریف مرد کو رونا چاہیے۔ ہماری اور آپ کی دنیا میں ایسے آنسوؤں کی تعداد بہت زیادہ ہے جو سماج کے شریف مگرمچھوں کی آنکھوں سے نکلتے ہیں۔

پھر مجھے اچانک خیال آیا کہ اگر وہ مر گئی ہے تو اسے کمرے میں لے جایا گیا ہے؟ میں تیزی سے چلتا ہوا اس کمرے میں پہنچا۔ وہاں رئیسہ کو آکسیجن پہنچانے کے انتظامات کیے جا رہے تھے۔ ڈاکٹر نے مجھے دیکھتے ہی بڑی ناگواری سے ہاتھ جھٹک کر باہر کی طرف اشارہ کیا۔ مطلب یہ تھا کہ میں باہر چلا جاؤں۔ میں نے ایسی توہین کبھی برداشت نہیں کی تھی مگر اسپتال کا وہ کمرہ ایک عدالت تھا۔ ڈاکٹر منصف تھا۔ وہ مجبور تھا کہ مجھے پھانسی کی سزا نہیں دے سکتا تھا مگر اس کمرے سے نکال سکتا تھا۔

میں باہر آ گیا۔ اس وقت میں بری طرح جھنجھلایا ہوا تھا کیونکہ رئیسہ زندہ تھی اور یہ لوگ خواہ مخواہ مجھ سے نفرت کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ نرس باہر آئی تو میں نے اس کا راستہ روک کر پوچھا۔

''یہ کیا ہو رہا ہے؟ تم نے یہ کیوں کہا تھا کہ میری بیگم مر گئی ہے؟''

نرس نے حیرانی سے گھورتے ہوئے پوچھا۔

''میں نے کب کہا تھا کہ وہ بے چاری مر گئی ہے۔ میں تو یہ بڑبڑاتی جا رہی تھی کہ بچی بہت خوبصورت تھی مگر پیدا ہوتے ہی مر گئی۔ آپ کے دماغ میں تو آپ کی بیگم کی موت سمائی ہوئی ہے آپ اور کیوں سوچیں گے؟''

یہ کہہ کر وہ آگے بڑھ گئی پھر ذرا رک کر بولی۔

''صبح تک زچہ سے کوئی نہیں مل سکتا۔ اب آپ یہاں سے چلے جائیں۔ ہمیں ڈسٹرب نہ کریں''۔

وہ اونچی ایڑی کی سینڈل کھٹکھٹاتی ہوئی چلی گئی۔ میں نے دروازے کے شیشوں سے جھانک کر دیکھا۔ رئیسہ ایک زندہ لاش کی طرح بستر پر پڑی تھی۔ وہ بڑی سخت جان تھا۔ وہ میرے لیے نہ سہی، اپنے چھوٹے بچوں کے لیے جینے کا عزم کر چکی تھی۔ خدا اس کا ساتھ دے رہا تھا۔ آکسیجن پہنچانے کے لیے اس کے چہرے پر شیشے کا ایک ماسک رکھا ہوا تھا۔ پھولتا اور پچکتا ہوا بریتھنگ بیگ اس بات کی گواہی دے رہا تھا کہ اس کی سانسیں اعتدال پر آ رہی ہیں۔

میں نادم ہو کر شہناز کے پاس آیا تو بازی پلٹ گئی تھی۔ وہ بستر پر پڑی آخری سانسیں لے رہی تھی۔ اس کے سرہانے خواب آور گولیوں کی ایک شیشی رکھی ہوئی تھی جو خالی ہو چکی تھی۔ میں گھبرا کر ایمبولینس کو فون کرنا چاہتا تو اس نے میری آستین پکڑ لی اور اکھڑی اکھڑی سانسوں کے ساتھ کہنے لگی۔

''بہت دیر ہو چکی ہے۔ میں نے ایک خط لکھ کر میز پر رکھ دیا ہے کہ میں اپنی خوشی سے مر رہی ہوں۔ اپنی خوشی

سے جی نہیں سکتی، مرتو سکتی ہوں۔ میں نے بہت سوچا۔ بہت غور کیا۔ یہی بات سمجھ میں آئی کہ نعیم سے ہی میری نیک نامی قائم رہ سکتی ہے۔ کیونکہ مجھ جیسی عورتیں تمہاری اس مطلبی دنیا میں...... نیک نامی کے بغیر...... زندہ نہیں رہ سکتیں۔ نعیم میری زندگی ہے اور تم صرف...... ایک بہلاوا ہو...... تم میری خالی خواہشات کے پسینے کو پونچھنے والا...... صرف ایک رومال تھے...... صرف ایک ایسے...... کپڑے کا ٹکڑا تھے...... جس سے سماج کی گندگی...... پونچھ کر نالی میں پھینکا جا[illegible] ہے۔ مشکل یہ کہ کہ اس...... کپڑے کو بھی سماج کے ڈر سے...... اپنے پرس میں چھپا کر...... رکھنا پڑتا ہے...... میں [illegible] پرس سے نکال کر پھینک نہیں سکتی تھی۔ جب میرے ضمیر نے مجھے سمجھا دیا...... کہ...... کہ میں نے اپنے اعت[illegible]نے والے شوہر کو دھوکہ دیا ہے...... نہ میں باحیا رہی نہ باوفا رہی...... نہ ادھر کی رہی نہ ادھر کی رہی...... تو اب میں ا[illegible]ثیت معلوم کرنے کے لیے...... اس کے پاس جا رہی ہوں...... جس نے مجھے...... خواہشات کا روگ دے کر اس [illegible]یا میں پیدا کیا...... خواہشات کا روگ...... خواہشات کا...... رو...... رو......''

وہ خواہشات کی بات کرتے کرتے چپ ہوگئی۔ ہزاروں خواہشیں تھیں اور ہر خواہش [illegible]لتے نکلتے آخر نکل ہی گیا۔

☆O......O☆

شیشوں کے مسیحا

ایسے مسیحاؤں کی کہانی
جو شیشوں کے نازک بدن
کو توڑتے ہیں پھر بار بار پچھتا
کر انہیں پیار سے جوڑنے پر
مجبور ہو جاتے ہیں۔

آدھی رات ادھر تھی اور آدھی ادھر اور وہ ادھر ہی آ رہا تھا۔ صوفیہ کی آنکھ کھلی تو وہ تکیہ سے سر اٹھا کر اسے دیکھنے لگی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا دروازے تک آیا تھا اور جیب سے چابیوں کا گچھا نکال کا تالا کھولنے کی کوشش کر رہا تھا۔ صوفیہ نے پریشان نظروں سے چاروں طرف دیکھا پھر بستر سے اٹھ کر آہستہ آہستہ لنگڑاتی ہوئی اس کے پاس آ کر کھڑی ہوگئی۔ وہ دروازے کے کی ہول میں چابی ڈالنے کی کوشش کر رہا تھا مگر نشے کے باعث اس کا ہاتھ بہک بہک جاتا تھا۔

''آدمی کتنی آسانی سے قبر میں اتر جاتا ہے مگر ایک چابی اپنے سوراخ میں نہیں اترتی۔ جب تک سانس چلتی رہتی ہے۔ زندگی کی چابی اسی طرح ادھر سے ادھر بھٹکتی رہتی ہے۔ نہ تالا کھلتا ہے، نہ سوچی ہوئی جنت کا دروازہ کھلتا ہے''۔

وہ نشے میں بڑبڑاتا جا رہا تھا۔ صوفیہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔

''خالد تمہیں ہزار بار سمجھایا ہے کہ آدھی رات کو آ کر بڑبڑایا نہ کرو، امی اٹھ جائیں گی۔ لاؤ، میں دروازہ کھولتی ہوں''۔

وہ اس کے ہاتھ سے چابی لے کر دروازہ کھولنے لگی۔ خالد نے دیوار سے ٹیک لگا کر کہا۔

''دروازہ کھولنا۔ بتی نہ جلانا۔ یہ اندھیرا ہماری بہت سی کمزوریوں کو چھپا لیتا ہے''۔

''اپنی کمزوریوں کی طرف آنکھ بند کر لینا اچھی بات نہیں ہے۔ تم اس گھر کو کباڑ خانہ کہتے ہو۔ ٹھیک ہے۔ دوسرے کمروں میں ڈھنگ کا سامان نہیں ہے، دیواروں پر پلاسٹر اکھڑے ہوئے ہیں۔ تم اب اپنے کمرے میں جا کر ٹوٹی ہوئی چارپائی پر سو جاؤ گے۔ تم اندھیرے میں اس کمرے کو قبول کر لیتے ہو مگر روشنی میں اس ٹوٹی ہوئی چارپائی کو دیکھنا نہیں چاہتے۔ تم یہاں ڈرائنگ روم میں کیوں نہیں سو جاتے؟''

ڈرائنگ روم کا بلب اونگھ رہا تھا۔ وہ بلب ان کی زندگی کے کم پاور کی طرح اونگھتا رہتا تھا، ڈرائنگ روم کی ہر چیز کو ٹوٹی ٹوٹی نظروں سے دیکھتا رہتا تھا۔

خالد نے بڑی مایوسی سے کہا۔
''ہاں! یہ ڈرائنگ روم کچھ سلیقے کا ہے۔ ایک صوفہ دس برس پرانا ہے۔ دوسرے کی عمر سات برس ہے۔ تیسرے صوفے کی عمر کا اندازہ کرنے کے لیے اس کی ٹوٹی ہوئی ٹانگ کو دیکھ لینا کافی ہے۔ان کے درمیان جو سینٹر ٹیبل ہے اس کی سطح پر جابجا خراشیں پڑی ہوئی ہیں۔ میری تنخواہ سے اتنے پیسے نہیں بچتے کہ ان پر رنگ و روغن چڑھایا جا سکے۔ ڈائننگ ٹیبل کی بھی یہی حالت ہے۔اس کا عیب چھپانے کے لیے اس پر پلاسٹک کی چادر بچھا دی گئی ہے۔ شیشے کا شوکیس برتنوں سے خالی ہے۔ وہاں تم نے شیشے کی ایک گڑیا کو بہت دنوں سے سنبھال کر رکھا ہوا ہے۔ تمہارے دل میں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ یہ کہیں ٹوٹ نہ جائے۔ اس ڈرائنگ روم کی سجاوٹ ایسی لگتی ہے جیسے کوئی بوڑھی عورت اپنی ظاہری خوبصورتی کو برقرار رکھنے کے لیے پرانے زمانے کے مسی کاجل یا سرمے سے کام چلا رہی ہو کیونکہ نئے زمانے کے میک اپ کے لوازمات بہت مہنگے ہیں۔ اس بوڑھے ڈرائنگ روم تک نہیں پہنچ سکتے''۔
''خالد! تم ہمیشہ دل توڑنے والی باتیں کرتے ہو۔ دل ہو یا کانچ کی گڑیا، انہیں توڑنے کی بجائے سنبھال سنبھال کر رکھنے کا نام ہی زندگی ہے''۔
ایسا کہتے وقت وہ بڑی اداس نظروں سے شوکیس میں رکھی ہوئی کانچ کی گڑیا کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی آنکھوں میں شبنم سی جمنے لگی۔ خالد نے اس کے کاندھے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
''باجی! تم کب تک اس گڑیا سے کھیلتی رہو گی؟''
وہ کچھ اور بھی کہنا چاہتا تھا مگر اسی وقت ایک کرخت سی آواز سنائی دی۔ اس آواز سے بوسیدہ دیواریں گونج اٹھیں۔
''تم آج بھی اتنی رات کو آئے ہو اور نشے کی حالت میں صوفیہ کو پھر باجی کہہ رہے ہو اگر کسی نے سن لیا تو؟''
بوڑھی ماں اپنے کمرے کے دروازے پر کھڑی ہوئی تھی۔ وہ ڈرائنگ روم ایک قسم کا چوراہا تھا۔ وہاں سے دوسرے کمروں کے دروازے کھلتے تھے۔ ایک دروازہ خالد کے کمرے میں کھلتا تھا دوسرا دروازہ ان کی ماں کے کمرے میں لے جاتا تھا۔ تیسرے دروازے کے پیچھے باورچی خانہ تھا اور چوتھا دروازہ باہر سے آنے والوں کے لیے تھا۔ صوفیہ کے لیے کوئی کمرہ نہیں تھا۔ اس کا سامان ماں کے کمرے میں رہتا تھا اور رات وہ ڈرائنگ روم کے فرش پر چٹائی بچھا کر سوتی تھی۔ ان ماں، بیٹے اور بیٹی کی سب سے پہلی اور اہم دعا یہی ہوتی تھی کہ کوئی مہمان ان کے یہاں نہ آئے ورنہ اوپر سے جو خوش پوشی کا بھرم قائم ہے، وہ ٹوٹ جائے گا۔ ماں نے قریب آکر پوچھا۔
''بتاؤ تم نے صوفیہ کو باجی کیوں کہا؟''
''امی! باجی مجھ سے بڑی ہیں اس لیے میں انہیں باجی کہتا ہوں''۔
ماں نے جھنجلا کر کہا ''ہزار بار منع کیا ہے کہ شراب نہ پیا کرو۔ نشے میں سچ بولنا شروع کر دیتے ہو''۔
''امی جھوٹ بول کر دیکھ لیا۔ اب تک کہیں سے باجی کا رشتہ نہیں آیا''۔
''تم پھر باجی کہہ رہے ہو۔ اتنے لمبے چوڑے جوان ہو، لوگ تمہیں دیکھ کر تمہاری بہن کا اندازہ لگا لیں گے اگر تم اسے صوفیہ کہہ کر پکارا کرو گے تو تمہارے ایک نام لے لینے سے اس کی عمر تم سے پانچ دس برس کم ہو جائے گی۔ بھاگتے ہوئے رشتوں کو پکڑنے کے لیے بھاگتی ہوئی عمر کو پکڑ کر جھوٹ کے شوکیس میں بند کرنا ضروری ہے بیٹے''۔
خالد کے دماغ میں نشہ گھوم رہا تھا۔ نگاہوں کے سامنے ہر چیز گھومتی ہوئی نظر آ رہی تھی۔ اس چکراتے ہوئے

منظر میں اس نے دیکھا، اس کی بہن ڈگمگاتی ہوئی شوکیس کی طرف جا رہی ہے۔ اس کے چہرے پر تاریک سائے لہرا رہے تھے۔ وہ نشے میں نہیں تھی۔ ڈگمگانے کی وجہ یہ تھی کہ اس کے ایک پاؤں میں معمولی سا نقص تھا۔ چلتے وقت وہ دائیں طرف ایک ذرا سی یوں جھک جاتی تھی جیسے تقدیر لات مار کر ایک طرف گراتی جا رہی ہو اور وہ سنبھلتی جا رہی ہو۔ چال میں اتنی معمولی سی لنگڑاہٹ تھی جو پہلی نظر میں محسوس نہیں ہوتی تھی۔ اگر وہ تیزی سے چلتی تو یہ عیب بھی چھپ جاتا لیکن قدرت نے عورت کو سبک لہروں کی طرح بہنے کے لیے پیدا کیا ہے، وہ سیلاب کی طرح نہیں گزر سکتی تھی۔ جوان لڑکی کی ایک جاذبیت یہ بھی ہے کہ وہ ٹھہر ٹھہر کر نگاہوں کے سامنے سے گزرے۔

وہ شوکیس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گئی۔ اس نے شیشے کی دیوار کو ہٹا کر بڑی محبت اور بہت سنبھل کر کانچ کی گڑیا اٹھائی۔ وہ جتنی عمر کی گڑیا بنائی گئی تھی وہی عمر اس کے کانچ کے وجود میں ٹھہر گئی تھی۔ اس وقت بوڑھی ماں نے بڑی حسرت سے سوچا۔ کاش کہ صوفیہ کی عمر بھی ٹھہر جاتی۔ وہ بیٹے کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے گئی۔ اسے سہارا دے کر چارپائی پر لٹایا۔ پھر اس کے قریب بیٹھنا چاہا تو ٹوٹی ہوئی چارپائی احتجاج کرنے لگی۔ وہ مجبوراً فرش پر بیٹھ کر کہنے لگی۔

''تم روز آدھی رات کے بعد آتے ہو۔ فضول سے نشے میں پیسے برباد کرتے ہو یہی پیسے بچا کر ہم صوفیہ کو دلہن بنا سکتے ہیں''۔

''کس کی دلہن؟''

بیٹے کا سوال ماں کے دل میں نشتر بن کر چبھ گیا۔ دلہا کا دور دور تک پتا نہیں تھا اور وہ خیالوں میں بیٹی کو دلہن بنا کر بٹھائے رکھتی تھی۔ کبھی نہ کبھی تو وہ دلہن بنے گی ہی۔ اسی امید پر اس نے کہا۔

''کسی دلہا کو بلانے سے پہلے دلہن کو بنا سنوار کر رکھنا پڑتا ہے۔ جس گھر میں وہ رہتی ہے اسے بھی تھوڑا بہت سجا بنا کر رکھنا ضروری ہے۔ میں چاہتی ہوں قسطوں پر نئے صوفے خرید لیں۔ تھوڑے پیسے بچا کر دروازے کھڑکیوں کے لیے نئے پردے لے آئیں۔ یہاں تھوڑی بہت نمائش کیے بغیر کام نہیں بنتا مگر تم اس فضول نشے میں پیسے برباد کرتے ہو''۔

خالد نے کروٹ بدل کر کہا۔

''امی سستے سے سستا صوفہ ایک ہزار روپے میں آئے گا۔ سستے پردوں اور کمرے کے رنگ و روغن پر مزید ایک ہزار روپے خرچ ہوں گے اور میں جو سستی سی شراب پیتا ہوں اس کا پوا چھ روپے میں آتا ہے۔ میں چھ روپے خرچ کر کے اس غم کو بھول جاتا ہوں کہ ہمیں دو ہزار روپے کہیں سے نہیں ملیں گے۔ یہ نشہ لعنت نہیں ہے، بہت بڑی نعمت ہے۔ ہم صبح تک تمام محرومیوں کو بھول جاتے ہیں اور میں کونسا روز روز پیتا ہوں۔ مگر کبھی تو مجھے جینے کے لیے شراب پی کر مرنے کی اجازت دیا کریں''۔

''ایسی باتیں نہ کرو۔ اس گھر میں میری بہو آ جائے گی تو تم بہت سے غم بھول جایا کرو گے''۔

''ہاں۔ اگر کبھی آپ کی بہو آئے گی تو کچھ پرانے غم بھول جائیں گے مگر بہت سی نئی پریشانیاں اور نت نئی ضرورتیں آپ کی بہو ساتھ لے آئے گی۔ امی! میں تو شادی کے بارے میں کبھی سوچتا بھی نہیں۔ جب ایک بیوی کے لیے دل مچلتا ہے تو میں کوئی نئی فلم دیکھ لیتا ہوں۔ جب ہم غریبوں کو عورت نہیں ملتی تو فلم کی ہیروئن مل جاتی ہے۔ سینما ہال کے اندھیرے میں وہ صرف ہمارے لیے گیت گاتی ہے۔ ہمارے لیے آہیں بھرتی ہے۔ دولت مند باپ کی بیٹی ہو کر ایک غریب سے شادی کرنے کے لیے رسم و رواج اور جھوٹی شان و شوکت سے بغاوت کرتی ہے۔ آخر میں مجھ

جیسے غریب سے شادی کر لیتی ہے۔ میں سینما ہال کے اندھیرے سے نکل کر اندھیری گلیوں سے گزرتا ہوا اپنے اس اندھیرے کمرے میں آجاتا ہوں۔ میرے ساتھ سینما ہال سے نکلی ہوئی دلہن بھی ہوتی ہے۔ وہ ابھی بھی یہاں موجود ہے۔ اس کمرے کی بتی جلے گی تو وہ چلی جائے گی۔ جب بیٹے کے کمرے میں بہو موجود ہو تو ماں کو وہاں نہیں رہنا چاہیے۔ آپ چلی جائیں امی۔ کیوں میرا نشہ خراب کر رہی ہیں''۔

اس کی بڑبڑاہٹ سن کر ماں اپنی جگہ سے اٹھ گئی اور خود بھی بڑبڑاتی ہوئی اس کمرے سے باہر آگئی۔ وہ کس کی ضرورت پوری کر سکتی تھی؟ بیٹا ایک بیوی کے بغیر ویران اور خالی خالی سی زندگی گزار رہا تھا اور بیٹی سہاگن بننے کے انتظار میں بوڑھی ہو رہی تھی۔ اس نے بیٹے کے کمرے کی طرف پلٹ کر دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے ایک دولت مند بہو اس کے بیٹے کے کمرے میں آگئی ہو اور اس کی ٹوٹی ہوئی چارپائی پر اس کے ساتھ......

آگے سوچتے ہی اس نے دروازے کو بند کر دیا۔ آج کل کے لڑکوں کو دروازے بند کرنے کا بھی ہوش نہیں رہتا۔ صبح چائے کے لیے ایک پاؤ دودھ رکھا ہوا تھا اب بہو کے لیے وہ دودھ کمرے میں بھیجنا ہوگا۔ اس نے شوکیس کے پاس بیٹھی ہوئی صوفیہ کو دیکھا تو بیٹے والا سہانا خواب ٹوٹ گیا کیونکہ بیٹی ابھی تک اپنی گڑیا کی عمر کو ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی اس نے بیٹی کے پاس آکر کہا۔

''کب تک بیٹھی رہے گی۔ کتنی بار سمجھایا ہے کہ گھر میں بیٹھے رہنے سے کچھ نہیں ہوگا۔ تجھے سہیلیاں بنانا چاہئیں۔ دوسروں کے یہاں آتی جاتی رہے گی تو رشتہ ڈھونڈنے والوں کی نظروں میں بھی آتی رہے گی''۔

وہ سر جھکا کر بولی ''امی مجھے شرم آتی ہے۔ میں باہر نکلتی ہوں تو یہ سوچ کر دل بیٹھنے لگتا ہے کہ سب لوگ مجھے لنگڑاتے ہوئے دیکھ رہے ہیں''۔

''تم کیوں احساس کمتری میں مبتلا ہوتی ہو۔ تم لنگڑی نہیں ہو۔ ہر انسان میں کوئی نہ کوئی نقص ہوتا ہے۔ کوئی بظاہر جسمانی طور پر مکمل ہوتا ہے تو اس کے اندر کوئی نہ کوئی خرابی چھپی رہتی ہے۔ چھپی ہوئی خرابی ظاہری عیب سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے۔ دیکھو! خود کو تسلی دینے اور سمجھانے کے کچھ طریقے ہوتے ہیں۔ اگر تم خود کو گراؤ گی تو دوسرے اور گرائیں گے۔ تم خود یہ سمجھاؤ کہ اس دنیا میں ایسی بے شمار لڑکیاں ہیں جو تم سے زیادہ لنگڑی ہیں۔ تم ان سے ہزار درجہ بہتر ہو۔ اب میں نے سوچ لیا ہے کہ کہیں سے قرضہ لے کر اور قسطوں میں سامان لے کر اس ڈرائنگ روم کو سجاؤں گی۔ کراچی جیسے شہر میں ڈرائنگ روم کی سجاوٹ سے ہم انسانوں کی حیثیت کا پتہ چلتا ہے۔ تم سو جاؤ۔ فکر نہ کرو۔ فکر کرنے کے لیے ابھی میں زندہ ہوں''۔

ماں نے اس کے ہاتھ سے کانچ کی گڑیا لے لی پھر اسے شوکیس میں رکھتے ہوئے بڑبڑانے لگی۔

''ہر بڑے آدمی کے گھر کا دروازہ اس کے ڈرائنگ روم سے کھلتا ہے۔ آنے والوں کو صرف ڈرائنگ روم میں بٹھایا جاتا ہے۔ اپنی اونچی حیثیت کی نمائش کرنے کے لیے اس کمرے کو خوب سے خوب سجایا جاتا ہے۔ کسی ناول کا دیباچہ خوبصورت نہ ہو تو اس کے بعد شروع ہونے والی کہانی کی ہیروئن کی خوبصورتی اور معیار کا پتا نہیں چلتا۔ ڈرائنگ روم کو ناول کے پیش لفظ کی طرح سجانا پڑتا ہے۔ اب میں یہی کروں گی۔

اس نے گڑیا کو شوکیس میں رکھنے کے بعد بیٹی کی طرف دیکھا۔ وہ فرش پر بچھی ہوئی چٹائی پر جا کر لیٹ گئی تھی۔ لیٹنے بیٹھنے اور کھڑے ہونے سے ذرا بھی پتا نہیں چلتا تھا کہ وہ تھوڑی سی لنگڑی ہے۔ لیٹنے کے بعد تو قیامت نظر آتی تھی۔ پکا ہوا بدن لباس میں چھپ کر بھی ہر طرف سے منہ زوری کرتا تھا۔ ماں سوچتی رہتی تھی کہ اسے کس شوکیس

میں بند کر کے رکھے۔ کھلا چھوڑے گی تو یہ کانچ کی گڑیا کسی کے ہاتھوں سے ٹوٹ جائے گی۔

وہ بڑبڑاتی ہوئی اور اپنی قسمت کو کوستی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ ڈرائنگ روم میں ایک بار پھر خاموشی چھا گئی۔ وہ چپ چاپ چٹائی پر لیٹی ہوئی دیوار گھڑی کی ٹک ٹک سن رہی تھی۔ دیوار گھڑی زمانے کی ستائی ہوئی تھی۔ اتنی بوڑھی ہوگئی تھی کہ اس کے ڈائل کے تمام نمبر مٹ گئے تھے۔ صرف پنڈولم کے ذریعے اس کی سانسیں چلتی تھیں اور دونوں کانٹے ڈائل کے سپاٹ صحرا میں اپنی زندگی کی مدت پوری کرنے کے لیے گھومتے رہتے تھے۔ وہ کانٹے خود نہیں جانتے تھے کہ کس وقت کیا بجا رہے ہیں مگر اس گھر کے رہنے والے دونوں کانٹوں کی پوزیشن دیکھ کر بتا دیتے تھے کہ وقت کیا ہوا ہے۔ وہ کانٹے کیسے اندھے سفر کی منزلیں طے کر رہے تھے؟

صوفیہ آنکھوں پر ہاتھ رکھے لیٹی ہوئی سوچ رہی تھی کہ کاش میری عمر کے تمام نمبر بھی میری زندگی کے ڈائل سے مٹ جاتے تو پھر امی کے سوا کوئی یہ نہ بتا سکتا کہ اس وقت میری عمر کیا بجا رہی ہے۔ انسان مایوس ہو کر کیسی کیسی احمقانہ باتیں سوچتا رہتا ہے۔ ایسا سوچنے سے کچھ حاصل تو نہیں ہوتا مگر اس طرح زندگی کا کچھ حصہ دھوکے سے گزر جاتا ہے۔

خالد کے کمرے کا دروازہ آہستگی سے کھلا۔ اس نے دروازے سے سر نکال کر سب سے پہلے اپنی ماں کے کمرے کے دروازے کی طرف دیکھا۔ اس کی امی اپنے کمرے کا دروازہ اندر سے بند کر کے سو رہی تھیں۔ وہ اطمینان سے ڈرائنگ روم میں آ گیا اور دور سونے والی صوفیہ کو خمار آلود نظروں سے دیکھنے لگا۔ وہ اپنے کمرے کے اندھیرے سے نکل آیا تھا۔ سینما ہال کے اندھیرے سے آئی ہوئی دلہن اس کے کمرے کے اندھیرے سے گھبرا کر بھاگ گئی تھی۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا، خود کو ہوش و حواس میں رکھنے کی کوشش کرتا ہوا، صوفیہ کے پاس آ کر فرش پر بیٹھ گیا۔ صوفیہ کا ایک ہاتھ چٹائی کے بستر سے باہر فرش پر آ گیا تھا۔ اس کی ہتھیلی یوں کھلی ہوئی تھی جیسے بھائی سے وہ کچھ مانگ رہی ہو۔ بھائی اس کے قریب بیٹھ کر ذرا ہچکچانے لگا۔ اس نے اپنا ایک ہاتھ بڑھا کر بہن کے ہاتھ پر رکھا تو اس وقت بری طرح کانپ رہا تھا۔ ہاتھ سے ہاتھ ملا تو صوفیہ کی آنکھ کھل گئی۔ پہلے تو اس نے حیرانی سے بھائی کو دیکھا پھر دوپٹا سنبھال کر اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''خالد! کیا بات ہے؟ تم اس وقت میرے پاس کیوں آئے ہو؟''

''وہ بات...... یہ ہے کہ......'' وہ کہتے کہتے جھجک رہا تھا۔

''تم پریشان کیوں ہو؟ بولتے کیوں نہیں ایسی کیا بات ہے کہ میرے سامنے جھجک رہے ہو۔ مجھے بتاؤ اگر میں تمہارے کسی کام آسکتی ہوں تو انکار نہیں کروں گی''۔

''باجی! بات دراصل یہ ہے کہ میں دن بھر مشین کے سامنے کھڑے ہو کر کام کرتا رہتا ہوں مگر میں انسان ہوں، مشین تو نہیں ہوں۔ میری بہت سی خواہشیں ہیں، بہت سی ضرورتیں ہیں جو میری چھوٹی سی تنخواہ میں پوری نہیں ہو سکتیں۔ حالات بتا رہے ہیں کہ میں تمہارے لیے کبھی ایک بھابی نہیں لاسکوں گا مگر دیکھو نا کسی سے دوستی کرنے سے میری زندگی کی ایک کمی کسی حد تک پوری ہو سکتی ہے۔ ایک لڑکی سے میری دوستی ہوگئی ہے''۔

''اچھا''۔ صوفیہ نے خوش ہو کر پوچھا۔ ''کون ہے وہ لڑکی؟ کہاں رہتی ہے وہ؟ میں اسے اپنی بھابی بناؤں گی''۔

''تم پھر جھوٹے خواب دیکھنے لگیں۔ یہاں کوئی لڑکی آسکتی ہے تمہاری بھابی نہیں آسکتی۔ تم سمجھتی کیوں نہیں مجھے ساڑھے تین سو روپے ماہوار ملتے ہیں۔ اس میں ہم تینوں کا گزارا نہیں ہوتا۔ چوتھی آئی تو ہم سب فاقے کریں گے۔ یہ بڑھتی ہوئی مہنگائی میری ہونے والی بیوی کو مجھ سے بہت دور لے گئی ہے۔ تم مجھے تقریر کرنے پر مجبور نہ کرو۔

کام کی بات سنو۔ اس کا نام زبیدہ ہے۔ دوا کی ایک فیکٹری میں پیکنگ کا کام کرتی ہے۔ اس کی فیکٹری میری مل کے راستے میں ہے۔ روزانہ آتے جاتے ہماری جان پہچان ہوگئی ہے۔ اب میں اسے دو چار گھنٹے کے لیے یہاں لانا چاہتا ہوں۔ میرا مطلب ہے صرف باتیں کرنے کے لیے۔ تم سمجھ سکتی ہو کہ راستے میں باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا''۔

''تو پھر اسے یہاں لے آؤ۔ اس میں ڈرنے کی کیا بات ہے؟''

''میں چاہتا ہوں کہ امی کو معلوم نہ ہو۔ انہیں معلوم ہوگا تو وہ اسے بہو بنانے کے لیے تیار ہو جائیں گی۔ اور اس گھر میں جو خسارے کا بجٹ ہے اس میں ایک بہو کے لیے گنجائش نہیں نکلے گی۔ دیکھو میں صرف تمہیں راز دار بنانا چاہتا ہوں۔ امی کو بیچ میں نہ لاؤ''۔

''اچھا انہیں نہیں بتاؤں گی۔ تم اسے کب لا رہے ہو؟''

''کل لے آؤں گا۔ امی صبح دس بجے بچوں کو پڑھانے چلی جاتی ہیں۔ وہ دوپہر کو تین بجے واپس آتی ہیں۔ میں زبیدہ کو گیارہ بجے لے کر آؤں گا۔ تم گھر میں رہتی ہو اس لیے میں تمہیں راز دار بنا رہا ہوں۔ امی کو نہیں بتاؤ گی نا؟''

''نہیں بتاؤں گی۔ اپنے بھائی کی خوشیوں کو اپنے دل میں چھپا کر رکھوں گی''۔

خالد نے خوش ہو کر اس کا ہاتھ تھام لیا، اس کی پیشانی کو چوم لیا۔ پھر وہاں سے اٹھ کر چلا گیا۔ اس نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کر لیا تھا مگر صوفیہ کی آنکھوں کے دروازے کھل گئے تھے۔ نیند اچانک ہی اڑ گئی تھی۔ وہ سونا چاہتی تھی مگر اس کا دماغ اس کے دل کو ٹہوکے دے دے کر پوچھ رہا تھا۔

''زبیدہ یہاں کیوں آئے گی؟ ایک جوان لڑکی اس کے بھائی کے ساتھ کیوں آئے گی۔ یہاں کیا ہوگا؟''

وہ سوالیہ نظروں سے چاروں طرف دیکھنے لگی۔ اسے یہ گھر بدلا ہوا نظر آنے لگا۔ اس میں وہ بات ہونے والی تھی جو پہلے کبھی نہ ہوئی تھی۔ مگر وہ بات کیا تھی؟ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی جسے وہ سمجھنے سے انکار کرتے ہوئے سونے کی کوشش کر رہی تھی۔ اس کوشش میں صبح کی اذان ہونے لگی۔ اذان کے بعد ذرا آنکھ لگی تو اس نے خواب میں کسی اجنبی نوجوان کو دیکھا جو اس سے کہہ رہا تھا۔

''راستے میں باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا۔ آس پاس سے گزرنے والے لوگ ہمیں دیکھتے رہتے ہیں تم میرے ساتھ میرے گھر چلو، وہاں ہم تنہائی میں اطمینان سے پیار و محبت کی باتیں کریں گے''۔

وہ خواب کے شہزادے سے کہنے لگی۔

''مجھے ڈر لگتا ہے میں تمہارے ساتھ تمہارے گھر کیسے جا سکتی ہوں۔ کسی نے دیکھ لیا تو میں بدنام ہو جاؤں گی''۔

''کسی سے ڈرنے کی کیا ضرورت ہے۔ ہم محبت کر رہے ہیں کوئی جرم تو نہیں کر رہے۔ تم گھبراؤ نہیں۔ ہم تنہائی میں صرف باتیں کریں گے''۔

صرف باتیں ہی کرنے کی بات تھی، وہ اپنے آئیڈیل کے ساتھ اس کے گھر میں آ گئی۔ پھر اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔ کمرے میں داخل ہوتے ہی اس کے محبوب نے دروازے کو اندر سے بند کر لیا۔

اکثر خواب کلائمکس پر پہنچ کر ٹوٹ جاتے ہیں یا پھر جو بات سمجھ میں نہیں آتی اس بات تک پہنچنے سے پہلے وہ خواب بکھر جاتے ہیں۔ جیسے ہی اس نوجوان نے دروازہ بند کیا ویسے ہی اس کی امی کی آواز نے چونکا دیا۔

''کیا بات ہے۔ اتنی دیر تک کیوں سو رہی ہو؟ اب اٹھ بھی جاؤ''۔

اس نے چونک کر آنکھ کھولی تو خواب کے ساتھ ساتھ دل بھی ٹوٹ گیا۔ کیسی نامراد زندگی ہے، نہ جاگتی آنکھوں کے سامنے کوئی دلہا دروازہ بند کرتا ہے، نہ سوتی آنکھ کے پیچھے وہ آرزو شرمندہ تکمیل ہوتی ہے۔ وہ بے دلی سے اٹھ کر بیٹھ گئی۔ سامنے ڈائننگ ٹیبل پر خالد جھکا ہوا ناشتے میں مشغول تھا۔ امی اس کے پاس بیٹھی ہوئی سمجھا رہی تھی۔

''کام پر جانے کی جلدی ہوتی ہے تو ذرا سویرے اٹھ جایا کرو۔ جلدی جلدی نوالے چبا کر کھاؤ گے تو ہاضمہ خراب ہو جائے گا۔ تم جانور تو نہیں ہو کہ بعد میں جگالی کر کے ہضم کر لو گے''۔

''امی! ہم مزدور بیل کی طرح جگالی نہیں کرتے مگر کولہو کے بیل کی طرح محنت کے ایک ہی محور پر ساری زندگی گھومتے رہتے ہیں۔ آپ چائے پیتی جائیں ٹھنڈی ہو رہی ہے''۔

اس کی امی چائے کی پیالی پر جھکی تو وہ صوفیہ کو دیکھ کر نظروں ہی نظروں میں بہت کچھ کہنے لگا۔ پچھلی رات راز داری کی بات ہو چکی تھی لہٰذا نظروں نے نظروں کو پہچان لیا۔

''دیکھو اپنے وعدے پر قائم رہنا۔ امی کو کچھ نہ بتانا۔ میں گیارہ بجے زبیدہ کے ساتھ آؤں گا''۔

جتنی دیر میں اس کی امی نے چائے کا ایک گھونٹ لیا، اتنی دیر میں خالد نے نظروں سے سب کچھ سمجھا دیا۔ پھر وہ اضطراب کے عالم میں ادھورا ناشتا چھوڑ کر کھڑا ہو گیا۔ ماں نے حیرانی سے کہا۔

''ارے کہاں چلے، ناشتا تو ٹھکانے سے کر لیا کرو''۔

''بس پیٹ بھر چکا ہے''۔

''تو پھر چائے پی لو''۔

''امی! آپ تو پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ چائے ڈیوٹی سے بڑھ کر تو نہیں ہے مجھے دیر ہو رہی ہے''۔

وہ کرسی کی پشت سے کوٹ اٹھا کر پہننے لگا۔ وہ کوٹ اس کے لیے پچھلے ہی ہفتے امریکا سے آیا تھا۔ امریکا والے بڑے غریب پرور ہوتے ہیں۔ ہمارے ملک کے غریبوں کے لیے تھوک کے حساب سے جدید فیشن کے کوٹ پتلون بھیجتے رہتے ہیں۔ سردی کا موسم ابھی شروع نہیں ہوا تھا مگر پیار کا موسم شروع ہو گیا تھا۔ زبیدہ کے ساتھ ذرا جچنے کے لیے اس نے کوٹ پہن لیا تھا۔ اپنی شخصیت کو ذرا پرکشش بنانے کے لیے اس کے پاس اس کوٹ سے بہتر کوئی چیز نہیں تھی۔

جب وہ چلا گیا تو صوفیہ کے لیے گیارہ بجے تک وقت گزارنا مشکل ہو گیا۔ وہ دس بجے تک اپنی ماں کے ساتھ گھر کے کاموں میں وقت گزارنے کی کوشش کرتی رہی۔ جب دس بجے اس کی ماں پرائمری سکول میں بچوں کو پڑھانے چلی گئی تو باقی ایک گھنٹہ پہاڑ بن گیا۔ کچھ خالد کی باتوں نے اسے الجھا دیا تھا کچھ اس کا اپنا خواب اسے پریشان کر رہا تھا۔

''توبہ۔ توبہ۔ کیسا شرمناک خواب تھا۔ آج تک اس نے کسی اجنبی نوجوان سے بات نہ کی تھی اور خواب ہی خواب میں اس کے ساتھ اس کے گھر چلی گئی تھی۔ توبہ توبہ میں کبھی ایسا نہیں کروں گی''۔

وہ اس نفسیاتی الجھن کو نہ سمجھ سکی کہ لڑکی جس بات سے انکار کرتی ہے۔ لاشعوری طور پر خواب کے عالم میں اسی بات کا اقرار کرتی ہے اس میں کوئی شبہ نہیں تھا کہ وہ بے حد شرمیلی تھی اور اس قدر احساس کمتری میں مبتلا تھی کہ کبھی کسی اجنبی کے قریب سے گزرتے وقت بھی خود کو بالکل ہی حقیر سمجھ کر سکڑ سی جاتی تھی۔

گیارہ بجنے سے پہلے ہی دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک سنتے ہی اس کا دل تیزی سے دھڑکنے لگا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ کسی دوسرے کے ساتھ دوسرے کے گھر کا دروازہ کھول کر اندر جانے والی ہو۔ اس نے دروازہ

کھولا تو خود کو ایک دم سے اجنبی ماحول میں پایا۔ ایک اجنبی نوجوان دروازے پر کھڑا تھا۔ وہ جلدی سے دروازے کی آڑ لے کر اپنا دوپٹا درست کرنے لگی۔ وہ پوچھنا چاہتی تھی کہ وہ کون ہے؟ سوتی آنکھ کے دروازے سے نکل کر جاگتی آنکھوں کے سامنے کیسے آگیا ہے؟

صوفیہ نے دروازے کھولتے وقت اسے صرف ایک نظر دیکھا تھا کیونکہ وہ فوراً ہی دروازے کے پیچھے چلی گئی تھی۔ وہ بھی چند لمحوں تک گم صم کھڑا رہا پھر اس نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے پوچھا۔

''خالد کہاں ہے؟ میں اس کا دوست ہوں''۔

صوفیہ کے دماغ میں اس کی بات کا جواب موجود تھا مگر اس وقت وہ بولنا بھول گئی تھی۔ اجنبی نے انتظار کے بعد پوچھا۔

''کیا تم گونگی ہو؟ مجھے یقین نہیں آتا کہ اتنی خوبصورت لڑکی قوت گویائی سے محروم ہو سکتی ہے''۔

اس کی بات سن کر وہ گھبرا گئی۔ ایک تو پہلے ہی قدرت نے اس میں عیب لگا دیا تھا اب کسی نے اسے گونگی سمجھ لیا تو کیا ہوگا؟ وہ کوئی تاثر حاصل کیے بغیر وہاں سے چلا جائے گا۔ وہ بڑی مشکل سے ہچکچاتی ہوئی بولی۔

''وہ......وہ نہیں ہیں''۔

''خدا کا شکر ہے کہ تم بولنے والی گڑیا ہو۔ میں تعریف کرنے پر مجبور ہوں۔ تم برا نہ ماننا۔ ہر اچھی چیز تعریف کی مستحق ہوتی ہے۔ تم ایک گڑیا کی طرح حسین بھی ہو اور معصوم بھی''۔

صوفیہ کے کانوں میں شہنائی بج رہی تھی۔ اپنے اپنے احساسات ہوتے ہیں۔ کوئی ہوس کے پٹارے میں بند کرنے کے لیے بین بجاتا ہے، کوئی اسے شہنائی کی آواز سمجھ لیتا ہے۔ یہ اپنی اپنی سمجھ کی باتیں ہوتی ہے۔ اجنبی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''خالد نے شادی نہیں کی تم اس کی گھر والی تو نہیں ہو سکتیں۔ پھر کون ہو؟''

''میں ان کی بہن ہوں۔ بس آپ......آپ چلے جائیں۔ میں دروازہ بند کروں گی''۔

''چلا جاؤں گا۔ میں یہ کہہ رہا تھا کہ میں خالد کے ساتھ مل کر کام کرتا ہوں۔ آج وہ ڈیوٹی پر نہیں آیا ہے۔ میں آدھی گھنٹے کی چھٹی لے کر اس کی خیریت معلوم کرنے آیا ہوں۔ اور تم ہو کہ دروازہ بند کر رہی ہو''۔

وہ جواب کا انتظار کرنے لگا۔ جواب نہیں ملا۔ دروازہ بھی بند نہیں ہوا۔ کسی لڑکی کی اتنی سی خاموشی سب کچھ سمجھا دیتی ہے۔ اس نے پھر کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے کہا۔

''تم بہت اچھی ہو۔ میں پہلے بھی اس گھر کے سامنے آچکا ہوں۔ میری خالد سے باہر ہی ملاقات ہو جایا کرتی تھی۔ آج پہلی بار دستک دینے کا اتفاق ہوا۔ کتنا حسین اتفاق ہے۔ میری ایک بات مان لو۔ پھر ایک بار اپنا چہرہ دکھا دو۔ میں تمہاری صورت اپنے دل میں اتار کر چلا جاؤں گا''۔

ہائے کیسے دل میں اتر جانے والے بول تھے۔ اجنبی نوجوانوں کے بازار سے اس دروازے پر پہلی بولی آئی تھی جو اس گمنام سی لڑکی کا بھاؤ بتا رہی تھی۔ اپنی قدر و قیمت کا اندازہ ہو جانے کے بعد بھی اس میں اتنی جرات نہ ہوئی کہ وہ خود کو دکھانے کے لیے بے حیائی سے سامنے چلی جاتی۔ وہ دروازے کے پیچھے ہولے ہولے لرزتی رہی۔ اجنبی نے مایوس ہو کر کہا۔

''میں سمجھ گیا تم سامنے نہیں آؤ گی۔ میں جا رہا ہوں۔ اگر میرا نام یاد رکھ سکو تو یاد کر لینا۔ میرا نام احسن ہے۔

خدا حافظ"۔

اس کے بعد اس کی آواز گم ہوگئی۔ شاید وہ چلا گیا تھا۔ وہ بڑی پریشانی سے سوچنے لگی کہ وہ سامنے کیوں نہیں گئی۔ آج کل کی لڑکیاں تو مرد سے ایک ہاتھ آگے نکل جاتی ہیں۔ میں پیچھے کیوں رہ گئی۔ اس نے ڈوبتے ہوئے دل سے دروازے کو بند کردیا۔ اس کے بعد بوجھل قدموں سے چلتی ہوئی شوکیس کے پاس آگئی۔ شیشے کی دیوار کے پیچھے کانچ کی گڑیا کھڑی ہوئی تھی۔ اس گڑیا کے سامنے بھی کوئی اجنبی آیا ہوگا مگر اس بے جان گڑیا نے شیشے کی دیوار نہیں ہٹائی ہوگی اس کی طرح دروازے کے پیچھے سے نکل کر اپنا مکھڑا نہیں دکھایا ہوگا۔

اس نے شیشے کو ایک طرف سرکا کر گڑیا کو بڑی احتیاط سے اپنے ہاتھوں میں لے لیا پھر اسے اپنے سینے سے لگا لیا۔ اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ آہ زندگی کے راستوں میں ہر ایک کو ایک نہ ایک ہم سفر مل جاتا ہے۔ زبیدہ کو بھی مل گیا۔ اور وہ اپنی لنگڑی چال کو چھپائے شوکیس کے پاس بیٹھی ہوئی تھی۔

اس ڈرائنگ روم کے باہر جب تک وہ قدم نہ نکالتی سمجھنے والا اسے کوئی ہم سفر نہیں ملتا۔ ماں نے اسے کئی بار سمجھایا تھا مگر وہ اپنے دماغ سے احساس کمتری کو نہیں مٹا سکتی تھی اس لیے وہ کبھی کبھی بہت مجبور ہوکر باہر نکلتی تھی۔ کسی اجنبی کو دوست بنانا تو دور کی بات ہے وہ کسی لڑکی کو سہیلی بناتے ہوئے بھی ہچکچاتی تھی اسی لیے باہر جاکر خالی ہاتھ واپس آجاتی تھی۔ یہ تو پتا نہیں کیسے اتنی مدت کے بعد ایک اجنبی راستہ بھول کر آگیا تھا لیکن اس نے شرم وحیا کے باعث یا ماڈرن خیال کے مطابق اپنی حماقت سے دروازہ بند کردیا تھا۔ اسے آگے بڑھنے کا موقع نہیں دیا، واپس جانے پر مجبور کردیا۔

پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ وہ چونک کر کھڑی ہوگئی۔ پچھلی رات اس نے سوچ رکھا تھا کہ خالد اپنی دوست لڑکی کو لے کر آئے گا تو وہ اپنی اس عارضی بھابھی کے لیے ناشتے کا انتظام کرے گی مگر اس اجنبی نے سب کچھ بھلا دیا تھا۔ وہ دونوں ہاتھوں سے گڑیا کو تھامے دروازے تک آئی پھر اسے ایک جھٹکے سے کھول دیا۔

دروازے پر احسن کھڑا ہوا تھا۔ اسے خلاف توقع دوبارہ دیکھتے ہی صوفیہ کی سانس اوپر کی اوپر رہ گئی۔ اسے فوراً ہی دروازہ بند کرنے یا اس کے پیچھے چھپنے کا ہوش نہ رہا۔ ہوسکتا ہے کہ اسے ہوش رہا ہو اور یہ عقل آگئی ہو کہ بار بار دروازے پر آنے والے کو مایوس نہ کیا جائے۔

ایسے وقت الجھے ہوئے خیالات کو سمجھانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ احسن نے مسکرا کر کہا۔

"میں نے دوبارہ تمہیں دیکھنے کی آرزو کی مگر تم نے دروازہ بند کردیا۔ تمہیں نظر بھر کر دیکھنے کی یہی تدبیر سمجھ میں آئی کہ ایک مرتبہ پھر دروازے پر دستک دو۔ اب دیکھ لو کہ میرے دل کی مراد کس طرح پوری ہوئی ہے"۔

صوفیہ ایک دم سے جھینپ کر دروازے کے پیچھے چلی گئی۔ اس وقت احسن کی شرارت پر غصہ بھی آرہا تھا اور ایک انجانی سی مسرت کا احساس بھی ہورہا تھا کہ کوئی اسے ایک نظر دیکھنے کے لیے کیسی تدبیریں کررہا ہے۔ اس دروازے کے باہر کھڑا صرف اسی کے لیے سوچ رہا ہے مگر وہ خود زیادہ دیر تک اس طرح کھڑی نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ سہمے ہوئے لہجے میں بولی۔

"آپ اس طرح بار بار نہ آئیں۔ میں بدنام ہوجاؤں گی"۔

"مجھے بھی اپنی بدنامی کا ڈر ہے۔ پہلے میں نے اطمینان کرلیا ہے کہ یہاں آتے ہوئے مجھے کسی نے دیکھا نہیں ہے"۔

"پھر بھی آپ چلے جائیں، میرا دل گھبرا رہا ہے" اس کی آواز میں لطیف سی لرزش تھی۔

''پہلے پہل ایسا ہی ہوتا ہے۔ میرا دل بھی گھبرا رہا ہے۔ مگر یہ محبت سے آشنا کرنے والی گھبراہٹ ہے۔ جب آشنائی کی بات آئی ہے تو مجھے اپنا نام بھی بتا دو۔ میں یہاں سے جانے کے بعد تمہیں کس نام سے یاد کروں؟''

گڑیا اس کے سینے سے لگی ہوئی تھی اور وہ سوچ رہی تھی۔ ہائے اللہ کیا اب ایک مرد کی زبان پر میرا نام آئے گا۔ یہ سوچ کر خوشی تو ہوتی ہے مگر ڈر لگتا ہے۔ احسن کی آواز سنائی دی۔

''ایک گڑیا تمہارے سینے سے لگی ہوئی ہے۔ کتنی خوش نصیب ہے وہ۔ چلو اسی گڑیا کا نام بتا دو۔ میرا دل اس گڑیا کا نام پکارے گا تو تم میرے خیالوں میں آجایا کرو گی۔ کیا نام ہے اس کا؟''

''صوفیہ''۔ شرماتی ہوئی زبان سے اپنا ہی نام ادا ہو گیا۔

''شکریہ۔ اب یہ بتا دو، کیا تم روز اس وقت تنہا رہتی ہو؟ خالد نے اپنی امی کا ذکر کیا تھا۔ وہ کہاں ہیں؟

''وہ صبح دس بجے بچوں کو پڑھانے جاتی ہیں پھر تین بجے واپس آتی ہیں''۔

''پھر ایک بار شکریہ۔ اب میں جا رہا ہوں، کل موقع دیکھ کر پھر آؤں گا''۔

''صوفیہ نے گھبرا کر کہا''نن......نہیں آپ نہ آئیں۔ مجھے ڈر لگتا ہے''۔

''میں نے کہا نا مجھے بھی ڈر لگتا ہے۔ میں بہت سوچ سمجھ کر آؤں گا۔ تم اطمینان رکھو تمہیں بدنام نہیں ہونے دوں گا۔ خدا حافظ''۔

شاید وہ چلا گیا۔ صوفیہ دروازے کے پیچھے سے نکل کر اسے نہ دیکھ سکی۔ وہ شرمیلی لڑکی تھوڑی دیر تک انتظار کرتی رہی پھر دروازے کو اندر سے بند کیا۔ اب وہ اپنے بھائی اور زبیدہ کو بالکل ہی بھول گئی تھی۔ پتا نہیں وہ آنے والے کہاں گم ہو گئے تھے اور جس کے آنے کی کبھی توقع نہیں کی جاسکتی تھی وہ دوبارہ اس کے دل کے دروازے کو کھول چکا تھا۔

اس نے گڑیا کو شوکیس میں رکھ کر شیشے کی دیوار کھڑی کر دی۔ اب گڑیا کی عمر اس میں سما گئی تھی۔ پہلی بار ایک مرد کی تعریفی نگاہوں نے اس کی عمر کا تعین کیا تھا۔ اسے گڑیا کی طرح کم از کم سولہ سال کی نہ سہی بیس سال کا سمجھ کر بہل گیا تھا حالانکہ خالد ستائیس سال کا تھا اور وہ خالد سے تین سال بڑی تھی۔ اس طرح عمر کا حساب لگانے سے دل بیٹھنے لگتا تھا۔

وہ جلدی سے پلٹ کر دیوار پر لگے ہوئے چھوٹے سے آئینے کے پاس گئی۔ آئینہ اسے احسن کی نظروں سے دیکھنے لگا، اسے اب تک کسی مرد کی نگاہوں نے قریب سے چھو کر نہیں دیکھا تھا۔ وہ بالکل اچھوتی تھی۔ دراصل مرد کی انگلیاں اور اس کی نگاہوں کی حرارت عورت کی عمر بڑھا دیتی ہے۔ یہ نہ ہو تو اس کے حسن اور اس کی شادابی پر ذرا سی بھی خراش نہیں آتی۔

وہ دن بڑا خوشگوار تھا۔ کبھی کانوں میں شہنائیاں گونج رہی تھیں۔ کبھی دل کی دھڑکنوں کے ساتھ سہاگ کے ڈھولک بج رہے تھے۔ رگ رگ میں نشہ سا گھل رہا تھا۔ دھک دھکا دھک کی آواز کے ساتھ پھر دروازے پر دستک ہوئی۔ دستک کی آواز سنتے ہی دل کی دھڑکنیں پھر پاگل ہو گئیں۔ شاید وہ جانے والا پھر واپس آ گیا تھا۔ وہ لنگڑاتی ہوئی دروازے کی طرف جاتے ہوئے سوچنے لگی کہ اب وہ دروازہ کھول کر ایک دم سے سامنا نہیں کرے گی، فوراً ہی دروازے کے پیچھے چلی جائے گی۔ پھر دماغ نے سمجھایا کہ ایسی حماقتیں کرتے عمر گزر گئی ہے۔ اب بھی یہی کرے گی تو اسی ڈرائنگ روم میں بیٹھے بیٹھے بوڑھی ہو جائے گی۔ بھلا کون عورت بوڑھی ہونا پسند کرتی ہے۔ اس نے بالکل سامنے کھڑے ہو کر دروازہ کھول دیا۔

مگر وہ نہیں تھا۔ اس کے سامنے خالد ایک سانولی لڑکی کے ساتھ کھڑا ہوا تھا۔ صوفیہ نے سمجھ لیا کہ وہ زبیدہ

ہی ہوگی۔ زبیدہ نے سر کے دوپٹے کو آگے کی طرف اتنا کھینچ لیا تھا کہ تقریباً آنکھوں تک اس کا چہرہ چھپ گیا تھا۔ صوفیہ نے جلدی سے زبیدہ کا ہاتھ تھام لیا اور بولی۔

''آؤ۔ اندر آجاؤ۔ یہ دوپٹے کا گھونگٹ یوں لگ رہا ہے جیسے سچ مچ میری دلہن بھابی آگئی ہو''۔

وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر کمرے میں لے آئی پھر اسے صوفے پر بٹھانے لگی تو خالد نے کہا۔

''تم زبیدہ سے بعد میں باتیں کر لینا پہلے ہمیں ضروری باتیں کر لینے دو۔ ایسا نہ ہو کہ امی آجائیں''۔

''وہ اتنی جلدی نہیں آئیں گی'' صوفیہ نے زبیدہ کو بٹھانے کے لیے اپنی طرف کھینچا تو دوپٹا اس کے ہاتھ میں آکر سرک گیا۔ گھونگھٹ والا چہرہ کھل کر سامنے آگیا۔ تب صوفیہ کو پتا چلا کہ گھونگھٹ کے پیچھے چھپنے والی کی ایک آنکھ پتھر کی ہے۔ اس کی ایک آنکھ پلکیں جھپکتی تھی مگر دوسری آنکھ بالکل ساکت ہو کر کھلی رہتی تھی۔

صوفیہ اسے دیکھ کر ساکت ہوگئی۔ اسے پتا ہی نہ چلا کہ خالد کب زبیدہ کو اس کے سامنے سے کھینچ کر لے گیا۔ وہ تو اپنی زندگی کے آئینے میں زبیدہ کو دیکھ رہی تھی۔ اس کی امی نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ اس دنیا میں ایسی بے شمار لڑکیاں ہیں جو اس سے بھی زیادہ جسمانی عیب رکھتی ہیں لیکن وہ لڑکیاں اس کی طرح احساس کمتری میں مبتلا نہیں رہتیں۔ وہ گھر سے باہر نکلتی ہیں۔ محنت مزدوری کرتی ہیں۔ اپنی کمائی سے اپنے جہیز کا سامان جوڑتی ہیں۔ وہ دل برداشتہ ہو کر یہ نہیں سوچتیں کہ انہیں کوئی جیون ساتھی نہیں ملے گا۔ اللہ میاں نے اسے دنیا میں سبھی کا جوڑا بنایا ہے۔ زبیدہ کو بھی اپنا جوڑا مل گیا تھا۔ صوفیہ نے گھوم کر دیکھا تو خالد کے کمرے کا دروازہ بند ہو چکا تھا۔

وہ صوفے پر بیٹھ کر بند دروازے کو دیکھنے لگی۔ انسانوں اس دنیا میں آگہی کے کتنے ہی دروازے بند کر دیئے جاتے ہیں۔ دوسروں سے چھپانے کی کوشش کی جاتی ہے مگر اس دیکھنے والی کا دماغ سوچ رہا تھا کہ دروازہ کیوں بند کر دیا گیا ہے۔ ایسی صورت میں تجسس بڑھتا ہی جاتا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی اور اس کے دماغ کے بند دروازے پر احسن دستک دے کر بہت کچھ سمجھا رہا تھا۔ جب بہت کچھ سمجھانے سے کچھ کچھ سمجھ میں آیا تو وہ آپ ہی آپ شرمندہ ہوگئی۔

زبیدہ ایک اجنبی لڑکی کی طرح آئی تھی اور اجنبی کی طرح واپس چلی گئی۔ صوفیہ کے دل میں ڈھیر ساری آرزوئیں تھیں کہ وہ کس طرح اپنی عارضی بھابی سے ڈھیر ساری باتیں کرے گی مگر خالد نے اپنی باتوں میں بہت سارا وقت گنوا دیا تھا۔ اسی لیے زبیدہ اس سے باتیں کیے بغیر چلی گئی تھی۔ خالد بھی اسے چھوڑنے کے لیے چلا گیا تھا۔ اسے یہ بتانے کا موقع نہیں ملا کہ اس کا ایک دوست احسن اس سے ملنے کے لیے آیا تھا۔ تین بجے کے بعد اس کی امی واپس آئیں تو بیٹی کو دیکھ کر ٹھٹک سی گئیں۔ ماں نے پہلی بار اس چپ چاپ سی رہنے والی لڑکی کے ہونٹوں پر دھیمی دھیمی مسکراہٹ دیکھی تھی۔ مسکراہٹ کھل کر سامنے آئے تو عام سی خوشیوں کا اظہار ہوتا ہے۔ جوان لڑکی کے ہونٹوں پر چھپ چھپ کر آئے تو کوئی خاص بات ہوتی ہے وہ خاص بات کیا ہو سکتی ہے؟

زمانہ شناس بوڑھی ماں پہلے تو اپنے طور پر سوچنے اور سمجھنے کی کوشش کرتی رہی مگر کچھ سمجھ میں نہیں آیا تو وہ ٹوٹے ہوئے صوفے پر آرام سے بیٹھ گئی پھر بیٹی کو مخاطب کیا۔

''صوفی! یہاں آؤ بیٹی! ذرا میرے پاس بیٹھو۔ میں بہت تھک گئی ہوں۔ تمہیں چپ چاپ مسکراتے دیکھ کر میری تھکن دور ہو رہی ہے''۔

وہ ڈائننگ ٹیبل پر سالن اور روٹیاں رکھ رہی تھی۔ ماں کی بات سن کر اس نے منہ پھیر لیا۔

مسکراہٹ کی جگہ گھبراہٹ نے لے لی کہ شاید ماں نے چوری پکڑ لی ہے۔ ماں نے پھر آواز دی۔
''کیا میرے پاس نہیں آؤ گی؟ کہو تو میں تمہارے پاس آجاؤں''۔
وہ ماں کے پاس جائے یا ماں اس کے پاس آئے، بات ایک ہی تھی۔ وہ کترا نہیں سکتی تھی، اس لیے دوپٹے کو سر پر سنبھالتی ہوئی ماں کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ ماں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔
''معلوم ہوتا ہے کہ میری بیٹی کو بہت بڑی خوشی ملی ہے۔ کیا ماں کو اپنی خوشیوں میں شریک نہیں کرو گی؟''
''کچھ نہیں امی! کچھ بھی تو نہیں ہے۔ پتا نہیں آپ میرے چہرے پر کیسی خوشیاں دیکھ رہی ہیں؟''
''بیٹی! جب میری شادی نہیں ہوئی تھی اس وقت میں بھی بہت سی باتیں اپنی ماں سے چھپایا کرتی تھی۔ ان دنوں میں اتنی خوبصورت تھی کہ اپنے ہی خاندان کے کتنے ہی چچا زاد، ماموں زاد اور پھوپھی زاد بھائی چھپ چھپ کر مجھے محبت کے پیغام دیتے تھے۔ ایک بار میں اپنے گھر میں تنہا تھی تو اچانک ہی ایک اجنبی دروازے پر آگیا تھا۔ کچھ عرصے بعد وہ اجنبی نہیں رہا۔ اس لیے کہ میں بے جا شرم کرنے والی لڑکی نہیں تھی۔ وہ مجھے اچھا لگا تو میں نے اپنی امی سے کہہ دیا۔ جانتی ہو وہ اجنبی کون تھا، وہ تمہارا باپ تھا''۔
ماں کی باتیں بڑا حوصلہ دے رہی تھیں۔ صوفیہ کے دل کو اطمینان ہوا کہ اس کی ماں کی زندگی میں کوئی اجنبی آیا تھا۔ اچھا تو ایسے اجنبی جیون ساتھی بن جایا کرتے ہیں۔ ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ اگر یہ ماں بیٹی کے درمیان رہے تو کوئی تیسرا بدنام کرنے نہیں آئے گا۔ بیٹی کو سوچتے دیکھ کر ماں نے کریدنا شروع کر دیا۔
''کیا تم باہر گئی تھیں؟''
''جی نہیں۔ میں صبح سے گھر کے اندر ہوں''۔
''اچھا۔ اچھا'' ماں نے سر ہلا کر کہا ''تو پھر مجھے کوئی بلانے آیا ہوگا''۔
''آپ کو نہیں خالد کو'' وہ روانی میں کہہ گئی پھر جانے کہاں سے جھجک آگئی۔ ماں کریدنے پر تلی ہوئی تھی۔ اس نے پر سر ہلا کر کہا۔
''اچھا تو خالد کو کوئی بلانے آیا تھا''۔
''جی۔ جی ہاں''۔
''اس کا کوئی دوست ہوگا''
''جی ہاں۔ خالد کے ساتھ وہ بھی مل میں کام کرتے ہیں۔ وہ یہ پوچھنے آئے تھے کہ خالد آج ڈیوٹی پر......''
وہ کہنا چاہتی تھی کہ خالد آج ڈیوٹی پر نہیں گیا ہے اسی لیے اس کا ایک دوست اس کی خیریت پوچھنے یہاں آیا تھا۔ اسے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا مگر بات زبان سے پھسل گئی تھی۔ ماں　　ا پوچھا۔
''تم رک کیوں گئیں؟ کیا خالد آج پھر ڈیوٹی پر نہیں گیا ہے؟''
''آں۔ وہ گیا ہوگا، مجھے کیا معلوم۔ میں کیا کہہ سکتی ہوں''۔
''تم سب جانتی ہو۔ بھائی کی باتیں مجھ سے چھپاتی ہو۔ اس نے آج پھر ناغہ کیا ہے۔ محلے میں کہیں بیٹھا تاش کھیل رہا ہوگا''۔
''نہیں امی۔ وہ تاش نہیں کھیل رہے وہ تو......''

''دیکھو صوفی! تم اپنی ماں سے کچھ نہیں چھپا سکتیں۔ تمہاری معصومیت اور یہ گھبراہٹ مجھے سب کچھ بتا دیتی ہے۔ مجھے سچ سچ بتاؤ کہ کیا بات ہے؟''

صوفیہ بری طرح بدحواس ہوگئی تھی اس کا دل سینے میں الٹ پلٹ کر دھڑک رہا تھا۔ اچانک ماں کو خیال آیا کہ وہ تو بیٹی کی خوشیاں معلوم کرنا چاہتی تھی، اب اصل موضوع سے ہٹ کر بیٹے کے پیچھے پڑ گئی تھی۔ یہ سوچتے ہی اس نے کہا۔

''اچھا جانے دو۔ میں خالد سے پوچھ لوں گی۔ ابھی تو تم مجھے اپنی خوشیوں میں شریک کرو۔ صوفی۔ میں تم سے پوچھ رہی تھی کہ اس کا دوست کیسا ہے؟ اس کے ساتھ مل میں کام کرتا ہے، اچھا کما لیتا ہوگا۔ تم ایک ہی ملاقات میں اسے نہیں پرکھ سکتیں۔ میرا بڑھاپا اسے پرکھ لے گا اور آج کل کسی کو سمجھنے کے لیے بہت زیادہ سمجھنے کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بس اتنا جان لینا کافی ہے کہ کیا کماتا ہے اور کیا بچاتا ہے؟ اس میں سارے جہاں کے عیوب ہوں مگر جواری نہ ہو۔ اس لیے کہ قمار بازی بہت بری لعنت ہے۔ بعض لوگ جوئے میں اپنی بیویوں کو ہار جاتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ وہ جواری نہیں ہوگا۔ توبہ ہے، میں ہی بولتی چلی جا رہی ہوں اور تم چپ بیٹھی ہو۔ اچھا یہ بتاؤ اس کا نام کیا ہے؟''

''احسن۔ انہوں نے خود ہی اپنا نام بتایا تھا''۔

''تم نے بھی اپنا نام بتایا ہوگا؟''

کہتے ہیں کہ مشرقی مائیں اپنی بیٹیوں سے ایسی باتیں نہیں کرتیں۔ ایسی باتوں سے بیٹیوں کو بے حیائی کا سبق ملتا ہے مگر شاید مشرقی روایات بدلتی جا رہی ہیں۔ بڑھتی ہوئی مہنگائی کے ساتھ لڑکے مہنگے ہوتے جا رہے ہیں۔ صرف مزدوروں کی تنخواہ بڑھانے سے مہنگائی کا زور کم نہیں ہوسکتا۔ اس لیے اب روزانہ اجرت پر مزدوری کرنے والے بھی اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ کہیں سے دولت لانے والی یا خود محنت سے دولت پیدا کرنے والی بیوی انہیں مل جائے۔ گھر سنبھالنے والی بھی باہر جا کر کام کرے گی تو دونوں کی کمائی سے زندگی گزر سکتی ہے۔ جب افراد کے سوچنے کا انداز بدلتا ہے تو ان کی روایات بھی بدلتی ہیں۔ معاشرے کا اندرونی ڈھانچہ بھی چپکے چپکے بدلتا ہے۔ چپکے چپکے مائیں اپنی بیٹیوں کو سمجھاتی ہیں کہ اگر کوئی بھولے بھٹکے دستک دینے آجائے تو کس طرح نئے رشتے کا دروازہ کھول دینا چاہیے۔ ایسا چور سبق ہر گھر میں پڑھایا جاتا ہے۔ کوئی تسلیم نہ کرے یہ اور بات ہے۔

جب ماں حوصلہ دے رہی تھی تو بیٹی نے خاموشی سے سر جھکا کر اعتراف کرلیا کہ وہ بھی اپنا نام بتا چکی ہے۔ اس وقت ماں کا دل سینے کی ہانڈی میں کھدبدا رہا تھا۔ وہ ایک بھٹکے ہوئے مسافر کو عزت و آبرو سے داماد بنانے کے لیے اس کے متعلق زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے پوچھا۔

''کیا اس نے تمہیں دیکھا ہے؟''

''میں انجانے میں دروازہ کھول کر ایک دم سے سامنے چلی گئی تھی۔ پھر جلدی سے دروازے کے پیچھے چھپ گئی تھی''۔

''تم نے دروازہ تو جلدی سے بند نہیں کیا ہوگا؟''

''نہیں۔ میں تو گھبرا گئی تھی۔ دروازہ بند کرنا بھول گئی تھی۔ جب وہ باتیں کرنے لگے تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ ایسے وقت دروازہ بند کرنا چاہیے یا نہیں''۔

''تم نے اچھا کیا جو دروازہ بند نہیں کیا بیٹی۔ تم تو بیسویں صدی میں رہ کر بھی صدیوں پرانی لڑکی ہو۔ تمہیں تو

ہجے کر کے سمجھانا ہوگا۔ ایسے وقت دروازہ بند کرنے سے تقدیر کے دروازے بند ہو جاتے ہیں۔ ہاں تو اس نے کیا کہا؟ مجھے بتاؤ تا کہ میں بھی تمہیں کچھ بتا سکوں''۔

اب وہ ماں کو کیا بتاتی کہ احسن کے بات کرنے کا انداز کیسا تھا۔ اسے خاموش دیکھ کر ماں نے پوچھا۔

''اس نے تمہاری تعریف کی ہوگی؟''

صوفیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ ماں نے خوش ہو کر کہا۔

''بس اتنا ہی کافی ہے۔ اب میں خالد سے بات کروں گی۔ یہ لڑکا بالکل ہی ناکارہ ہے۔ اس کی مل میں اور اس کے دوستوں میں کتنے کنوارے ہیں مگر وہ کسی کو دوست بنا کر گھر نہیں لاتا۔ پتا نہیں یہ جو احسن آیا تھا یہ کنوارہ ہے یا شادی شدہ۔ میں خالد سے پوچھوں گی مگر وہ تو کبھی دو گھڑی چین سے بیٹھ کر بات ہی نہیں کرتا۔ آج بھی جلدی جلدی ناشتہ کر کے چلا گیا۔ ایسی جلد بازی کرتا ہے جیسے وہ نہیں جائے گا تو مل کی تمام مشینیں بند ہو جائیں گی مگر یہ سب دکھاوا ہے۔ وہ کام کرنے نہیں جاتا کہیں بیٹھ کر تاش کھیلتا ہے۔ آنے دو اسے، دیکھ لینا آج کیسی باتیں سناتی ہوں''۔

صوفیہ نے پریشان ہو کر کہا ''امی آپ خالد سے کچھ نہ کہیں''۔

''کیوں نہ کہوں۔ کیا اسے جواری بننے کی آزادی دے دوں''۔

''امی بھائی جان تاش نہیں کھیلتے ہیں''۔

''وہ تاش نہیں کھیلتا ہے۔ ڈیوٹی پر نہیں جاتا ہے تو پھر وہ کیا کرتا ہے؟ کہاں جاتا ہے؟''

صوفیہ کا سر جھک گیا۔ ایک بار اس کے جی میں آئی کہ وہ ماں کو بھائی کے بارے میں سب کچھ بتا دے۔ آخر وہ ماں ہے بیٹے کی محرومیوں اور نامرادیوں کو سمجھ جائے گی۔ جب مائیں بچوں کی خواہشیں پوری کرنے کے قابل نہیں رہتیں تو چپ چاپ تماشہ دیکھنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ ماں اپنی بیٹی کے جھکے ہوئے سر کو دیکھ کر اس کی بہت سی چوریاں پکڑ لیتی تھی۔ اس نے کہا۔

''صوفی! تم اپنے بھائی کی کوئی بات چھپا رہی ہو''۔

صوفیہ نے اچانک سر اٹھایا۔ پھر فوراً ہی نظریں چرانے لگی۔ ماں نے کہا۔

''میں ماہر نفسیات نہیں ہوں لیکن اپنے بچوں کے ساتھ رہ کر ماں باپ کو اتنا سلیقہ آ جاتا ہے کہ وہ ان کے مزاج کو سمجھ سکیں اور ان کی سوچ کو پڑھ سکیں۔ جب ہم کسی کی بات کرتے ہیں تو بات ختم ہو جانے کے بعد اسی کے متعلق سوچتے ہیں۔ ابھی میں خالد کی باتیں کر رہی تھی۔ لہٰذا تم خالد کے بارے میں سوچ رہی ہو اور کچھ چھپا رہی ہو''۔

''کچھ نہیں امی! آپ تو بس پیچھے پڑ جاتی ہیں۔ آپ بھائی جان پر نکتہ چینی کرنے اور انہیں ڈانٹنے ڈپٹنے کے سوا کچھ نہیں جانتیں۔ آخر وہ بھی تو انسان ہیں۔ روز صبح سے شام تک چیختی ہوئی مشینوں کے ساتھ مشین نہیں بن سکتے۔ لوگ تو گھبرا کر دنیا سے بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ وہ تو کبھی کبھی اپنی مل سے بھاگتے ہیں۔ آج بہت عرصے کے بعد انہوں نے ناغہ کیا ہے۔ بہت مدت کے بعد وہ اپنی ایک دوست کے ساتھ......''

وہ کہتے کہتے رک گئی۔ ماں نے اسے گھور کر دیکھا۔

''دوست مذکر ہوتا ہے۔ تم مؤنث کے طور پر کیوں کہہ رہی ہو کہ وہ اپنی ایک دوست کے ساتھ۔ اپنی دوست کیا ہوتا ہے؟ یا تو تمہاری زبان کمزور ہے بعض اوقات تم تذکیر کو تانیث بنا دیتی ہو یا وہ سچ مچ کسی تانیث کے

ساتھ۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے۔ وہ شراب کے نشے میں اکثر فلمی ہیروئنوں کی باتیں کرتا رہتا ہے۔ سچ سچ بتاؤ کیا اس نے اپنی کسی دوست لڑکی کا تذکرہ تم سے کیا ہے؟''

صوفیہ نے چپ چاپ اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کون ہے وہ لڑکی؟''

''زبیدہ''۔

''زبیدہ کہہ دینے سے میں کیسے سمجھ لوں گی کہ وہ کون ہے؟''

''اس کی ایک آنکھ نہیں ہے''۔

''کیا؟'' ماں نے تقریباً چیخ کر پوچھا۔''کیا فلم کی ہیروئن ایسی ہوتی ہے؟''

''ہماری زندگی میں ایسی ہوتی ہے۔ مجھ میں بھی تو ایک نقص ہے''۔

ماں کو اپنی بیٹی کی لنگڑاہٹ یاد آ گئی۔ ایک ذرا دیر پہلے وہ ساس بن کر اپنی ان دیکھی بہو میں کیڑے نکالنا چاہتی تھی۔ ماں بن کر یاد آ گیا کہ لڑکیوں کے ساتھ یہ قدرت کا مذاق ہے۔ اس مذاق کے آگے صوفیہ اور زبیدہ جیسی لڑکیاں مجبور اور بے بس ہیں۔ وہ بے چینی سے پہلو بدلتے ہوئے بولی۔

''ٹھیک ہے۔ مگر میرا بیٹا بہت خوبصورت ہے، اسے اچھے گھرانوں کی کتنی ہی لڑکیاں مل سکتی ہیں''۔

صوفیہ نے جواب نہیں دیا۔ ماں اسے خاموش دیکھ کر خود ہی سوچنے لگی۔

''میری طرح دوسرے لڑکوں کی مائیں بھی اسی انداز میں سوچ سکتی ہیں کہ ان کے بیٹوں کو ایک سے ایک حسین لڑکی مل سکتی ہے جو تمام عیبوں سے پاک ہوتی ہے پھر لنگڑی صوفیہ کو اپنی بہو کیوں بنایا جائے''۔

خود غرضی تو ہر جگہ ہے، ہر دل میں ہے، انسان کے ہر مفاد میں ہے، ماں کے دل نے سمجھایا کہ صوفیہ کے جسم میں ایسا نقص نہیں ہے جیسا کہ زبیدہ میں ہے، جیسا کہ اور دوسری لڑکیوں میں ہوسکتا ہے۔ اپنی بیٹی میں تو عیب ہو ہی نہیں سکتا۔ وہ چلتے وقت لنگڑاتی ہوئی نہیں بلکہ لہراتی ہوئی بل کھاتی ہوئی نظر آتی ہے۔

مگر بات بیٹے کی ہو رہی تھی۔ اس نے ایسی لڑکی کو کیوں پسند کیا۔ ایسی بہو کو ہر وقت کالا چشمہ پہنائے رکھنا ہوگا۔ اگر وہ چشمہ بار بار ٹوٹتا رہا یا ہونے والے بچے توڑتے رہے تو چھوٹی سی تنخواہ میں چشمے کے پیسے الگ نکالنے ہوں گے۔ اس نے بیٹی سے پوچھا۔

''آخر اس لڑکے نے زبیدہ میں کیا خوبی دیکھی ہے۔ تم انصاف سے کہو میں اسے بہو کیسے بنا سکتی ہوں؟''

''آپ بہو کیوں بنانا چاہتی ہیں؟ خالد۔ میرا مطلب ہے بھائی جان تو اس سے شادی کرنا نہیں چاہتے''۔

''ایں۔ شادی نہیں کرنا چاہتا؟ تو پھر دوستی کیوں کی ہے؟''

''صرف ضروری باتیں کرنے کے لیے''۔

''ضروری باتیں۔ اس کا مطلب کیا ہوا؟''

''وہ...... اصل بات یہ ہے کہ امی زبیدہ ایک فیکٹری میں پیکنگ کا کام کرتی ہے۔ اس کی فیکٹری بھائی جان کے راستے میں پڑتی ہے۔ اس طرف سے آتے جاتے زبیدہ سے دوستی ہوگئی مگر انہیں راستے میں ضروری باتیں کرنے کا موقع نہیں ملتا تھا اس لیے آج وہ زبیدہ کو یہاں لے آئے تھے۔ دیکھیے امی، آپ بھائی جان سے کچھ نہ کہیں۔ انہوں

نے مجھ سے کہا تھا کہ آپ کو کچھ نہ بتاؤں۔ انہوں نے بڑے اعتماد سے مجھے اپنا رازدار بنایا ہے مگر میں کیا کروں میرے پیٹ میں بات نہیں رہتی۔ آپ ان سے کچھ نہیں کہیں گی؟''

''کیوں نہیں کہوں گی، اسے آنے تو دو۔ توبہ توبہ گھر میں جوان بہن ہے اور اس کے سامنے ایسی حرکتیں......''

''حرکتیں کیسی وہ تو ضروری باتیں کرنے......'' صوفیہ نے جلدی سے صفائی پیش کی۔

''تم چپ رہو۔ کیا ضروری باتیں کرنے کے لیے یہی گھر ملا تھا۔ کیا وہ اپنے کمرے میں گیا تھا؟''

صوفیہ نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''کیا اس نے دروازہ بند کیا تھا؟''

صوفیہ نے پھر سر ہلا دیا۔ ماں سر پکڑ کر بیٹھ گئی ''کیسی ٹھس لڑکی ہے۔ گڑیا کی طرح ہاں ہاں میں گردن ہلائے جا رہی ہے۔ کیا یہ اندر سے کچھ نہیں سمجھتی ہوگی۔ جب میں جوان تھی تو میں بھی اپنے اندر بہت سے طوفان چھپائے رکھتی تھی اور اوپر سے بے حس بنی رہتی تھی۔ میں اپنی بیٹی کو نہیں سمجھوں گی تو اور کون سمجھے گا۔ آنے دو اسے، آج میں اسے سمجھ لوں گی''۔

وہ بڑبڑاتی ہوئی گھر کے کاموں میں مصروف ہوگئی۔ کام کے دوران کبھی وہ اپنے کمرے میں جا رہی تھی اور کبھی باورچی خانے میں جا رہی تھی ایک بار وہ باورچی خانے سے باہر آ کر بولی۔

''یہ لڑکے تو ماؤں کو پریشان کرنے کے لیے پیدا ہوتے ہیں۔ اس کے لیے سوچتی ہوں تو تمہیں بھول جاتی ہوں۔ ابھی احسن کی بات سن کر سوچ رہی تھی کہ اس ڈرائنگ روم کا حلیہ بدلنا ہوگا۔ ہم اسے دعوت دیں گے تو یہاں آ کر کیا دیکھے گا؟ ہماری شکستہ حالی سے بددل ہو جائے گا۔ گڑیا کا بھاؤ بتانے سے پہلے شوکیس کو سجانا پڑتا ہے۔ مگر تمہارا بھائی یہ باتیں نہیں سمجھتا۔ وہ تو ایسے الجھا کر رکھ دیتا ہے کہ میں ساری باتیں بھول جاتی ہوں۔ ابھی میں تمہیں ایک خوشخبری سنانے والی تھی۔ دیکھو میں پھر بھول جاؤں گی۔ تم بیچ میں کچھ نہیں بولنا۔ خالد کی بات چھیڑو گی تو میں پھر......''

''امی آپ پھر بھول رہی ہیں۔ وہ خوش خبری کیا ہے؟''

''وہ پچھلے دو سالوں سے جو ٹیچروں کی اضافی تنخواہ رکی ہوئی تھی نا وہ کل ہمیں مل جائیں گی۔ نئی حکومت کا بھلا ہو مجھے پورے چوبیس سو روپے ملیں گے۔ یعنی دو ہزار چار سو روپے۔ مگر تم چوبیس سو یاد رکھو۔ اس طرح تمہیں یاد رہے گا کہ خالد کی عمر چوبیس برس ہے اور اس سے تم چار سال چھوٹی ہو اور ہاں خالد سے روپے کی بات نہ کرنا ورنہ وہ سو پچاس مانگنا شروع کر دے گا۔ میں تمہاری شادی کے لیے یہ روپے رکھ رہی ہوں۔ صرف ڈرائنگ روم کے لیے پانچ سو روپے خرچ کروں گی۔ قسطوں پر نئے صوفے آ جائیں گے۔ لنڈے بازار سے کھڑکیوں اور دروازوں کے پردے لے آؤں گی۔ تھوڑی سی تبدیلی ہو جائے تو ڈرائنگ روم ایک دم سے بدل جائے گا۔ تمہاری تقدیر بھی بدل جائے گی''۔

یہ کہہ کر وہ پھر باورچی خانے میں چلی گئیں۔ صوفیہ شوکیس کی طرف دیکھ کر سوچنے لگی ''امی ایسے منصوبے بنا رہی ہیں جیسے وہ سچ مچ دولہا بن کر آئیں گے۔ کیا سچ مچ ایسا ہو سکتا ہے؟ یہ سوچتے ہی اس کے کانوں میں شہنائیاں گونجنے لگیں۔ ڈھولک کی تھاپ پر سکھیاں گیت گانے لگیں ''بنا میرا آئے گا......'' بنے کو چشم تصور میں دیکھتے ہی اس نے شرما کر چہرے کو دونوں ہاتھوں سے چھپا لیا۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ خیال کی دنیا میں پہنچ کر سب ہی اپنی لنگڑاتی ہوئی زندگی کو بھول جاتے ہیں۔

خالد شام کو ڈیوٹی کے وقت کے مطابق واپس آیا۔ ماں غصے میں بھری بیٹھی تھی۔ بہت زیادہ غصے میں نہیں بولا

جاتا۔ وہ بھی کئی بار بولتے بولتے رہ گئی۔ خالد ہمیشہ کا لاپرواہ تھا، وہ ماں کو نظر انداز کر کے کوٹ اتارتے ہوئے اپنے کمرے کی طرف جانے لگا تب ماں سے برداشت نہ ہوسکا۔

''کہاں جا رہے ہو، ادھر آؤ۔ اتنی گرمی میں یہ کوٹ کسے پسند کرانے گئے تھے؟ اب جھوٹ نہ بولنا کہ ڈیوٹی پر گئے تھے مجھے سب معلوم ہو چکا ہے۔ بہتر ہے اپنی زبان سے سب کچھ کہہ دو''۔

خالد نے گھوم کر صوفیہ کی جانب شکایت بھری نظروں سے دیکھا۔ ماں نے ڈانٹ کر کہا۔

''اسے کیا دیکھ رہے ہو؟ تم میری بیٹی کو سکھاتے ہو کہ وہ مجھ سے جھوٹ بولے۔ تمہاری آوارگیوں کو مجھ سے چھپاتی رہے۔ صوفی! تم یہاں سے جاؤ''۔

صوفیہ ماں کے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے جانے کے بعد ماں نے کہا۔

''ہاں۔ اب بتاؤ؟''

''آپ سب کچھ جان چکی ہیں اور میں کیا بتاؤں؟''

''تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''آپ ایسے سوال کر رہی ہیں جس کا جواب ایک بیٹا اپنی ماں کے سامنے نہیں دے سکتا''۔

''اور ایک بھائی اپنی بہن کے سامنے بھی تو ایسا نہیں کر سکتا''۔

''امی آپ میرا محاسبہ کرنے سے پہلے میری مجبوریوں کو سمجھنے کی کوشش کریں۔ آپ کیا چاہتی ہیں؟ کیا میں ساری زندگی خواب دیکھتے دیکھتے یا فلمیں دیکھتے دیکھتے گزار دوں؟''

''تم فلمیں کیوں دیکھتے ہو؟ یہ فلمیں اخلاق بگاڑ دیتی ہیں''۔

''یہ غلط ہے امی۔ ہماری محرومیاں ہمارا اخلاق بگاڑتی ہیں۔ ہم انسان فطرتاً شکاری، عاشق اور جنگجو واقع ہوئے ہیں۔ جب ہمارے اس فطری جذبے کی تسکین نہیں ہوتی تو ہم شکاری، عاشق اور جنگجو قسم کے ہیرو کی فلمیں دیکھتے ہیں۔ وہ خطرات میں گھر جاتا ہے تو ہم بھی خطرات میں گھر جاتے ہیں۔ وہ دشمنوں کو ٹھوکریں مارتا ہے، حالات سے لڑتا ہے اور مفلسی کے ظالم پنجوں سے اپنی دولت مند حسین محبوبہ کو چھین لیتا ہے تو ایسے وقت ہمارے جذبوں کی تسکین ہوتی رہتی ہے۔ پھر ہم اپنے اس بوسیدہ سے مکان میں آکر سوچتے ہیں کہ ہم ایسا کیوں نہیں کر سکتے۔ پھر ہماری محرومیاں ہمیں سمجھاتی ہیں کہ اکبر سیٹھ اگر دو لاکھ روپے کماتا ہے تو ہم اپنی محنت سے کم از کم دو سو کما سکتے ہیں۔ اکبر سیٹھ کے پہلو میں دو آنکھوں والی محبوبہ آتی ہے ہمارے حصے میں کم از کم ایک آنکھ والی تو آسکتی ہے مگر جب ہمارے حصے کی بات آتی ہے تو اخلاقی قدروں کی دیواریں کھڑی کر دی جاتی ہیں''۔

''اخلاقی قدروں کو بھولا نہیں جا سکتا۔ یہ کیسی غیر اخلاقی بلکہ شرمناک حرکت ہے کہ تم نے جوان بہن کو اپنا رازدار بنایا ہے۔ تم نے یہ نہیں سوچا کہ یہ معصوم کتنی محرومیوں کا شکار ہے۔ تمہاری اس حرکت سے اس کے ذہن پر کیا اثر پڑے گا''۔

یہی سوچتے سوچتے اور ڈرتے ڈرتے اتنی عمر گزر گئی۔ اتنی مدت کے بعد یہ سوچ کر ذرا سی جرات پیدا ہوئی ہے کہ بھوک کے وقت مانگنے سے روٹی نہ ملے تو کسی سے مانگ کر کھائی جاتی ہے یا چرا کر کھائی جاتی ہے۔ میں نے بہت مجبور ہو کر اس سماج کے دستر خوان میں سے ایک لڑکی کو چرایا ہے۔ آپ خود دیکھ لیں کہ میں نے بہت بڑی چوری نہیں کی ہے۔ چوری کے بعد بھی جس طرح ہمیں سوکھی روٹیاں ملتی ہیں اسی طرح ایک روکھی پھیکی لڑکی ملی ہے''۔

''میں صوفیہ کی بات کر رہی ہوں اور تم بات بدل رہے ہو''
''صوفیہ ایک نادان لڑکی ہے امی۔ نادان ہے، معصوم ہے اور اس شوکیس میں رکھی ہوئی گڑیا کی طرح بے حس ہے۔ میں نے اسے کبھی مسکراتے اور کبھی رنگوں سے محبت کرتے نہیں دیکھا''۔
''اپنے گھر کی لڑکی ایسی ہی نادان اور بے حس نظر آتی ہے مگر وہ اندر سے کیا ہے؟ یہ تم ماں سے زیادہ نہیں جانتے۔ مگر اب تمہیں سب کچھ جاننا اور سمجھنا پڑے گا۔ تمہیں اس کے رشتے کی فکر کرنا ہوگی۔ تمہارا کوئی دوست تمہارے ساتھ مل میں کام کرتا ہے، اس کا نام احسن ہے۔ کیا اس کی شادی ہو چکی ہے؟''
''آپ احسن کو کیسے جانتی ہیں؟'' اس نے حیرانی سے پوچھا۔
''پہلے میری بات کا جواب دو۔ کیا اس کی شادی ہو چکی ہے؟''
''نہیں۔ وہ بھی میری طرح خواب دیکھتا ہے۔ اس کی تنخواہ مجھ سے پچاس روپے زیادہ ہے''۔
''پھر تو اچھا لڑکا ہے'' ماں نے جلدی سے کہا۔
''مگر وہ سوچتا ہے کہ جب بیوی آئے گی اور بچے بڑھیں گے تو تنخواہ نہیں بڑھے گی۔ وہ چار سو روپے چار روپے کے برابر ہو جائیں گے''۔
''تم اسے کسی دن یہاں لے کر آؤ۔ میں اسے سمجھاؤں گی کہ بیوی بچوں کی تقدیر سے بھی آمدنی بڑھتی ہے''۔
''اگر یہ کوئی لطیفہ ہے تو مجھے ہنسنا چاہیے۔ اگر اس میں حقیقت ہے تو پھر ہم سب کو بیوی بچوں کی فیکٹریاں کھول لینی چاہئیں۔ ویسے آپ یہ بتائیں کہ آپ احسن کو کیسے جانتی ہیں؟''
''وہ یہاں تم سے ملنے آیا تھا۔ میں گھر پر نہیں تھی۔ صوفی نے دروازہ کھولا۔ دونوں نے ایک دوسرے کو اچھی طرح دیکھ لیا ہے''۔
''کیا مطلب؟ کیا وہ گھر کے اندر آیا تھا؟''
''نہیں، دروازے پر کھڑا رہا''۔
''آپ کیسے کہہ سکتی ہیں کہ صوفیہ نے آپ سے سچ کہا ہے۔ وہ یہاں اندر آیا ہوگا''۔
''اگر میری بیٹی نے مجھ سے جھوٹ بولا ہے تو اس جھوٹ پر تمہیں شرمانا چاہیے، کیونکہ پہلے تم نے ایک لڑکی کے لیے اس گھر کا دروازہ کھولا ہے''۔
خالد نے غصے سے منہ پھیر کر کہا۔
''اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ صوفیہ بے حیائی پر اتر آئے۔ میں اس کا گلا گھونٹ کر مار ڈالوں گا''۔
''بکواس مت کرو۔ اپنے بدن میں آگ لگتی ہے تو جلن کا احساس ہوتا ہے۔ تمہارے پاس ذرا بھی عقل ہے تو سمجھ داری سے کام لو۔ ابھی اس گھر میں آگ نہیں لگی ہے۔ مجھے اپنی بیٹی پر پورا اعتماد ہے۔ وہ میرے سامنے کبھی جھوٹ نہیں بولتی۔ میں نے اس سے معلوم کیا ہے وہ دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔ احسن اس کی تعریف کر رہا تھا''۔
''کیا وہ میری بہن کی تعریف کر رہا تھا۔ میں اس کی زبان کھینچ لوں گا''۔
''بے وقوف کہیں کے، زبان کھینچنے کی بجائے تم اسے یہاں کھینچ کر کیوں نہیں لاتے۔ میری عقل سے کام کرو۔ وہ یہاں ایک بار آئے گا۔ ہمارے یہاں ایک وقت کا کھانا بھی کھائے گا۔ یہاں اطمینان سے بیٹھ کر صوفیہ سے

باتیں کرے گا تو شادی کے لیے فوراً راضی ہو جائے گا''۔
''کیا آپ چاہتی ہیں کہ وہ یہاں آئے اور میں اپنی بہن سے اسے باتیں کرنے کا موقع دوں؟ یہ بے غیرتی ہے''۔
''یہ مصلحت اندیشی ہے۔تم کیا جانو، کتنے ہی گھروں میں جھانک کر دیکھتی ہوں، ہر جگہ یہی ہوتا ہے۔اپنی بیٹیوں کو سات پردوں میں رکھنے والے والدین بھی حالات سے مجبور ہو کر اپنی بیٹی کو اپنے ہونے والے داماد سے مل بیٹھنے کا موقع دیتے ہیں۔گھر کی بات گھر ہی میں رہتی ہے۔باہر والوں کو پتا نہیں چلتا کہ گھر کی چار دیواری میں تھوڑی دیر کے لیے کورٹ شپ کی اجازت دی گئی ہے''۔
''مگر امی آپ یہ تو سوچئے کہ مجھے کتنی شرم آئے گی''۔
''شرم تو مجھے بھی آئے گی مگر اب میں شرمانے سے زیادہ سوچنے لگی ہوں کہ وہ تیس برس کی ہو چکی ہے۔اس کے آگے میں اور کچھ نہیں سوچ سکتی۔اگر تمہیں شرم آئے تو تم گھر میں نہ رہنا۔تھوڑی دیر کے لیے باہر چلے جانا''۔
خالد نے کوئی جواب نہیں دیا۔جھنجلاہٹ کا مظاہر کرتے ہوئے اپنے کمرے میں چلا گیا۔
دو دن میں ڈرائنگ روم کا نقشہ بدل گیا۔محدود سرمائے کے مطابق قسطوں پر نئے صوفے آگئے۔دیواریں سستے ڈسٹمپر سے گلابی گلابی ہوگئیں۔کھڑکیوں اور دروازوں پر لنڈے بازار کے پردے لٹک گئے۔ان حالات میں اکثر ہمارے گھروں کو کوٹھیوں کی طرح سجایا جاتا ہے۔تیسری شام احسن کھانے کی دعوت پر آیا تو صوفیہ کو سجا بنا کر بٹھا دیا گیا تھا۔تہذیب اور شرافت کے دائرے میں رہ کر ایسا کیا جائے تو بیٹی اور ہونے والے داماد کے لیے لائسنس کی ضرورت نہیں پڑتی۔
صوفیہ بہت گھبرا رہی تھی۔احسن بھی اپنی ہونے والی ساس کے سامنے شرما رہا تھا۔خالد ایک معقول سا بہانہ بنا کر باہر چلا گیا تھا۔
کھانے کی میز پر صوفیہ کی ماں احسن کے سامنے کھانے کی پلیٹیں بڑھاتے ہوئے اپنے اس خاندان کے گن گا رہی تھیں جو پہلے بہت اونچا تھا، اب نیچا ہو گیا تھا۔پھر اس نے پوچھا۔
''بیٹا تمہارے گھر میں کون کون ہے؟''
''کوئی نہیں ہے۔ماں باپ مر چکے ہیں۔غریبی نے رشتہ داروں سے ناطہ تڑوا دیا ہے۔صرف ایک چھوٹی بہن ہے۔سوچتا ہوں پہلے اس کی شادی کر دوں پھر اپنی فکر کروں''۔
''اے بیٹا! میرے جیتے جی تم فکر نہ کرو۔میں تمہاری بہن کے ہاتھ پیلے کروں گی۔کبھی اسے بھی یہاں لاؤ میں ذرا دیکھوں کہ میری بیٹی کیسی ہے''۔
''میں کل ہی اسے یہاں لے آؤں گا۔مگر آپ کی یہ صاحبزادی خاموش بیٹھی ہیں۔پتا نہیں کھانے سے شرما رہی ہیں یا مجھ سے شرم آ رہی ہے''۔
''بیٹا یہ تو جنم کی شرمیلی ہے۔کبھی اس نے کسی غیر کے سامنے بیٹھ کر کھانا نہیں کھایا۔میں نے اسے سمجھا دیا ہے کہ یہ تمہیں غیر نہ سمجھے۔تم خالد کے دوست ہو اس لیے میرے بیٹے جیسے ہو۔بیٹی کھاتی رہو، باتیں کرتی رہو۔اب ایسا بھی کیا شرمانا؟ دو دن سے تو احسن کی تعریفیں کر رہی تھیں''۔
صوفیہ کے ہاتھ سے نوالہ چھوٹ گیا۔ماں کیسا سفید جھوٹ بول رہی تھی۔اس کی زبان سے تعریف کا ایک لفظ بھی نہیں نکلا تھا۔اس جھوٹ پر وہ شرم سے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ماں اسے گھبراتے دیکھ کر اپنی جگہ سے اٹھ گئی

''میں ابھی آتی ہوں'' کہہ کر باورچی خانے کی طرف چلی گئی۔اس کے جاتے ہی احسن نے بڑی آہستگی سے کہا۔

''تمہارے ہاتھ بہت نازک ہیں۔لقمہ چھوٹ جاتا ہے۔کہو تو میں اپنے ہاتھوں سے کھلا دوں؟''

وہ ایک دم سے سمٹ گئی جیسے وہ حملہ کرنے آرہا ہو۔مگر وہ اپنی جگہ سمٹا بیٹھا ہوا تھا۔ماں باورچی خانے سے باہر آئی تو اس کے ہاتھوں میں سالن کا ایک بڑا پیالہ تھا۔اس نے قریب آکر کہا۔

''صوفی۔میں یہ سالن پڑوسی کو دے کر آرہی ہوں جب تک تم احسن سے باتیں کرو''۔

وہ جواب سنے بغیر آگے بڑھتی چلی گئی۔صوفیہ نے گھبرا کر آواز دینا چاہی مگر جتنی دیر میں اس نے حلق سے آواز نکالنے کی کوشش کی اتنی دیر میں ماں جا چکی تھی۔دروازہ بند ہو چکا تھا۔

''تمہاری امی بہت سمجھ دار ہیں''۔

''احسن اپنی جگہ سے اٹھ کر اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھ گیا۔صوفیہ نے ایک دم سے گھبرا کر اٹھنے کی کوشش کی تو گڑبڑا گئی۔کرسی پیچھے کی طرف الٹ گئی۔وہ بھی پیچھے کی طرف الٹ جاتی مگر احسن نے جلدی سے اٹھ کر اسے اپنے بازوؤں میں تھام لیا۔اس انداز کو تھامنا نہیں کہتے۔اس نے تو اسے اپنے بازوؤں میں جکڑ کر سینے سے لگا لیا تھا۔صوفیہ فوراً ہی سمجھ نہ سکی کہ یہ اچانک کیا ہو رہا ہے۔پہلے تو وہ سمجھی کہ گر رہی ہے پھر سمجھ میں آیا کہ سنبھل رہی ہے۔پھر خیال آیا کہ صدیوں سے دیکھے جانے والے سپنوں کا شہزادہ اسے سنبھال رہا ہے اور وہ اس کے سینے سے لگ گئی۔یہ سب خواب کی سی کیفیت تھی۔کھلی آنکھوں کے سامنے تو کبھی کسی نے ایسی جرات نہیں کی تھی اور نہ ہی خود اس میں اتنا حوصلہ تھا کہ وہ اپنے خوابوں کی تعبیر کو گلے لگاتی۔

جب تک وہ خواب کی سی حالت میں رہی وہ میٹھی میٹھی سرگوشیوں میں اسے بہلاتا رہا۔اپنے ہونٹوں سے اس کی گردن، پیشانی پر، آنکھوں اور لبوں پر اترتا رہا۔اس لڑکی پر پہلے کبھی ایسی افتاد نہیں پڑی تھی۔اجنبی سانسوں کے جھونکے نجانے اسے کہاں اڑائے لیے جا رہے تھے۔ایک دم سے اس کا سر چکرا گیا۔اچانک کوئی حادثہ پیش آجائے تو ایسا ہی ہوتا ہے۔احسن اسے دونوں بازوؤں میں اٹھا کر ڈائننگ ٹیبل کی طرف سے گھوم کر صوفے پر لے آیا۔پھر اسے نئے صوفے پر لٹا دیا۔اس کے بعد اس کے رخساروں کو پیار سے تھپک تھپک کر آوازیں دینے لگا۔

''صوفی میری جان۔کیا تم مجھ سے ڈرتی ہو؟''

اس کا سر چکرا رہا تھا۔وہ آنکھیں کھول کر آس پاس کے ماحول کو سمجھنے کی کوشش کرنے لگی مگر کچھ سمجھنے سے پہلے ہی یک بیک تاریکی چھا گئی۔شاید بجلی کا فیوز اڑ گیا تھا یا پھر پورے علاقے کی بجلی چلی گئی۔اندھیرے نے اس لڑکی کو اور زیادہ بدحواس کر دیا۔اندھیرے نے اس کی عمر کو بہت پیچھے لے جا کر پھینک دیا۔عمر کے اس اندھیرے میں وہ کچھ سمجھنے اور کچھ نہ سمجھنے کی حالت سے دوچار ہونے لگی۔نیند کی تاریکی میں خواب اتنا نہیں سمجھاتے جتنا کہ جاگتی آنکھوں کا اندھیرا آہستہ آہستہ سمجھا دیتا ہے۔

وہ بہت دیر تک اندھیرے سے الجھتی رہی، جو ظالم بھی تھا اور مہربان بھی تھا جو زخم بھی لگاتا تھا اور زخم کو چومتا بھی تھا۔اس کی پھٹی پھٹی آنکھوں کے سامنے رنگ برنگے جگنو اڑتا جا رہا تھا۔اچانک ہی شوکیس کے پاس گڑبڑ ہوئی۔ایک چھناکے سے شیشہ ٹوٹ گیا۔انہوں نے سر اٹھا کر دیکھا تو گہری تاریکی میں دو آنکھیں گھور رہی تھیں۔وہ بلا تھا۔پہلے وہ شوکیس پر آکر کودا تھا پھر اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں کہ وہ کھانے کی میز کی طرف جا رہا ہے۔احسن نے ہش کر کے اسے بھگا دیا تو وہ فوراً ہی بھاگ گیا۔

مگراس کے بھاگنے سے کیا ہوتا ہے شیشہ تو ٹوٹ چکا تھا۔احسن نے اندھیرے میں صوفیہ کوٹٹول کر دیکھا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپائے رورہی تھی۔اس نے روتی ہوئی گڑیا کو آغوش میں لے کر پوچھا۔

''کیا ہوامیری جان۔کیوں رو رہی ہو؟''

وہ سسک سسک کر کہنے لگی''میری کانچ کی گڑیا ٹوٹ گئی ہے۔اللہ میں نے کتنی مدت سے سنبھال رکھا تھا۔ کبھی کسی کو ہاتھ نہیں لگانے دیتی تھی مگراس بلے نے نہ جانے کہاں سے آکراسے توڑ دیا ہے''۔

احسن اسے پچکارنے لگا''اس میں رونے کی کیا بات ہے۔اسے تو ایک دن ٹوٹنا ہی تھا''۔

وہ اس کے بازوؤں سے نکل کر وہاں سے اٹھ گئی۔پھر اندھیرے میں ٹٹولتی ہوئی شوکیس کی طرف جانے لگی۔احسن نے اسے آواز دی۔

''کہاں ہوتم؟''

اسے جواب نہیں ملا۔وہ گہری تاریکی میں گھورتا رہا۔پھر اچانک ہی بجلی آگئی۔ڈرائنگ روم روشن ہوگیا۔وہ شوکیس کے پاس ٹوٹی ہوئی گڑیا کو ہاتھوں میں لیے بیٹھی تھی۔اس گڑیا کے باقی ٹکڑے شوکیس کے اندر بھرے ہوئے تھے۔احسن نے اس کے پاس بیٹھتے ہوئے کہا۔

''غم نہ کرو۔میں تمہیں دوسری گڑیا لاکر دے دوں گا''۔

صوفیہ نے اپنا سراس کے شانے پر رکھ دیا۔پھر بڑی آہستگی سے بولی

''مجھے گڑیا نہیں چاہیے۔مجھے......آ......آپ کی ضرورت ہے''۔

''مجھے بھی تمہاری ضرورت ہے۔جب تک ہم ایک دوسرے کے دکھ درد کو نہیں سمجھیں گے اس وقت تک ایک دوسرے کے نہیں بن سکیں گے''۔

''میں آپ کے تمام دکھ سمیٹ لوں گی''۔

''میرا ایک ہی دکھ ہے اور وہ میری بہن ہے۔جب بھی میں اپنی شادی کے لیے سوچتا ہوں تو میرا ضمیر مجھ سے کہتا ہے کہ پہلے بہن کی شادی کرو''۔

''بھائی جان بھی میرے لیے پریشان رہتے ہیں''صوفیہ نے کہا۔

''ہر غیرت مند بھائی پہلے اپنی بہن کی فکر کرتا ہے۔یہ فکر کرتے کرتے میں بوڑھا ہو رہا ہوں۔مجھے تو سب ہی رشتہ دیتے ہیں مگر میری بہن کا رشتہ کہیں سے نہیں آتا۔اب میں نے سوچ لیا ہے کہ ایسے گھر میں رشتہ کروں گا، جہاں سے ایک بہن کو اپنے گھر لاؤں گا اور اپنی بہن کو دلہن بنا کر اس کے گھر پہنچا دوں گا۔پہلے زمانے میں جب سکے رائج نہیں ہوئے تھے تو جنس سے جنس کا تبادلہ ہوتا تھا۔تہذیبی ارتقا کے اس دور میں بھی ایسی سودے بازیاں ہو رہی ہیں۔ہم اپنی بہنوں اور بیٹیوں کے مسائل اسی طرح حل کر سکتے ہیں۔میں تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنا لوں گا مگر اس سے پہلے تم اپنے بھائی کو راضی کرلو کہ وہ میری بہن کو عزت وآبرو سے یہاں لے آئے''۔

''میں......میں یہ بات بھائی جان سے کیسے کہہ سکتی ہوں؟''

''تم اپنی امی سے کہو۔تمہاری امی اپنے بیٹے کو راضی کرلیں گی''۔

اتنے میں ماں کے کھانسنے،کھنکارنے کی آواز آئی۔وہ ڈرائنگ روم میں داخل ہونے سے پہلے کھانسنے کا

الارم بجا رہی تھی۔ احسن جلدی سے اٹھ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ صوفیہ نے جلدی سے اپنا لباس درست کیا۔ پھر اپنی بکھری ہوئی زلفوں کو سمیٹ کر جوڑا باندھتی ہوئی دروازے کی طرف جانے لگی۔ ماں خود ہی دروازہ کھول کر اندر آ گئی۔ وہ مسکراتی ہوئی آئی تھی مگر بیٹی کا حلیہ دیکھ کر ٹھٹک گئی۔ بستر کی چادر درست کرنے کے باوجود شکنیں رہ جاتی ہیں۔ لباس کی شکنیں اور بے ترتیبی سے بندھے ہوئے جوڑے نے ماں کو بہت کچھ سمجھا دیا۔ وہ بوڑھی عورت اس حد تک چھوٹ نہیں دے سکتی تھی مگر وہ پڑوسن کے ہاں جا کر پھنس گئی تھی۔ اس نے پڑوسن کو یہ نہیں بتایا تھا کہ اس کے یہاں کوئی نوجوان آیا ہے۔ جب اس علاقے کی بجلی چلی گئی تو وہ اٹھ کر آنے لگی مگر پڑوسن نے ہاتھ پکڑ کر بٹھاتے ہوئے کہا۔

"گھبراتی کیوں ہو۔ صوفیہ نڈر لڑکی ہے۔ بجلی گئی ہے لالٹین جلا لے گی۔ ہاں تو میں کہہ رہی تھی میری بیٹی کی شادی......"

پڑوسن نے اپنی بیٹی کا ذکر چھیڑ کر اسے الجھا دیا۔ وہ اپنی پڑوسن سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ اپنی صوفی کو ایک نوجوان کے پاس چھوڑ کر آئی ہے اور اب اندھیرا ہو گیا ہے اور اگر نوجوان سے بات نہ بنی تو یہ اندھیرا ہمیشہ کے لیے صوفی کی بوڑھی جوانی پر چھا جائے گا۔

آہ! بہت دیر ہو چکی تھی۔ بوڑھی ماں اسے کچھ نہ کہہ سکی، سر جھکا کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ جب دوبارہ واپس آئی تو احسن جا چکا تھا۔ بیٹی صوفے پر سر جھکائے نڈھال نڈھال سی بیٹھی ہوئی تھی۔ جوڑا کھل کر بکھر گیا تھا۔ ماں اچانک ہی فرش پر بیٹھ کر رونے لگی۔

"ہائے یہ تو نے کیا کیا؟ بے وقوف لڑکی۔ اگر احسن واپس نہ آیا تو کیا ہو گا؟"

صوفیہ صوفے کی پشت کی طرف گھوم گئی۔ پھر اپنے بازو میں منہ چھپاتی ہوئی بولی۔

"وہ ایسے نہیں ہیں۔ وہ بہت اچھے ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ کل اپنی بہن کو لے کر آئیں گے"۔

ماں کو ذرا اطمینان ہوا کیونکہ احسن پہلے بھی اپنی بہن کو لانے کی بات کہہ چکا تھا۔ اس نے پوچھا "احسن اور کچھ کہہ رہا تھا؟"

"ہاں وہ کہہ رہے تھے کہ بھائی جان ان کی بہن سے شادی کر لیں وہ بھی مم......مجھ سے......"

"اچھا اچھا میں سمجھ گئی۔ یہ اس کی شرط ہے۔ جب وہ اپنی بہن کی بات چھیڑ رہا تھا اسی وقت میں سمجھ گئی تھی مگر تم بہت نادان ہو۔ تمہاری نادانی کی وجہ سے ہمیں یہ شرط ماننا پڑے گی"۔

صوفیہ چپ چاپ اٹھ کر اپنی ماں کے کمرے میں چلی گئی۔ ماں فرش پر اٹھ کر میز پر سے جھوٹے برتن اٹھانے لگی۔ کیسی جھوٹی زندگی ہے یہ؟ اور یہ کیسے جھوٹے لوگ ہوتے ہیں، معصوم کنواریوں کو جھوٹے برتن کی طرح چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ کیا وہ واپس آئے گا؟ یہ سوچ سوچ کر بوڑھی ماں کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔

خالد اپنے دستور کے مطابق آدھی رات کے بعد واپس آیا تو وہ اپنے بیٹے کے انتظار میں جاگ رہی تھی۔

"کیا ہوا امی۔ احسن سے کچھ بات بنی؟"

"وہ تو بات بنا گیا ہے۔ اگر تم چاہو تو فوراً ہی تمہاری بہن کے ہاتھ پیلے ہو سکتے ہیں"۔

"میرے چاہنے سے کیا ہوتا ہے؟ میری محدود آمدنی ہے اسی آمدنی سے کچھ بچا کر اسے دلہن بنایا جا سکتا ہے"۔

"بیٹے ہم جیسوں کے یہاں دولت اور جہیز کے بل پر شادی نہیں ہوتی۔ چیز سے چیز کا تبادلہ ہوتا ہے۔ تم

احسن کی بہن سے شادی کرلو، تمہاری بہن بھی سہاگن بن جائے گی۔
کل وہ اپنی بہن کو لے کر یہاں آئے گا۔ تم اسے دیکھ لینا''۔
''اگر وہ پسند نہ آئی تو؟''
''یہاں لڑکی پسند کرنے کا سوال نہیں ہے۔ اپنے اپنے بہنوئی پسند کرنے کی بات ہے۔ وہ اپنی بہن کے لیے تمہیں پسند کر چکا ہے۔ تم اپنی بہن کے لیے اسے پسند کرلو۔ اپنے دماغ سے یہ احمقانہ خیال نکال دو کہ تمہاری زندگی میں فلموں جیسی کوئی دولت مند ہیروئن آئے گی۔ خواب کچھ ہوتے ہیں زندگی کچھ اور ہوتی ہے بیٹے''۔
خالد ماں کے پاس سے اٹھ کر چپ چاپ اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس رات صوفیہ اپنی ماں کے کمرے میں سوتی رہی اور جاگتی رہی۔ ماں نے اسے بتا دیا تھا کہ خالد اپنی شادی کی بات سن کر خاموش ہوگیا ہے۔ صرف اس کے دماغ میں ایک الجھن ہے وہ یہ کہ لڑکی اسے پسند آئے گی یا نہیں؟ صوفیہ ہر کروٹ پر دعا مانگ رہی تھی کہ جس طرح احسن نے اسے پسند کیا ہے اسی طرح خالد بھی اس کی بہن کو پسند کرلے۔
دعا مانگتے مانگتے صبح ہوگئی۔ اس روز خالد ڈیوٹی پر نہیں گیا۔ شاید وہ احسن کا سامنا نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس سے باتیں کرنے سے پہلے اس کی بہن کو دیکھنا چاہتا تھا۔ وقت گزرتے کتنی دیر لگتی ہے۔ شام کو احسن اپنی بہن کو لے کر ان کے دروازے پر آگیا۔ ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا تو صوفیہ اور خالد کی آنکھیں بھی کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ احسن کے ساتھ اس کی بہن زبیدہ کھڑی ہوئی تھی اور وہ اپنے دوپٹے کو اپنے چہرے پر کھینچ کر ایک آنکھ کو چھپانے کی ناکام کوشش کررہی تھی۔ خالد کے دل میں آیا کہ وہ اسی وقت چیخ چیخ کر کہنا شروع کردے۔ نہیں میں اس سے شادی نہیں کروں گا۔ میرے خوبصورت فلمی خوابوں کا اس طرح مذاق نہ اڑاؤ''۔
مگر وہ کچھ نہ کہہ سکا۔ اس کی اپنی بہن لنگڑاتی ہوئی اس کے پاس آکر کھڑی ہوگئی تھی۔ احسن نے اپنی بہن کا ہاتھ پکڑ کر اسے اندر لاتے ہوئے کہا۔
''یہ میری بہن زبیدہ ہے۔ یہاں اس مکان کے سامنے آکر یہ اک دم سے گھبرا گئی تھی اور اندر آنے سے انکار کررہی تھی۔ میں نے ڈانٹ ڈپٹ کر پوچھا تو اس نے بتایا کہ یہ یہاں پہلے بھی آچکی ہے۔ تعجب ہے آپ لوگوں نے مجھ سے یہ بات کیوں چھپائی؟''
بوڑھی ماں نے زبیدہ کو یہاں آتے نہیں دیکھا تھا۔ اس نے پہلے بیٹے کو سوالیہ نظروں سے دیکھا اس کے بعد صوفیہ کو دیکھا تو وہ جھجکتی ہوئی بولی۔
''امی یہ وہی ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا نا۔ یہ بھائی جان کے ساتھ یہاں آئی تھیں''۔
یہ سنتے ہی احسن نے چونک کر پوچھا۔
''زبیدہ تم...... تم خالد کے ساتھ یہاں آئی تھیں؟'' پھر اس نے خالد کو دیکھتے ہوئے پوچھا ''کیوں آئی تھی؟ تم کب سے میری بہن کو جانتے ہو؟ تم کس رشتے سے اسے یہاں لائے تھے؟''
خالد نے کہا ''احسن تم جارحانہ انداز سے سوالات نہ کرو۔ تمہاری بہن اپنی مرضی سے میرے ساتھ آئی تھی''۔
زبیدہ نے چونک کر سر اٹھایا اور شکایت بھری نظروں سے خالد کو دیکھنے لگی۔ وہ زبان سے تو کچھ نہ کہہ سکی مگر اس کی نظریں کہہ رہی تھیں ''خالد مجھ اکیلی کو الزام نہ دو۔ یہاں آنے میں صرف میری مرضی نہیں، ہم دونوں کی مرضی

تھی۔اگر ہم نے کوئی جرم یا گناہ کیا ہے تو ہم دونوں مجرم یا گناہگار ہیں''۔

احسن نے کہا'' خالد! تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔تم دونوں ہی اس بات کے جواب دہ ہو۔زبیدہ میری بہن ہے۔میں اس سے سوال جواب کروں گا مگر تمہاری ماں کا فرض ہے کہ وہ تمہارا محاسبہ کرے''۔

ماں نے دونوں کے درمیان آکر کہا۔''میں سمجھ گئی۔تم دونوں بات نہ بڑھاؤ۔جو ہو چکا ہے اس پر مٹی ڈالو۔میں زبیدہ کو اپنی بہو بناؤں گی''۔

زبیدہ نے شرما کر منہ پھیر لیا۔خالد نے پریشان ہو کر کہا۔

''امی! میں اپنی شادی کا فیصلہ آپ کروں گا''۔

''تو پھر جلدی فیصلہ کر'' ماں نے کہا۔

''آپ ذرا صبر سے کام لیں۔پہلے میں احسن سے تنہائی میں باتیں کرنا چاہتا ہوں''۔

احسن نے کہا''میں تیار ہوں۔باتیں کرنے کے لیے یہ گھر مناسب ہوگا یا ہم باہر چلیں؟''

ماں نے سمجھایا۔''گھر کی بات گھر ہی میں ہونی چاہیے۔میں صوفی اور زبیدہ کو لے کر پڑوسن کے ہاں آدھ گھنٹے کے لیے چلی جاتی ہوں اتنی دیر میں تم آپس میں سمجھوتا کرلو۔آؤ لڑکیو! میرے ساتھ چلو''۔

وہ صوفیہ اور زبیدہ کو لے کر ڈرائنگ روم سے باہر چلی گئی۔ان کے جاتے ہی خالد نے آگے بڑھ کر دروازے کو بند کر دیا مگر چٹخنی نہیں چڑھائی۔پھر وہاں سے پلٹ کر آتے ہوئے بولا۔

''احسن! شادی بیاہ بچوں کا کھیل نہیں ہے۔شادی کے بعد مرد ہمیشہ کے لیے ایک عورت کے ساتھ بندھ جاتا ہے لہٰذا خوب سوچ سمجھ کر کسی کو اپنا بنانا چاہیے۔پہلے تم یہ بتاؤ کہ تم نے صوفیہ کو کس حد تک شریک حیات کے قابل سمجھا ہے''۔

احسن نے جواب دیا''اگر وہ شریک حیات بننے کے قابل نہ ہوتی تو آج میں رشتہ مانگنے نہ آتا''۔

''تم رشتہ مانگنے نہیں۔سودے بازی کے لیے آئے ہو''۔

''یہ بھی درست ہے لیکن سودے بازی کے لیے بھی پہلے یہ ضروری ہے کہ سودا پسند آجائے۔لہٰذا میں نے پہلے صوفی کو پسند کیا ہے اس کے بعد حالات سے مجبور ہو کر تبادلے کا سودا کر رہا ہوں۔اب تم بتاؤ۔کیا زبیدہ کو اپنی شریک حیات نہیں بناؤ گے؟''

''میں اسے اپنی بیوی بناؤں گا جس کا چال چلن اچھا ہوگا۔تمہاری بہن ہر روز گھر سے باہر فیکٹری میں کام کرنے جاتی ہے۔آج سے چار دن پہلے وہ میرے ساتھ یہاں آئی تھی۔اس سے پہلے وہ نہ جانے کتنوں کے ساتھ......''

بات مکمل ہونے سے پہلے ہی احسن نے اس کے منہ پر ایک الٹا ہاتھ رسید کرتے ہوئے کہا۔

''بس۔اس سے آگے میری بہن کو گالی نہ دینا۔ہم مردوں کی یہ پرانی عادت ہے کہ جب کسی لڑکی کو بدنام اور ذلیل کرتے ہیں تو یہ بھول جاتے ہیں کہ خود بھی اس کے ساتھ ذلت کی پستیوں میں گر چکے ہیں''۔

خالد نے جواباً ایک گھونسا اس کے منہ پر جماتے ہوئے کہا۔

''مرد ہر حال میں شریف کہلاتا ہے۔عورت ایک ذرا سی لغزش کے بعد فاحشہ کہلاتی ہے۔ہر شخص ایک کھرا اور چمکتا ہوا سکہ چاہتا ہے اور تمہاری بہن ایک کھوٹا سکہ ہے''۔

وہ بہن کی توہین برداشت نہ کرسکا۔اس نے اچھل کر خالد کے سینے پر ایک لات ماری۔خالد لڑکھڑاتا ہوا

پیچھے صوفہ پر جا گرا۔ پھر صوفہ کے ساتھ دوسری طرف الٹ گیا۔ احسن چھلانگ لگا کر اس پر آیا اور اسے اپنے نیچے دبوچ کر اس کے منہ پر گھونسا مارتے ہوئے کہا۔

''بے وقوف تیری بہن بھی ایک کھوٹا سکہ بن گئی ہے''۔

''تو جھوٹ بولتا ہے اپنی بہن کی بے حیائی چھپانے کے لیے میری بہن پر کیچڑ اچھال رہا ہے''۔

''یہ کہتے ہی اس نے احسن کو اپنے اوپر سے اچھال دیا۔ وہ الٹ کر فرش پر آیا تو خالد نے اس پر سوار ہوتے ہی تابڑ توڑ گھونسے مارنے کے بعد کہا۔

''میں تجھے اچھی طرح سمجھ گیا ہوں میں تیری بہن سے شادی نہیں کرنا چاہتا اس لیے اب تو باہر جا کر میری بہن کو بدنام کرے گا مگر میں تجھے یہاں سے زندہ نہیں جانے دوں گا''۔

اس نے جھک کر احسن کی گردن دبوچ لی۔ احسن کے ہاتھوں میں بھی اس کی گردن آ گئی۔ دونوں زور لگانے لگے۔ دونوں شہ زور تھے کوئی کسی سے کم نہیں تھا۔ کبھی احسن غالب آ کر اسے گرا دیتا تھا کبھی وہ احسن کو زیر کر دیتا تھا۔ ماں نے فیصلہ کرنے کے لیے آدھ گھنٹے کا وقت دیا تھا اور فیصلہ بازوؤں کی قوت سے ہو رہا تھا۔ دونوں کے منہ اور ناک سے خون رسنے لگا۔ آنکھیں وحشیوں کی طرح ابلی پڑ رہی تھیں اور کپڑے تار تار ہو رہے تھے۔

پندرہ منٹ کی لڑائی میں وہ دونوں نڈھال ہو کر لڑکھڑانے لگے۔ وہ اپنے پیروں پر کھڑے تھے مگر اب ایک دوسرے پر حملہ کرنے کی سکت نہیں رہی تھی۔ اب صرف زبان چل رہی تھی۔ احسن نے اس کی طرف انگلی اٹھا کر کہا۔

''تم سمجھتے ہو کہ گھر سے باہر جا کر ملازمت کرنے والی لڑکیاں بدچلن ہوتی ہیں۔ میں کہتا ہوں کہ گھر اور باہر سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جہاں ہمارے قدم پہنچتے ہیں وہاں لڑکیوں کی پارسائی خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ تم نے اپنی صوفیہ کو برسوں سے اس گھر کی چار دیواری میں شیشے کی گڑیا کی طرح سنبھال کر رکھا تھا مگر میرے قدم یہاں پہنچ گئے۔ دیکھ لو وہ شوکیس خالی ہے۔ کانچ کی گڑیا ٹوٹ چکی ہے''۔

خالد نے غصے سے کہا ''لفاظی نہ کرو۔ اگر تم سچے ہو تو ثبوت پیش کرو''۔

''میں گواہ پیش کر سکتا ہوں اور وہ گواہ تمہاری ماں ہے۔ وہ صوفی کو میرے پاس چھوڑ کر پڑوسن کے ہاں گئی تو اچانک بجلی فیل ہو گئی اور ہم بیس منٹ کے اندھیرے میں ایک دوسرے کے قریب ہو گئے''۔

خالد نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا پھر ہونٹوں کو سختی سے بھینچ لیا۔ احسن نے کہا۔

''اگر تم ڈھٹائی سے انکار کرنا چاہو تو کر سکتے ہو مگر حقیقت نہیں بدلے گی۔ ہم خیبر شکن نہیں، شیشہ شکن ہیں۔ عزت کے شیشوں کو توڑتے ہیں معاشرے کے ایک گوشے میں ہم کسی کی بہن کو ورغلا کر لے جاتے ہیں تو دوسرے گوشے میں کوئی ہماری بہن کو لے جاتا ہے۔ ارے اب تو اس شرمناک سچائی کو تسلیم کر لو''۔

خالد ڈگمگاتے ہوئے قدموں سے شوکیس کے پاس گیا اور لڑکھڑا کر گر پڑا اور شوکیس سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ احسن بھی قریب آ کر شوکیس کا سہارا لیتے ہوئے فرش پر دو زانو ہو گیا۔ اس کے بعد کہنے لگا۔

''تھک کر گر جانے سے بات نہیں بنے گی۔ اگر تم سچائی سے انکار کرو گے تو ہم دونوں کی بہنیں اپنے اپنے گھروں میں بیٹھی رہ جائیں گی۔ اندھیرا اور بڑھے گا، برائی اور پھیلے گی۔ ہم برائی کو ختم نہیں کر سکتے مگر اسے اپنی حد تک روک سکتے ہیں۔ ہم نے جن شیشوں کو توڑا ہے، انہیں اپنے طور پر جوڑ سکتے ہیں۔ ان کی مسیحائی کر سکتے ہیں''۔

خالد نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''ہاں۔ایک بار صوفی نے کہا تھا کہ دل ہو یا کانچ کی گڑیا، انہیں توڑنے کی بجائے سنبھال کر رکھنے کا نام زندگی ہے''۔

اسی وقت ڈرائنگ روم کا دروازہ کھلا۔ بوڑھی ماں، صوفیہ اور زبیدہ کمرے میں داخل ہوتے ہی گھبرا گئیں۔ صوفے الٹے ہوئے تھے۔ان کے پیچھے دور شوکیس کے پاس خالد اور احسن کے چہرے اپنے اپنے لہو میں بھیگ رہے تھے۔ان کے لباس تار تار ہو چکے تھے اور وہ بالکل ہی پاگل نظر آ رہے تھے۔ پھر وہ دونوں ہی پاگلوں کی طرح قہقہے لگانے لگے۔ماں نے قریب آ کر پریشانی سے پوچھا۔

''ارے کیا ہو گیا تم لوگوں کو؟ یہ کیا حالت بنا رکھی ہے؟''

صوفیہ دوڑتی ہوئی احسن کے پاس گئی۔زبیدہ خالد کے پاس پہنچ کر اپنے دوپٹے سے اس کے چہرے کے لہو کو پونچھنے لگی۔وہ دونوں تھوڑی دیر تک قہقہوں کے شور میں اپنی ندامت کو چھپاتے رہے پھر احسن نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ خالد نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارتے ہوئے کہا۔

''فیصلہ ہو گیا۔ہم ٹوٹے ہوئے دلوں اور ٹوٹے ہوئے شیشوں کے مسیحا بنیں گے۔اے فن شیشہ گری ہمیں آداب زندگی سکھا دے......''

جزیرے کی چاندنی

محبت کی ایک ایسی دردناک کہانی
جسے آپ آنکھوں سے نہیں
زبانوں سے نہیں، صرف دل
کی دھڑکنوں سے پڑھیں گے۔

جب پورے چاند کی رات ہوتی ہے اور دودھیا چاندنی میں بھیگی ہوئی سمندر کی لہریں ساحلی چٹانوں سے ٹکرانے لگتی ہیں تو بستی کے لوگ حیرانی اور عقیدت سے اس ننھے جزیرے کی جانب دیکھنے لگتے ہیں، جہاں دو بھٹکی ہوئی روحیں آج بھی آکر ملتی ہیں اور دیکھنے والوں کی نگاہوں کے سامنے کبھی یقین کی طرح مستحکم اور کبھی گمان کی طرح مبہم مبہم سی جھلکتی جھلملاتی رہتی ہیں۔

کوئی بانکا جوان ماہی گیر ہاتھ اٹھا کر انگلی کے اشارے سے کہتا ہے۔

''وہ دیکھو تراب نظر آ رہا ہے۔ وہ چٹان پر بیٹھا ہوا ہے۔ میں یقین سے کہتا ہوں کہ وہ تراب ہے''۔

کوئی البیلی مچھیرن اپنے دھڑکتے ہوئے دل پر ہاتھ رکھ کر کہتی ہے۔

''ہاں میں بھی دیکھ رہی ہوں۔ رجو اس کے شانے پر سر ٹیکے بیٹھی ہوئی ہے، اس کی کھلی ہوئی زلفیں ہوا میں لہرا رہی ہیں۔ وہ ایک دوسرے کو محویت سے دیکھ رہے ہیں اور چاندنی آہستہ آہستہ ان کی آنکھوں میں اتر رہی ہے......''

''یہ جھوٹ ہے'' منگو چیختا ہے۔ اس لیے چیختا ہے کہ رجو اس کے ہاتھ سے ایسے نکل گئی ہے جیسے اناڑی مچھیرے کے ہاتھ سے مچھلی تڑپ کر نکل جاتی ہے۔ سب اسے پاگل سمجھتے ہیں اور وہ سچ مچ پاگلوں کی طرح چیختا ہے۔

''تم سب جھوٹے ہو۔ رجو کا نام لے کر مجھے جلاتے ہو۔ ستاتے ہو۔ میں جانتا ہوں وہ مر چکی ہے۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے اس چٹان سے اس نے چھلانگ لگائی تھی میری آنکھوں کے سامنے ڈوب گئی تھی۔ وہ مر چکی ہے۔ چلے جاؤ یہاں سے بھاگ جاؤ''۔

وہ ساحلی ریت پر لڑکھڑاتے ہوئے دوڑتا ہے۔ انہیں مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے۔ سب اس سے کترا جاتے ہیں۔ وہ پاگل ہے، پاگل کے منہ کون لگتا ہے۔ وہ آپ ہی دوڑتا ہے اور آپ ہی گرتا ہے۔ ریت میں دھنستا جاتا ہے اور اٹھتا جاتا ہے پھر بھوکھلا کر ادھر ادھر دیکھتا ہے جب کچھ سمجھ میں نہیں آتا تو سیپیاں اور گھونگھے اٹھا اٹھا کر ننھے

جزیرے کی طرف یوں پھینکتا ہے جیسے رجو اور تراب کو نشانہ بنا رہا ہو یا چاند پر خاک اڑا رہا ہو، کسی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ وہیں تھک ہار کر اوندھے منہ گر پڑتا ہے۔

وہ ننھا جزیرہ ساحل سے دور ہے۔ دراصل وہ جزیرہ نہیں ہے سوگز کے رقبے میں پھیلی ہوئی ایک چٹان ہے جو سمندر کی ہتھیلی پر ابھر آئی ہے۔ جب سمندر شانت ہوتا ہے اور لہریں پرسکون رہتی ہیں تو چاندنی راتوں میں مچھیرے اپنی کشتیاں سمندر میں ڈال دیتے ہیں اور اپنی عورتوں اور بچوں کے ساتھ وہاں جاکر زندگی کی کچھ خوشیاں چرا لیتے ہیں، ایک دوسرے کے ساتھ ہنستے بولتے ہیں اور سمندر اور انسان کے صدیوں پرانے رشتوں کے لوک گیت گاتے ہیں۔

ایسا اکثر نہیں ہوتا لیکن کبھی کبھی جوار بھاٹا کے وقت لہریں غضب ناک ہو جاتی ہیں۔ سینکڑوں فٹ کی بلندی تک اڑتی اور بھرتی ہوئی آتی ہیں اور اس چٹانی جزیرے کو تھوڑی دیر کے لیے نگل جاتی ہیں۔

ملاح اور مچھیرے سمندر کے مزاج کو سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ کب جوار بھاٹا کی تیزی اس جزیرے کو لے ڈوبتی ہے اور کب لہریں شانت ہو کر انہیں خوشیاں منانے کے لیے جزیرے میں آنے کی اجازت دیتی ہیں۔

اس وقت بھی سب کے دل دھڑک رہے ہیں۔ لہریں رفتہ رفتہ بلند ہو رہی ہیں اور چٹانی جزیرے کی اونچائی کو چھو رہی ہیں۔ رجو جوں کی توں اپنے تراب کے شانے پر سر ٹیکے بیٹھی ہے۔ سمندر غرا رہا ہے، تراب اپنی رجو کی آنکھوں میں جھانک رہا ہے اور چاندنی لرز رہی ہے۔

چٹان پر رکھی ہوئی کشتی ایک بپھری ہوئی لہر کی زد میں آکر الٹ گئی ہے اور وہ لہر دو محبت کرنے والوں کو جھنجوڑتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی ہے۔

پگلی رجو، آجا واپس آجا۔ اب کوئی تیرے پیار کے راستے کا پتھر نہیں بنے گا۔ تراب تو بچپن سے سمندر کے مزاج کو سمجھتا ہے۔ ضد نہ کر، اپنی محبت کو لے کر آجا۔ اب یہ دنیا والے تجھے کچھ نہیں کہیں گے۔

مگر وہ دونوں خاموش ہیں اور سمندر بول رہا ہے۔ گرج گرج کر بول رہا ہے۔

لہروں کے دوسرے ریلے میں کشتی کے پرخچے اڑ گئے ہیں۔

لہریں اونچی اور اونچی ہو رہی ہیں اور ان کے سروں پر بکھر رہی ہیں۔ پانی کے چھینٹوں اور شفاف بوندوں کی جھالروں میں ان کا وجود جھلمل جھلمل کر رہا ہے۔ چاندنی میں جھلک رہا ہے اور لہروں میں چھپ رہا ہے۔

لہریں بلند ہو گئی ہیں۔ اتنی بلند ہو گئی ہیں کہ وہ چٹانی جزیرہ کسی اژدھے کے منہ میں چلا گیا ہے۔ اب کچھ نظر نہیں آرہا ہے۔ دیکھنے والوں کی سانسیں چند ساعت کے لیے رک گئی ہیں۔

لہریں واپس جا رہی ہیں۔ اب جزیرہ بھکاری کی پھیلی ہوئی ہتھیلی کی طرح خالی ہے۔ چاند چمک رہا ہے، چاندنی ویران جزیرے پر بھٹک رہی ہے انہیں تلاش کر رہی ہے۔ کہاں ہو تم دونوں؟

چاند کے نیچے چاندنی اور سمندر کی تہ میں محبت ہے۔

دیکھنے والوں کے سر جھک گئے ہیں۔ اب وہ آہستہ آہستہ بوجھل قدموں سے واپس جا رہے ہیں۔ ان کی آنکھوں میں خواب ہیں اور دلوں میں یقین ہے کہ اگلے ماہ جب چودھویں کا چاند کھلے گا تو تراب اپنی رجو کے ساتھ کشتی میں بیٹھ کر پھر اس جزیرے میں ضرور آئے گا۔

سمندر! تو انسانوں کو بہا کر لے جا سکتا ہے لیکن محبت کو کبھی ڈبو نہیں سکتا۔

اگلے ماہ......ہاں اگلے ماہ......

O☆O

بچے عام طور سے پہلے اماں اور ابا بولنا سیکھتے ہیں لیکن رجو کی زبان پر پہلے چچا اور چچی کا نام آیا کیونکہ جب اس نے آنکھ کھولی تو ماں باپ مر چکے تھے اور زبان کھولی تو پکارنے کے لیے صرف چچا اور چچی ہی رہ گئے تھے۔ بستی کے دوسرے لوگوں کی طرح اس کا چچا بھی غریب تھا۔ غریب اس لیے بھی تھا کہ محنت سے جی چراتا تھا۔ رات کو افیون کی پنک میں رہتا تھا اور صبح دیر تک سوتا رہتا تھا، دوسرے مچھیرے آدھی رات کو کشتیاں لے کر سمندر میں جال ڈالنے کے لیے نکل جاتے تھے۔ صبح ہوتے ہی وہ مچھلیوں سے بھری ہوئی کشتیاں لے کر واپس آجاتے تو ساحل پر اچھا خاصا میلہ لگ جاتا تھا۔ شہر سے آنے والے مچھلیوں کے آڑھتی بڑے بڑے ٹرکوں میں آتے تھے۔ مچھلیوں کا سودا ہونے انہیں تولنے اور ٹرکوں میں لادنے کے دوران بڑ گہما گہمی رہتی تھی۔ پان، سگریٹ، چائے اور شربت وغیرہ کی عارضی دکانیں کھل جاتی تھیں۔ شہر کے لوگ کھرے دام دے کر چیزیں خریدتے اور مزدوروں کو معقول اجرتیں دیا کرتے تھے۔ رجو کی چچی بھی دوسری عورتوں کے ساتھ مزدوری کرتی تھی، کشتیوں کا مال اٹھا کر ٹرکوں پر لادا کرتی تھی۔

اس کا چچا جب سو کر اٹھتا اور اپنی جھگی سے باہر آتا تو اس وقت ساحل ویران ہو جاتا تھا۔ ریت پر گاڑیوں کے پہیوں کے مٹے مٹے نشان رہ جاتے تھے۔ دور مچھیروں کے بچے سمندر کی لہروں سے کھیلتے رہتے۔ کسی جگہ رجو لڑکے اور لڑکیوں کے ساتھ بیٹھی ریت کے گھروندے بناتی رہتی اور جھگی کے باہر اس کی چچی مچھلیوں میں نمک بھر کر انہیں دھوپ میں سکھایا کرتی تھی۔ روز کا یہی معمول تھا۔ اس کی چچی محنت کرتی تھی اور چچا بیٹھ کر کھاتا تھا۔

رجو کا ایک چچازاد بھائی تھا۔ وہ بڑی منتوں اور مرادوں کے بعد پیدا ہوا تھا، اس کی چچی کا عقیدہ تھا کہ اگر حضرت لال شہباز قلندر اس کی نہ سنتے تو بیٹا کبھی پیدا نہ ہوتا چونکہ وہ منتوں سے مانگا ہوا تھا اس لیے اسے منگو کے نام سے پکارا جاتا تھا۔

رجو سے اس کی کبھی نہ بنتی تھی وہ نفرت سے کہتی تھی۔

''منگو مانگنے والے کو کہتے ہیں تو بھیک منگا ہے''۔

وہ اس کی چوٹی کھینچ کر کہتا۔

''بھیک منگی تو ہے جو میرے گھر میں رہتی ہے اور میرے گھر میں کھاتی ہے''۔

وہ بچپن ہی سے بڑی حساس تھی کبھی چچی جھڑکتی اور چچا اسے مارتا تو اسے اپنی بدنصیبی اور تنہائی کا احساس ہونے لگتا تھا۔ منگو ان کا بیٹا تھا اس لیے اس کی ہر شرارت قابل معافی تھی، وہ کسی کی بیٹی نہیں تھی اس لیے سب ہی اس پر اپنا غصہ اتارتے تھے۔ ایسے وقت وہ منہ لٹکائے تراب کے پاس آکر بیٹھ جاتی تھی اور اسے اپنا دکھڑا سنانے لگتی تھی۔

''جب میں چچی کی طرح بڑی ہو جاؤں گی تو میں بھی مزدوری کروں گی۔ اپنا کھانا خود پکاؤں گی۔ ان کی ہانڈی میں جھانکنے تک نہیں جاؤں گی۔ اونہہ! ذرا سا کھلاتے ہیں اور دنیا بھر کی باتیں سناتے ہیں''۔

''تم ایک دبلی پتلی کمزور لڑکی ہو، تم سے مزدوری نہیں ہوگی۔ جب میں اپنے باپ کی طرح بڑا ہو جاؤں گا تو سمندر میں مچھلیاں پکڑنے جاؤں گا پھر وہ مچھلیاں بیچ کر اپنے سارے پیسے لا کر تمہیں دوں گا۔ تم میرے لیے کھانا پکاؤ گی؟''

''ہاں پکاؤں گی''۔

''میرے گھر میں رہو گی؟''

''ہاں رہوں گی۔ تم میرے چچا اور چچی کی طرح مجھے مارو گے نہیں؟''

''کبھی نہیں۔ کیا میں نے آج تک تم سے کبھی لڑائی کی ہے؟''

''نہیں۔ تم بہت اچھے ہو''۔

وہ سب بچپن کی باتیں تھیں۔ دس برس کی رجو نہیں جانتی تھی کہ ان باتوں کے پیچھے پیار کی کتنی مٹھاس ہے۔ وہ محض چچا اور چچی کے ظلم سے اور اپنی یتیمی کے دکھ سے نجات حاصل کرنا چاہتی تھی۔ ایسے وقت تراب ہی اس کو ایک ہمدرد اور مہربان نظر آتا تھا۔ تراب کی یہ ہمدردی اور اس سے بڑھتا ہوا میل جول منگو کو برا لگتا تھا۔ وہ اپنی ماں سے شکایتیں کرتا تھا کہ رجو اس کے ساتھ نہیں کھیلتی اور ہمیشہ اس سے لڑتی جھگڑتی رہتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بچپن ہی سے اس پر سختی ہونے لگی کہ وہ تراب کی جھگی کی طرف نہ جایا کرے اگر تراب کھیلنے کے لیے آئے تو اسے منگو کو بھی اس کھیل میں شریک کرنا چاہیے۔

تراب پندرہ برس کا ہوا تو اپنے باپ کے ساتھ سمندر میں جانے لگا۔ رجو تیرہ برس کی ہوگئی تھی دوسری لڑکیوں کی طرح وہ بھی ہلکی پھلکی مزدوری کرنے لگی تھی۔ تراب سمندر سے واپس آتا تو وہ اس کی کشتی سے ٹوکری میں مچھلیاں بھر کر ٹرک میں لادنے کا کام کرتی۔ اور اس کے ساتھ مل جل کر جال کو دھوپ میں پھیلاتی، جال کی کوئی ڈور کمزور ہو جاتی تو اسے درست کرنے بیٹھ جاتی۔ تراب کا باپ اسے دوسروں سے زیادہ پیسے اور زیادہ مچھلیاں دیا کرتا تھا۔ آمدنی بڑھتے دیکھ کر چچی اس سے محبت سے پیش آنے لگی۔ کچھ ہی دنوں میں کایا پلٹ گئی۔ اب وہ منگو کو باتیں سنایا کرتی تھی کہ وہ باپ کی طرح نکھٹو ہے۔ صبح مزدوری کرنے کی بجائے ٹرک والوں سے باتیں کرتا ہے اور ان سے سگریٹ مانگ کر پیتا ہے۔

منگو کو ماہی گیری کے پیشہ سے نفرت تھی۔ سمندر کی غضب ناک لہروں سے کھیلنا، تمام رات چپو چلاتے رہنا اور مچھلیوں کی بساند میں زندگی گزارنا اسے بالکل پسند نہیں تھا۔ وہ بڑا آدمی بننا چاہتا تھا، وہاں آنے والے شہریوں کی طرح اچھے اچھے کپڑے اور جوتے پہننا چاہتا تھا۔ یہی سپنے دیکھتے دیکھتے ایک روز وہ بستی سے چپ چاپ چلا گیا۔ ماں نے سمجھا کہ بیٹا اس کی جلی کٹی باتیں سن کر کہیں دور نکل گیا ہے۔ شام تک بھوک لگے گی تو آپ ہی واپس آجائے گا۔ شام ہوگئی۔ رات گزر گئی۔ دوسرے دن بھی بیٹے کی صورت نظر نہ آئی تو اس نے رونا پیٹنا شروع کر دیا۔ بستی والے بھی حیران تھے کہ وہ اچانک کہاں غائب ہوگیا ہے؟ تیسری صبح ایک ٹرک ڈرائیور نے اسے بتایا کہ منگو اس کے ساتھ اس وعدے پر کراچی گیا تھا کہ دوسرے دن پھر اسی ٹرک میں واپس آجائے گا مگر کراچی پہنچ کر وہ ٹرک ڈرائیور سے کچھ کہے سنے بغیر کہیں چلا گیا اور جاتے جاتے ڈرائیونگ سیٹ کے نیچے سے اس کے جمع کیے ہوئے پچاس روپے چرا کر لے گیا ہے۔ اس کی ماں نے چھاتی پیٹ کر رونا شروع کر دیا۔

میرے بچے کو کہیں سے ڈھونڈ کر لاؤ، میں ہر ماہ تمہیں دس روپے دے کر تمہارے پچاس روپے ادا کر دوں گی''۔ ڈرائیور نے جواب دیا۔

''مائی میں اپنے روپے کے لیے خود ہی اس کی تلاش میں ہوں مگر وہ بہت بڑا شہر ہے۔ یہ جو سمندر دیکھ رہی ہو نا اس سے بھی بڑا شہر ہے، سمندر میں چھپی ہوئی مچھلیوں کو پکڑنا آسان ہے مگر کراچی شہر میں کسی چھپے ہوئے آدمی کو ڈھونڈ نکالنا مشکل ہے بہت مشکل ہے''۔

رجو نے دل ہی دل میں دعا مانگی کہ اللہ کرے وہ ہمیشہ کے لیے کہیں گم ہو جائے اور کبھی نہ آئے۔ جیسے جیسے

دن مہینے اور سال گزرنے لگے اسے یقین آتا گیا کہ اس کی دعا قبول ہوگئی ہے۔ منگو واپسی کا راستہ بھول گیا تھا یا وہ بڑا آدمی بننے میں مصروف تھا۔ اس عرصے میں اس کی چچی اپنے بیٹے کا انتظار کرتے کرتے اس دنیا سے چل بسی۔

تین برسوں کے دوران رجو آہستہ آہستہ چودھویں کے چاند کی طرح مکمل ہوگئی۔

اب وہ اپنی چچی کی طرح محنت کرتی تھی۔ بستی کے لوگ برسوں پہلے کی دبلی پتلی سی رجو کو بھول گئے تھے۔ عمر کے اس نئے موڑ پر اس کا روپ رنگ نکھرتا جارہا تھا۔ جب وہ مچھلیوں سے بھری ٹوکری اٹھا کر چلتی تو اس کے جسم میں آپ ہی آپ لہروں کا سا لوچ اور خرام آجاتا۔ صحت ایسی جاذب نظر تھی جیسے وشال سمندر کے خزانے چھپائے پھر رہی ہو۔ سمندر کے سینے پر جال پھینکنے والے مچھیرے اب اس پر اپنی نگاہوں کے جال پھینکنے لگے۔ شہر سے آنے والے بیوپاری اور ٹرک ڈرائیور گھوم پھر کر تراب کی کشتی کی جانب آتے تھے اور رجو سے باتیں کرنے یا کچھ دیر تک اپنی آنکھیں سینکنے کا بہانہ تلاش کرتے رہتے تھے۔ کیونکہ اس بے سہارا لڑکی پر تراب کی نگاہوں کا پہرا تھا اور اس کے دل پر بچپن سے اس جیالے کی محبت نقش ہوتی آئی تھی۔

تراب نے جوانی میں خوب اونچا اور بھرپور قد نکالا تھا۔ اس کا سینہ چٹان کی طرح چوڑا اور سمندر سے کھیلنے والے بازو فولاد کی طرح مضبوط تھے۔ رجو کی طرح اس کا رنگ صاف نہیں تھا، سانولا تھا۔ جب وہ مچھلیوں کی بھری کشتی کھیتے ہوئے ساحل پر آتا تو پسینے سے اس کا بدن تانبے کی طرح چمکنے لگتا تھا۔ مسلسل چپو چلانے کی وجہ سے اس کا سانس پھولنے لگتا تھا۔ سینہ دھونکنی کی طرح چلتا رہتا تھا اور جسم سے مچھلیوں کی بساند آتی رہتی۔

شہر سے آنے والے ناک بھوں چڑھا کر رجو کی پسند پر تنقیدیں کرتے رہتے تھے۔ یہ تو اپنی اپنی پسند اور اپنے اپنے دل کی دھڑکنوں کا فیصلہ ہوتا ہے۔ کوئی ہیرا پسند کرتا ہے اور کوئی کنکر۔ سنا ہے انہی کنکروں نے مل کر تاریخ کی گود میں محبت کا ایک تاج محل بنایا ہے۔

رجو پھول تھی اور تراب کانٹا جو پھول کو نہیں چبھتا بلکہ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں کھٹکتا ہے۔ ایک نوجوان مچھیرے شاکر نے رجو کے چچا کو اپنی مٹھی میں لینے کی کوشش کی۔

''چاچا! رجو کو مجھے دے دو، میں تمہارے بڑھاپے کا بوجھ اٹھالوں گا''۔

ایک شاکر ہی نہیں تھا کچھ اور بھی نوجوان اور بوڑھے تھے جو رجو کے چچا کا بڑھاپا برداشت کرنے اور ہر رات اس کے لیے افیون کا کوٹہ مہیا کرنے کے لیے ہمہ وقت تیار تھے مگر چچا رجو کا محتاج تھا اس کی کمائی پر پل رہا تھا لہٰذا اس کی پسند کے خلاف کوئی فیصلہ نہیں کرسکتا تھا۔

رجو اور تراب کے پیار کا چرچا بستی کی ہر گلی اور ہر گھر میں تھا۔ کوئی عورت اپنی پڑوسنوں میں بیٹھ کر کہتی ''ابھی گھنٹہ بھر پہلے میں نے رجو کو دیکھا ہے وہ تراب کے ساتھ اکیلی ساحل کے موڑ کی طرف جارہی تھی۔ ہائے دونوں ایک دوسرے کو کتنا چاہتے ہیں انہیں دیکھ کر مجھے اپنی جوانی یاد آجاتی ہے''۔

کسی گلی میں تاش کھیلنے والے نوجوانوں میں سے کوئی نوجوان ترپ کا پتہ پھینک کر کہتا ''ترپ ہمارے ہاتھ میں ہے اور جیت تراب کی ہورہی ہے۔ آج رجو اس کے ساتھ چٹانی جزیرے پر گئی ہے بھئی کچھ بھی ہو۔ وہ بڑا خوش نصیب ہے ہم رجو پر جان دیتے ہیں اور رجو اس پر جان دیتی ہے''۔

کسی درخت کے نیچے بیٹھے ہوئے بوڑھوں میں سے کوئی چلم کا کش لگا کر کہتا۔

"یہ بے حیائی ہے۔ان کا کیا رشتہ ہے کہ وہ اتنی آزادی سے گھومتے پھرتے ہیں کبھی کشتی کی سیر کرتے ہیں کبھی ساحل پر گھومتے ہیں اور کبھی چٹانی جزیرے پر جاتے ہیں یہ تو کھلی بے حیائی ہے۔انہیں دیکھ کر ہمارے جوان بچے بھی بہکنے لگیں گے"۔

اس کی باتیں سن کر کچھ لوگ تائید میں سر ہلاتے تھے اور کچھ لوگ رجو اور تراب کی حمایت کرتے تھے۔ان کی حمایت کرنے میں بھی ایک مصلحت تھی۔ وہ چاہتے تھے کہ رجو اور تراب ایک دوسرے سے محبت کریں مگر شادی نہ کریں۔شادی سے پہلے شیر وشکر ہو جانے والوں میں اکثر تلخیاں پیدا ہو جاتی ہیں، ایک دوسرے سے بے زاری بڑھ جاتی ہے۔اگر رجو تراب سے بے زار ہوگئی تو کسی دوسرے چاہنے والے کے نصیب جاگ جائیں گے۔

لیکن پیار آخر پیار ہی ہوتا ہے، مچھلی کا بیوپار نہیں ہوتا کہ گاہک بدلتے جائیں۔ رجو اپنی زندگی کی تمام سانسیں تراب سے منسوب کر چکی تھی اس لیے تراب کی کشتی کے سوا کسی دوسرے کی کشتی پر مزدوری کے لیے نہیں جاتی تھی۔ جب وہ کشتی لے کر جال ڈالنے کے لیے نکل جاتا تو وہ سیدھی لالہ کی دکان پر آتی اور اس کے دروازے پر دستک دیتی۔ روز کا یہی معمول تھا اس کی دستک سنتے ہی لالہ کی بیوی بڑبڑاتی ہوئی دروازہ کھولتی۔

آ گئی کمبخت نیند حرام کرنے۔ جب ساری بستی سو جاتی ہے جب ہم دکان بند کر دیتے ہیں تب ہی اسے تمباکو خریدنا یاد آتا ہے۔ اری تراب سے کیوں نہیں کہتی کہ وہ دن کو خود ہی آ کر اپنے لیے تمباکو خرید لیا کرے گا۔ رجو جواب دیتی۔ "نہیں چاچی! وہ خود سے خریدے گا تو بہت زیادہ تمباکو پینے کی عادت ڈالے گا۔ میں تو حساب سے خریدتی ہوں اور حساب سے اسے پینے دیتی ہوں۔ دیکھو نا جب وہ سمندر سے آتا ہے تو کس بری طرح ہانپتا رہتا ہے۔ تمام رات لہروں سے جنگ کرتے رہنا بچوں کا کھیل نہیں ہے۔ میں مانتی ہوں کہ وہ فولاد ہے پھر بھی اسے زیادہ تمباکو نہیں پینا چاہیے۔ اس لیے میں اسے روکتی رہتی ہوں۔ وہ بہت اچھا ہے چاچی! میری ہر بات مان لیتا ہے، میری خوشی کو اپنی خوشی سمجھتا ہے، تم تو اسے اچھی طرح جانتی ہو، تم نے تو اسے گود میں کھلایا ہے"۔

"اف! رجو تو بولتی ہے تو بولتی چلی جاتی ہے۔ اری میں نے تو تجھے بھی گود میں کھلایا ہے۔ میں تم دونوں کو اچھی طرح جانتی ہوں دونوں ہی پاگل ہو۔ لے یہ تمباکو کی پڑیا۔ لالہ دکان بند کرنے سے پہلے ہی یہ پڑیا باندھ دیتا ہے کہ نہ جانے تو کس وقت آ دھمکے"۔

لالے کی بیوی ٹھیک ہی کہتی تھی۔ دوسرا پاگل تراب تھا۔ وہ بھی کسی رات اپنے دوست رمضو کے ہاں پہنچ جاتا۔ رمضو کے آنگن میں بیلے کے پھول کھلتے تھے۔ اس کی بیوی ان پھولوں کو کبھی گجرے کی صورت میں اور کبھی ہار کی صورت میں گوندھ کر رکھتی تھی۔ دروازے پر دستک سنتے ہی وہ بڑبڑاتی ہوئی آتی۔ آ گیا ہماری نیند حرام کرنے۔ ہزار بار سمجھایا ہے کہ شام کو آ کر پھول لے جایا کر مگر دماغ میں تو بھوسہ بھرا ہوا ہے۔ تراب جواب دیتا "یہ بات نہیں ہے بھابھی۔ آج رجو ذرا ناراض ہوگئی تھی، مناتے مناتے یہ وقت ہوگیا اب سے جلدی آیا کروں گا"۔

"تو جھوٹ کہتا ہے رجو کبھی ناراض نہیں ہو سکتی۔ روٹھنے کی عادت مردوں کی ہوتی ہے تاکہ ہم ہاتھ جوڑ کر انہیں منائیں اور ان کی خوشامد کریں مگر تجھ سے اب بحث کون کرے گا یہ لے گجرا۔ آج اسے رجو کے ہاتھوں میں نہ پہنانا۔س کے جوڑے میں لگانا بیلے کی یہ سفید کلیاں اس کے سیاہ بالوں میں خوب کھلیں گی"۔

اس کی بھابھی نے ہنستے ہوئے وہ گجرا اسے دیا۔ پھر دعائیہ نگاہوں سے دیکھتے ہوئے دروازے کو بند کر دیا۔

وہ پورے چاند کی رات تھی۔ تراب رجو کا لایا ہوا تمبا کو ایک بے ڈھنگے پائپ میں رکھ کر سلگا رہا تھا۔ رجو کے جوڑے میں بیلے کی سفید کلیاں مہک رہی تھیں۔ رات خاموش تھی۔ چاند مسکرا رہا تھا اور وہ دونوں ساحل پر کھڑے ہوئے دور اس چٹانی جزیرے کو دیکھ رہے تھے جو لہروں کے مدو جزر میں گھرا ہوا تھا۔

رجو نے کانپتے ہوئے لہجے میں کہا ''کیسی غضبناک لہریں ہیں کتنی بے دردی سے اس جزیرے کو اپنی لپیٹ میں لے رہی ہیں، ہم تاروں بھری رات میں وہاں جاتے ہیں۔ وہ جزیرہ ہمارے پیار کا شاہد ہے۔ میرے بس میں ہوتا تو میں اسے طوفانی لہروں سے بچالیتی۔ کبھی اسے ڈوبنے نہ دیتی''۔

تراب نے پائپ سے ایک کش لیا پھر دھواں چھوڑنے کے بعد کہا۔ وہ وقتی طور پر ڈوبتا ہے پھر ابھر آتا ہے۔ وہ جزیرہ ہمیں سکھاتا ہے کہ محبت چٹان کی طرح اٹل ہو تو کبھی نہیں ڈوبتی۔ ڈوبتی بھی ہے تو حالات کی لہروں میں شرابور ہو کر نکھر آتی ہے پہلے سے زیادہ شفاف ہو کر چاندنی میں جگمگاتی ہے''۔

''ایسا کیوں ہوتا ہے تراب۔ میری بڑی آرزو ہے کہ کبھی چاندنی رات میں وہاں جاؤں مگر چاند نکلتے ہی یہ سمندر کی لہریں پاگل ہو جاتی ہیں۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟''

''یہ قدرت کا کرشمہ ہے۔ چاند کی کشش سے لہریں اس کی جانب بلند ہوتی ہیں لیکن زمین کی کشش زیادہ ہے اس لیے وہ لہریں پھر نیچے آجاتی ہیں۔ لہریں محض کھلونا ہیں۔ چاند اور زمین اس کھلونے سے کھیلتے رہتے ہیں۔ کھیل ہی کھیل میں ہمارے پیار کا جزیرہ ڈوب جاتا ہے۔ سوچتا ہوں کہیں ہماری محبت بھی طوفانی لہروں میں نہ گھر جائے۔ میں کل ہی تمہارے چاچا کے پاس جاؤں گا اور ان سے کہوں گا کہ ہماری شادی کی تاریخ پکی کر دیں''۔

رجو نے فرطِ مسرت سے اس کے بازو کو تھام لیا۔ اسی وقت ایک بہت اونچی لہر چیختی چنگھاڑتی آئی اور اس نے پیار کے اس جزیرے کو حرفِ غلط کی طرح نگاہوں سے مٹا دیا۔

رجو اپنے محبوب کے فیصلے پر خوشی سے مسکرا رہی تھی اور اندر ہی اندر سمندر کی نا انصافی پر گھبرا رہی تھی۔ وہ بہت دیر تک وہاں کھڑے رہے اور دھیرے دھیرے پیار بھری باتیں کرتے رہے پھر وہ اپنی جھگیوں کی طرف واپس جانے لگے، ان کے سروں پر صاف و شفاف نیلگوں آسمان کا سایہ تھا۔ قدموں تلے ٹھنڈی ریت بچھی ہوئی تھی۔ چاند رات کی سیاہی کو ان کے قریب پھٹکنے سے روک رہا تھا۔ تراب نے رجو کے ہاتھ کو ایسی مضبوطی اور اتنے اعتماد سے تھام رکھا تھا جیسے ملاح اپنے پتوار کو اور مچھیرا جال کھینچنے کی ڈور کو تھامے رکھتا ہے۔ وہ رجو کو اس کی جھگی تک پہنچانے جا رہا تھا۔

جھگی کے سامنے ایک دبلا پتلا سا آدمی اپنی دونوں ٹانگیں پھیلائے اور دونوں ہاتھ کمر پر رکھے بڑی شان سے کھڑا ہوا تھا۔ اس نے دھاری دار پتلون اور پھولدار قمیص پہنی ہوئی تھی۔ سر پر کسی کباڑیے سے خریدا ہوا ہیٹ پہن رکھا تھا۔ رجو کا کلیجہ دھک سے رہ گیا، وہ منگو تھا۔

منگو نے دانت پیستے ہوئے تراب کو دیکھا پھر رجو سے کہا ''اچھا تو تم میرے باپ کو افیون کھلا کر اس کے ساتھ رنگ رلیاں منانے جاتی ہو۔ کیا تمہیں ہماری عزت کا ذرا بھی خیال نہیں ہے؟''

تراب نے غصہ سے کہا۔

''فضول باتیں نہ کرو منگو۔ رجو سے میرا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ تمہارے باپ نے منظوری دی ہے کل میں یہاں آکر شادی کی تاریخ پکی کروں گا''۔ ''اونہہ!'' اس نے حقارت سے کہا۔

''وہ افیونی بوڑھا کون ہوتا ہے منظوری دینے والا۔ میری ماں نے بچپن ہی میں مجھ سے کہہ دیا تھا کہ یہ میری بہو بنے گی''۔

رجو نے اس کی طرف تھوکتے ہوئے کہا۔

''ارے جا۔ بڑا آیا مجھ سے شادی کرنے والا۔ چور بدمعاش، کل صبح وہ ڈرائیور آئے گا اور تیری گردن پکڑے گا جس کے پچاس روپے چرا کر بھاگ گیا تھا''۔ منگو قہقہہ لگانے لگا۔

''اس کے روپے میں نے بہت پہلے دے دیئے ہیں۔ تراب جیسے مچھیرے کی طرح غریب نہیں ہوں۔ ہر ماہ سینکڑوں روپے کماتا ہوں۔ کراچی شہر کا اے ون بس ڈرائیور ہوں۔ اس وقت میری جیب میں دو ہزار روپے ہیں اتنے روپے کبھی تیرے باپ نے بھی نہیں دیکھے ہوں گے''۔

وہ ہاتھ نچا کر بولی ''میرے باپ نے نہیں دیکھے ہیں تو تیرے باپ نے کب دیکھے ہیں جا کر پوچھ لے چاچا سے۔ اس نے افیون کی گولیوں کے سوا دنیا میں کچھ دیکھا ہی نہیں ہے تو کس برتے پر میرے باپ کا نام لے رہا ہے؟''

تراب نے کہا ''رجو تم اس بے وقوف کے منہ نہ لگو۔ میں یہ بھی نہیں چاہتا کہ تم اس جھگی میں اس لفنگے کے ساتھ رہو۔ چلو میرے ساتھ چلو''۔ وہ رجو کا ہاتھ پکڑ کر لے جانے لگا۔

منگو نے آگے بڑھ کر کہا۔ ''ٹھہرو، رجو کا ہاتھ چھوڑ دو۔ دیکھو تراب میں تم سے جھگڑا نہیں کرنا چاہتا۔ ورنہ تم نہیں جانتے میں بہت خطرناک آدمی ہوں''۔

تراب نے حقارت سے ہنستے ہوئے کہا۔

''کیا پدی اور کیا پدی کا شوربہ۔ ایک ہاتھ رکھ دوں گا تو زمین سے اٹھ نہیں سکے گا۔ ہمت ہے تو راستہ روک کر دیکھ لے۔ میں رجو کو اپنے دوست رمضو کے ہاں لے جا رہا ہوں تو جب تک یہاں رہے گا رجو وہاں بھابھی کے ساتھ رہا کرے گی''۔ یہ کہہ کر وہ رجو کو ساتھ لے جانے لگا۔ منگو غصے سے مٹھیاں بھینچتے ہوئے بڑی بے بسی سے تراب کے فولادی جسم کو دیکھ رہا تھا کہ اس کے ساتھ ٹکرانے کے نتیجے میں شکست اور شرمندگی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔ اس گنوار کو شہری ہتھکنڈوں سے مات دینی ہوگی۔

O☆O

بستی والوں کے لیے دوسرا دن بہت ہی دلچسپ اور ہنگامہ پرور تھا۔

رجو اور تراب کے دشمن خوشی کا اظہار کر رہے تھے کہ منگو واپس آگیا ہے۔ تراب کی حمایت کرنے والے اور رجو کی بھلائی چاہنے والے منگو کو نفرت سے دیکھ رہے تھے وہ شہری لباس میں اینڈتا پھر رہا تھا اور پھر جیب سے بڑے بڑے نوٹ نکال کر دکھاتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

''تعجب ہے اس بستی میں کسی کے پاس سو روپے کی ریزگاری نہیں ہے۔ اب میں اتنے بڑے نوٹ رکھ کر یہاں کیسے زندہ رہ سکتا ہوں اسی لیے تو میں یہاں نہیں آ رہا تھا مگر کمبخت رجو کا خیال مجھے کھینچ لایا ہے۔ اے موسی! تجھے یاد ہوگا میری ماں رجو سے میری شادی کرنا چاہتی تھی۔ اے بابا تو نمازی ہے، دوسروں کو بھی نماز پڑھاتا ہے تو سچ سچ کہہ دے میری ماں نے تجھ سے بھی کہا تھا کہ میرا اور رجو کا نکاح تو ہی پڑھائے گا''۔

''ہاں تو ٹھیک کہتا ہے'' موسی اور نمازی بابا نے اس کی تائید کی۔

وہ بستی میں پھرتا رہا۔ ایمان والوں کو ایمان کا واسطہ دیتا رہا۔ ضرورت مندوں کے ہاتھوں میں دو چار روپے رکھتا گیا اور ایک سیاسی لیڈر کی طرح تمام لوگوں کو اپنے حق میں ووٹ دینے کے لیے آمادہ کرتا رہا۔ چھوٹی سی بستی میں کچھ ایسی فضا قائم ہوگئی جیسے کوئی زبردست الیکشن ہونے والا ہو، صبح شام رجو، تراب اور منگو کے چرچے ہونے لگے۔ جھگیوں میں، گلیوں میں، ساحل پر، سمندر پر بہنے والی کشتیوں پر یہی ذکر تھا۔

''رجو تراب کو چاہتی ہے تراب ہی سے شادی ہوگی''۔

''رجو منگو سے منسوب تھی منگو سے شادی ہوگی''۔

''نہیں ہوگی کبھی نہیں ہوگی''۔

''ضرور ہوگی۔ منگو کے راستے میں آنے والا سر کچل دیا جائے گا'' دونوں طرف کی پارٹیاں لاٹھیاں اٹھا کر ایک دوسرے کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئیں۔ ایک پارٹی نے کہا۔

''رجو تراب کے دوست کے ہاں نہیں رہے گی۔ اسے اپنے چچا کی جھگی میں رہنا ہوگا''۔

دوسری پارٹی نے جواب دیا'' جس جھگی میں منگو رہتا ہے وہاں رجو نہیں رہے گی جب تک کہ شادی کا فیصلہ نہ ہو جائے''۔

منگو کے لوگوں نے کہا'' اگر وہ منگو کے ساتھ جھگی میں نہیں رہے گی تو پھر تراب کی کشتی پر بھی مزدوری کے لیے نہیں جائے گی جب تک کہ شادی کا فیصلہ نہ ہو جائے''

بستی کے بوڑھے ان کے درمیان آگئے۔'' ٹھہرو ٹھہرو۔ آپس میں خون خرابہ نہ کرو۔ رجو کا فیصلہ پنچایت کرے گی۔ ہم بوڑھوں نے دنیا دیکھی ہے ہم جو فیصلہ کریں گے وہ سب کے لیے قابل قبول ہوگا''۔

''کیسے قابل قبول ہوگا'' ایک نے کہا'' رجو تراب کو چاہتی ہے اس لیے فیصلہ رجو کے حق میں ہوگا''۔

منگو نے آگے بڑھ کر کہا۔

''تم سب یہ دیکھتے ہو کہ جوانی میں رجو نے تراب کو پسند کیا ہے۔ یہ نہیں دیکھتے کہ بچپن سے میری ماں نے اس لڑکی کی پرورش کی ہے، اس کے لیے خون پسینہ ایک کیا ہے تاکہ اسے اپنی بہو بنا کر رکھے۔ تم سب میری مرحوم ماں سے ناانصافی کر رہے ہو''۔

تراب نے آگے بڑھ کر جواب دیا'' ہم تمہاری ماں کا احسان مانتے ہیں لیکن لڑکی کو حق پہنچتا ہے کہ وہ اپنی آئندہ زندگی گزارنے کا فیصلہ اپنی مرضی سے کرے''۔

منگو نے غصہ سے ہاتھ جھٹک کر کہا'' تو پھر جاؤ رجو کو بیاہ کر لے جاؤ مگر اس سے پہلے میری ماں کے خون پسینہ کا حساب کرنا ہوگا۔ اگر رجو ہماری ہوتی تو میں کبھی غیروں کی طرح حساب نہ مانگتا۔ اس نے تین برس میرے باپ کو اپنی کمائی کھلائی ہے مگر میری ماں نے تیرہ برس تک اسے کھلایا ہے، کپڑے پہنائے ہیں دکھ بیماری میں اس کے لیے راتیں جاگی ہے، دواؤں کے دام دیئے ہیں، ان سب احسانات کی قیمت چکا سکتے ہو تو پھر لے جاؤ رجو کو''۔

اس کی باتیں سن کر تھوڑی دیر کے لیے سناٹا چھا گیا۔ تراب کے حمایتی آپس میں کھسر پھسر کرنے لگے۔ منگو کے حمایتی طنزیہ انداز میں مسکرانے لگے۔ ان کے منگو نے بڑی زبردست سیاسی چال چلی تھی۔ تیرہ برس کا احسان چکانا بچوں کا کھیل نہیں تھا۔ ایک بوڑھا جو جوان ہونے کی کوشش کر رہا تھا اور جس نے ایک بار رجو سے شادی کا پیغام بھیجا تھا

اور رجو کے منہ سے گالیاں بھی سن چکا تھا۔ وہ منگو کی اس بات پر بڑا خوش ہوا۔ اس نے مدبرانہ انداز میں سر ہلاتے ہوئے کہا "اپنوں کی پرورش کی جائے تو ان سے حساب نہیں لیا جاتا لیکن رجو اپنی نہیں رہی، وہ کھلم کھلا پرائی بن گئی ہے لہٰذا کسی پرائے شخص کو کچھ دیا جاتا ہے تو اس سے دام وصول کیے جاتے ہیں۔ منگو ٹھیک کہہ رہا ہے رجو اس کی ماں کی مقروض ہے جب تک وہ تیرہ برس کا قرضہ ادا نہیں کرے گی اس وقت تک تراب سے شادی نہیں کرے گی"۔

"رجو کیسے قرضہ ادا کرے گی؟" رمضو نے پوچھا "منگو آخر چاہتا کیا ہے؟ وہ صاف صاف کہہ دے اگر وہ روپے چاہتا ہے تو تراب ہزار دو ہزار بھی دے سکتا ہے"۔

منگو نے جواب دیا "کیا میری ماں نے اتنے برسوں میں صرف دو ہزار رجو کے پیچھے خرچ کیے ہیں؟ ذرا عقل کے ناخن لو۔ ماں نے جو روپے رجو پر خرچ کیے وہی روپے میرے لیے جمع کرتی تو آج میں شہر جا کر ایک نئی ٹیکسی قسطوں پر حاصل کر لیتا۔ ایک ٹیکسی قسطوں پر حاصل کرنے کے لیے کم از کم پندرہ بیس ہزار روپے کی ضرورت ہوتی ہے۔ اب تم لوگ خود ہی سوچو اور حساب کرو اگر ماں نے ہر ماہ رجو کے لیے سو روپے خرچ کیے ہیں تو اس حساب سے تیرہ برسوں میں پندرہ ہزار روپے ہو جاتے ہیں۔ لاؤ نکالو پندرہ ہزار اور رجو کو لے جاؤ"۔

لالہ پرچون والے نے کہا "جے رام رام، ہم بھی قرض لیتے ہیں دیتے ہیں مگر کبھی یہ نہیں سنا کہ کسی کو بچپن سے پالنے میں جو رقم خرچ کی گئی ہے، اس رقم کو قرض کے طور پر وصول کیا گیا ہو۔ بھئی رجو کو پالنے والی اس کی چاچی تھی کیا رشتہ داری میں قرض وصول کرو گے؟"

منگو نے جواب دیا "رشتہ داری ہوتی تو میں کبھی یہ بات نہ اٹھاتا۔ رجو خود ہی رشتہ توڑ رہی ہے اس لیے تراب سے رشتہ جوڑنے سے پہلے اسے قرض ادا کرنا پڑے گا۔ صلح صفائی کا یہی ایک راستہ ہے ورنہ قرض ادا کرنے سے پہلے تراب نے رجو سے شادی کرنے کی کوشش کی تو میرے آدمی کمزور اور بزدل نہیں ہیں، یہاں دنگے فساد ہوں گے، لوگ زخمی ہوں گے، مارے جائیں گے۔ ایک لڑکی کے لیے یہاں جھگیاں جلتی ہوئی نظر آئیں گی"۔

بستی کی عورتیں سہم گئیں۔ انہیں اپنا سہاگ لٹتا اور جھگیاں جلتی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ بوڑھے بھی سمجھ رہے تھے اور اس فساد کو روکنے کا یہی ایک راستہ تھا کہ منگو کا مطالبہ پورا کر دیا جائے۔ ایک بوڑھے نے کہا "اس بستی میں کبھی فساد نہیں ہوا۔ ہم ایک لڑکی کے لیے اپنے گھروں کو برباد، عورتوں کو بیوہ اور بچوں کو یتیم نہیں کر سکتے۔ منگو اپنی ماں کی خرچ کی ہوئی واجب رقم مانگ رہا ہے مگر بہت زیادہ مانگ رہا ہے، صلح صفائی کے لیے دونوں فریق نرمی سے کام لیں۔ منگو اپنی رقم میں کچھ کمی کر دے اور تراب اس کی ادائیگی کے لیے راضی ہو جائے اس طرح بات بنے گی"۔

منگو نے تراب کی جانب دیکھا اس نے سوچا کہ اگر وہ اپنے مطالبہ میں کچھ کمی کرے گا تب بھی اس مچھلی پکڑنے والے کے پاس اتنی رقم نہیں ہوگی جس کے عوض وہ رجو کو اپنا سکے۔ اس نے کہا۔

"اچھی بات ہے۔ بڑے بوڑھے کہہ رہے ہیں اس لیے میں ایک ہزار کم کیے دیتا ہوں رجو پر ساری زندگی میرا یہ احسان رہے گا" رجو نے عورتوں کی بھیڑ سے نکل کر کہا "میں تھوکتی ہوں تیرے احسان پر۔ میں چاچی کے احسان کا بدلہ چکاؤں گی۔ میں ساری زندگی محنت مزدوری کروں گی اور ایک ایک پیسہ جوڑ کر تیرے منہ پر ماروں گی"۔

"اچھی طرح سوچ لے رجو"۔ منگو نے کہا "جب تک تو قرض ادا نہیں کرے گی، اس وقت تک تراب سے نہ شادی کر سکے گی نہ مل سکے گی اور نہ اس سے بات کر سکے گی۔ مجھ سے رشتہ توڑ کر اس سے رشتہ جوڑنے کے لیے پہلے

تجھے پندرہ ہزار کی رقم جمع کرنی ہوگی اور تو ایک ایک پیسہ جوڑتے جوڑتے بوڑھی ہو جائے گی'' تراب نے کہا ''تو رجو کو
تنہا کیوں سمجھتا ہے میں نے اپنی جھگی کی جگہ ایک پکا مکان بنانے کے لیے اب تک تین ہزار روپے جمع کیے ہیں یہ روپے
میں رجو کو دوں گا اور روز کی آدھی کمائی اس کے لیے بچایا کروں گا''۔ تراب کے دوست رمضو نے کہا ''میرے پاس
ایک سو تیس روپے ہیں، میں بھی اپنی آمدنی کا ایک حصہ رجو کے لیے بچایا کروں گا۔ اگلے چار ماہ تک پانچ سو روپے
دینے کے قابل ہو جاؤں گا''۔

لالہ نے آگے بڑھ کر کہا ''میری کوئی اولاد نہیں ہے۔ میں نے اور میری پتنی نے تراب اور رجو کو گود میں کھلایا
ہے۔ آج ان بچوں پر بپتا آئی ہے تو میں بھی ان کی سہاتا کروں گا۔ میں اپنی جمع پونجی سے انہیں دو ہزار روپے دوں گا''
نمازی بابا نے اپنی جگہ سے اٹھ کر کہا ''میں بارہ برس سے یہاں ایک چھوٹی سی مسجد بنانے کے لیے ہر ایک کے سامنے
ہاتھ پھیلاتا ہوں اور پیسے دو پیسے سبھی سے لیتا رہتا ہوں۔ اب تک میں نے ساڑھے چار سو روپے جمع کیے ہیں۔ سچ کہتا
ہوں ابھی بیٹھے بیٹھے میرے دل میں الہام نازل ہوا ہے کہ انسان پر آئی ہوئی آفات دور کرنے کے لیے چندہ کیا جاتا
ہے، خدا کے لیے چندہ جمع کرنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ خدا کسی کا محتاج نہیں۔ رجو بیٹی ایک گھر کی اور ایک گھر والے
کی محتاج ہے۔ میری مخالفت کرنے والے ہزار باتیں بنائیں گے مگر میں نے فیصلہ کیا ہے کہ مسجد کے لیے چھت ڈالنے
سے پہلے بیٹی کے سر پر آنچل ڈالوں گا''۔

رجو کی آنکھوں میں خوشی سے آنسو آ گئے سب لوگ لالہ اور نمازی بابا سے متاثر ہو کر ایک دوسرے سے کچھ
کہہ رہے تھے۔ رجو اور تراب نے محبت کی تھی اور لالہ کا دھرم اور نمازی بابا کا مذہب اس محبت کے سنگم پر آ کر مل رہے
تھے۔ تراب اور رجو کے حمایتی بھی اپنی اپنی حیثیت کے مطابق کچھ نہ کچھ دینے کے لیے وعدے کر رہے تھے۔ منگو
اور اس کے حمایتی غرا کر انہیں دیکھ رہے تھے۔ ویسے وہ مطمئن تھے کہ اتنی امداد کے باوجود رجو اور تراب کو پندرہ ہزار تک
پہنچنے کے لیے ابھی کئی برس محنت کرنی پڑے گی۔

دوسرے دن سے محنت شروع ہوگئی وہ سب ایک نئی لگن سے اور نئے حوصلے سے دن رات محنت کرنے
لگے۔ دوسری طرف منگو کے آدمی ان کے حوصلے پست کرنے کی فکر میں تھے۔ تراب اور اس کے ساتھی زیادہ سے زیادہ
مچھلیاں پکڑنے کی کوشش کرتے تھے۔ دشمن چوری چھپے کبھی ان کے جال کے تاروں کو ڈھیلا کر دیتے تھے اور کبھی کشتیوں
کو نقصان پہنچاتے تھے۔ وہ بھی اس طرح کہ کسی کو ان کی دشمنی کا ثبوت نہ ملے۔

ایک بار تراب اور اس کے ساتھیوں نے آمدنی بڑھانے کے لیے مچھلیوں کے دام بڑھائے تو منگو کے
ساتھیوں نے دام گرا دیئے۔ ان کے درمیان اچھی خاصی سیاسی پینترے بازیاں چل رہی تھیں۔ دن پر دن گزر رہے
تھے رجو بھی زیادہ سے زیادہ پیسے کمانے کے لیے زیادہ سے زیادہ محنت کر رہی تھی۔ اب اس کا کام رمضو کی کشتی پر
کرتا تھا کیونکہ تراب سے ملنے اور اس سے باتیں کرنے پر پابند لگا دی گئی تھی وہ دونوں دور ہی سے ایک دوسرے کو دیکھ
کر ٹھنڈی آہیں بھرا کرتے تھے۔ رات کو منگو کا کوئی جاسوس ساحل پر ٹہلتا رہتا تھا تاکہ وہ چوری چھپے بھی نہ مل سکیں۔

رمضو کی بیوی روز شام کو بیلے کی کلیاں گوندھ کر رجو کو دیتی اور رجو لالہ کی دکان سے تمباکو کی پڑیا لا کر رمضو کو
دیتی کہ وہ اسے تراب تک پہنچا دے اور تاکید کرتی کہ زیادہ تمباکو نہ پئے کلیجہ جل جاتا ہے۔ پیسے جمع کرنے کے لیے
اپنے کھانے پینے میں کمی نہ کرے نہیں تو میں بھی بھوکی رہ کر پیسے جمع کروں گی۔

پھر منگو نے اعتراض کیا کہ تراب پچھلی رات رمضو کے ہاں رجو سے ملنے گیا تھا۔ یہ سراسر جھوٹ تھا رجو اور تراب ایک دوسرے کے سائے کو بھی چھو کر نہیں گزرے تھے لیکن فیصلہ کرنے والوں کو منگو کی بات پر اس لیے یقین آ گیا کہ رمضو تراب کا گہرا دوست تھا اور دوستی کا حق نبھانے کے لیے وہ اپنے دوست کو رجو سے ملنے کا موقع فراہم کر سکتا تھا لٰہذا رجو کو نمازی بابا جیسے ایماندار آدمی کی سرپرستی میں دے دیا گیا اور وہ دوسرے دن سے شاکر کی کشتی پر کام کرنے لگی۔ جس رمضو سے تراب کے پیغامات ملتے تھے اس کا بھی ساتھ چھوٹ گیا تھا۔

یہ سب کچھ منگو کی جھنجھلائی ہوئی کارروائیاں تھیں۔ اسے معلوم ہو گیا تھا کہ صرف چھ ماہ کے عرصے میں وہ دس ہزار روپے تک پہنچ گئے ہیں۔ تراب اور رجو نے بھی اپنی کامیابی دیکھ کر منگو کے خلاف کوئی جوابی کارروائی نہیں کی۔ اب صرف پانچ ہزار کی بات رہ گئی تھی۔ تراب نے سوچا کہ پندرہ ہزار روپے ہوتے ہی وہ رقم منگو کے منہ پر مارے گا۔ رجو سے شادی کرے گا۔ اس کے بعد یہاں منگو کا رہنا دشوار کر دے گا۔

ویسے اب رجو سے جدائی برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ پہلے تو یہ بات تھی کہ تراب کا کوئی نہ کوئی پیغام مل جاتا تھا اور وہ اپنے دل کو سمجھا لیتی تھی کہ وہ ایک دوسرے سے زیادہ دور نہیں ہیں مگر اب وہ بہت دور تھا اتنی دور کہ شاکر کی کشتی سے ایک ننھے کھلونے کی طرح نظر آتا تھا۔ اس کی نگاہوں کی گرمی بھی رجو تک نہیں پہنچتی تھی۔

اسے اداس دیکھ کر شاکر نے کہا ''میں تمہارا دکھ سمجھتا ہوں مجھے اپنے دل کی بات کہو۔ میں تمہارا پیغام تراب تک پہنچا دوں گا کسی کو اس بات کی خبر نہیں ہوگی''۔

ایک ہمدرد کو پا کر رجو نے اپنے دل کی بات کہہ دی کہ تراب سے کہو ایک بار مجھ سے مل لے۔ ایک بار ملنے سے کسی کا کیا بگڑے گا۔ اگر دشمنوں نے دیکھ بھی لیا تو کیا ہوگا۔ وہ ہمیں پھانسی تو نہیں چڑھا دیں گے۔ شاکر نے اطمینان دلایا کہ کوئی انہیں نہ دیکھ سکے گا۔ وہ ایسا انتظام کرے گا کہ کسی کو خبر نہ ہوگی۔ آج رات وہ سب سمندر پر جائیں گے۔ وہ تراب سے کہے گا کہ تھوڑی دیر کے لیے وہ چٹانی جزیرے پر چلا جائے گا۔ اس کے جانے کے بعد وہ کشتی لے کر ساحل پر آئے گا اور رجو کو اس میں بٹھا کر چٹانی جزیرے پر اس کے محبوب کے پاس پہنچا دے گا۔

رجو نے احسان مندی سے اسے دیکھا ''یہ بہت اچھی تدبیر ہے شاکر۔ تم بہت اچھے ہو بہت اچھے۔ میں زندگی بھر تمہارا احسان نہیں بھولوں گی''۔

''اس میں احسان کی کیا بات ہے۔ میں اس لیے تمہارے کام آ رہا ہوں کہ تمہارا دکھ مجھ سے دیکھا نہیں جاتا ہے۔ آج رات تم ساحل کے اس موڑ پر میرا انتظار کرنا۔ جب تمام مچھیرے سمندر پر چلے جائیں گے تو میں کشتی لے کر وہاں آؤں گا۔ میں اپنی طرف سے پوری کوشش کروں گا کہ کسی کو اس ملاقات کا علم نہ ہو، تم بھی احتیاط برتنا اپنے سائے سے بھی نہ کہنا کہ تم کہاں جا رہی ہو''۔

رجو کے لیے وہ دن گزارنا مشکل ہو گیا۔ وہ بڑی بے چینی سے سورج غروب ہونے کا انتظار کرتی رہی۔ رات آئی تو جھگی سے نکلنے کی تدبیر سوچتی رہی۔ تدبیر اسی وقت کام آئی جب نمازی بابا عشا کی نماز پڑھ کر سو گئے۔ وہ دبے پاؤں جھگی سے نکلی۔ اندھیری رات تھی، اس بات کا ڈر نہیں تھا کہ کوئی دیکھ لے گا۔ بلا سے دیکھ لے۔ آج وہ ساری بندشیں توڑ کر ایک بار صرف ایک بار اپنے محبوب سے ملنے کا مصمم ارادہ کر چکی تھی۔ ساحل پر کشتی تیار تھی۔ شاکر اس کا انتظار کر رہا تھا۔ اسے دیکھتے ہی بولا۔

''تم نے بہت دیر کردی۔ تراب تمہارا انتظار کرتے کرتے کہیں مایوس نہ ہو جائے۔ چلو بیٹھو'' وہ بیٹھ گئی۔ شاکر کشتی کو لہروں کے اتار چڑھاؤ پر کھینچ کر لے جانے لگا۔ جب لہریں کشتی کو سمندر کی طرف دھکیلنے لگیں تو وہ بھی کشتی پر آگیا اور پتوار چلا کر اس کا رخ چٹانی جزیرے کی طرف موڑنے لگا۔ رجو کا دل بری طرح دھڑک رہا تھا تقریباً سات ماہ کے بعد وہ اپنے تراب سے ملنے والی تھی۔ اس نے دور ساحل کی جانب دیکھا، اندھیرے میں بستی اور جھگیاں نظر نہیں آرہی تھیں۔ ستاروں کی مدھم روشنی میں آس پاس صرف سمندر کا پانی دکھائی دے رہا تھا۔ چٹانی جزیرہ زیادہ دور نہیں تھا۔ چاند کی روشنی میں بستی سے صاف نظر آتا تھا لیکن وہ چھپ کر جارہے تھے اس لیے ایک لمبا چکر کاٹ رہے تھے، آدھے گھنٹے کے بعد کشتی جزیرے کے کنارے سے لگ گئی۔ دور ایک پتھر پر بیٹھا ہوا تراب سائے کی طرح نظر آرہا تھا۔ رجو کشتی سے چھلانگ لگا کر کنارے پر آئی اور بے اختیار اسے پکارتی ہوئی دوڑنے لگی۔

''تراب تراب'' قریب پہنچ کر وہ ایک جھٹکے سے رک گئی۔ وہ منگو تھا۔ اس نے قہقہہ لگا کر کہا ''اچھا تو تم تراب سے ملنے آئی ہو۔ آؤ مجھ سے ملو'' وہ دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھنے لگا۔ رجو پلٹ کر کشتی کی طرف بھاگی مگر وہاں شاکر راستہ روکے کھڑا تھا۔ وہ بھی دونوں ہاتھ پھیلا کر اس کی طرف بڑھتے ہوئے بولا ''یہ میری خوش نصیبی ہے کہ تم مجھے دوست سمجھ کر میرے ساتھ آئی ہو۔ آؤ اب دوست بن کر رہیں......''

وہ دونوں سے کترا کر پیچھے ہٹنے لگی ''خبردار۔ میرے قریب نہ آنا جھوٹے مکار فریبی تم لوگ سمجھتے ہو کہ اس تنہائی میں، میں تم سے ڈر جاؤں گی؟ میں اپنی جان دے دوں گی مگر تمہیں قریب نہیں آنے دوں گی''۔

''ہم بھی جان کی بازی لگا کر یہاں آئے ہیں'' منگو نے کہا۔ ''تم سمجھتی ہو کہ پندرہ ہزار روپے لے کر میں تمہارا پیچھا چھوڑ دوں گا، تراب جیت جائے گا اور میں ہار جاؤں گا۔ میں لعنت بھیجتا ہوں ایسے پندرہ ہزار پر جسے حاصل کرنے کے بعد مجھے شکست کھانا پڑے اور بستی والوں کے سامنے شرمندہ ہونا پڑے۔ میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں، تمہیں صرف تمہیں۔ آج تم میری بنو گی یا پھر اس سمندر کی تہ میں ہمیشہ کے لیے سو جاؤں گی''۔

یہ کہتے ہی وہ رجو کی طرف لپکا۔ رجو بھاگنے لگی۔ دوسری طرف سے شاکر اسے گھیرنے لگا۔ وہ جانتی تھی کہ اگر ان کے ہاتھ آگئی تو عزت کی سلامتی ناممکن ہو جائے گی۔ وہ بھاگتی ہوئی دوسرے کنارے پر چلی گئی اور ہاتھ اٹھا کر بولی، ٹھہرو، رک جاؤ۔ آگے بڑھو گے تو مجھے زندہ نہیں پاؤ گے۔ میں کہتی ہوں رک جاؤ''۔

وہ چیخنے لگی۔ منگو نے دانت پیستے ہوئے کہا ''ہم تمہیں زندہ کب چھوڑنا چاہتے ہیں، ہم اتنے احمق نہیں ہیں کہ تمہیں بستی والوں سے شکایت کرنے کے لیے یہاں سے واپس لے جائیں۔ آؤ مرنے سے پہلے ایک بار ہمارے پاس آجاؤ''۔

رجو نے پل بھر میں فیصلہ کیا کہ ان سے رحم اور ہمدردی کی توقع کرے گی تو پھر ان کے دام میں آجائے گی اور عزت کی موت نہیں مر سکے گی۔ یہ فیصلہ کرتے ہی وہ دوڑتی ہوئی ایک اونچی سی چٹان پر پہنچ گئی۔ وہ دونوں تیزی سے دوڑتے ہوئے اسے پکڑنے آرہے تھے۔ اس نے پلٹ کر ان کی جانب دیکھا اور آخری بار اپنے محبوب کو پوری قوت سے چیخ کر آواز دی۔

''تو......را......آ......آ......آب......''

پھر سمندر کی سطح پر چھپاک کی زوردار آواز آئی اور پانی بلندی پر اڑتا ہوا دور تک بکھرتا چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے

لیے ایک گرداب بنا، ذرا ہلچل سی ہوئی پھر سمندر شانت ہو گیا۔

دوسرے روز بستی کے مرد، عورتیں، بوڑھے اور جوان سب ہی حیرانی سے رجو کو پوچھ رہے تھے اور پریشانی سے اسے تلاش کر رہے تھے۔ بستی کی ایک ایک جھگی کے اندر جا کر دیکھا گیا کہ شاید کسی وجہ سے چھپی بیٹھی ہو۔ لوگ میلوں دور تک اسے تلاش کرنے گئے کہ شاید اپنی موجودہ پریشانیوں سے گھبرا کر تنہائی اور سکون کی تلاش میں نکل گئی ہو لیکن وہ کہیں نظر نہیں آئی۔

شاکر سہما سہما سا تھا مگر منگو ڈھیٹ بنا ہوا تھا۔ اس نے الزام لگایا کہ تراب نے اسے غائب کر دیا ہے۔ کہیں لے جا کر چھپا دیا ہے تاکہ پندرہ ہزار نہ دینا پڑیں۔ اس الزام کو لوگوں نے تسلیم نہیں کیا کیونکہ وہ علی الصبح مچھلیوں سے بھری کشتی لے کر ساحل پر آیا تھا جس سے ظاہر تھا کہ وہ تمام رات سمندر میں جال پھینکتا رہا ہے پھر جبکہ دس ہزار جمع ہو چکے تھے اور باقی پانچ ہزار بھی چند ماہ تک جمع ہونے والے تھے ایسے میں تراب کوئی بے ایمانی نہیں کر سکتا تھا۔

تراب کے ساتھیوں نے منگو پر الزام لگایا کہ اس نے رجو کو غائب کیا ہے ان کا الزام بھی قابل قبول نہ تھا منگو کو چند ماہ کے بعد پندرہ ہزار ملنے والے تھے ایسے میں وہ رجو کو نقصان پہنچا کر اتنی بڑی رقم سے محروم نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ رجو اس کی مقروض تھی وہی اسے روپے دیتی۔ جب وہ نہ ہوگی تو اس کا قرض کون ادا کرے گا؟ اور کیوں ادا کرے گا؟

بات کسی کی سمجھ میں نہیں آئی۔ رجو کی گمشدگی ایک راز بن گئی۔ تراب پر عجیب دیوانگی طاری ہو گئی تھی۔ وہ تمام دن بستی کے ایک ایک مرد اور عورت کو پکڑ پکڑ کر پوچھتا تھا۔ تم نے کہیں دیکھا ہے میری رجو کو۔ بتاؤ کہیں تو دیکھا ہوگا آخر وہ اسی زمین پر ہوگی، وہ مجھے چھوڑ کر کہیں نہیں جائے گی۔ وہ اکیلی مر بھی نہیں سکتی کیونکہ ہم نے ساتھ جینے اور مرنے کی قسم کھائی ہے۔

بستی والے اسے جھوٹی تسلیاں دیتے تھے کہ وہ آئے گی ایک دن ضرور واپس آئے گی۔

بیس میل دور ایک پولیس چوکی سے ایک تھانیدار دو سپاہیوں کے ساتھ آ کر تفتیش کر رہا تھا۔ دو روز کی چھان پھٹک کے بعد وہ بھی اس خیال سے متفق ہو گیا کہ اس گمشدگی میں کسی کا ہاتھ نہیں ہے وہ خود ہی کہیں چلی گئی۔

تراب یہ تسلیم کرنے کو تیار نہیں تھا کہ رجو خواہ مخواہ اسے چھوڑ کر کہیں چلی جائے گی۔ وہ دیوانہ وار اسے تلاش کرتا رہا۔ اس کی بھوک پیاس مر گئی تھی، اس کے حوصلے مر گئے تھے۔ اسے اپنے تن بدن کا ہوش نہ تھا۔ کپڑے پھٹ کر تار تار ہو گئے تھے۔ راتوں کو ساحل پر ادھر سے ادھر بھٹکتا پھرتا تھا اور اسے پکارتا رہتا تھا۔

"رجو......رج......جو......او......او"

جواب میں سمندر کی لہریں تڑپ کر آتی تھیں اور اس کے قدموں سے لپٹ کر روتی تھیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ رجو انہی لہروں میں چھپ کر، گھل کر آ رہی ہے۔ اس کے قدموں کو بوسہ دے رہی ہے اور ناکام و نامراد واپس جا رہی ہے۔ رجو......رج......جو......او......او"۔

رجو پھر بے قراری سے لوٹ پوٹ کر آتی تھی اور اس کے قدموں سے لپٹ کر کہتی تھی "ہائے تراب! یہ میں ہوں......میں...... مجھے پہچانو"۔

لہروں کی زبان سمجھ نہیں آتی لیکن پیار کی خاموشی الہام کی طرح دل میں اتر جاتی ہے۔ اس رات بستی کے کچھ لوگوں نے تراب کو ہنستے اور قہقہے لگاتے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں خوشی کی ایسی چمک تھی جیسے اس نے اپنی محبت کو

پالیا ہو۔ اس رات وہ تنہا کشتی لے کر سمندر پر گیا۔ مچھلیاں پکڑنے کا جال ساحلی ریت پر چھوڑ گیا۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کیوں گیا ہے۔ رمضو نے اس کے ساتھ جانا چاہا لیکن اس نے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا۔ سب یہ سوچ کر خاموش رہے کہ وہ بیچارہ پریشان ہے اور کچھ دیر کے لیے سکون کی تلاش میں جا رہا ہے۔ اس رات سمندر بادلوں کی طرح گرجتا رہا۔ لہریں تڑپ تڑپ کر شور مچاتی رہیں۔ آدھی رات کے بعد چاند نکل آیا تھا اس لیے لہروں میں اور زیادہ ابال آ گیا تھا۔ بستی والوں کا کہنا ہے کہ ایسا بھیانک مدوجزر انہوں نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔ کچھ لوگوں کو ان طوفانی لہروں کے اس پار تراب کی آواز سنائی دی تھی۔ وہ اپنی رجو کو پکار رہا تھا اور سمندر کو للکار رہا تھا ''سمندر اے سمندر بتا دے میرے رجو کہاں ہے؟''

''تیری لہروں میں مجھے اپنے پیار کی خوشبو ملی ہے۔ میں تجھ سے اپنی رجو کو لے کر جاؤں گا۔ تو اپنے گود سے مچھلیوں کے خزانے دیتا ہے۔ آج میں اس خزانے کی تلاش میں نہیں، محبت کی تلاش میں آیا ہوں۔ بتا میری رجو کہاں ہے؟ میرے مہربان سمندر۔ میرے ظالم سمندر''۔

کچھ لوگ یہی کہتے ہیں کہ انہوں کی تراب کی آواز سنی تھی یا پھر وہ سمندر اور انسان کے رشتوں اور عداوتوں کا صدیوں پرانا لوک گیت تھا جو ان کی سماعت میں گونج رہا تھا۔ دوسری صبح وہ واپس نہیں آیا، اس کے کشتی کے چند ٹوٹے ہوئے تختے لہروں میں بہتے ہوئے ساحل پر آ گئے۔ بستی پر ماتمی سکوت چھا گیا۔ سب کے سر جھکے ہوئے تھے۔ ہر شخص اپنے دل پر ایک بوجھ سا محسوس کر رہا تھا۔ سب کی زبانیں خاموش تھیں اور وہ غم و غصہ اور شدید نفرت سے منگو کو دیکھ رہے تھے۔

O☆O

کہانی ختم ہو جاتی ہے لیکن اس کا تذکرہ لوگوں کی زبان پر رہ جاتا ہے۔ اب کوئی ملاح چاندنی راتوں میں محبت کا کوئی گیت الاپتا تو اس کی آواز میں ایسا درد اور ایسا سوز و گداز پیدا ہو جاتا جیسے اس کی آواز کے پردے میں تراب پکار رہا ہو اور رجو سسکیاں لے رہی ہو۔ جب دو چار عورتیں ایک جگہ باتیں کرنے بیٹھ جاتیں تو ان کی گفتگو رجو سے شروع ہوتی اور رجو پر ختم ہوتی تھی۔ گفتگو کا اختتام کچھ اس طرح ہوتا۔

''سنا ہے جو نامراد رہ کر اس دنیا سے جاتے ہیں ان کی روحیں سدا بھٹکتی رہتی ہیں''۔

''ہاں بہن۔ میں نے بھی سنا ہے۔ میری دادی اماں آنکھوں دیکھا واقعہ سنایا کرتی تھیں۔ دادی اماں کی جوانی کی بات تھی کہ ایک عورت اپنے خاوند کی تلاش میں نکلی تھی۔ تن تنہا رن کچھ کے میدان سے گزر رہی تھی۔ دادی اماں بتاتی ہیں کہ وہ بہت بڑا ریگستانی علاقہ ہے۔ تمام دن سورج ایسے جلاتا ہے جیسے سوا نیزے پر آ گیا ہو۔ وہ بے چاری پیاس کی شدت سے بے حال ہو گئی۔ ریگستان تھا کہ ختم ہونے ہی میں نہیں آتا تھا۔ پاؤں میں چھالے پڑ رہے تھے، زبان خشک ہو کر تالو سے چپک رہی تھی۔ وہ دوپہر ڈھلنے سے پہلے ہی بے دم ہو کر گر پڑی۔ ایسی گری کہ پھر نہ اٹھ سکی۔

شام کو ادھر سے گزرنے والے ایک قافلے کے آدمیوں نے اس کی لاش کو وہیں دفن کر دیا۔ دادی اماں اسی طرف کی رہنے والی تھیں۔ انہوں نے دیکھا کہ وہ رات کو ان کے گاؤں سے گزرتی تھی۔ کسی سے سامنا ہو جاتا تو اس سے پانی مانگتی تھی اور اپنے خاوند کا پتہ پوچھتی تھی۔

تمام عورتیں اپنی سانسیں روک کر بڑی حیرت سے وہ کہانی سنتی تھیں پھر اس کی تائید میں کہتیں ''ہاں بے چاری پیاسی مرگئی تھی اسی لیے اس کی روح پانی مانگتی تھی''۔

''آہ بے چاری رجو بھی پیاسی تھی۔ خدا کرے وہ زندہ ہو اور کسی پیاسی روح کی طرح بھٹکتی نہ ہو'' سب ہی افسوس کا اظہار کرتیں اور ایسی باتیں کرتیں کہ وہ باتیں رجو کے لیے دعائیں بن جاتی تھیں۔ منگو اس بستی سے بیزار ہو گیا تھا، وہ جہاں سے گزرتا تھا وہاں رجو اور تراب کا تذکرہ سنائی دیتا تھا اس لیے جھنجھلا کر اس نے واپس شہر جانے کا فیصلہ کرلیا۔ اپنے دو چار دوستوں کو اس نے اچھی خاصی رقم ادھار دے دی تھی۔ وہ اسی انتظار میں تھا کہ رقم وصول ہوتے ہی وہاں سے چلا جائے گا۔

ایک رات لالہ دکان بند کر کے سونے کی تیاری کر رہا تھا۔ اس کی بیوی ایک چوکی پر بیٹھی گیتا کا پاٹھ کر رہی تھی۔ اسی وقت دروازے پر دستک سنائی دی۔ وہ دونوں چونک کر دروازے کی جانب دیکھنے لگے۔ چونکنے کی وجہ یہ تھی کہ اس دستک کو وہ برسوں سے پہچانتے تھے۔ ہزاروں در کھٹکھٹائے جائیں تب بھی وہ رجو کی مخصوص دستک کو پہچان لیتے اور وہ پہچان رہے تھے۔

''کیا وہ واپس آگئی ہے؟'' لالے کی بیوی نے حیرت سے پوچھا۔ لالہ جواب دینے کی بجائے تیزی سے چلتا ہوا دروازے تک آیا اور اس نے دونوں پٹ کھول دیئے۔ باہر کی نیم تاریکی میں وہ کھڑی ہوئی تھی، اس کے جسم پر وہی مخصوص لباس تھا، پنڈلیوں تک لہراتا ہوا گھاگھرا، پیٹ سے اوپر بلاؤز اور پتلی ململ کی اوڑھنی گردن کے اطراف دونوں شانوں پر سے ہوتی ہوئی ہوا میں لہرا رہی تھی۔

''اری رجو! تو کہاں چلی گئی تھی۔ آ اندر آجا......'' لالے کی بیوی نے اسے اندر آنے کے لیے کہا۔ وہ چپ تھی۔ ایک پتھر کے مجسمے کی طرح خاموش کھڑی تھی۔ اس کا دایاں ہاتھ ان کی طرف اٹھا ہوا اور ہتھیلی یوں پھیلی ہوئی تھی جیسے کچھ مانگ رہی ہو۔ لالہ نے بڑے ہی دکھ بھرے لہجے میں کہا ''بیٹی ہم سمجھتے ہیں تو اپنے تراب کے لیے تمباکو لینے آئی ہے۔ آہ! ہم کس زبان سے کہیں کہ اب وہ اس دنیا میں نہیں ہے''۔ اس کی بیوی نے کہنی سے ٹھوکا دے کر کہا ''کیوں اس کا دل توڑنے والی بات کرتے ہو؟ کیا ثبوت ہے کہ وہ اس دنیا میں نہیں ہے۔ جیسے یہ گئی تھی ویسے ہی وہ بھی گیا ہے اور میں تو کہتی ہوں وہ بھی آگیا ہے جب ہی تو یہ اس کے لیے تمباکو لینے آئی ہے۔ آجا بیٹی دو گھڑی بیٹھ کر باتیں کر پھر تمباکو لے کر چلی جانا......''

وہ ٹس سے مس نہ ہوئی جوں کی توں ساکت کھڑی رہی۔ اس کی ہتھیلی اب تک پھیلی ہوئی تھی۔ ان دونوں کو کچھ عجیب سا محسوس ہوا جس لڑکی کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی وہ اس وقت بالکل خاموش کھڑی تھی۔ نہ بولتی تھی نہ حرکت کرتی تھی۔ سب سے عجیب بات یہ تھی کہ وہ پلکیں نہیں جھپک رہی تھی خالی خالی نظروں سے ایک طرف دیکھے جا رہی تھی۔ لالہ کی بیوی نے کہا ''میں سمجھ گئی، تراب بھی اس کے ساتھ آیا ہے، کہیں اس کا انتظار کر رہا ہوگا۔ یہ ابھی ہمارے پاس نہیں بیٹھے گی ٹھہر جا میں تمباکو لے کر آتی ہوں''۔

وہ دکان کا اندرونی دروازہ کھولنے چلی گئی۔ لالہ نے اپنی بیوی کی طرف گھوم کر کہا ''ٹھہرو۔ ابھی تمباکو نہ نکالو۔ پہلے یہ تراب کو بلا لائے گی پھر اس کے مطلب کی چیز ملے گی۔ یہ اتنے دنوں کے بعد آئے ہیں کیا کھائے پیئے بنا ہی چلے جائیں گے''۔ کہہ کر وہ رجو سے ہمکلام ہونے کے لیے دروازے کی طرف پلٹا مگر وہاں کسی کا وجود نہ تھا۔ دروازے کی چوکھٹ خالی تھی اور باہر دور تک اندھیرے کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا ''ارے وہ چلی گئی۔ رجو رجو''۔ دروازے سے باہر آکر اندھیرے میں وہ اسے آوازیں دینے لگا۔

اس کی بیوی لالٹین اٹھا کر تیزی سے چلتی ہوئی آئی "وہ آج نہیں تو کل تراب کے ساتھ یہاں آجاتی۔ تم نے تمبا کو دینے سے انکار کر دیا اور وہ ناراض ہو کر چلی گئی"۔ لالہ نے اس کے ہاتھ سے لالٹین لے کر کہا۔ وہ زیادہ دور نہیں گئی ہوگی، میں ابھی اسے بلا کر لاتا ہوں۔ وہ لالٹین ہاتھ میں اٹھائے اسے آوازیں دیتے ہوئے آگے بڑھنے لگا۔ رات کے سناٹے میں "رجو رجو" کی آواز دور تک لہراتی جارہی تھی۔ جھگیوں سے لوگ اٹھنے لگے۔ سوئی ہوئی بستی جاگنے لگی "کون رجو کو پکار رہا ہے؟"

"لالہ کی آواز ہے"۔ مرد باہر نکل آئے، عورتیں دروازوں سے جھانکنے لگیں۔ ذرا سی دیر میں یہ خبر پھیل گئی کہ رجو لالہ کے دروازے پر تمبا کو مانگنے آئی تھی۔ پھر کتنی ہی لالٹینیں جھگیوں سے نکل آئیں۔ کسی نے کہا وہ رمضو کے ہاں گئی ہوگی۔ چلو وہاں دیکھ لیتے ہیں۔

سب کے سب اسی طرف جانے لگے۔ لالہ انہیں تفصیل سے رجو کے آنے اور جانے کا واقعہ سنا رہا تھا۔ جب وہ رمضو کے مکان کے سامنے پہنچے تو اس کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اس کی بیوی اندھیری چوکھٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ انہیں دیکھتے ہی اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولی "کیا مل گیا، تراب مل گیا؟"

"تراب! نہیں تو۔ ہم تو تراب کو نہیں رجو کو ڈھونڈنے آئے ہیں۔ کیا وہ یہاں نہیں آئی ہے؟"

"نہیں، یہاں ابھی تراب آیا تھا۔ دروازے پر دستک سنتے ہی میں پہچان گئی کہ وہ تراب ہے۔ رمضو سو رہا تھا۔ میں نے اسے اٹھانا مناسب نہیں سمجھا کیونکہ دو گھنٹے کے بعد وہ سمندر پر جانے والا تھا۔ میں نے خود ہی اٹھ کر دروازہ کھولا۔ وہ یہاں چوکھٹ سے باہر کھڑا ہوا تھا اور اپنا ہاتھ پھیلا کر مجھ سے کچھ مانگ رہا تھا۔ میں سمجھ گئی کہ وہ اپنی رجو کے لیے بیلے کی کلیاں مانگنے آیا ہے۔ میں نے اس سے پوچھا کہ وہ اتنے دنوں سے کہاں تھا؟ سب اسے مردہ سمجھ رہے ہیں۔ وہ اس طرح باہر کیوں کھڑا ہے، اندر کیوں نہیں آتا؟ اپنی بھابھی سے باتیں کیوں نہیں کرتا؟"

مگر وہ خاموش رہا۔ ایک لفظ بھی اس کی زبان سے نہ نکلا۔ میرے دماغ میں بات آئی کہ شاید وہ رجو کو ڈھونڈ کر لے آیا ہے جبھی بیلے کی کلیاں مانگ رہا ہے۔

میں نے اس سے کہا ٹھہرو۔ میں تمہارے دوست کو جگاتی ہوں۔ وہ تمہارے ساتھ جا کر رجو کو لے آئے گا۔ جب تک وہ نہیں آئے گی میں پھول نہیں دوں گی۔ یہ کہہ کر میں کمرے میں گئی اور جب رمضو کے ساتھ واپس آئی تو وہ یہاں نہیں تھا۔ کیا پتہ پھول نہ دینے کی وجہ سے ناراض ہو کر چلا گیا ہو، رمضو اسے ڈھونڈنے کے لیے اس کی جھگی کی طرف گیا ہے"۔

اس کی بات ختم ہوتے ہی رمضو واپس آ گیا۔ اس نے بتایا کہ تراب وہاں نہیں ہے۔

"پھر وہ دونوں کہاں چلے گئے؟ تمام لوگ اپنی اپنی لالٹینیں لے کر چاروں طرف پھیل گئے۔ بستی میں، بستی کے باہر، اور ساحل پر دور دور تک انہیں تلاش کرتے رہے۔ انہیں آوازیں دیتے رہے اور رات کے سناٹے میں اپنی ہی آوازوں کی بازگشت سنتے رہے پھر رات کے پچھلے پہر تھک ہار کر اپنی اپنی جھگیوں میں آکر سو گئے۔

منگوان کی حماقتوں پر ہنس رہا تھا۔ وہ تراب کے متعلق وثوق سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ وہ زندہ ہے یا مر چکا ہے لیکن رجو کو سمندر کے گہرے پانی میں ڈوبتے ہوئے اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ وہ اب کبھی واپس نہیں آئے گی۔

دوسرے دن بستی کے لوگ سو کر اٹھے تو نہیں رات کی باتیں خواب نظر آنے لگیں۔ تراب کو سمندر پر جاتے

سب نے دیکھا تھا۔ مگر اسے اور اس کی کشتی کو واپس آتے کسی نے نہیں دیکھا تھا اس کی کشتی کے ٹوٹے ہوئے تختے بتا چکے تھے کہ اب وہ کبھی واپس نہیں آئے گا۔ رمضو کی بیوی پاگل ہے جو اس کی واپسی کا قصہ سنا رہی ہے۔ اسی طرح لالہ کا دماغ بھی چل گیا ہے۔ رات کو نیند کی حالت میں نہ جانے کسے دیکھ کر رجو کو پکارتا ہوا گھر سے نکل گیا تھا۔

لوگ مختلف باتیں کرنے لگے۔ کچھ لوگوں کو یقین تھا کہ وہ دونوں زندہ ہیں۔ لیکن پچھلی رات بستی میں آکر کہاں غائب ہو گئے تھے؟ کیوں روپوش ہو گئے تھے؟ اس کی وجہ سمجھ میں نہیں آ رہی تھی اس لیے کچھ لوگ ان کی باتوں کو جھٹلا رہے تھے۔ پھر ہر رات ان کا انتظار ہونے لگا۔ جب وہ ایک بار آئے تھے تو دوسری بار بھی آ سکتے تھے۔ رجو اپنے تراب کے لیے تمبا کو مانگنے اور تراب اپنی رجو کے لیے بیلے کی کلیاں مانگنے ضرور آتا۔ لالہ کی بیوی پڑیا باندھ کر تیار رکھتی تھی۔ رمضو کی بیوی سرِ شام ہی بیلے کی کلیاں ہار اور گجرے کی صورت میں گوندھنے بیٹھ جاتی تھی۔

مگر وہ نہیں آئے۔ لالہ نے افسوس کا اظہار کیا ''کاش کہ میں اسی وقت اسے تمبا کو دے دیتا۔ وہ ناراض ہو کر چلی گئی ہے، اب میرے دروازے پر کبھی نہیں آئے گی''۔ رمضو کی بیوی کا بھی یہی خیال تھا کہ تراب ناراض ہو کر چلا گیا ہے اور ان کے خیال پر اب بستی کے لوگ بے زاری سے کہتے تھے کہ سب خیال ہی خیال ہے اس رات کوئی نہیں آیا تھا۔ سب ان کا وہم ہے۔ رفتہ رفتہ اندھیری راتیں گزرنے لگیں۔ چاند ہر رات جوان ہونے لگا اور چاندنی میں ریت کے ذرے چمکنے لگے۔ ایسے ہی وقت رمضو ساحل کی طرف دوڑتا اور چلاتا ہوا بستی کی طرف آیا ''وہ آ گئے ہیں۔ میں نے انہیں جزیرے پر دیکھا ہے۔ میں نے چیخ چیخ کر آوازیں دی ہیں۔ انہیں واپس آنے کے لیے کہا ہے مگر وہ میری نہیں سن رہے ہیں۔ جلدی چلو۔ کسی طرح انہیں بلاؤ سمندر کی لہریں غضبناک ہو رہی ہیں''۔

جو لوگ رمضو کی باتوں پر یقین کرتے تھے اور جو تراب اور رجو سے دلچسپی رکھتے تھے، وہ فوراً ہی دوڑتے ہوئے ساحل پر چلے گئے۔ چاند آسمان پر مسکرا رہا تھا اور چاندنی جزیرے کو چوم رہی تھی۔ شفاف اور دودھیا چاندنی میں وہ دونوں نظر آ رہے تھے۔ وہ پوری طرح واضح نہیں تھے۔ ان کا وجود کچھ ایسا تھا جیسے وہ شیشے کے بنے ہوں جن کے آر پار سمندر کی لہریں دکھائی دے رہی تھیں۔ نگاہوں کے سامنے جھلملاتی ہوئی چاندنی تھی جو تراب اور رجو کی صورت میں مجسم ہو گئی تھی۔

بستی والے انہیں بچپن سے دیکھتے آئے تھے اس لیے دور سے بھی پہچان رہے تھے اور چیخ چیخ کر انہیں مخاطب کر رہے تھے ''تراب کیا پاگل ہو گئے ہو، رجو کو لے کر آ جاؤ''۔ لہریں رفتہ رفتہ بلند ہو رہی تھیں اور چٹانی جزیرے پر آ کر پھسل رہی تھیں۔ رجو تراب کے شانے سے سر ٹیکے بیٹھی ہوئی تھی، اس کی کھلی ہوئی زلفیں ہوا میں لہرا رہی تھیں اور وہ ایک دوسرے کو محویت سے دیکھ رہے تھے۔

لالے کی بیوی نے چیخ کر کہا ''رجو بیٹی آ جا، واپس آ جا۔ اب کوئی تیرے پیار کے راستے کا پتھر نہیں بنے گا''۔ نمازی بابا نے ذرا آگے بڑھ کر آواز دی ''تراب تو بچپن سے سمندر کے مزاج کو سمجھتا ہے ضد نہ کر، رجو کو لے کر آ جا۔ اب یہ دنیا والے تجھے کچھ نہیں کہیں گے''۔

مگر وہ دونوں خاموش تھے اور سمندر گرج رہا تھا۔ اس وقت جزیرے کے ساحل پر رکھی ہوئی کشتی ایک بپھری ہوئی لہر کی زد میں آ کر الٹ گئی اور دو محبت کرنے والوں کو جھنجھوڑتی ہوئی دوسری طرف چلی گئی۔ لہروں کے دوسرے ریلے میں کشتی کے پرخچے اڑ گئے۔ رمضو کی بیوی چیخیں مار مار کر رو رہی تھی اور تراب کو پکار رہی تھی۔

''آ جا تراب اب آ جا، میں نے تیری رجو کے لیے ہار اور گجرے گوندھ کر رکھے ہیں۔ ارے کیوں اپنی

بھابھی کو رلا رہا ہے''۔لہریں بلند ہوگئیں تھیں۔ان کے سروں پر بکھر رہی تھیں۔پانی کے چھینٹوں اور شفاف بوندوں کی جھالروں میں ان کا وجود جھلمل جھلمل ہو رہا تھا، چاندنی میں جھلک رہا تھا اور لہروں میں چھپ رہا تھا۔پھر وہ لہریں بلند ہوگئیں۔اتنی بلند ہوگئیں کہ وہ جزیرہ کسی اژدھے کے منہ میں چلا گیا۔کچھ عورتیں رو رہی تھیں۔کچھ اپنی آہوں میں آنسوؤں کو چھپا رہی تھیں۔رمضو اور اس کے ساتھی وہاں نہیں تھے۔انہوں نے پہلے پہلے اپنی کشتیاں لے کر جزیرے کی طرف جانے کی کوشش کی تھی، یہ جانتے ہوئے بھی کہ ان لہروں کی مخالف سمت چپو چلانا ناممکن ہے۔انہوں نے دوستی اور دیوانگی میں ایک کوشش کی تھی لیکن لہروں نے انہیں اٹھا کر واپس ساحل پر پھینک دیا۔اور جب انہوں نے ناکام ہوکر جزیرے کی جانب دیکھا تو جزیرہ بھکاری کی پھیلی ہوئی ہتھیلی کی طرح خالی نظر آ رہا تھا۔

O☆O

جب پورے چاند کی رات ہوتی ہے اور دودھیا چاندنی میں بھیگی ہوئی سمندر کی لہریں ساحلی چٹانوں سے ٹکرانے لگتی ہیں تو وہ دونوں اس جزیرے پر آ کر ملتے ہیں مگر وہ منگو کو نظر نہیں آتے۔وہ نفرت کا اندھا ہے اس لیے محبت کی چاندنی میں اسے نظر نہیں آتا۔وہ نہیں جانتا کہ محبت آنکھوں سے دیکھنے کی چیز نہیں ہے وہ دلوں میں دھڑکتی ہے، دماغ سے سوچی جاتی ہے اور عقیدت کی آنکھوں سے کبھی لالہ کے دروازے پر کبھی رمضو کی دہلیز پر اور کبھی جزیرے کی چاندنی میں دیکھی جاتی ہے۔

رجو اور تراب سے محبت کرنے والے ہر ماہ کی چودھویں کو انہیں دیکھتے ہیں اور بڑی عقیدت سے کہتے ہیں۔ سمندر انسان کو تو بہا کر لے جا سکتا ہے لیکن محبت کو کبھی نہیں ڈبو سکتا''۔

جب تمام لوگ سر جھکا کر چلے جاتے ہیں تو لالے کی بیوی اور تراب کی بھابھی آہستہ آہستہ سر جھکا کر گھٹنے گھٹنے پانی میں آتی ہیں پھر ایک عورت تمباکو کی پڑیا اور دوسری عورت بیلے کی تازہ کلیاں لہروں میں بہا دیتی ہے۔کہیں کسی گوشۂ تنہائی میں کوئی بانکا جوان ماہی گیر اپنی محبوبہ سے کہتا ہے''تراب کی قسم میں تیرا ہوں صرف تیرا......''

کوئی البیلی مچھیرن اپنے محبوب کے شانے پر سر رکھ کر کہتی ہے''رجو کی قسم! مجھے بھی پیار کا سلیقہ آ گیا ہے۔ آج سے میں تیری ہوں صرف تیری......''

☆O......O☆

ممتا کی واپسی

ایک نیم مردہ بچے کی تین سگی ماؤں
کی کہانی، وہ مائیں اس بچے کی سلامتی
کے لیے اپنی اپنی ممتا کو سوتیلی ماؤں
کی طرح کچل رہی تھیں۔

طیارے کی کھڑکی کے باہر صاف و شفاف بادل دھوئیں کی طرح بل کھاتے ہوئے گزر رہے تھے۔ پانچ برس کا جانی کھڑکی کے شیشے کو اپنی ننھی انگلیوں سے یوں نوچ رہا تھا جیسے اڑتے ہوئے بادلوں کو پکڑنے کی کوشش کر رہا ہو۔ وہ بیچارہ تو ایک ناسمجھ بچہ تھا بڑی عمر کے سمجھ دار لوگ بھی ہر اس چیز کو پکڑنے کی کوشش کرتے ہیں جو ان کی دسترس سے باہر ہوتی ہے۔

وہ ایک فلائنگ کلب کا طیارہ تھا۔ اس میں صرف ایک پائلٹ اور تین مسافروں کے لیے گنجائش تھی۔ ایک مسافر ننھا جانی تھا باقی دو مسافر اس کے ممی اور ڈیڈی تھے۔ بڑے آدمیوں کی بڑی باتیں ہوتی ہیں۔ انہوں نے اپنے بیٹے جانی سے وعدہ کیا تھا کہ اس کی پانچویں سالگرہ کی خوشی میں اسے ہوائی جہاز کی سیر کرائیں گے۔ سو وعدہ وفا ہو رہا تھا۔

ماں اپنے بیٹے کی طفلانہ حرکتوں کو دیکھ دیکھ کر قربان ہو رہی تھی۔ ممتا کے جذبے سے مسکراتی ہوئی آنکھیں یوں بھیگی بھیگی سی تھیں جیسے مسرتوں کے جام لبریز ہو کر چھلکنے کو تیار ہوں۔ باپ کی آنکھوں سے اطمینان جھلک رہا تھا۔ ایک طویل مدت کے تھکا دینے والے انتظار کے بعد وہ پیارا سا بچہ ان کی گود میں آیا تھا۔ سب ہی بچوں کے ذہن میں یہ تجسس ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا میں یا اپنے والدین کی گود میں کہاں سے آئے ہیں؟ یہ بہت ہی مشکل سوال ہے۔ دنیا کی کوئی ماں اور کوئی باپ آج تک اپنے بچے کو صحیح جواب نہ دے سکا۔ بس یہ کہہ کر ٹال دیا کہ تم اللہ میاں کے پاس سے آئے ہو۔

لیکن جانی کے متعلق اس کے والدین خود نہیں جانتے تھے کہ وہ کہاں سے آیا ہے؟ ایسے ہی وقت خدا کی دین کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ وہ بانجھ عورت کی گود میں بھی پھول کھلا دیتا ہے۔ جانی کی ممی اپنے کھلے ہوئے پھول کو دیکھ کر خوشی سے کھلی جا رہی تھی۔ اس نے جانی کو گرم سوٹ پہنا دیا تھا کہ ہلکی سی سرد ہوا بھی اسے نقصان نہ پہنچائے۔ ماؤں کے پاس ایسا کوئی لباس نہیں ہوتا جسے وہ بچے کو پہنا کر موت کے سرد ہاتھوں سے تمام عمر بچاتیں رہیں۔ لے دے کر صرف دعائیں ہوتی ہیں۔

"خدایا میرے بچے کو قیامت کی عمر لگ جائے۔ زندگی اسے کبھی ٹیڑھی نظر سے نہ دیکھے اور موت ہمیشہ اسے

طرح دے جائے۔ خدایا......"

اچانک ہی جہاز کو ایک ہلکا سا جھٹکا لگا۔ کچھ ایسی آوازیں آنے لگیں جیسے جہاز کا موٹر ناراض ہو رہا ہو۔ اس کے ساتھ ہی ماں باپ کے دل و دماغ کو جھٹکے لگنے لگے۔ انہوں نے گھبرا کر اپنے جانی کو دیکھا۔ بیٹا بہت خوبصورت تھا۔ والدین کی جان سے سے زیادہ قیمتی تھا لیکن حادثے کسی کی قدر و قیمت کو نہیں سمجھتے۔ جہاز کا موٹر بیمار ہو چکا تھا۔ اس بیمار کو رہ رہ کر کھانسی کے جھٹکے لگ رہے تھے اور جہاز دائیں بائیں ڈول رہا تھا۔ پھر کھڑکی کے شیشے کے پار نیلا آسمان گردش میں آگیا۔ پانچ برس کے جانی کے لیے وہ عجیب تماشہ تھا کہ جن سفید بادلوں کو وہ پکڑنا چاہتا تھا وہ اوپر تلے ڈوبتے ابھرتے جا رہے تھے۔ کیا موت اسی طرح جھولا جھلاتی ہے؟

پہاڑ کی وہ عمودی سیاہ چٹان یوں کھڑی تھی جیسے انگلی دکھا رہی ہو "خبردار! میری طرف نہ آنا، کون جانتا ہے کہ تم ٹوٹ جاؤ گے یا میری انگلی ٹوٹ جائے گی۔ خبردار! آگے نہ بڑھنا......"

مگر وہ عمودی چٹان گویا ایک مقناطیس تھی۔ جہاز اس کی طرف کھنچا جا رہا تھا جیسے بچپن جوانی کی طرف جوانی بڑھاپے کی طرف اور بڑھاپا موت کی طرف کھنچا جاتا ہے لیکن جانی تو ابھی بچہ تھا۔ کیا موت بچپن کے حسن کو اور ماں کے دودھ کے چٹخارے کو بھی نہیں پہچانتی؟

یکبارگی زور کا دھماکہ ہوا۔ ایسا زوردار دھماکہ کہ آسمان کے پھٹنے سے نہیں، ماں کی چھاتی پھٹنے سے ہوتا ہے۔ کون جانتا ہے کہ بصد شوق بچے کی سالگرہ منانے والوں پر کیا گزری؟ پہاڑ کی مغرور بلندی پر چند لمحوں کے لیے قیامت برپا ہوئی۔ پھر ایک دم سناٹا چھا گیا۔ سیاہ عمودی چٹان کی "خبردار" کہنے والی انگلی ٹوٹ چکی تھی۔

O☆O

بانو دکان کے اندر کھلونوں اور کتابوں کو ترتیب سے رکھ رہی تھی۔ اس کی ماں دکان کے باہر رعایتی سیل کا بورڈ لگا رہی تھی۔۔ بورڈ پر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔

"صرف ایک روپے میں آپ اپنی پسند کی کوئی بھی چیز خرید سکتے ہیں"۔

لوگ آ رہے تھے اور اپنی پسند کی چیزیں خرید رہے تھے۔ ایک بری فوج کا کیپٹن ٹہلتا ہوا وہاں پہنچ گیا۔ فوج کی وردی میں ملبوس وہ بہت ہی اسمارٹ نظر آ رہا تھا۔ اس نے بانو کی بوڑھی ماں سے کہا۔

"ماں جی یہ جنگ کا زمانہ ہے، فوجی گاڑیاں یہاں سے کسی وقت بھی گزر سکتی ہیں اور آپ نے دکان کا سامان یہاں راستے تک پھیلا دیا ہے۔ پلیز! یہ سامان اپنی دکان تک محدود رکھیں"۔

ایسا کہتے وقت اس کی نظریں بھٹکتی ہوئی دکان کے اندر گئیں پھر بانو پر ٹھہر گئیں۔ وہ گلابی رنگ کے لباس میں گلابی گلابی سی لگ رہی تھی۔ آفیسر سے نظریں ملتے ہی وہ گلابی سے سرخی مائل ہوگئی۔ اجنبی نگاہوں کی دھوپ رنگ حسن کا مزاج بدل دیتی ہے۔ اس کی ماں آفیسر سے معذرت چاہ رہی تھی اور وعدہ کر رہی تھی کہ وہ جلدی تمام سامان راستے سے ہٹالے گی۔ آفیسر نے مسکرا کر کہا۔

"ماں جی! کوئی بات نہیں۔ جب فوجی گاڑیوں کے گزرنے کا وقت آئے گا تو میں آپ کو بتا دوں گا۔ ابھی آپ اطمینان سے دکانداری کریں"۔

"آفیسر تم کتنے اچھے ہو۔ کتنے مہربان ہو۔ آؤ میری دکان سے کوئی چیز پسند کرو"۔

اس نے دور بانو کی طرف نظریں دوڑاتے ہوئے کہا۔
''بے شک پسند کروں گا لیکن قیمت ادا کروں گا۔ میں رشوت پسند نہیں کرتا کیونکہ میں خدا سے ڈرتا ہوں''۔
بوڑھی عورت نے حیرانی سے پوچھا۔
''اوہ آفیسر! کیا تم مسلمان ہو؟''
''الحمدللہ لیکن آپ کو حیرانی کیوں ہے؟''
''اس لیے کہ تم ہندوستانی فوج کے سپاہی ہو''۔
اس نے ہنستے ہوئے کہا''تو کیا ہوا۔ بھارتی سینا میں مسلمان سپاہی بھی ہوتے ہیں۔ یہ دیس ہم سب کا ہے''۔
وہ مسکراتا ہوا دکان کے شوکیس کے پاس آگیا۔ بانو ایک گاہک سے نمٹ رہی تھی۔ جب وہ چلا گیا تو اس نے کیپٹن سے پوچھا''فرمایئے''۔
اس نے دکان کے باہر بورڈ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔
''اس بورڈ پر لکھا ہوا ہے کہ ایک روپے میں کوئی بھی چیز خریدی جاسکتی ہے''۔اس نے بانو کے چہرے پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا''کیا کوئی بھی چیز؟''
''جی ہاں۔کوئی بھی......'' وہ کہتے کہتے چونک گئی۔کیپٹن اسے مسکرا کر دیکھ رہا تھا پھر اس نے جیب سے ایک روپیہ نکال کر اس کی طرف بڑھا دیا۔
بانو کو میٹھا میٹھا سا خطرہ محسوس ہوا۔اس کی امی اسے نصیحتیں کرتی رہتی تھی کہ وہ مردوں کی بے تکلفی اور لچھے دار باتوں سے خود کو بچا کر رکھے۔ایک بار وہ فریب کھا چکی ہے، اب اسی فریب کے آئینہ میں اجنبی مردوں کا چہرہ دیکھنا چاہیے۔لہٰذا بانو نے اس ایک روپے کو قبول کرنے کے بجائے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
''آپ یہ تو بتائیں خریدنا کیا چاہتے ہیں؟''
''سب سے حسین چیز......اگر چہ یہ انمول ہے، دنیا کے سارے دولت منداس کی قیمت ادا نہیں کر سکتے۔ یہ ایک روپیہ تو میں اس دکان کے اصول کے مطابق دے رہا ہوں''۔
بانو کا دھڑکتا ہوا دل کہنے لگا۔''واقعی یہ مرد لچھے دار باتیں کرتے ہیں۔ایک بات کے پیچھے اپنے مطلب کی دوسری بات کہہ جاتے ہیں۔آفیسر کی اس بے باکی پر مجھے غصہ کا اظہار کرنا چاہیے مگر میرا دل کیوں دھڑک رہا ہے؟''
اس نے ایک دم گھبرا کر ماں کو آواز دی۔ ماں تیزی سے چلتی ہوئی آئی''کیا بات ہے بانو؟''
بانو کے بولنے سے پہلے کیپٹن نے کہا۔
''میں آپ کی بیٹی کو یہ روپیہ دے رہا ہوں۔ یہاں سے کچھ خریدنا چاہتا ہوں''۔
بانو اس کی بے باکی پر بوکھلا گئی۔ ماں نے محبت سے پچکارتے ہوئے کہا۔
''بیٹی تم پریشان کیوں ہوگئیں؟ آفیسر جو مانگ رہے ہیں وہ دے دو''۔
''مم......مگر امی مجھے ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آتیں۔آپ پوچھ لیں کہ یہ کیا چاہتے ہیں؟''
وہ کاؤنٹر سے ہٹ کر دکان کے دور افتادہ حصہ میں چلی گئی پھر خود کو دوسرے کاموں میں لگا کر اس کی طرف سے منہ پھیر لیا۔مگر کان اس کی آواز پر لگے رہے، وہ کہہ رہا تھا۔

''ماں جی! کیا میں آپ کو امی کہہ سکتا ہوں؟''

ماں کی باچھیں کھل گئیں ''ضرور میرے بیٹے! تمہارے ماں باپ کہاں ہیں؟''

''میرا کوئی نہیں ہے میں اتنی بڑی دنیا میں بالکل تنہا......''

اتنا کہتے کہتے اس کا لہجہ شیشہ دل کی طرح تڑخ گیا۔ ماں کے دل سے آہ نکلی۔ بانو کے دل نے کہا ''بیچارہ!'' پہلے پہل درد کے رشتے اسی طرح ہمدرد بنتے ہیں۔ پہلے کسی اجنبی دل کے خلا میں جھانک کر دیکھا جاتا ہے پھر محبت اس دل کے خالی کیسٹ میں اپنی آواز ریکارڈ کرتی ہے۔

ایسا سوچتے ہی بانو چونک گئی۔ ''ہائے! یہ میں کیا سوچ رہی ہوں۔ کوئی اس دنیا میں تنہا ہے توجہ اور ہمدردی کا مستحق ہے تو ہوا کرے۔ میرے دل نے جو زخم کھائے ہیں، ان کے لیے اب میرے پاس آنسوؤں کا مرہم بھی نہیں ہے۔ میں روتے روتے تھک گئی ہوں۔ اب میں کوئی نیا روگ نہیں لگاؤں گی۔ اب اس کی باتیں نہیں سنوں گی''۔

وہ نگاہیں چرا سکتی تھی، منہ پھیر سکتی تھی مگر اپنے کان بند نہیں کر سکتی تھی۔ وہ کہہ رہا تھا۔

''امی آپ کی صورت ہو بہو میری امی جیسی ہے۔ بالکل ایسا ہی ممتا کا نور ہے۔ آپ کو دیکھتے ہی بے اختیار امی کہنے کو جی چاہنے لگا''۔

ماں نے بڑے پیار سے اس کا ہاتھ تھام لیا ''آج سے میں تمہاری امی ہوں۔ دکان کے اندر آؤ میں تمہیں دودھ پتی کی چائے پلاؤں گی''۔

وہ دکان کے اندر تو کیا، دل کے اندر جا کر بیٹھنا چاہتا تھا۔ اس نے بانو کو چور نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

''امی ابھی میں ڈیوٹی پر ہوں، شام کو فرصت ملے گی۔ میں آپ کو بتا دوں کہ آج میری پیدائش کا دن ہے۔ میں مایوس تھا کہ تنہا کس طرح سالگرہ مناؤں لیکن اب آپ کی ممتا نے تنہائی کا دکھ سمیٹ لیا ہے۔ میں آپ کو اور آپ کی صاحبزادی کو...... میرا مطلب ہے آپ کے گھر والوں کو ڈنر میں شریک کرنا چاہتا ہوں۔ کیا آج رات آپ میرے ساتھ لگژری ہوٹل چلیں گی''۔

''نہیں بیٹے۔ یہ تکلف نہ کرو۔ میں تمہیں فضول خرچی کی اجازت نہیں دوں گی''۔

''آپ بڑی خوبصورتی سے میری دعوت کو ٹھکرا رہی ہیں''۔

''تم غلط سمجھ رہے ہو۔ ماں اپنے بچوں کا دل کبھی نہیں توڑتی۔ میں اپنے گھر میں سالگرہ کا اہتمام کروں گی۔ شام کو چھٹی ہوتے ہی یہاں چلے آنا۔ میرا گھر یہاں سے دور نہیں ہے''۔

''او امی! یو آر گریٹ! تین برس کے بعد میں ایک گھر میں باقاعدہ سالگرہ مناؤں گا۔ یہ خوشیاں مجھے آپ ہی کے دم سے مل رہی ہیں''۔

بانو نے ذرا سر گھما کر اسے دیکھا۔ اتنے بڑے آفیسر کے چہرے پر بچوں جیسی خوشیاں دیکھ وہ بے اختیار مسکرانے لگی۔ کیپٹن نے اچانک اس کی طرف دیکھا تو وہ جھینپ گئی۔ فوراً ہی سر گھما کر بے کام کے کام میں مصروف ہو گئی۔

کیپٹن کے دل نے کہا ''وہ مارا''۔

بانو کے دل نے کہا ''ہائے میں مر گئی۔ کہیں وہ میری مسکراہٹ کا مطلب غلط نہ سمجھ بیٹھے۔ پھر کیا ہوگا؟''

وہ واپس جا رہا تھا۔ ماں نے پوچھا ''بیٹے تم کوئی چیز خریدنے والے تھے خالی ہاتھ کیوں جا رہے ہو؟''

اس نے پلٹ کر بانو کو دیکھا پھر ماں کو دیکھ کر کہا۔

''میں نے یہاں سے انمول چیز خریدی ہے اور وہ ہے محبت......''

بانو کا دل دھک سے رہ گیا جیسے محبت کے ایک لفظ نے دھکا مارا ہو۔ جوانی کی شاہراہ پر جذبوں کا آتا جاتا ہجوم ہو تو کہیں نہ کہیں سے ضرور دھکا لگتا ہے اور دھکا مارنے والے بڑی لاپروائی سے گزر جاتے ہیں۔ بانو نے ذرا سنبھل کر دیکھا تو وہ جا چکا تھا۔

اس کی ماں بظاہر چپ چاپ کھڑی اوجھل ہونے والے سپاہی بیٹے کو دیکھ رہی تھی۔ لیکن اس کی نظریں دائیں طرف ایک آئینے پر بھی تھیں جس میں بانو دکھائی دے رہی تھی۔ وہ سوچ رہی تھی اور الجھ رہی تھی۔ بیٹی کو الجھتے دیکھ کر ماں کے احساسات دکھنے لگے۔ جوانی کی ایسی کڑی دھوپ میں لڑکیاں محبت کی چھاؤں تلاش کرتی ہیں اور بانو محبت کی چھاؤں میں جل گئی تھی۔ ماں فکر مند ہو گئی کہ اب کیا ہو گا۔ بیٹی پہاڑ جیسی جوانی کیسے گزارے گی؟ کیا ہمیشہ شادی کے خیال سے سہم جایا کرے گی؟''

وہ زیادہ دیر تک سوچ نہ سکی۔ آتے جاتے گاہکوں نے اس کا دھیان بیٹی کی طرف سے ہٹا دیا۔ شام ہوتے ہی بلیک آؤٹ کی وجہ سے دکانیں جلد بند ہو جاتی تھیں اس لیے ماں بیٹی بھی دکان بڑھانے لگیں۔ ماں نے کہا۔

وہ ابھی تک نہیں آیا۔ میں بھی عجیب ہوں۔ اسے بیٹا بنایا مگر اس کا نام پوچھنا بھول گئی۔ تم نے پوچھا تھا بانو؟''

''آں نہیں تو، میں بھلا کیوں کسی کا نام پوچھوں؟''

''ایسا نہ کہو بیٹی۔ سب ہی مرد آصف کی طرح نہیں ہوتے۔ یہ لڑکا اچھا ہے پھر بالکل اکیلا ہے۔ اسے ہماری محبت ملے گی تو یہ کبھی ساتھ نہیں چھوڑے گا''۔

''امی ہم دکاندار ہیں۔ یہاں گاہک جانے کے لیے آتے ہیں اور وہ آ کر جا چکا ہے۔ اب آپ دکان بڑھائیں''۔

''نہیں بانو! میں کچھ دیر اس کا انتظار کروں گی۔ تم گھر جا کر سالن اور بریانی تیار کرو۔ میں برتھ ڈے کیک لے آؤں گی''۔

وہ دل ہی دل میں بڑبڑاتی ہوئی دکان سے باہر نکل آئی۔ باہر رعایتی سیل کا بورڈ لگا ہوا تھا۔ اس نے سوچا ''امی کا بس نہیں چلتا ورنہ مجھے بھی رعایتی شرط پر کسی کے ساتھ چلتا کر دیتیں۔ یہ بھی کوئی بات ہے دو گھڑی کی جان پہچان میں دعوت کا انتظام کر رہی ہیں، اس کی سالگرہ منانے والی ہیں''۔

ماں پچھلے دو برس سے کسی بھی خوبرو اور کماؤ پوت شریف زادے کو ایسی نظروں سے دیکھتی آ رہی تھی جیسے وہ اس کی بانو کے لیے پیدا کیا گیا ہو۔ لیکن ہندوستان میں مسلمان لڑکے کہاں رہ گئے تھے۔ معلوم ہوتا تھا سب کے سب پاکستان چلے گئے ہیں۔ کسی نے نہیں سوچا کہ بانو جوان ہو گی تو اس کا کیا بنے گا؟ اسی لیے جب کوئی مسلمان لڑکا بھولے سے نظر آ جاتا تو ماں اس پر واری صدقے ہونے لگتی تھی۔

بانو راستے کے کنارے ٹھٹک گئی۔ وہ فوجی وردی میں ملبوس چند قدم کے فاصلے پر کھڑا مسکرا رہا تھا۔ سپاہی جانتا ہے کہ مورچہ کہاں بنانا چاہیے۔ اس نے بانو کو شرماتے دیکھ کر کہا۔

''تمہاری سہمی ہوئی، جھجکی ہوئی اور شرماتی ہوئی ادائیں بتا رہی ہیں کہ تم کنواری اور اچھوتی ہو اور مجھ سے پہلے کسی نے تمہارا راستہ نہیں روکا ہے''۔

بانو کو یوں لگا جیسے سپاہی اپنی بندوق کی گولی سے اس کے سینے کو داغ رہا ہے۔ وہ جلدی سے بولی۔
''امی نے آپ کے انتظار میں دکان ابھی تک بند نہیں کی۔ آپ کو فوراً وہاں جانا چاہیے۔''
''میں جان بوجھ کر دکان کی طرف نہیں گیا۔ میں نے سوچا کہ دعوت کے سلسلے میں کچھ پکانے کے لیے تمہاری امی گھر جائیں گی تو دکان میں آ کر تم سے دل کی بات کہوں گا مگر وہ دکان میں رہ گئیں اور تم شاید گھر جا رہی ہو چلو یوں بھی کام بن رہا ہے تم ناراض تو نہیں ہو''۔
وہ ناراض کیوں ہوتی؟ اسے تو اپنی قدر و قیمت کا اندازہ ہو رہا تھا وہ راستے کے کنارے یوں انتظار کر رہا تھا جیسے اپنی تقدیر کا راستہ دیکھ رہا ہو۔ جیسے اپنی وردی پر اسے تمغہ کی طرح سجانا چاہتا ہو۔ ایسے میں کوئی لڑکی ناراض نہیں ہوتی۔ صرف رسماً اعتراض کرتی ہے۔
''آپ کو ایسی باتیں نہیں کرنی چاہئیں''۔
''میں نے آج تک کسی لڑکی سے دل کی بات نہیں کی۔ میں نہیں جانتا کہ کیسے کہنا چاہیے؟ کس طرح ابتدا کرنی چاہیے۔ عام سا طریقہ یہ ہے کہ اجنبیت دور کرنے کے لیے پہلے اپنا تعارف کرایا جاتا ہے۔ تمہارا نام تو مجھے معلوم ہو چکا ہے۔ ایران میں کنواری لڑکیوں کو بانو کہہ کر مخاطب کیا جاتا ہے''۔
پھر وہی کنوار پن کی بات اس نے کہہ دی۔ بانو نے تیزی سے قدم آگے بڑھا دیئے تاکہ اس سے آگے نکل جائے۔
''بھئی اتنی تیزی سے نہ چلو۔ کیا مجھے اپنے ساتھ چلنے کا حق نہیں دو گی؟ کم از کم میرا نام تو پوچھ لو کبھی کام آئے گا۔
''امی آپ کا نام پوچھنا بھول گئیں تھیں۔ آپ انہیں بتا دیں''۔
''میں انہیں بتاؤں گا۔ پھر وہ تمہیں بتائیں گی۔ پھر تم اپنے دل کو بتاؤ گی پھر تمہارا دل اپنی دھڑکنوں کو بتائے گا۔ کسی کا نام تھانے کچہری میں بھی اتنا نہیں گھومتا جتنا تم گھمانا چاہتی ہو''۔
بانو کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔ وہ اپنی سنجیدگی برقرار نہ رکھ سکی۔ اپنے ہنستے کھلکھلاتے لبوں کو ہتھیلی کی آڑ میں چھپا کر بولی۔
''آپ بہت زیادہ بولتے ہیں''۔
''ابتدائی مرحلے پر لڑکیاں شرماتی ہیں۔ اس لیے خود بولنا چاہیے۔ اس کے بعد وہ بولنے کا موقع نہیں دیتیں''۔
''آپ کو لڑکیوں کی دوستی کا خاصا تجربہ ہے''۔
''ہاں میں نے دو بار قسمت آزمائی کی مگر قسمت میرے صبر کو آزماتی رہی۔ پہلی بار میں نے محبت کی مگر وہ میری ہم مزاج نہیں تھی۔ اس لیے میں نے اسے چھوڑ دیا۔ دوسری بار لڑکی میرے معیار کے مطابق تھی مگر اس نے مجھے چھوڑ دیا''۔ اس نے بانو کو دیکھتے ہوئے کہا ''پتا نہیں تیسری بار کیا ہوگا''۔
بانو نے دھڑکتے ہوئے دل سے کہا ''بار بار دھوکا کھانے سے بہتر ہے کہ کسی خالص محبت کی توقع نہ کی جائے''۔
''یہ کیسے ہو سکتا ہے'' کیپٹن نے کہا ''ہم ٹریفک کے ہجوم سے گزرتے ہیں، یہ جانتے ہوئے بھی کہ کبھی نہ کبھی حادثہ پیش آئے گا ہم راستوں پر چلنا چھوڑ تو نہیں دیتے۔ ہم جانتے ہیں کہ ایک انسان دوسرے انسان کو محبت کا فریب دیتا ہے پھر بھی ہم کسی نہ کسی سے محبت کیے بغیر نہیں رہ سکتے۔ یہ نہ ہو تو دنیا میں گولے بارود اور فوجی وردی کے سوا کچھ نہ رہے''۔
بانو کے دل نے تائید کی ''ہاں محبت کے بغیر ہر خوشی کھوکھلی سی لگتی ہے۔ کسی کو پیار سے کچھ دیئے اور کچھ لیے بغیر رہا

نہیں جاتا۔اسی لیے محبت ہماری زندگی میں موت کی طرح اٹل ہے، ضرور آتی ہے اور بڑی خوبصورتی سے مارتی رہتی ہے''۔

وہ محبت کے مارے اندر ہی اندر مرنے لگی۔اس کے دل نے کہا''یہ آفیسر کچھ اور بولے۔کم از کم اپنا نام ہی بتا دے۔نام نہیں بتائے گا تو پھر کس نام سے خیالوں میں آئے گا''

''آپ باتیں کرتے کرتے کتنی دور آ گئے ہیں، آپ کو امی کے پاس جانا چاہیے''۔

''چلا جاؤں گا اور انہیں اپنا نام بھی بتا دوں گا کہ میرا نام سرتاج حسین ہے مگر تم چاہو تو سرتاج کہہ سکتی ہو''۔

سرتاج۔یہ لفظ بڑا ہی محبت پرور اور پائیدار ہوتا ہے۔عورت کا محافظ ہوتا ہے، اس کی عزت و آبرو اور مستقبل کا ضامن ہوتا ہے۔مگر یہ لفظ پان کی پیک کی طرح بانو کے منہ پر پڑا اور دل کے لہو میں گھل گیا۔اسے آصف یاد آیا جو سرتاج بن کر آیا تھا اور سر کی چادر نوچ کر لے گیا تھا۔وہ کیپٹن سرتاج حسین سے دور بھاگتی چلی گئی۔اچھا ہوا کہ گھر سامنے آ گیا تھا۔وہ مکان میں گھستے ہی دروازے بند کر کے دیکھنے والے کی نظروں سے چھپ گئی۔

سرتاج حسین دور کھڑا تھوڑی دیر تک بند دروازے کو دیکھتا رہا اور سوچ کر مسکراتا رہا کہ اس نے اپنے نام کا فائدہ اٹھا کر سرتاج والی بات خوب کہی۔شادی اور سرتاج کے ذکر پر کون کنواری نہیں شرماتی۔اسی لیے وہ شرما کر بھاگ گئی۔انسان کبھی کبھی خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے۔وہ مسکراتا ہوا دکان کی طرف واپس چلا گیا۔

بانو دروازے کے پیچھے کھڑی ایسے مرد کے خیال سے کانپتی رہی جو شوہر بن کر آتا ہے اور سہاگ کے نام پر سب کچھ لوٹ کر چلا جاتا ہے۔اس کے پاؤں کانپ رہے تھے، سر چکرا رہا تھا۔کوئی اور وقت ہوتا تو وہ چولہے کے پاس کبھی نہ جاتی، بستر پر جا کر گر پڑتی اور خوب پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کر دیتی لیکن ماں نے آج رات پھر ایک مہمان کے لیے دستر خوان بچھانے کا فیصلہ کیا تھا۔شرافت کے دائرے میں...... جوان بیٹیوں کو اسی طرح نگاہوں کے سامنے بچھایا جاتا ہے۔وہ ماں کے سر سے اپنا بوجھ اتارنے کے لیے باورچی خانے میں یوں جانے لگی جیسے خود کو چولہے میں جھونکنے جا رہی ہو۔

○☆○

گمشدہ طیارے کے پائلٹ سے رابطہ قائم نہیں ہو رہا تھا۔کنٹرول ٹاور کے ریڈیو آپریٹر نے آخری بار اسے کال کیا پھر مایوس ہو کر اس نے ٹیلی فون ریسیور اٹھایا اور ٹریفک کنٹرول سینٹر کے نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔

''ہیلو، میں کنٹرول ٹاور سے ریڈیو آپریٹر بول رہا ہوں۔فلائنگ کلب سے ایک چارٹرڈ کیے ہوئے طیارے ایف سی ون ٹو او ٹو کا پائلٹ خاموش ہے، بار بار کال کرنے کے باوجود جواب نہیں مل رہا ہے۔اس طیارے کو فوراً تلاش کیا جائے''۔

دوسری طرف سے کنٹرول سینٹر کے کیپٹن نے پوچھا۔

''اس طیارے سے آخری بار کب رابطہ ہوا تھا؟''

''صبح ساڑھے نو بجے۔اس وقت وہ شمال کی طرف یہاں سے پچیس میل کے فاصلے پر تھا''۔

''ٹھیک ہے۔ابھی ایک پارٹی اسے تلاش کرنے کے لیے روانہ کی جائے گی''۔

اس گفتگو کے بیس منٹ بعد ایک طیارہ شمال کی جانب پرواز کر رہا تھا۔وہاں سے فاصلہ زیادہ نہ تھا۔جلد ہی ایئر سرچ پٹرول کے پائلٹ نے اس سیاہ عمودی چٹان کی ٹوٹی ہوئی انگلی دیکھ لی۔پھر طیارے میں بیٹھنے والے سارجنٹ کو اطلاع دی۔

''ہم جائے حادثہ کے قریب پہنچ چکے ہیں۔کیمرے تیار رکھے جائیں۔میں عمودی چٹان کے اطراف دو چکر

لگاؤں گا۔ میرا خیال ہے دو راؤنڈ کافی ہوں گے''۔

سارجنٹ کا جواب ملتے ہی پائلٹ ایک دائرہ کی صورت میں طیارے کو موڑنے لگا۔ کیپٹن آنکھوں سے دوربین لگا کر دیکھنے لگا۔ چٹان کی وسیع آغوش میں ایک ٹوٹا ہوا، بکھرا ہوا طیارہ نظر آرہا تھا۔ کیپٹن نے دوربین سے نظریں ہٹا کر دوسری کھڑکی کی جانب دیکھا وہاں سارجنٹ کیمرے پر جھکا ہوا تصویریں اتارنے میں مصروف تھا۔ وہ سوچنے لگا کہ آہنی طیارے کے پرخچے اڑ گئے ہیں۔ کیا انسانی جسم سلامت ہوں گے؟''

اس کا جواب تصویروں سے مل سکتا تھا۔ پینتالیس منٹ کی پرواز کے بعد جب وہ کنٹرول سینٹر میں واپس آئے تو سارجنٹ فوراً ہی تصویروں کو ڈیولپ اور انلارج کرنے ڈارک روم میں چلا گیا۔ کیپٹن بے چینی سے ادھر ادھر ٹہلنے لگا۔ بے چینی اس قدر تھی کہ بار بار سگریٹ کے لمبے لمبے کش لگا رہا تھا۔ ایک وقت آتا ہے کہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہو جاتی ہیں لہٰذا وہ گھڑیاں بھی گزر گئیں۔ سارجنٹ ڈارک روم سے باہر آیا پھر اس نے گیلی تصویریں سامنے پھیلا دیں۔

کیپٹن محدب شیشہ اٹھا کر باری باری ان تصویروں کو دیکھنے لگا۔ جہاز کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کے درمیان انسانی جسم گڈے گڈیوں کی طرح اوندھے سیدھے پڑے ہوئے تھے۔ ان میں ایک مرد تھا، ایک عورت تھی اور مرد کے قدموں کے پاس ایک بچہ نظر آرہا تھا۔ طویل فاصلے سے کھینچی ہوئی تصویروں کو دیکھ کر یہ کہنا مشکل تھا کہ وہ بچہ ہے یا بچی؟ وہ جو بھی ہو کیپٹن اسے دیر تک نہ دیکھ سکا۔ کیونکہ اتنا بڑا اس کا بچہ بھی تھا۔ تصویر کو دیکھتے ہی اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس نے مردہ سی آواز میں کہا ''سب کے سب مر چکے ہیں''۔

''بہت ہی المناک حادثہ ہوا ہے۔ ایسے حادثہ میں کوئی بھی زندہ نہیں بچ سکتا۔ اب ان لاشوں کو وہاں سے لانے کا مسئلہ ہے کیونکہ وہ عمودی چٹان بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ہے''۔

وہ فون پر گفتگو کر رہا تھا اور سارجنٹ محدب شیشہ کے آر پار ان تصویروں کو دیکھ رہا تھا۔ یکبارگی وہ چونک کر اچھل پڑا اور چیخ کر بولا۔

''سر! اسے دیکھیے ...... یہ ...... یہ اس تصویر کو دیکھیے بچہ زندہ ہے''۔

کیپٹن کے ہاتھ سے ریسیور چھوٹ کر گر پڑا۔ اس نے بھی جواباً حیرت سے چیخ کر پوچھا ''کیا واقعی بچہ زندہ ہے''۔

O☆O

چولہے کی آنچ دو طرفہ تھی۔ ایک طرف سالن پک رہا تھا دوسری طرف بانو پک رہی تھی۔ اس کے دماغ کے چولہے پر آصف کی یادیں ابل رہی تھیں۔ ایسا تو ہوتا ہے کہ ایک دل سے جاتا ہے تو دوسرا اس خالی دل کے آنگن میں آجاتا ہے۔ آج سرتاج حسین آرہا تھا۔ کچھ اسی طرح آصف بھی آیا تھا بلکہ وہ عشق و محبت کے مراحل سے گزر کر نہیں بلکہ سیدھے سادے انداز میں دولہا بن کر اس کے گھونگھٹ تک پہنچ گیا تھا۔

بانو نے گھونگھٹ کے پیچھے سے پہلی بار اسے دیکھا تھا۔ ماں نے پہلے ہی سمجھا دیا تھا ''دیکھو بیٹی! مرد کی صورت شکل نہیں دیکھی جاتی۔ بس یہ دیکھا جاتا ہے کہ وہ ہاتھ پاؤں کا مضبوط ہو اور برائی نظروں سے بچا کر رکھ سکتا ہو۔ وہ جیسا بھی ہو آخر مجازی خدا ہوتا ہے''۔

ماں نے آصف کو بیٹی کے لیے پسند کیا تھا اس لیے شادی سے پہلے صفائی پیش کر دی تھی کہ آصف بہت زیادہ خوبصورت نہیں ہے اور بدصورت بھی نہیں ہے۔ وہاں ہر وقت یہ دھڑکا لگا رہتا تھا کہ پتا نہیں کب ہندو مسلم فسادات شروع ہو

جائیں اور ہندو غنڈے بانو کو اٹھا کر لے جائیں۔ ماں چھاتی پیٹتی رہ جائے گی کوئی عزت بچانے والا نہ ہوگا۔ اگر اس کی شادی ہو جائے تو گھر میں ایک مرد آ جائے گا۔ اس بات کا اطمینان رہے گا کہ غنڈے بے باکی سے حملہ نہیں کریں گے۔

حالات ایسے تھے کہ بانو کسی آئیڈیل کا تصور نہیں کر سکتی تھی اور نہ ہی خوابوں کے شہزادے کا انتظار کرنے کے لیے سال دو سال جوانی کی دہلیز پر بیٹھی رہ سکتی تھی۔ آئے دن یہ خبریں سننے میں آتی تھیں کہ ہندوستان کے بڑے بڑے شہروں میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی جا رہی ہے۔ ان کے شہروں میں آگ اور خون کا یہ کھیل کسی بھی وقت کھیلا جا سکتا تھا۔ اسی گھبراہٹ اور افراتفری میں وہ دلہن بن کر آصف کی پناہ میں آ گئی۔

آصف ایک دبلا پتلا سا نوجوان تھا۔ صورت اچھی تھی نہ بری، کوئی بھی جوان لڑکی اسے محبوب کے روپ میں نہیں، صرف شوہر کے روپ میں قبول کر سکتی تھی۔ بانو نے بھی اسے قبول کر لیا۔ شادی کے بعد ایک ماہ تک وہ گھر میں پڑا رہا۔ تین وقت کھاتا تھا پھر ڈکاریں لیتا ہوا باہر تفریح کے لیے نکل جاتا تھا اور رات کو واپس آ کر محبت کے فرائض ادا کرتا تھا۔ ایک دن بانو کی ماں نے ٹوک دیا۔

''بیٹا! مرد محنت کرتے اچھے لگتے ہیں۔ تمہیں کوئی کام کرنا چاہیے''۔

''ماں جی! اس دیس میں مسلمانوں کو کام کہاں ملتا ہے۔ یہاں کی بھوکی جنتا میں ہم جیسوں کی تعداد زیادہ ہے''۔

''ایسا نہ کہو بیٹے! یہاں کروڑوں کی تعداد میں مسلمان ہیں۔ آخر وہ کسی نہ کسی طرح سے زندگی گزار رہے ہیں''۔

''پتا نہیں کس طرح گزار رہے ہیں، مجھے کوئی راستہ سجھائی نہیں دیا۔ اس لیے آپ کا داماد بن کر یہاں آ گیا۔ آپ کی دکان اچھی چل رہی ہے۔ اللہ دے رہا ہے تو مجھ جیسے ایک بندے کو بٹھا کر کھلانے میں کیا نقصان ہے؟''

اس کی باتیں سن کر بانو کو بہت غصہ آیا۔ اس کی ماں اپنے داماد سے یہ نہیں کہہ سکتی تھی کہ وہ ان پر بوجھ بنا ہوا ہے مگر ایک بیوی اپنے شوہر سے لڑ سکتی تھی۔ ماں کے جانے کے بعد اس نے کہا۔

''آپ مرد ہیں۔ آپ کو اپنی محنت مزدوری سے میرے اخراجات پورے کرنے چاہیں۔ کیا یہ شرم کی بات نہیں ہے کہ آپ امی کی دکان پر تکیہ کیے بیٹھے ہیں''۔

''تم مجھے شرم نہ دلاؤ۔ شرم تمہیں آنی چاہیے۔ بتاؤ میرے لیے جہیز میں کیا لائی ہو؟ میں نے کبھی مطالبہ نہیں کیا۔ اب بات نکلی ہے تو بولنا پڑتا ہے۔ تمہاری ماں بوڑھی ہو چکی ہے۔ آج یا کل اللہ کو پیاری ہو جائیں گی۔ پھر ان کی دکان تمہاری ہوگی اور تمہاری ہر چیز میری ہی ہوتی ہے''۔

وہ حیرانی سے دیدے پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھتی رہ گئی۔ حیرانی اس بات کی تھی کہ جیسا اس نے کبھی سوچا نہ تھا ویسا اس کا شوہر تھا۔ دکان کو اپنی بیوی کا جہیز سمجھ رہا تھا اور اس کی امی کے مرنے کا خواب دیکھ رہا تھا۔ وہ صرف تین وقت کھانا اور اس کے ساتھ سونا جانتا تھا۔ تیسرا کوئی کام اسے نہیں آتا تھا۔ وہ ایک دم سے پھٹ پڑی۔

''آپ میری امی کے مرنے کا انتظار کر رہے ہیں۔ اللہ کرے آپ کو موت آ جائے۔ اگر مجھے معلوم ہوتا کہ آپ ایسے ناکارہ، کام چور اور مطلب پرست ہیں تو میں کبھی شادی نہ کرتی۔ دور ہو جایئے میری نظروں سے''۔

وہ مزید بحث کیے بغیر اطمینان سے گنگناتا ہوا باہر چلا گیا۔ اس کے جاتے ہی بانو کے سر سے آنچل گر گیا، اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ آخر اپنے سہاگ سے کچھ تو لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے۔ آنچل پھٹا پرانا ہی کیوں نہ ہو، سر کو ڈھانپ تو لیتا ہے۔ دنیا والے اسے سر سے ننگی تو نہیں کہہ سکتے۔ غصے میں وہ بھول گئی تھی کہ مجازی خدا خواہ کیسا ہی ہو اس

کی شان میں گستاخی نہیں کرنی چاہیے۔ اب وہ چلا گیا تو غصہ دھیما پڑ گیا اور غلطی کا احساس ستانے لگا۔ ماں رات کو دکان بند کر کے آئی تو اس نے تسلی دی۔

''بیٹی گھبراؤ نہیں وہ آجائے گا۔ اس کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے اور نہ ہی وہ محنت سے چار پیسے کما سکتا ہے۔ یہاں مفت کی روٹیاں ملتی ہیں اس لیے وہ ضرور آئے گا''۔

مگر وہ رات کو نہیں آیا۔ صبح بانو دکان کھولنے جایا کرتا تھی، اس روز نہ جا سکی۔ اس کا دل کہہ رہا تھا کہ وہ ضرور آئے گا۔ ماں اس کی پریشانیوں کو سمجھ کر خود ہی دکان داری کے لیے چلی گئی۔ دوپہر کو جب وہ روٹیاں پکا رہی تھی تو وہ بھوکا پیاسا آ کر باورچی خانے میں بیٹھ گیا۔ اسے دیکھ کر بانو کو یوں لگا جیسے وہ اپنا کوئی نہیں ہے مگر گھر کا ایک سامان ہے جو گم ہونے کے بعد مل گیا ہے۔ اسے خوشی ہوئی لیکن غصہ دکھانا بھی ضروری تھا۔ اس نے غصے سے روٹیوں کا چھابہ اس کے آگے پٹخ دیا۔ ہانڈی سے سالن نکال کر دیا۔ اس طرح غصہ بھی دکھایا اور اس کی خاطر تواضع بھی کی۔ پھر طنز بھی کیا۔

''جس کے ساتھ رات گزار کر آئے ہو کیا اس نے روٹی نہیں کھلائی؟''

اس نے ایک لقمہ چباتے ہوئے کہا۔

''میں نے رات اسٹیشن کی سرائے میں گزاری ہے۔ کل سے کچھ نہیں کھایا۔ بھوکا پیاسا تمہیں یاد کرتا رہا''۔

بانو کا دل بھر آیا۔ بیچارہ کل سے بھوکا تھا۔ وہ اس سے محبت کرتا ہو یا نہ کرتا ہو مگر بھوک پیاس کے وقت مجھے یاد کرتا ہے، کسی نہ کسی طرح میرا محتاج ہے۔ بیچارہ دو وقت کھا لیا کرے گا تو کون سا بوجھ بن جائے گا۔ کم از کم نام تو ہوگا کہ اس گھر میں ایک مرد بھی رہتا ہے''۔

یہ سوچ کر وہ محبت سے سمجھانے لگی ''آپ کہیں ملازمت کے لیے پریشان نہ ہوں۔ میں صبح سے دوپہر تک دکان میں بیٹھتی ہوں، میری جگہ آپ دکان سنبھالا کریں۔ امی خوش ہو جائیں گی کہ آپ کو ذمہ داری کا احساس ہو گیا ہے''۔

آصف راضی ہو گیا۔ بانو تین دن تک اس کے ساتھ دکان پر جاتی رہی۔ اسے تمام چیزوں کی قیمت اور گاہکوں سے نمٹنے کے گر سکھاتی رہی۔ جتنا اس نے سکھایا۔ آصف نے اس سے کچھ زیادہ ہی سیکھ لیا۔ آئے دن موقع پا کر گلے سے روپے چرانے لگا۔ بانو کی ماں گلے کا وزن خوب سمجھتی تھی، اس نے سمجھ لیا کہ دکان کی آمدنی میں کچھ ہیرا پھیری ہو رہی ہے مگر ساس اور داماد کے رشتہ کی لاج بھی رکھنی تھی اس لیے اس نے روزانہ دو چار روپے کی چوری برداشت کر لی۔ بانو کو بھی سمجھا دیا کہ آصف کو شرمندہ نہ کرو۔ سمجھ لو کہ وہ گلے میں سے اپنا جیب خرچ نکال لیا کرتا ہے۔

ماں بیٹی بڑی مصلحت سے کام لے رہی تھیں مگر چور کا حصہ بڑھنے لگا۔ رفتہ رفتہ پتا چلا کہ وہ نشہ کیا کرتا تھا۔ کنگال ہونے کے بعد نشہ چھوٹ گیا۔ اب پھر جیب میں خاصی رقم رہنے لگی تو اس نے دارو پینا شروع کر دیا۔ اس پر ماں بیٹی کا صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ ایک رات بانو نے اسے خوب سنائیں۔

''تمہیں شرم نہیں آتی۔ شراب پی کر گھر آتے ہو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم شرابی اور جواری ہو، نکھے اور بے غیرت ہو۔ تمہاری بیوی بن کر رہنے سے بہتر ہے کہ میں بیوہ بن کر رہوں۔ اگر تمہیں موت نہیں آتی ہے تو کہیں جا کر ڈوب مر۔ مرنے کا حوصلہ نہیں ہے تو صبح ہونے سے پہلے اس گھر سے چلے جاؤ''۔

وہ مدہوشی کی حالت میں بیوی کی کھری کھری باتیں سنتے سنتے سو گیا۔ آدھی رات کے بعد بانو بھی اپنی بدنصیبی کا دکھڑا روتے روتے سو گئی۔ صبح ماں کے چیخنے چلانے سے اس کی آنکھ کھلی۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔

''آصف کہاں ہے؟''

بانو کو اس کا بستر خالی نظر آیا۔ ماں نے کہا۔

''تمہیں معلوم ہے کہ میں نے دکان کا نیا اسٹاک خریدنے کے لیے پانچ ہزار روپے رکھے تھے وہ روپے نہیں ہیں۔ ذرا تم اپنی الماری تو دیکھو''۔

بانو الماری کی پاس گئی تو وہ کھلی ہوئی تھی جس دراز میں اس کے زیورات رکھے ہوئے تھے اب وہاں ایک تہہ کیا ہوا کاغذ نظر آرہا تھا، اس نے کھول کر پڑھا لکھا تھا۔

''بانو بیگم! اب تم میری بیوی نہیں ہو۔ تم نے کہا تھا کہ مجھ جیسے کی بیوی بننے کے بجائے بیوہ بن کر رہنا چاہتی ہو۔ مجھ میں مرنے کا حوصلہ نہیں ہے اس لیے بہ ہوش وحواس تمہیں طلاق دے کر جارہا ہوں۔ میری تلاش فضول ہے۔ فقط آصف''۔

طلاق نامہ پڑھتے ہی بانو چکرا کر گرنے لگی۔ ماں نے بڑی مشکل سے اسے سنبھال کر بستر پر لٹا دیا پھر وہاں سے بھاگی بھاگی محلے کی لیڈی ڈاکٹر کو بلا لائی۔ اس نے ڈاکٹر کو یہ نہیں بتایا کہ بیٹی پر کیسی قیامت ٹوٹ پڑی ہے۔ پچھلی رات تک وہ سہاگن تھی اور اب اس کا سہاگ اجڑ گیا ہے۔ اجاڑنے والا گھر سے نقدی اور زیورات بھی سمیٹ کر لے گیا ہے۔ اس نے لیڈی ڈاکٹر کو صرف اتنا ہی بتایا کہ پچھلے دو دنوں سے بانو علیل تھی، آج بستر سے اٹھتے ہی چکرا کر گر پڑی۔

لیڈی ڈاکٹر نے اس کی نبض دیکھی پھر اسے ادھر ادھر ٹٹول کر مسکراتے ہوئے کہا۔

''گھبرانے کی بات نہیں ماں جی! تمہاری بیٹی ماں بننے والی ہے''۔

ماں چند لمحوں تک گم صم کھڑی رہی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ یہ خبر سن کر اسے خوش ہونا چاہیے یا اپنا سر پیٹنا چاہیے۔ خوشی کی بات یہ تھی کہ بیٹی ماں بننے والی تھی افسوس کا مقام یہ تھا کہ وہ ایک چور کی اولاد کو جنم دے گی۔

بانو کو ہوش آنے کے بعد لیڈی ڈاکٹر اسے بھی خوش خبری سنا کر چلی گئی۔ وہ طلاق کے بوجھ تلے دبی ہوئی تھی۔ خزاں میں پھول نہیں کھلتے اگر کھلتے بھی ہوں تو خوشبو سے خالی ہوتے ہوں گے۔ بانو بھی ایسے وقت ماں کی ممتا اور بچے کی خوشبو سے خالی رہی۔ بعد کی بات ہوگی کہ کبھی ممتا جوش میں آئے گی ابھی تو اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کی کوکھ میں بچہ نہیں بلکہ بھاگنے والے چور کے نقش قدم ہیں۔

اس روز ماں بیٹی نے دکان نہیں کھولی، گھر میں تمام دن چپ چپ سی رہیں۔ بانو مطلقہ عورت بن کر اپنی توہین محسوس کررہی تھی۔ یہ خیال اسے مار رہا تھا کہ پاس پڑوس کی سہاگنیں اب اسے اپنے پاس نہیں بٹھائیں گی کیونکہ وہ سہاگ کی دہلیز کے باہر پھینک دی گئی تھی۔ اب اس کی سماجی حیثیت قابل فخر نہیں تھی۔ ایسا سوچتے وقت وہ خود کو ایک خوبصورت بچے کے تصور سے بہلانے کی کوشش کرتی رہی۔ اپنے دل کو سمجھاتی رہی کہ اس دنیا میں کوئی اپنا نہیں ہوتا۔ صرف اپنے جگر کا ٹکڑا ہی اپنا ہوتا ہے۔ وہ اپنے بچے کے سہارے زندگی گزار دے گی۔

دوسری طرف ماں سوچ رہی تھی کہ بانو اپنی پہاڑ جیسی جوانی کیسے گزارے گی؟ صرف بڑھاپا ایسا ہے جو اولاد کے سہارے گزرتا ہے ورنہ جوانی کسی جوان کا ہاتھ تھامے بغیر آگے نہ بڑھے تو کہیں نہ کہیں ٹھوکر کھا جاتی ہے۔ لہٰذا اس بچے کو پیدا نہیں ہونا چاہیے۔ اگر پیدا ہو جائے تو زندہ نہیں رہنا چاہیے۔ ایک تو یہاں مسلمان لڑکوں کا قحط پڑا ہوا ہے اگر کوئی بانو کے حسن سے متاثر ہو کر آئے گا تو اسے بچے والی دیکھ کر واپس چلا جائے گا۔ بانو تو آئندہ بھی ماں بن

سکتی ہے لیکن گود میں ایک بچہ رکھ کر سہاگن نہیں بن سکتی۔

ماں نے دل پر جبر کرتے ہوئے دونوں مٹھیاں سختی سے بھینچتے ہوئے کہا۔

''وہ بچہ زندہ نہیں رہے گا''۔

O☆O

''ہاں وہ بچہ زندہ ہے''۔

میز پر گیلی تصویریں بکھری پڑی تھیں۔ سارجنٹ نے دوعدد تصویریں اٹھا کر کیپٹن کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔

''آپ ان تصویروں کو ذرا غور سے دیکھیں''۔

کیپٹن محدب شیشہ ہاتھ میں لے کر توجہ سے دیکھنے لگا۔ سارجنٹ کی آواز اس کے کانوں میں اتر رہی تھی۔

''سر! ہمارے طیارے نے عمودی چٹان کے دو چکر لگائے تھے۔ یہ تصویر پہلے راؤنڈ میں اتاری گئی تھی۔ اس تصویر میں بچہ بے حس وحرکت پڑا ہوا ہے۔ دوسرے راؤنڈ میں یہ تصویر اتاری گئی ہے، اس میں بچے کے ہاتھ پاؤں ذرا اٹھے ہوئے ہیں۔ وہ ہاتھ پاؤں جھٹک رہا ہے''۔

کیپٹن کے جس ہاتھ میں تصویر تھی، وہ ہاتھ کانپنے لگا۔ بچہ ہاتھ پاؤں جھٹک رہا تھا یعنی اپنی زندگی کے لیے لڑ رہا تھا۔ کیپٹن کا دل تڑپ تڑپ کر کہہ رہا تھا کہ اس کا اپنا بچہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر پہنچ کر ہاتھ پاؤں ہلاتے ہوئے سگنل دے رہا ہے ''پپا آؤ مجھے بچالو......''

وہ بچہ صرف کیپٹن کو نہیں، ابھی ساری انسانیت کو تڑپانے والا تھا۔ اس نے فون کا ریسور اٹھا کر نمبر ڈائل کرنے کے بعد کہا۔

''میں کیپٹن ہری رام بول رہا ہو۔ طیارے کو جہاں حادثہ پیش آیا ہے وہاں ایک بچہ زندہ ہے، وہاں فوراً امدادی پارٹی روانہ کرو۔ مجھے بلاتاخیر رپورٹ ملنی چاہیے کہ بچے کا کیا حال ہے''۔

یہ حکم دینے کے بعد کیپٹن نے فلائنگ کلب سے رابطہ قائم کیا۔

''میں کیپٹن ہری رام کنٹرول سینٹر سے بول رہا ہوں۔ آپ فوراً تفصیلی رپورٹ پیش کریں کہ کس شخص نے طیارہ ایف سی ون ٹو او ٹو چارٹر کیا تھا؟ طیارے میں کتنے افراد تھے؟ ان میں ایک بچہ بھی تھا، اس کا تعلق کس سے ہے؟''

اس کے بعد وہ کسی تیسری جگہ نمبر ڈائل کرنے لگا مگر اب وہ تنہا پریشان نہیں تھا۔ متعلقہ اداروں میں ایک سرے سے دوسرے سرے تک ٹیلی فون کی گھنٹیاں چیخ رہی تھیں۔ ہر فون کی چیخ وپکار کے پیچھے جو لوگ تھے ان کے دماغوں کی سکرین پر صرف ایک معصوم بچہ تھا جو دو لاشوں کے پاس پڑا ہوا زندگی کو پکار رہا تھا۔

O☆O

آٹھ ماہ سے وہ بچہ بانو کے وجود میں چھپ کر کروٹیں بدل رہا تھا۔ وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر سوچتی رہتی تھی۔

''میرا بچہ کیسا ہوگا؟ اپنے باپ کی طرح یا میری طرح؟''

ماں نے بارہا سمجھایا ''وہ جیسا بھی ہو، اسے اپنے دل سے نوچ کر پھینک دو۔ تمہیں سمجھاتے سمجھاتے آٹھ ماہ گزر گئے۔ اگر تم پہلے ہی مان جاتیں تو وہ بچہ آسانی سے ضائع ہو جاتا۔ اب بھی وقت ہے بانو اپنے آپ پر رحم کرو''۔

''امی کیا آپ ہوش وحواس میں نہیں ہیں؟ کیا آپ میرے بچے کی قاتل بننا چاہتی ہیں؟''

''نہیں بیٹی! میں تم دونوں کی بھلائی چاہتی ہوں۔ تمہاری بھلائی اس میں ہے کہ تم پہلے جیسی بن جاؤ۔ ہم یہ دکان فروخت کر کے کسی دوسرے شہر میں چلے جائیں گے۔ کوئی یہ نہ جان سکے گا کہ کبھی تم سہاگن بنی تھیں اور ایک بچے کو جنم دیا تھا۔ بچے کی بھلائی اس میں ہے کہ وہ کسی فلاحی ادارے میں پرورش پائے''۔

''نہیں امی! میں اپنے ہاتھوں سے اپنے جسم کے ایک حصے کو کاٹ کر نہیں پھینک سکتی۔ میں اس معصوم سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں کر سکتی''۔

''تم کبھی آصف سے بھی جدا ہونے کا تصور نہیں کرتی تھیں۔ مگر اب اس کے لیے صبر کر لیا۔ اسی طرح رفتہ رفتہ بچے کے لیے صبر آ جائے گا''۔

''آپ ضد کیوں کر رہی ہیں۔ میں اب شادی نہیں کروں گی، بس دیکھ لی مرد کی ذات۔ ایک نے مجھے داغ لگایا ہے، دوسرا کوئی آئے گا تو مجھے داغدار کہہ کر طعنہ دے گا۔ آپ ایسی باتیں نہ کریں ورنہ میں گھر سے چلی جاؤں گی''۔

ماں ڈر کر خاموش ہو گئی کہ کہیں بیٹی سے بھی ہاتھ نہ دھو بیٹھے۔ وہ ممتا کو سمجھ رہی تھی۔ جیسے وہ اپنی بیٹی کی آئندہ زندگی سنوارنے کے لیے دن رات پریشان رہتی تھی اسی طرح بیٹی اپنی ممتا سے مجبور تھی اور خیال ہی خیال میں بچے کو سینے سے لگا کر چومتی رہتی تھی۔ یہ نہیں سوچتی تھی کہ ایک بچے کی وجہ سے اس کی جوانی غارت ہو جائے گی۔

جب وہ بانو کو سمجھا کر تھک گئی تو یہ سوچ کر خاموش ہو گئی کہ وقت کی کوئی ٹھوکر ہی اسے سمجھائے گی۔ یہ آج کل کے بچے اپنی من مانی کرتے ہیں، بزرگوں کے تجربات کو یکسر جھٹلا دیتے ہیں۔ لیکن وقت بڑا سنگدل ہوتا ہے وہ ایک ہی جھٹکے میں ماں کو بھی سنگدل بننا سکھا دیتا ہے۔ ایک رات بانو دردزہ سے تڑپ رہی تھی اور باہر قیامت کا شور برپا تھا۔ بہت دور سے ''ہر ہر مہا دیو'' کی آوازیں آ رہی تھیں اور محلے والے جواباً ''اللہ اکبر'' کے نعرے لگا رہے تھے۔

پورے محلے میں وہی ایک گھر ایسا تھا جہاں کوئی مرد نہیں تھا، کوئی محافظ نہ تھا۔ ماں پریشانی کے عالم میں کبھی بانو کے پاس بیٹھ جاتی تھی، کبھی بھاگی بھاگی دوسرے کمرے میں جا کر کھڑکی کھول کر دیکھتی تھی۔ باہر جو انسان تھے وہ درندے بن گئے تھے۔ نہ عورتوں کی عزت کا پاس تھا، نہ انسانی زندگی کی کوئی قیمت تھی۔ پانی کی طرح لہو بہایا جا رہا تھا۔

ماں کو واپس آنے میں دیر ہوئی تو وہ درد سے تڑپتی اور کراہتی ہوئی بستر سے اٹھ گئی۔ پلنگ کا سہارا لے کر دیوار تک پہنچ گئی پھر اپنے کمرے کی کھڑکی کھول کا باہر کا منظر دیکھا تو حلق سے چیخ نکل گئی۔ ایک وحشی درندہ ایک نوزائیدہ بچے کو فضا میں اچھال کر نیزے کی انی پر روک رہا تھا۔ بس اس سے زیادہ وہ کچھ نہ دیکھ سکی۔ ایک دم سے چکرا کر فرش پر گر پڑی۔

ماں اپنی بیٹی کی چیخ سن کر دوڑتی ہوئی کمرے میں آئی تو اب بانو تنہا نہیں تھی۔ اس کے قدموں کے پاس فرش پر ایک نوزائیدہ بچہ خون میں لتھڑا ہوا چیخ رہا تھا۔ باہر درندے لہو اچھال کر زندگی چھین رہے تھے، اندر ایک ماں اپنے لہو کے چھینٹوں سے ایک ننھے انسان کو زندگی دے رہی تھی۔ وہ مارے دہشت کے یہ بھول گئی تھی کہ دردزہ کیا ہوتا ہے اور وہ تخلیق کے کرب سے کیسے گزر گئی۔ اسے ایک ہی منظر یاد تھا کہ بچہ نیزے پر اچھالا جا رہا ہے۔ وہ جنونی حالت میں چیخنے لگی۔

''امی بچایئے! میرے بچے کو بچایئے۔ وہ ظالم اسے چھین کر لے جا رہے ہیں۔ وہ میرے بچے کو مار ڈالیں گے''۔

اس کی ماں نے بچے کو کپڑے میں لپیٹ کر سینے سے لگایا۔ پھر روتے ہوئے بولی۔

''بیٹی اب تو خدا ہی ہماری مدد کر سکتا ہے۔ اس دن کے لیے سمجھاتی تھی کہ اسے جنم نہ دو۔ مہذب درندوں کی اس دنیا میں ہم اپنی حفاظت نہیں کر سکتے پھر اس بچے کو کہاں لے جا کر چھپائیں گے؟''

باہر ایک مکان دھڑا دھڑ جل رہا تھا۔ اس کے دہکتے ہوئے شعلوں کا عکس کھڑکی کے راستے بانو کے چہرے پر پڑ رہا تھا جیسے خود اس کا چہرہ جل رہا ہو، اس کا دل سلگ رہا ہو۔ وہ تھرتھراتی ہوئی آواز میں بولی۔

''اسے کہیں بھی چھپا دیجیے۔ اسے لے کر یہاں سے بھاگ جایئے۔ میں صرف اپنے بچے کی سلامتی چاہتی ہوں۔ آپ میری فکر نہ کریں۔ مجھے میرے حال پر چھوڑ دیں''۔

''نہیں بانو! تم اپنے بچے کی سلامتی چاہتی ہو اور میں تمہاری سلامتی چاہتی ہوں۔ اب بھی وقت ہے، میری بات مان لو۔ میں اس بچے کو ایسی جگہ پہنچا دوں گی جہاں اس پر کوئی آنچ نہیں آئے گی''۔

''کہاں؟ بانو نے دھڑکتے ہوئے دل سے پوچھا۔

''کہیں بھی یہ نہ پوچھو۔ اپنے دل پر پتھر رکھ لو۔ تم اسے کبھی نہیں دیکھ سکو گی مگر یہ زندہ سلامت رہے گا''۔

''نن......نہیں میں اپنے بچے......''

اس کا انکار اس کے حلق میں اٹک کر رہ گیا۔ کھڑکی کے قریب ایک کرخت آواز سنائی دی۔ پھر شعلوں کی روشنی میں ایک سکھ کا خونی چہرہ نظر آیا۔ اس کا گنڈاسا لہو سے بھیگا ہوا تھا۔ وہ ''ست سری اکال'' کہتا ہوا کھڑکی کے راستے کمرے میں آنا چاہتا تھا۔ اسی وقت اس کے حلق سے چیخ نکل گئی۔ کسی نے اس کی پشت پر خنجر گھونپ دیا تھا۔ وہ کھڑکی پر سے الٹ کر باہر گر پڑا۔ ماں نے دوڑ کر کھڑکی کو اندر سے بند کر دیا اور روتے ہوئے بولی۔

''بانو تم خودغرض ہو۔ یہ ممتا نہیں بچے سے دشمنی ہے''۔

وہ ہذیانی انداز میں چیخنے لگی۔

''میں خودغرض نہیں ہوں، میں اپنے بچے کی دشمن نہیں ہوں۔ اسے لے جایئے۔ ابھی لے جایئے۔ میں اس کی جدائی برداشت کر لوں گی مگر یہ الزام نہیں اٹھاؤں گی کہ ماں کی محبت ہی بچے کو مار ڈالتی ہے''۔

ماں تیز قدموں سے چلتی ہوئی کمرے میں چلی گئی تاکہ اب بچے کی آواز بھی بانو کے کان میں نہ پڑے۔

تھوڑی دیر میں صبح ہونے والی تھی۔ اس نے سوچ لیا کہ باہر کا ہنگامہ سرد پڑتے ہی بچے کو یتیم خانے میں چھوڑ آئے گی۔

بانو کمرے کے فرش پر تنہا پڑی ہوئی تھی۔ جب بچہ نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے آنسو بھری آنکھیں میچ لیں۔ پھر ایک طویل سانس اس طرح چھوڑی جیسے اندر سے بالکل خالی ہونا چاہتی ہو۔ خالی تو وہ ہو گئی تھی، اب لٹنے کے لیے کچھ نہیں رہ گیا تھا۔ اب کوئی چور، کوئی قاتل اس کے دروازے پر نہیں آسکتا تھا۔ اب وہ ایک مفلس کی طرح آرام سے سو سکتی تھی۔

دوسری صبح اس کی آنکھ کھلی تو آس پاس کا ماحول ایسا خالی، ایسا ننگا نظر آیا جیسے اتنی بڑی دنیا کے تن بدن سے آخری کپڑا بھی اتار لیا گیا ہو۔ ماں سامنے کھڑی تھی، اس کی جھکی جھکی سی نظریں کہہ رہی تھیں کہ اس نے ایک معصوم بچے اس کی ماں سے جدا کر دیا ہے۔ بانو کی آنکھوں میں پھر آنسو آ گئے۔ اس نے پوچھا۔

''میرا لعل کہاں ہے؟ میرے بیٹا ہوا تھا نا؟''

''ہاں بالک آشرم......''

''بالک آشرم؟'' بانو جلدی سے اٹھ کر بیٹھ گئی'' آپ میرے بچے کو ہندوؤں کے آشرم میں کیوں چھوڑ آئی؟ آپ کو کیا ہو گیا ہے امی؟''

''میں مجبور تھی بانو! مسلمانوں کی بستی ویران ہو رہی ہے۔یتیم خانے میں گئی تو وہ خالی پڑا تھا کچھ بچے مارے گئے، باقی بھاگ گئے۔یتیم خانہ کے کرتا دھرتا بھی نہیں تھے۔میرے دل میں بات آئی کہ انسان، انسان کا دشمن ہوتا ہے مگر مذہب مذہب کا دشمن نہیں ہوتا۔کوئی دھرم نفرت اور دشمنی نہیں سکھاتا۔اس لیے میں نے سوچا کہ جس دھرم کے چند لوگ تمہارے بچے کو مار ڈالنا چاہتے ہیں وہ بچہ فی الحال اسی دھرم کی پناہ میں محفوظ رہ سکتا ہے۔

بانو چند لمحے ماں کو دیکھتی رہی پھر روتے ہوئے بولی۔

''آپ نے بچے سے صرف اس کی ماں کو نہیں، اس کے ایمان کو بھی چھین لیا۔کیا ایسا کرتے وقت آپ کے دل سے بھی ایمان نکل گیا تھا؟''

''مجھے طعنے نہ دو۔میں نے حالات سے مجبور ہو کر خدا کے بھروسے پر ایسا کیا ہے۔خدا کو منظور ہوگا تو وہ آشرم میں بھی صاحب ایمان رہے گا''۔

''کیسے رہے گا امی۔آپ مجھے بہلا رہی ہیں''۔

''اسے بہلاوہ سمجھ کر صبر کرلو، اب یہاں سے چلنے کی تیاری کرو۔ہم اس شہر میں نہیں رہیں گے......''

O☆O

اناتھ بالک آشرم کے ایک کمرے میں اٹھائیس برس کی ایک حسین عورت بیٹھی ہوئی تھی۔اس کے بال شانوں تک ترشے ہوئے تھے۔سیاہ رنگ کے ماتمی بلاؤز اور اسکرٹ میں اس کے حسن کی چاندنی کھل رہی تھی۔اس کا نام میرا تھا۔

میرا روزنامہ سندیس کے صفحہ اول کی رپورٹر تھی۔اخبارات کے حلقے میں وہ بہت تیز طرار سمجھی جاتی تھی۔لیڈروں اور سیاستدانوں کے راز اڑا کر انہیں اپنے اخبار کی زینت بنا دیتی تھی۔بڑے بڑے لوگ اس سے خوف زدہ بھی رہتے تھے اور خاکسار بھی رہتے تھے لیکن اس روز میرا تیز و طرار نظر نہیں آرہی تھی اور نہ ہی بالک آشرم سے کسی بچے اور اس کی ماں کا کوئی راز چرا کر اخبار میں شائع کرنے کی غرض سے آئی تھی۔

وہ خود ایک راز بن کر اس آشرم میں پہنچی تھی اور بار بار اس دروازے کو دیکھ رہی تھی جس کے پیچھے پنڈت جی کسی سے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔وہ اپنی باری کا انتظار کر رہی تھی۔کتنے ہی آرام سے بیٹھو پر انتظار کانٹے کی طرح چبھتا ہے اس لیے وہ رہ رہ کر پہلو بدل رہی تھی۔تھوڑی دیر بعد آشرم کی بوڑھی ملازمہ اس کے پاس آئی تو وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ملازمہ نے کہا۔

''بیٹھو بیٹی۔بیٹھ جاؤ۔ابھی ذرا دیر ہے، پنڈت جی خود تمہیں بلائیں گے''۔

وہ بیٹھ گئی۔ملازمہ نے سامنے ایک لکڑی کی چوکی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''کیسا کلجگ ہے۔مائیں اپنے بچوں کو چھوڑ دینے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔آج سویرے میں آشرم کا دروازہ کھول رہی تھی۔میں نے دیکھا ایک بوڑھی عورت ایک ننھے بچے کو ہمارے دروازے پر رکھ کر جا رہی ہے۔میں نے اسے پکارا تو وہ بھاگتی چلی گئی۔مجھے دمے کی بیماری ہے نہیں تو میں دوڑ کر اسے پکڑ لیتی''۔

میرا نے وقت گزارنے کے لیے اس کی باتوں میں دلچسپی لیتے ہوئے پوچھا۔

''تم نے اس عورت کو اچھی طرح دیکھا تھا؟''

''اچھی طرح تو نہیں مگر ہاں دیکھا تھا۔اس کے ماتھے میں سیندور نہیں تھا یا تو وہ ودھوا (بیوہ) ہوگی یا پھر مسلمان''۔

''ایسے وقت جب کہ ہندو مسلم فسادات ہو رہے ہیں۔ایک مسلمان عورت اپنے بچے کو اس آشرم میں کیوں چھوڑے گی''۔

''بیٹی! جس کا کوئی باپ نہ ہو اس کا کوئی دھرم نہیں ہوتا۔وہ بچہ اس بوڑھی کا نہیں ہو سکتا، اس کی کسی جوان بہن یا بیٹی کا ہوگا''۔

بوڑھی ملازمہ کی یہ بات میربا کے دل کو لگ گئی کہ جس کا باپ نہ ہو اس کا کوئی مذہب بھی نہیں ہوتا۔واقعی دنیا کا ہر مذہب مرد کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔محمد احمد، رام ایشور اور ٹونی ہڈسن جیسے ناموں والے کسی باپ کے جائز بچے کا مذہب سمجھ میں آجاتا ہے۔یہ مرد کے لیے بڑے فخر کی بات ہے اور یہ بھی بڑے فخر کی بات ہے کہ اس کے ناجائز بچے کا مذہب سمجھ میں نہیں آتا۔جب کہ وہ اپنی سوسائٹی میں بیٹھا روزے نماز کی باتیں کر رہا ہوگا یا بھگوان کی مورتی کے سامنے ڈنڈوت کر رہا ہوگا یا مسیح کے بت کے سامنے سینہ پر صلیب کا نشان بنا رہا ہوگا۔کیا مذہب یا دھرم کا تقدس اسی طرح قائم رہ سکتا ہے؟

میربا نے پوچھا ''جو بچہ تمہارے دروازے پر پڑا ہوا تھا کیا اسے آشرم میں رکھ لیا گیا ہے؟''

''ہاں یہ آشرم ایسے ہی بچوں کے لیے ہے''۔

''مگر آشرم کے کھاتے میں بچے کا باپ کا نام اور دھرم کیا لکھا جائے گا؟''

''یہاں بچوں کے باپ کے نام نہیں لکھے جاتے کیونکہ یہاں آنے کے بعد بچوں سے ان کے تمام رشتے ناطے ٹوٹ جاتے ہیں اور وہ بچے ہمارے دھرم کے ہو کر رہ جاتے ہیں''۔

''ہاں جب کوئی ناطہ نہ رہے تو بچے کسی بھی دھرم کی گود میں جا سکتے ہیں۔ماں باپ کو کسی پہلو سے اعتراض کرنے کا حق نہیں رہتا''۔

میربا نے تھکے ہوئے انداز میں آنکھیں بند کرلیں مگر دوسرے ہی لمحہ اس نے چونک کر آنکھیں کھول دیں۔اس کے سامنے کمرے کا دروازہ کھل گیا تھا۔کھلے ہوئے دروازے پر بائیس برس کی ایک حسینہ کھڑی ہوئی تھی۔اس کے بال بکھرے ہوئے تھے۔بدن پر قیدیوں کا لباس تھا اور اس کے آس پاس دو سپاہی کھڑے ہوئے تھے ان کے پیچھے ایک پولیس انسپکٹر نظر آرہا تھا۔

میربا نے اس قیدی حسینہ کو دیکھتے ہی پہچان لیا۔وہ بھارتی فلموں کی سب سے مشہور اداکارہ یشو رانی تھی۔دیش کے تمام فلمی رسالے اور نوجوانوں کے تمام بیڈروم اس کی تصویروں کے بغیر مکمل نہیں ہوتے تھے۔اب وہ قیدی کے لباس میں اور آشرم کے پس منظر میں ایسی تصویر بنی ہوئی تھی جسے وہ خود اپنی زندگی کے کسی بھی خوبصورت کمرے میں لگانا پسند نہ کرتی۔ایسی تصویریں تو صرف تقدیر کے بے حس کیمرے ہی اتارتے ہیں۔

اس کے پیچھے کھڑے ہوئے پولیس انسپکٹر نے کہا۔

''تم رک کیوں گئیں آگے بڑھو''۔

یشو رانی چونک کر آگے بڑھ گئی۔اس کے بوجھل قدموں سے پتا چل رہا تھا کہ وہ کسی قیامت سے گزر رہی ہے اور اپنے پیچھے اپنی زندگی کا اہم سرمایہ چھوڑ کر جا رہی ہے۔وہ چلتے چلتے رک گئی۔جنونی انداز میں اپنے سر کو انکار میں ہلانے لگی۔

''نہیں نہیں۔میں اسے چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔میرا لعل، میرا بچہ مجھے واپس کردو''۔

وہ پلٹ کر واپس کمرے کی طرف بھاگنا چاہتی تھی مگر سپاہیوں نے پکڑ لیا۔پھر انسپکٹر کے حکم پر اسے کھینچ کر

باہر لے جانے لگے۔ میربا کا کلیجہ ہانپنے لگا۔ ایک ماں کو اس کے بچے سے جدا کیا جا رہا تھا۔ ایسا تو کوئی قانون نہیں ہے کہ عورت کے جسم کے کسی حصے کو کاٹ کر یا نوچ کر اس سے الگ کر دیا جائے۔ پھر وہ قانون کے محافظ اس جنم جلی کو زبردستی کہاں لے جا رہے تھے۔ اگر یشورانی نے پاپ کیا تھا تب بھی دنیا کی کسی قانونی کتاب میں یہ نہیں لکھا ہے کہ بچے کو اس کی پاپن ماں سے جدا کر دیا جائے۔ پھر یہ قصہ کیا ہے۔ دوسروں کے رازوں کو ٹٹول کر کہانیاں بنانے والی میربا نے سوچا۔ اس المناک منظر کے پیچھے ایک ماں اور اس کے بچے کی دردناک داستان ہے، اس داستان کو کریدنا چاہیے۔

بعض اوقات زندگی اتنی فرصت نہیں دیتی کہ دوسروں کی زندگی میں جھانک کر دیکھا جا سکے۔ میربا کا دھیان بٹ گیا۔ پنڈت جی نے دروازے کھول کر کہا۔

''بیٹی میربا اندر آ جاؤ''۔

میربا سر جھکا کر دروازے کے پاس آئی۔ پھر پنڈت جی کے سامنے سے گزرتی ہوئی کمرے میں آ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔ پنڈت جی نے دروازے کو بند کرنے کے بعد میز کے دوسری طرف ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔

''مجھے پنڈت گردھاری لال کہتے ہیں۔ بیٹی ہم جان بوجھ کر کسی دوسرے دھرم کے بچے اپنے ہاں نہیں رکھتے۔ ہاں کوئی مجبوری ہو تو دوسری بات ہے۔ اب یہی دیکھو کہ آج سویرے سویرے کوئی بوڑھی عورت ہمارے دروازے پر ایک بچے کو چھوڑ کر چلی گئی۔ ایسی حالت میں ہم بچے کو کہیں پھینک نہیں سکتے۔ بھگوان کسی کو اتنا کٹھور نہ بنائے''۔

میربا نے قدرے مایوس ہو کر پوچھا۔

''کیا آپ میرے بچے کو نہیں رکھیں گے؟ میں، میں ایک عیسائی ہوں''۔

''بیٹی! تم اپنے دھرم کے انوسار اپنی عیسائی مشنری میں بچے رکھ سکتی تھیں۔ میں یہ نہیں پوچھوں گا کہ تم نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ روزنامہ سندیس کے ایڈیٹر سودیش مکرجی نے یہاں آ کر ہم سے پرارتھنا کی تھی کہ ہم تم سے کچھ نہ پوچھیں، تمہارے بچے کو ہندو سمجھ کر رکھ لیں۔ میں تم سے صرف یہ پوچھنے کے لیے بلایا گیا ہوں کہ بچے کا دھرم بدل جائے تو تمہیں انکار تو نہیں ہوگا؟''

''نہیں یہ بات میری سمجھ میں آ گئی ہے کہ ہر مذہب میں تھوڑے بہت شیطان ہوتے ہیں۔ ان کے پیچھے اگر کسی بھی مذہب کی پناہ میں آ کر انسان بن سکیں تو یہ بڑی بات ہوگی۔ مجھے انکار نہیں ہے''۔

''بس میں یہی معلوم کرنا چاہتا تھا۔ اب میرے من میں یہ بات کھٹکتی نہیں رہے گی کہ میں نے کسی کے بچے کو اپنی اچھا سے اپنے دھرم میں شامل کر لیا ہے۔ اب تم جا سکتی ہو''۔

میربا جانے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھ نہ سکی۔ وہ ہچکچاتی ہوئی بولی۔

''مجھے یوں لگ رہا ہے جیسے میں اپنی آدھی جان یہاں چھوڑ کر جا رہی ہوں''۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ پنڈت گردھاری لال نے کہا۔

''تم بڑی دھیرج والی ہو۔ اتنی خاموشی سے آنسو بہا رہی ہو۔ دوسری مائیں تو یہاں گود خالی کرتے وقت دھاڑیں مار مار کر روتی ہیں۔ ابھی تم نے ایک ناری کو اسی طرح چیختے چلاتے اور روتے دیکھا ہوگا''۔

''ہاں یشورانی کی آنکھ اور میرا دل دونوں ساتھ ساتھ رو رہے تھے۔ میں، میں یہاں سے جانے سے پہلے...... آخری بار اپنے بچے کو دیکھنا چاہتی ہوں۔ اس آشرم میں یہ میرا آخری دن اور آخری خواہش ہے پھر کبھی یہاں نہیں آؤں گی''۔

''بیٹی! خواہش کبھی آخری نہیں ہوتی جب تک سانس چلتی رہے ایک کے بعد دوسری خواہش مچلتی رہتی ہے۔ میں تمہارا دل نہیں توڑوں گا مگر تمہارے ایڈیٹر سودیش مکرجی جب بچے کو اسپتال سے لے کر یہاں آئے تھے تو انہوں نے کہا تھا کہ تم نے بچے کی صورت نہیں دیکھی ہے''۔

''ہاں! مکرجی کا خیال تھا کہ بچے کی صورت دیکھ کر میری ممتا تڑپنے لگے گی۔ پھر میں اسے چھوڑنے کا ارادہ بدل دوں گی مگر اب تو جو ہونا تھا وہ ہو چکا۔ میں آپ سے وعدہ کرتی ہوں کہ اسے دور سے ایک نظر دیکھ کر چلی جاؤں گی''۔

''مگر بیٹی! تم اپنے بچے کو کس طرح پہنچانو گی۔ صبح سے اب تک یہاں چار بچے آچکے ہیں۔ ان میں سے ایک لڑکی ہے باقی تین لڑکے ہیں تم اپنے بیٹے کو کیسے پہچانو گی؟''

''آں؟ میرا باسوچنے لگی۔ میں کیسے پہنچانوں گی؟ کیا میرا بچہ مجھے دیکھتے ہی پکارے گا؟ یہ کیسا احمقانہ خیال ہے؟'' پنڈت گردھاری لال نے کہا۔

''میں تمہیں پریشان نہیں کرنا چاہتا مگر مجبوری ہے، تینوں لڑکے ہم رنگ ہیں اور ہم عمر ہیں اور تینوں کا جنم دن پندرہ ستمبر ہے''۔

O☆O

کنٹرول سینٹر کی عمارت کے باہر اخبارات کے رپورٹروں اور فوٹو گرافروں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ کیپٹن ہری رام اپنے دفتر میں بیٹھا ہوا سگریٹ کے کش پر کش لگا رہا تھا۔ میز کے دوسری طرف فلائنگ کلب کا لائسن آفیسر رپورٹ پیش کر رہا تھا۔

''سر! آج پندرہ ستمبر ہے۔ دو دن پہلے آج کے لیے طیارہ چارٹر کرایا گیا تھا۔ چارٹر کرانے والے کا نام ہمیش چند چٹر جی تھا۔ وہ ہمیش اسٹیل ملز کے مالک تھے''۔

کیپٹن رام نے پوچھا۔

''ہمیش چند آج فلائنگ کلب میں کب آئے تھے؟''

''صبح پونے نو بجے''۔

''ان کے ساتھ اور کتنے لوگ تھے؟''

''ان کے ساتھ ان کی دھرم پتنی اور پانچ سال کا ایک لڑکا تھا''۔

''آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ لڑکا پانچ برس کا تھا؟''

''ہمیش چند اس لڑکے کو گود میں اٹھا کر طیارے کی طرف جاتے ہوئے اسے پیار کر رہے تھے اور کہہ رہے تھے کہ آج وہ اپنے بیٹے کی پانچویں سالگرہ منا رہے ہیں''۔

''ان کا پتا کیا ہے؟''

''وہ کلکتہ سے آئے تھے۔ دارجلنگ میں ان کا ایک کاٹج ہے، تن سنگ روڈ پر''۔

''اتنے میں سارجنٹ دروازہ کھول کر اندر آیا اور کیپٹن کو مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

''سر ہیلی کاپٹر واپس آ گیا ہے۔ اس عمودی چٹان کے آس پاس بہت سی چٹانیں ابھری ہوئی ہیں اس لیے وہاں ہیلی کاپٹر لینڈ نہیں کیا جا سکتا۔ ان کی رپورٹ ہے کہ یہ بچہ حرکت کر رہا ہے۔ ہیلی کاپٹر سے کمبل اور کھانے پینے کی

چیزیں پھینکی گئی ہیں......''

اس کی بات ادھوری رہ گئی۔ کھلے ہوئے دروازے سے تمام رپورٹرز اور فوٹوگرافر دفتر میں گھس آئے تھے اور انہوں نے طرح طرح کے سوالات شروع کر دیئے تھے۔ کیپٹن نے باری باری ہر سوال کا جواب دیا۔

''اسٹیل مل کے مالک کروڑ پتی ہمیش چند چٹر جی گرمیاں گزارنے کے لیے دار جلنگ آئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کی دھرم پتنی اور ان کا بیٹا تھا۔ حادثے میں ہمیش چند اور ان کی پتنی ہلاک ہو گئے ہیں۔ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر صرف ان کے پانچ سالہ بچے کی زندگی کے آثار پائے گئے ہیں۔ آج پندرہ ستمبر ہے اور وہ زندگی اور موت کے درمیان سالگرہ کا دن گزار رہا ہے''۔

O☆O

سالن کے جلنے کی بو آئی تو بانو چونک گئی۔ اسے ہوش آیا کہ وہ باورچی خانے میں چولہے کے سامنے کھڑی ہوئی ہے اور تھوڑی دیر بعد کیپٹن سرتاج حسین اپنی سالگرہ منانے اس کے گھر آنے والا ہے''۔

سوچ کی رفتار، آواز کی رفتار سے زیادہ تیز ہوتی ہے۔ وہ سوچتے سوچتے پلک جھپکتے ہی دو سال پیچھے آصف کے پاس پہنچ گئی تھی۔ اس کی بیوی بن گئی تھی۔ پھر ایک بچے کو جنم دے کر واپس باورچی خانے میں آ گئی تھی تاکہ سرتاج حسین کے لیے بریانی اور سالن تیار کر سکے۔

تنہائی میں ماضی کی طرف دیکھتے ہی بچے کا خیال دل میں کچوکے لگانے لگتا تھا۔ دماغ میں طرح طرح کے سوالات ابھرتے تھے، وہ کہاں ہوگا۔ اب پورے دو برس کا ہو گیا ہوگا۔ دو برس کے بچے ''اماں اماں'' کہنے لگتے ہیں۔

اسی وقت اسے اپنی ماں کی آواز سنائی دی۔

''کیا سوچ رہی ہو؟ کھانا تیار ہو گیا؟''

''آں! جی ہاں سالن ذرا جل گیا ہے مگر کھانے کے قابل ہے''۔

''اچھا میں دیکھ لیتی ہوں تم منہ ہاتھ دھو کر لباس بدل لو۔ میں اسے ساتھ لے آئی ہوں، وہ ڈرائنگ روم میں بیٹھا ہوا ہے''۔

''کون؟'' بانو نے بے خیالی میں سوال کیا۔ حالانکہ وہ سمجھ گئی تھی۔

''یہ لو، کیا تم اتنی جلدی بھول گئیں؟ وہی فوجی افسر، جانتی ہوں اس نے مجھے اپنا نام کیا بتایا ہے! اس کا نام سرتاج حسین ہے۔ جلدی جاؤ بیچارہ برسوں سے تنہا زندگی گزار رہا ہے۔ اسے احساس دلاؤ کہ وہ اپنے گھر میں بیٹھا ہے''۔

وہ وہاں سے جانے لگی پھر پلٹ کر بولی۔

''امی آپ کو تو معلوم ہوگا دو برس کے بچے اماں کہنے لگتے ہیں''۔

ماں نے بیٹی کو بڑے کرب سے دیکھا پھر قریب آ کر محبت سے اس کے شانہ پر ہاتھ رکھ کر بولی۔

''بیٹی! بچے اپنی ماں کو اماں یا امی کہتے ہیں لیکن تمہارا کوئی بچہ تھا اور نہ ہے۔ میں نے کئی بار سمجھایا ہے کہ دو برس پہلے کی بانو کو مار ڈالو۔ تم نے نیا جنم لیا ہے۔ اگر شادی کی بات چل نکلی تو تم پہلی بار دلہن بنو گی۔ سرتاج تمام راستے تمہاری باتیں کرتا آیا ہے۔ جاؤ وہ انتظار کر رہا ہوگا''۔

وہ منہ ہاتھ دھونے کے لیے غسل خانہ کی طرف چلی گئی۔ اس کے دل پر ایک عجیب سی ہڑبونگ مچی ہوئی تھی۔ ماں کی ستار ہا تھا اور

مستقبل کی مسرتیں اپنی طرف بلا رہی تھیں۔ ماں بار بار سمجھاتی تھی کہ جو پیچھے دیکھ کر چلتے ہیں وہ آگے ٹھوکر کھاتے ہیں۔ وہ بچہ جسے ماں کی بدنصیبی کھا گئی وہ دوبارہ واپس نہیں آئے گا۔ اگر وہ پھر سے سہاگن بنی تو پھر اس کے پیچھے بچے ہی بچے ہوں گے۔

ماں اسے خوشگوار زندگی گزارنے کا سبق پڑھاتی تھی اور یہ بھول جاتی تھی کہ پچھلا سبق ہمیشہ یاد رہتا ہے۔ کوئی بھی تخلیق کار اپنے فن پارے کو کبھی نہیں بھولتا۔ دس بچوں کی ماں بننے کے بعد بھی بانو اپنی پہلی تخلیق کو نہیں بھول سکتی تھی۔

جب وہ منہ ہاتھ دھونے کے بعد لباس بدل کر آئینے کے سامنے آئی تو کچھ دیر تک اپنے آپ کو دیکھتی رہ گئی۔ آئینے میں جو بانو تھی وہ بالکل کورے کاغذ کی طرح تھی۔ جیسے ابھی تک اس پر کسی نے اپنا نام نہیں لکھا تھا اور نہ ہی اس کاغذ پر کبھی کسی بچے کی تصویر بنائی گئی تھی۔ اسی لیے تو سرتاج بے اختیار اس کی طرف کھنچتا چلا آیا تھا۔ بانو کو اس کی بات یاد آ گئی۔

''تم چاہو تو مجھے سرتاج کہہ سکتی ہو''۔

وہ آئینے کے سامنے شرما گئی۔ اس نام کے سائے میں شادی کا پیغام تھا۔ سرتاج کا پیار بھرا لہجہ کہہ رہا تھا کہ تمام مرد آصف کی طرح سنگدل اور بے حس نہیں ہوتے۔ وہ پھول کو پھول کی طرح اٹھاتے ہیں اور آخری سانس تک زندگی کے خوبصورت گلدان میں سجا کر رکھتے ہیں۔ وہ سوچنے لگی ''ہائے ایسی محبت اور مسرت اب تک کہاں تھی۔ اتنی دیر سے کیوں آئی ہے؟''

سوچ کی نگری میں ہمیشہ دیر ہو جاتی ہے۔ اسے احساس ہوا کہ وہ آئینے کے سامنے بڑی دیر سے سوچ میں کھڑی ہے۔ سرتاج ڈرائنگ روم میں تنہا بیٹھا ہوگا۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی اپنے کمرے سے باہر آئی۔ ڈرائنگ روم کے دروازے تک پہنچ کر اس کی تیزی رفتاری برقرار نہ رہی۔ شرم وحیا نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ وہ دروازے کے ایک پٹ کو تھام کر دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگی۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ ڈرائنگ روم میں نہیں بلکہ سرتاج کے دل کے کسی گوشے میں قدم رکھنے والی ہے۔

اسی وقت پتہ چلا کہ وہ کمرے میں تنہا نہیں ہے۔ اسے امی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔

''بیٹا بانو بڑی شرمیلی ہے۔ وہ اس طرح نہیں آئے گی میں اسے بلا کر لاتی ہوں''۔

''نہیں امی۔ آپ نہ جائیں۔ میں آپ سے ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں مگر ڈر لگتا ہے کہ آپ ناراض نہ ہو جائیں''۔

''بیٹے کیسی باتیں کرتے ہو۔ جب تمہیں بیٹا کہا ہے تو تمہاری کسی بات پر ناراض کیسے ہو سکتی ہوں۔ تم بلا جھجک کہو''۔

''امی بات یہ ہے کہ میری شرافت کی گواہی دینے کے لیے میرا کوئی عزیز یا رشتے دار نہیں ہے۔ اگر آپ مجھے شریف اور ایماندار سمجھتی ہیں تو بانو کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں۔ میں اسے اپنی عزت بنا کر ہمیشہ اس کی عزت کروں گا''۔

اچانک ہی بانو کے کانوں میں شہنائیاں گونجنے لگیں۔

نگاہوں کے سامنے آتش بازیاں چھوٹنے لگیں۔

ایک ماہتابی تیزی سے سرسراتی آسمان کی بلندی کی طرف جانے لگی۔

اس کے ساتھ ہی وقت کا پنچھی تیزی سے پروں کو پھڑپھڑاتا ہوا اڑتا چلا گیا۔

ایک ماہ گزر گیا۔

وہ دلہن کا سرخ جوڑا پہنے، گھونگھٹ نکالے سہاگ کی سیج پر بیٹھی تھی۔ گھونگھٹ کے سائے میں ہر کنواری کا دل گھبراتا ہے کہ پتا نہیں اب کیا ہونے والا ہے۔ لیکن وہ تو کنواری نہیں تھی۔ کلی سے پھول یا لڑکی سے عورت بننے کے بعد کنوارے گھونگھٹ میں چھپی بیٹھی تھی۔ کیا پردہ اٹھنے کے بعد بھی وہ اپنے سرتاج سے چھپی رہ سکے گی؟ اگر چھپ نہ سکے اور ماضی کھل کر سامنے آجائے تو کیا ہوگا؟ کیا دوسری باری طلاق ہوگی؟ یہی سوچ کر اس کا دل گھبرا رہا تھا۔

وہ سہاگن بن کر مسرتوں کے ہجوم میں خوف زدہ تھی۔ بعض اوقات انسان کو ایسے ہی ڈرانے دھمکانے والی خوشیاں ملتی ہیں۔ ایسی خوشیاں خدا نہیں دیتا بلکہ انسان خود خریدتا ہے۔ ایک دوسرے سے لین دین کے موقع پر اگر ایک اپنا سب کچھ دے کر بھی کچھ چھپا لیتی ہے تو بے پناہ مسرتیں حاصل کرنے کے باوجود سہم سہم کر زندگی گزارتی ہے۔

سوچتے سوچتے انتظار کی گھڑیاں ختم ہوگئیں۔ گھونگھٹ کے پیچھے سے کچھ دکھائی نہیں دے رہا تھا پھر بھی وہ سمجھ گئی کہ...... سرتاج حسین سہاگ کے کمرے میں آگیا ہے۔ اسے سمجھنے کا جو تجربہ تھا اس کے مطابق اور زیادہ سمٹ کر بیٹھ گئی۔ اس کا خیال تھا کہ دنیا کے تمام دلہا آصف کی طرح ایک ہی انداز میں ریکارڈ کی مانند بولتے ہیں اور گھونگھٹ اٹھاتے ہی اپنا قرض وصول کرنے لگتے ہیں لیکن جب سرتاج حسین نے اس کے قریب بیٹھ کر اور اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر بولنا شروع کیا تو بانو کا تجربہ غلط ہوگیا کہ تمام دلہا اپنی خواہشات کو اہمیت دیتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ سہمی ہوئی دلہن کی دلجوئی کرتے ہیں۔ اسے دائمی محبت اور قائمی تحفظ کا یقین دلاتے ہیں۔

سرتاج حسین کا انداز ایسا تھا کہ بانو کا دل خود بخود اس کی طرف کھنچتا چلا گیا۔ اس کے دل و دماغ میں جو خوف سمایا ہوا تھا وہ آپ ہی آپ دور ہوگیا۔ بعض مرد ساحر ہوتے ہیں، اس لیے تو وہ سحر زدہ ہوگئی تھی۔ اسے معلوم نہ ہو سکا کہ وہ کب اور کیسے اپنے سرتاج حسین کی آغوش میں چلی گئی۔ تب سرتاج حسین نے کہا۔

"آج سے تم مجھ میں ہو اور میں تم میں ہوں۔ ان حسین لمحات کے بعد ہمارے درمیان کوئی پردہ نہیں رہے گا۔ میں پہلے ہی تمہیں بتا چکا ہوں کہ تم سے پہلے میری زندگی میں دو لڑکیاں آچکی ہیں۔ اگر تمہاری زندگی میں مجھ سے پہلے کوئی آیا ہو تو مجھ سے نہ چھپاؤ......"

بانو کے دل کی دھڑکنیں ایک دم سے تیز ہوگئیں۔ جو خوف مٹ گیا تھا وہ یکبارگی اس کے اندر زلزلے کے سے جھٹکے پہنچانے لگا۔ وہ ہزار ضبط کے باوجود کانپنے لگی۔ وہ اپنی دانست میں اپنی کوئی کمزوری ظاہر نہیں کر رہی تھی لیکن بعض باتوں کا ردعمل بے اختیار ہوتا ہے۔ اس پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔ سرتاج چند لمحوں تک انتظار کرتا رہا کہ شاید وہ جواباً کچھ بولے گی پھر وہ خود ہی بولا۔

"تم لرز رہی ہو۔ میں سمجھ گیا۔ میں پہلا شخص ہوں جو تمہاری زندگی میں آیا ہوں۔ یہ تمہارے بدن کی کنواری کپکپاہٹ ہے۔ میں سمجھ گیا...... بالکل سمجھ گیا......"

بانو کو یوں لگا جیسے وہ طنز کر رہا ہے مگر وہ تو پیار کر رہا تھا۔ اس کی سانسوں کے راستے دل میں اتر رہا تھا۔ جس بات کا جواب وہ نہ دے سکی تھی، سرتاج اس بات کو اس کی اداؤں میں ڈھونڈ رہا تھا۔ کوئی ضروری نہیں تھا کہ سرتاج سراغرساں بن گیا ہو۔ بانو کے دل کا چور ایسا سوچ رہا تھا۔ حالانکہ سب ہی شوہر اپنے حقوق کے مطابق ایسے وقت سراغرساں بن کر پیار سے تفتیش کرتے ہیں۔

کمرے میں گہری تاریکی تھی۔ اس تاریکی میں وہ اپنے آپ کو بھی نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس لمحے کچھ احساسات

تھے کہ وہ آپریشن تھیٹر کے بیڈ پر پڑی ہوئی ہے۔ اسے جھوٹ کا سرطان ہوگیا ہے اور سچائی کے نشتر سے اس کا آپریشن کیا جارہا ہے۔ کیا واقعی دنیا میں کوئی ایسا اسپتال ہے جہاں سے جھوٹ کی میڈیکل رپورٹ حاصل کی جاسکتی ہو؟

"نہیں" بانو نے بڑے حوصلے سے سوچا "کوئی میرے جھوٹ کو نہیں پکڑ سکتا۔ اس کے باوجود میں فیصلہ کیا تھا کہ محبت کرنے والا شوہر ملے گا تو اس سے کچھ نہیں چھپاؤں گی مگر امی نے مجھے اس بچے کی قسم دی ہے (جو نہیں ہے اور ہے) انہوں نے التجا کی ہے کہ اب میں کسی پر اعتماد نہ کروں۔ سرتاج خواہ کتنا ہی شریف، ایماندار اور محبت کرنے والا شوہر ہو، وہ ایک باسی دلہن کو کبھی برداشت نہیں کرے گا"۔

وہ بڑی قیامت کی رات تھی۔ گزرنا ہی نہیں چاہتی تھی۔ اندیشے تھے کہ دل میں گھر کر رہے تھے اور اس کے چاروں طرف تاریکی اسے دلاسے دے رہی تھی کہ اسے پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ رات کی تاریکی میں اور ماں کے پیٹ میں ہر بات چھپ جاتی ہے۔

رات کے پچھلے پہر سرتاج اٹھ کر کھڑکی کے پاس گیا۔ پھر اس کے پٹ کھولنے کے بعد ایک سگریٹ سلگانے لگا۔ بانو نے جھجکتے ہوئے کروٹ بدل کر اس کی جانب دیکھا۔ کھڑکی کے باہر تاروں بھرے آسمان کے پس منظر میں وہ ایک سائے کی طرح نظر آرہا تھا۔ اس کی پشت بانو کی طرف تھی۔ تھوڑی دیر تک دونوں کے درمیان بڑی پراسرار خاموشی رہی۔ پھر وہ ایک سگریٹ کا ایک کش لگا کر دھواں چھوڑنے کے بعد ہنسنے لگا۔

وہ کس پر ہنس رہا تھا۔ بانو پر یا اپنے آپ پر؟ ہنسنے کی کوئی تو وجہ ہوگی۔ بغیر کسی وجہ کے صرف پاگل ہنستے ہیں۔

"میں بھی کیسا نادان ہوں کہ اپنے سامنے کے ہر انسان سے یہ توقع کرتا ہوں کہ وہ پوری سچائی سے میرے سامنے آئے۔ یہ سراسر حماقت ہے ہر انسان کا اپنا ایک ماضی، اپنے چند راز اور غرور ہوتا ہے۔ کسی کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ اس کے ذاتی معاملات کی چھان بین کرے"۔

اس نے پھر سگریٹ کا ایک کش لگایا۔ اندھیرے میں سگریٹ کی آگ دہکنے لگی۔ بانو کو یوں لگا جیسے وہ اس کے سلگتے ہوئے دل کو پھونک رہا ہو۔ آخر اس نے کہا۔

"بانو! میں یہ نہیں سمجھتا کہ تم نے مجھ سے کچھ چھپایا ہے۔ اگر چھپایا ہے تو پھر ہمیشہ چھپائے رکھنا۔ میں چاہتا ہوں کہ تمہاری انا کو ٹھیس نہ پہنچے۔ تم میری عزت ہو اور تمہاری عزت رکھنا میرا فرض ہے"۔

بانو اس کی محبت اور شرافت کا یہ انداز دیکھ کر تڑپ گئی۔ اس کے جی میں آیا کہ وہ ابھی جاکر اس کے قدموں سے لپٹ جائے اور اپنے ماضی کی ایک ایک بات اسے بتائے۔ مگر کون کون سی بات؟

وہ تو سوچ رہا ہوگا کہ اس کی دلہن کی زندگی میں پہلے بھی کوئی آچکا ہے۔ وہ زیادہ سے زیادہ اسے کنواری نہیں سمجھ رہا ہوگا لیکن اتنی دور تک نہیں سوچ سکتا کہ وہ ایک بچے کی ماں بن چکی ہے۔ یہ درست ہے کہ عورت سرتاج جیسے شوہر پر اپنی جان بھی قربان کردیتی ہے مگر عورت کی جوانا ہوتی ہے اسے ٹھیس نہیں پہنچاتی۔ اپنے دل کی بات خود کبھی زبان کی نوک تک نہیں لاتی۔ بانو کے ساتھ بھی یہی عورت کی مجبوری تھی جسے وہ خود سمجھ سکتی تھی۔ اپنے ضمیر کو نہیں سمجھا سکتی تھی۔

وہ قیامت کی رات کسی طرح گزر ہی گئی۔ دوسری صبح ناشتے کی میز پر ماں موجود تھی اور بڑی خاموشی سے بیٹی اور داماد کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کررہی تھی۔ سرتاج اپنی عادت کے مطابق ہنس بول رہا تھا، بانو کچھ چپ چپ سی تھی لیکن سرتاج کی کسی کسی بات پر شرما کر مسکرادیتی تھی۔ ماں کو اعتماد ہوگیا کہ بات بن گئی ہے۔ جب داماد خوش ہے تو

بانو کی قسمت بھی خوش ہے۔ بانو تو اپنی عادت سے مجبور ہو کر چپ چپ سی رہتی ہے۔

پھر دن، ہفتے اور مہینے گزرنے لگے۔ سرتاج نے پھر کوئی ایسی بات نہیں چھیڑی جو بانو کے دل پر بوجھ بن جاتی۔ وہ تو پہلے دن سے ہی اس کا دیوانہ بن گیا تھا اور اس کی دیوانگی بدستور قائم تھی۔ مشکل یہ ہے کہ انسان کو کسی کروٹ قرار نہیں ملتا۔ بانو کے دل سے خوف اور اندیشے دور ہوئے تو وہ سرتاج کی دیوانہ وار محبت سے گھبرانے لگی۔ وہ اپنے خلوص اور محبت سے عظمت حاصل کر رہا تھا اور وہ تھی کہ آپ اپنی ہی نظروں سے گرتی جا رہی تھی۔

ایک سال کے بعد سرتاج نے اس کے لیے دو بیڈ روم اور ایک ڈرائنگ روم کا چھوٹا سا مکان بنایا اور اس کے ہاتھ میں مکان کی چابی دے کر کہا۔

''یہ تمہارا گھر ہے، اس کا دروازہ اپنے ہاتھوں سے کھولو اور اپنی محبت سے اس گھر کو جنت بنا دو''۔

اپنے مکان کا پہلا دروازہ کھولتے وقت بانو کے ہاتھ کانپ رہے تھے۔ ایک وہ آصف تھا جو گھر لوٹ کر چلا گیا تھا ایک یہ سرتاج تھا جس نے اپنی محنت کے گاڑھے پسینے سے محبت کا وہ چھوٹا سا تاج محل بنایا تھا۔ کیا وہ اس گھر کو اس کے لیے جنت بنا سکتی تھی؟ مگر کیسے بنا سکتی تھی؟ اس نئے گھر میں داخل ہوتے ہی پہلا خیال اس کے دل میں یہی آیا کہ اگر وہ بچہ آصف کا نہ ہوتا، سرتاج کا ہوتا تو وہ اسے بانہوں میں لے کر اس نئے مکان میں قدم رکھتی۔ پھر اس کے اور سرتاج کے درمیان کوئی جھوٹ اور بے اعتمادی نہ ہوتی۔

جب دو برس گزر گئے تو سرتاج نے ایک رات اسے بازوؤں میں سمیٹ کر پوچھا۔

''کیا بات ہے کیا ہمارے اس چھوٹے سے گھر میں ایک ننھا سا پھول نہیں کھلے گا؟''

بانو اس کے سینے پر سر رکھتے ہوئے بولی۔

''میں کیا کہوں۔ یہ تو خدا کی دین ہے وہ جب چاہے گود میں پھول کھلا دے''۔

ایسا کہتے وقت اس کا حلق خشک ہو گیا۔ اس کی نظریں سامنے دیوار سے لگے ہوئے کیلنڈر پر گئیں۔ کیلنڈر پندرہ ستمبر کی تاریخ بتا رہا تھا۔ اس کا دل جیسے حلق میں آ کر دھڑکنے لگا ''اوہ خدایا! اب تو میرا لعل چار برس کا ہو گیا ہوگا۔ وہ ابھی کیا کر رہا ہوگا؟''

ایسے وقت شوہر سے وفا کرتے کرتے ایک ننھی سی دیوار حائل ہو جاتی تھی۔ اگر بچہ نگاہوں کے سامنے ہو تو اسے چھوڑ کر شوہر کے سینے سے لگا جا سکتا ہے مگر نگاہوں سے اوجھل ہو تو ازدواجی محبت کے درمیان وہ عورت کو بیوی کے بدلے صرف ماں بنا کر رکھ دیتا ہے۔ بانو کو یہ ممتا بڑی مہنگی پڑ رہی تھی۔

ایک برس اور گزر گیا۔ پندرہ ستمبر کی صبح بانو کی آنکھ کھلی تو اسے سب سے پہلے یاد آیا کہ بیٹے سے بچھڑے ہوئے پورے پانچ سال گزر چکے ہیں۔ اگر وہ آج موجود ہوتا تو صبح ہی سے اس کی پانچویں سالگرہ کی تیاری شروع ہو جاتی۔ محلے کے بچوں کو مدعو کیا جاتا گانے بجانے کا پروگرام ہوتا۔ میرا بیٹا تمام بچوں کے درمیان شہزادہ نظر آتا۔ کیسا ہنگامہ ہوتا۔ یہ گھر خوشیوں سے بھر جاتا۔

اس کی نظر گھڑی پر پڑ گئی، نو بج گئے تھے۔ وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی اب اسے سرتاج کا خیال آیا۔ اکثر ایسا ہوتا تھا کہ وہ صبح دیر تک سوتی رہتی تھی اور سرتاج ناشتہ کیے بغیر ڈیوٹی پر چلا جاتا تھا۔ وہ بستر سے اٹھ کر اپنی کوتاہیوں کا احساس کرتی ہوئی مکان سے باہر لان میں آئی، اس خیال سے کہ شاید وہ ابھی لان میں بیٹھا اخبار پڑھ رہا ہو مگر وہ نہیں تھا۔

ٹھیک نو بج کر دس منٹ پر اسے ایک طیارے کی آواز سنائی دی۔ وہ سر اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھنے لگی۔
وہ نہیں جانتی تھی کہ وہ چھوٹا سا طیارہ زندگی کے ائیر پورٹ سے پرواز کرتا آیا ہے اور موت کے رن وے پر لینڈ کرنے والا ہے۔
اس کے دل نے دھڑک کر یہ نہیں بتایا کہ اس طیارے میں ایک پانچ برس کا ننھا سا مسافر اپنی پانچوں سالگرہ منا رہا ہے۔
وہ جسے پانچ برس کا ایک ایک لمحہ ایک کانٹے کی طرح چبھتا رہا تھا۔ اس کے خون میں ابال نہیں آیا کہ اس کے خون کا ایک چھینٹا اس کی نگاہوں کے سامنے سے پرواز کرتا گزر رہا ہے۔
ہاں! اچانک ہی اس کے دل میں درد سا محسوس ہوا۔ وہ سمجھ نہ سکی کہ یہ درد کون سے چور دروازے سے آیا ہے وہ دونوں ہاتھوں سے سینے کو تھام کر مکان کے اندر چلی گئی۔

O☆O

خبریں عموماً اخبارات سے پہلے ریڈیو پر نشر ہو جاتی ہیں۔ دیس کے تمام ریڈیو اسٹیشن پانچ سالہ جانی کے متعلق خبریں سنا رہے تھے۔ طیاروں کو حادثات پیش آتے رہتے ہیں۔ حادثات میں مرنے والوں پر افسوس بھی کیا جاتا ہے پھر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ان حادثات کو بھلا دیا جاتا ہے۔ لیکن یہ خبر سن کر ہر ماں باپ کا دل دہل گیا کہ ایک پانچ برس کا بچہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر بے یار و مددگار پڑا ہے۔ یہ خبر سن کر کوئی ماں ایسی نہیں تھی جس نے اپنے بچے کو فوراً ہی کھینچ کر سینے سے نہ لگا لیا ہو۔
ڈیلی ایوننگ ٹیلی گرام کے ایڈیٹر نے ریڈیو کا سوئچ آف کرتے ہوئے اپنے رپوٹر داس دیو سے کہا۔
''داس دیو! اپنے فوٹو گرافر کے ساتھ فوراً دار جلنگ پہنچو۔ وہاں پہنچ کر جانی کا ٹج کی تصویر لو۔ کاٹیج کے اندر پہنچ کر اس بچے کے خالی بستر کی بھی ایک تصویر اتارو۔ وہاں جو لوگ ہوں ان کے بیانات لے کر ایک معصوم بچے کے متعلق ایسی لرزہ خیز کہانی بناؤ کہ پڑھنے والوں کے دل دہل جائیں۔ یہ سنہری موقع ہے ہمارے اخبار کی اشاعت بڑھ جائے گی''۔
''میں سمجھتا ہوں باس! جب تک دھماکہ خیز خبریں شائع نہ ہوں اخبار ہاتھوں ہاتھ نہیں بکتا......''
ایڈیٹر نے کہا ''صرف دھماکہ خیز سچی باتوں سے کام نہیں چلتا۔ ان خبروں میں نمک مرچ اور دوسرے مسالے لگانے پڑتے ہیں۔ مثلاً ہم جانی کے خالی بستر کی ایک تصویر شائع کریں گے اور اس کے نیچے لکھیں گے کہ اس آرام دہ بستر پر ماں کی لوریاں سننے والا جانی بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر پتھریلی چٹان کی گود میں پڑا ہے۔ ہمارے دیس کی کوئی ماں اپنی لوری کی آواز اس کے کانوں تک نہیں پہنچا سکتی...... کہو یہ کیسا نیوز اسسٹنٹ ہوگا؟''
''غضب ہو جائے گا باس! ایسی باتیں پڑھ کر تمام مائیں چیخنے لگیں گی''۔
''یہی تو پوائنٹ ہے۔ جب عورتیں چیخیں گی اور ضد کریں گی تو ان کے پتی یا پتا ہمارا اخبار خریدنے پر ہو جائیں گے۔ بس اب جلدی سے جاؤ، ایسا نہ ہو کہ روزنامہ سندیس کی میر با تم سے پہلے وہاں پہنچ جائے۔ کوشش کہ وہ شیطان کی خالہ تم سے پہلے کوئی خاص معلومات حاصل نہ کر سکے''۔
''ایسا ہی ہوگا باس! وہ کتنی ہی چالاک ہو مجھ سے بازی نہیں لے جا سکے گی''۔
ایسا ہی ہوا۔ سب سے پہلے دیو داس اپنے فوٹو گرافر کو لے دار جلنگ پہنچ گیا۔ جانی کا ٹیج اید۔

دامن میں تھا۔ جب داس دیو کاٹیج کے احاطے میں داخل ہونے لگا تو مالی نے احاطہ کا دروازہ کھولا اس کا چہرا اترا ہوا تھا اور آنکھیں روتے روتے سوج گئیں تھیں۔ داس نے اس سے پوچھا۔

''تم یہاں کام کرتے ہو؟''

''ہاں صاحب! میں یہاں کا مالی ہوں مگر آج یہاں کی پھلواری اجڑ گئی ہے''۔

''واہ واہ کیا دل کو لگنے والی بات کہی ہے۔ ٹھہرو میں اسے لکھ لیتا ہوں''۔

اس نے نوٹ بک میں لکھنے کے بعد کہا۔

''تم اس کھمبے سے ٹیک لگا کر آسمان کی طرف یوں حسرت بھری نظروں سے دیکھو جیسے یہ آسمان جانی کے جہاز کے بغیر ننگا ہو گیا ہو۔ ہم تمہاری تصویر اخبار میں چھاپیں گے''۔

پھر اس نے اپنے فوٹو گرافر سے کہا کہ وہ تصویر اتارنے کے لیے تیار ہو جائے۔ اسی وقت میر با کی آواز سن کر چونک گیا۔ اس نے پلٹ کر دیکھا وہ بلاشنگ کلر کا بلاؤز اور اسکرٹ پہنے اپنے شانے سے ایک کیمرے لٹکائے کھڑی تھی۔ اس نے گہری سنجیدگی سے کہا۔

''مسٹر داس دیو۔ ایک مالی کو اداکار بنانے سے تمہارے اخبار کی مانگ نہیں بڑھے گی۔ صحافت کے پیشے کو مذاق نہ بناؤ''۔

داس دیو نے بات ٹالنے کے لیے مسکرا کر کہا۔

''اچھا تو تم پہنچ گئیں۔ مگر کیا بات ہے؟ آج تم کچھ کھوئی کھوئی سی لگ رہی ہو۔ بھئی اس بچے کی ٹریجڈی ماؤں کو اداس کر سکتی ہے اور تم تو ابھی کنواری ہو''۔

میر با کے دل کو ایک دھچکا سا لگا کہ وہ کنواری مریم ہے۔ کوئی اس کی ممتا کو نہیں سمجھ سکتا جب سے اس پانچ سالہ جانی کی خبر سنی تھی اس کا دل بے طرح گھبرا رہا تھا۔ وہ اپنے بچے کی عمر کا حساب لگا چکی تھی۔ اگر چہ وہ نہیں جانتی تھی کہ جانی وہی بچہ ہے۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک کروڑ پتی سیٹھ کا بچہ اس کے اپنے خون کا پروردہ ہو سکتا ہے۔ وہ تو محض ایک بچے کا درد اپنے دل میں لے کر وہاں آئی تھی اور اپنے روزنامہ کے لیے صحیح خبریں حاصل کرنا چاہتی تھی۔

وہ کوئی جواب دیے بغیر کاٹیج کے دروازے کی طرف جانے لگی۔ داس دیو اس سے پہلے تیزی سے چلتا ہوا کال بیل تک پہنچ گیا پھر اس کا بٹن دبانے کے بعد بولا۔

''میر با! یہاں کوئی تیسرا اخباری رپورٹر نہیں ہے۔ آؤ ہم دونوں آپس میں سمجھوتا کر لیتے ہیں یہاں سے جو معلومات حاصل ہوں گی وہ معلومات ہم آپس میں بانٹ لیں گے یعنی معلومات کا جو حصہ میں شائع کروں گا وہ تم نہیں کرو گی اور جو حصہ تم شائع کرو گی وہ میں نہیں کروں گا''۔

میر با نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھ کر کہا۔

''مجھے منظور ہے لیڈیز فرسٹ کے اصول کے مطابق پہلے میں کہتی ہوں کہ جانی کی تصویر میرے اخبار میں شائع ہو گی۔ سمجھوتے کے مطابق تم اس کی تصویر شائع نہیں کرو گے''۔

داس دیو نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔

''یہ...... یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جانی تو اہم موضوع ہے۔ اس کی تصویر تمام اخبارات شائع کریں گے''۔

میرہا نے کہا ''اس طرح جانی کے متعلق جتنی خبریں ہوں گی وہ سب ہی اہم ہوں گی لہٰذا فضول سمجھوتے بازی سے پرہیز کرو''۔

اتنے میں دروازہ کھل گیا۔ایک بوڑھی ملازمہ نے ساڑھی کے آنچل سے آنسو پونچھتے ہوئے پوچھا۔

''آپ کون لوگ ہیں؟''

داس دیو نے اپنے فوٹو گرافر سے کہا کہ آنسو پونچھتی ہوئی اس عورت کی فوراً تصویر اتاری جائے۔فوٹو گرافر نے کیمرے کی آنکھ سے دیکھا۔اسی وقت میرہا اس بوڑھی عورت کے بالکل قریب آکر اپنے رومال سے اس کے آنسو پونچھنے لگی۔کیمرے کا بٹن دبنے کے بعد فوٹو گرافر کو پتا چلا کہ میرہا بھی تصویر میں چلی آئی ہے۔

داس دیو نے جھلا کر کہا۔

''یہ کیا حرکت ہے؟ کیا ابھی آنسو پونچھنا ضروری تھا؟''

''ہاں! داس دیو، ہم پہلے انسان ہیں بعد میں رپورٹر ہیں۔ایک دکھی عورت کے آنسو پونچھ کر اسے تسلی دینے کے بعد ہم اپنا کام کر سکتے ہیں''۔

بوڑھی ملازمہ نے اس سے متاثر ہو کر کہا۔

''بیٹی! تم بہت اچھی ہو۔عورت ہی عورت کے دکھ درد کو سمجھ سکتی ہے۔آؤ اندر آجاؤ''۔

داس دیو اس سے پہلے ہی کمرے میں پہنچ گیا۔اس نے پوچھا۔

''ماں جی! آپ کا بچے کے ساتھ کیا رشتہ ہے''۔

''میں اس گھر کی ملازمہ ہوں۔مگر ایک ماں کی طرح دن رات جانی کو گود میں کھلایا ہے۔میں ان کا انتظار کر رہی تھی کہ وہ جانی کو ہوائی جہاز کی سیر کرانے کے بعد آتے ہی ہوں گے۔اس وقت میں نے ریڈیو لگایا تو یہ منحوس خبر سنائی دی۔اپنے کانوں سے سن کر بھی یقین نہیں آرہا ہے۔بیٹی یہ خبر جھوٹی نہیں ہوسکتی؟''

''نہیں ماں جی! میرہا نے کہا'' یہ خبر جھوٹی ہوتی تو ہم یہاں نہ آتے۔آپ کرپا کر کے جانی کی ایک تصویر ہمیں دے دیں۔کیا آج جانی کی سالگرہ منائی جارہی تھی''۔

''ہاں یہ دیکھو کل رات ہی بڑا برتھ ڈے کیک منگوایا گیا تھا''۔

ملازمہ نے آگے بڑھ کر ایک میز پر سے کپڑے کو ہٹا دیا۔وہاں ایک بڑا سا برتھ ڈے کیک رکھا ہوا تھا۔ فوٹو گرافر اس کی تصویر اتارنے لگا۔خوبصورت سے کیک پر واضح الفاظ میں ''پندرہ ستمبر'' لکھا ہوا تھا۔میرہا سالگرہ والی بات جانتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ آج کون سی تاریخ ہے لیکن کیک پر ''پندرہ ستمبر'' کی تحریر دیکھ کر اس کا دل ڈوبنے لگا۔ اس کے دماغ کی کوکھ میں اس کا بچہ مچل مچل کر پوچھنے لگا۔

''ممی! آپ میری سالگرہ نہیں منائیں گی؟ دیکھیے نا؟ میرا برتھ ڈے کیک تیار ہے بولیے نا۔کیا آپ میری سالگرہ نہیں منائیں گی؟''

ایک بچہ اندر ہی اندر سے اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔اسے یوں لگ رہا تھا جیسے اب کچھ ہونے والا ہے۔اس نے اپنے آپ کو ٹٹولا کہ کیا ہوسکتا ہے؟ پانچ برس پہلے تو وہ اندر سے مر چکی تھی۔مرنے کے بعد اور کون سا المیہ اسے رلا سکتا ہے؟ انسان جو سوچ بھی نہیں سکتا وہی اس کے آگے آتا ہے۔وہ چپ چاپ کھڑی کیک پر لکھی ہوئی تاریخ کو

تکے جا رہی تھی۔

''میں بارہ سال سے ملازمت کر رہی ہوں۔ پانچ برس پہلے میں سیٹھ اور سیٹھانی کے ساتھ خود جانی کو لانے گئی تھی''۔

''لانے گئی تھیں؟'' داس دیو نے قدرے تعجب سے پوچھا۔

''یعنی آپ اسپتال یا میٹرنٹی ہوم سے اسے لانے گئیں تھیں؟''

''آں؟'' ملازمہ ایک ذرا ہچکچانے لگی اور اپنے دونوں بازوؤں کو گود لینے کے انداز میں یوں تکنے لگی جیسے بچے کو اٹھائے بہت دور سے لا رہی ہو۔ پھر وہ حسب عادت بڑبڑانے لگی۔

''اس کے پالنے والے تو سورگ باشی ہو گئے اب یہ بتانے سے کیا فرق پڑے گا کہ وہ اسپتال سے لایا گیا ہے یا آشرم سے......''

یہ بات میرا کے سینے میں گولی کی طرح لگی۔ وہ ایک دم سے لڑکھڑا کر صوفہ پر گر پڑی۔ اس سے بے خبر داس دیو نے چٹکی بجا کر کہا۔

''وہ مارا۔ یہ خبر بڑی دھماکہ خیز ہوگی کہ وہ بچہ لے پالک ہے۔ اگرچہ حادثے میں اس کا باپ اور اس کی ماں مر چکی ہے۔ اس کے بعد بھی اسے جنم دینے والی ماں کہیں زندہ ہوگی۔ اف اس خبر سے کیسی سنسنی پھیل جائے گی''۔

ممتا کیسی سنسنی اور کیسے کرب سے گزر رہی تھی، یہ میرا کا چہرہ بتا رہا تھا۔ اس کے دماغ میں آندھیاں چل رہی تھیں 'میرا بچہ...... میرا بچہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر بے یارومددگار پڑا ہوا ہے۔ میں ابھی جاؤں گی۔ ساری بلندیوں کو گرا کر اسے سینے سے لگا لوں گی'۔

وہ تھرتھراتی ہوئی اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اسی وقت داس دیو نے کہا۔

''میرا! میں تم سے زیادہ فاسٹ ہوں۔ دیکھ لینا یہ خبر سب سے پہلے میرے اخبار میں آئے گی''۔ پھر اس نے ملازمہ سے پوچھا 'جانی کو کس آشرم سے لایا گیا تھا؟''

''جلپائی گوڑی کے بالک آشرم سے......''

ملازمہ کی بات سن کر میرا کو مکمل یقین ہو گیا کہ وہ بچہ اسی کا ہے۔ اس نے داس دیو کا بازو تھام کر کہا۔

''ٹھہرو۔ داس دیو! میری ایک بات مان لو۔ ہم میں سے کسی کو یہ خبر شائع نہیں کرنی چاہیے کہ وہ بچہ لے پالک ہے''۔

''کیوں؟'' داس دیو نے بھنویں سکیڑ کر پوچھا۔

''اس لیے کہ وہ بچہ ایک کروڑ پتی سیٹھ مہیش چند کے نام سے پہچانا جاتا ہے۔ اگر تم یہ خبر شائع کرو گے تو اس معصوم بچے سے ایک باپ کا نام چھن جائے گا۔ آئندہ کے لیے اس کا تمام کیریئر تباہ ہو جائے گا۔

''میرا! مجھے بے وقوف بنانے کی کوشش نہ کرو۔ تم یہ خبر میرے پاس روک کر خود اپنے اخبار میں شائع کرو گی۔ اپنی یہ چالا کی اپنے پاس ہی رکھو''۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا باہر جانے لگا۔ میرا نے اسے آواز دی۔ داس دیو نے دروازے سے پلٹ کر میرا کو نظر انداز کرتے ہوئے اپنے فوٹو گرافر سے کہا کہ وہ اس گھر سے جانی کی ایک تصویر حاصل کر لے۔ پھر اس نے بوڑھی

ملازمہ سے پوچھا۔
''ماں جی! مجھے یقین ہے کہ آپ جانی کی اصلی ماں کو جانتی ہیں۔ کیا آپ مجھے اس کا پتا بتائیں گی؟''
میربا نے جلدی سے کہا۔
''ماں جی کچھ نہیں جانتیں...... یہ کچھ نہیں بتائیں گی''۔
بوڑھی عورت نے تائید کی''یہ سچ ہے بیٹا! آشرم والوں نے جانی کے ماں باپ کا پتا بتانے سے انکار کردیا تھا''۔
''میں اچھی طرح سمجھتا ہوں میربا! ماں جی کو تمہارا اشارہ مل گیا ہے لیکن میں نے کچی گولیاں نہیں کھیلی ہیں۔ میں آشرم سے معلومات حاصل کروں گا''۔
یہ کہتے ہی وہ کوئی جواب سنے بغیر کاٹیج سے باہر آگیا۔ ڈاک خانہ وہاں سے زیادہ دور نہیں تھا۔ وہ تیزی سے چلتا ہوا وہاں پہنچا۔ پھر ٹرنک کال کا ذریعے اپنے ایڈیٹر سے باتیں کرنے لگا۔ اس نے ایڈیٹر کو بتایا کہ وہ میربا کے مقابلے میں کتنی تیز رفتاری اور ذہانت سے کام کررہا ہے۔ فوٹو گرافر شام تک اہم تصویریں لے کر دفتر پہنچ جائے گا۔ اس نے وہ دھماکہ خیز خبر بھی سنادی کہ جانی لے پالک لڑکا ہے اور اب وہ آشرم کی طرف جارہا ہے تاکہ جانی کی اصل ماں کا سراغ لگا سکے۔
یہ تفصیلی رپورٹ دینے کے بعد وہ ریلوے اسٹیشن آیا۔ وہاں سے نیرو گیج کے ذریعہ سلی گوڑی پہنچا۔ سلی گوڑی سے براڈ گیج کے ذریعہ جلپائی گوڑی پہنچ کر اس نے آشرم کا معلوم کیا۔ پندرہ منٹ کے بعد وہ سائیکل رکشہ میں بیٹھ کر آشرم میں آیا تو دفتر میں قدم رکھتے ہی ٹھٹک گیا۔ اس کا سارا جوش وخروش سرد پڑ گیا۔ میربا اس سے پہلے ہی وہاں پہنچ کر پنڈت گردھاری لال سے باتیں کررہی تھی۔ اس نے داس دیو کو دیکھتے ہی کہا۔
''داس دیو! میں نے تمہیں سمجھایا تھا کہ ایک معصوم اور مظلوم بچے کا کیریئر تباہ نہ کرو، کسی ماں پر کیچڑ نہ اچھالو۔ کیا تمہاری کوئی ماں نہیں ہے؟''
''فضول باتیں نہ کرو میربا! میری ماں ایک آدرش ناری ہے''۔
''تو پھر اس آدرش ناری سے جاکر پوچھو کہ وہ تمہارے جیسے سپوت کو کسی عورت ذات کی توہین کرنے کی اجازت دے سکتی ہے یا نہیں؟ اپنا نام کرنے اور اپنا اخبار بیچنے کے لیے آدمی کو اتنا نہیں گرنا چاہیے''۔
داس دیو نے اسے ناگواری سے دیکھتے ہوئے پنڈت جی کو مخاطب کیا۔
''شریمان! آپ دھرم کی باتیں کریں۔ ایک لے پالک بچہ جو اپنے ماں باپ سے محروم ہوچکا ہے، اس بچے کو اس کی اصلی ماں تک پہنچانا کیا ہمارا کرتو (فرض) نہیں ہے؟''
''ہاں بیٹے!'' پنڈت جی نے کہا''مجھے خوشی ہے کہ تمہارے جیسے نوجوان اپنے کرتو کو سمجھتے ہیں لیکن تم اس آشرم کے دستور کو نہیں جانتے۔ یہاں جو بچے آتے ہیں ان کی ماؤں کے نام کسی کھاتے میں لکھ کر نہیں رکھے جاتے کیونکہ ایسی ماؤں سے اولاد کا رشتہ ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا ہے اور جو چیز ٹوٹ جاتی ہے اسے سنبھال کر نہیں رکھا جاتا''۔
''یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ داس دیو نے کہا''ہم آپ جب دفتر کھول کر بیٹھتے ہیں تو چھوٹی سے چھوٹی چیز کا حساب رکھتے ہیں۔ پھر یہ کیسے یقین کیا جاسکتا ہے کہ ماں اور بچے کا حساب یہاں نہیں رکھا جاتا ہے''۔
''میرے بیٹے ان باتوں کو سمجھنے کے لیے ایک عمر چاہیے اس دنیا میں چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیزوں کی گنتی کی جاتی ہے مگر آدمی اپنے لہو کی بوند کا حساب نہیں رکھتا۔ ایسے ہی لہو کے چھینٹے اس آشرم میں آتے ہیں۔

اگر مرد اپنے پاپ (گناہ) کا انکار نہ کرے تو عورت اپنے بچے کو یہاں نہ لائے۔ اب اگر میں بولتا جاؤں تو بات بہت دور تک جائے گی''۔

''آپ مجھے ٹالنے کے لیے یہ سب کچھ کہہ رہے ہیں''۔

''بیٹے جو صحیح تھا وہ میں نے کہہ دیا''۔

''نہیں شریمان! میں بچہ نہیں ہوں کہ بہل جاؤں۔ میربا نے عورت ذات کی لاج رکھنے کی پرارتھنا کی ہوگی۔ اسی لیے آپ مجھے اس بچے کی ماں کا نام اور پتا نہیں بتائیں گے لیکن میں ہار ماننے والا آدمی نہیں ہوں۔ جب یہ خبر میرے اخبار میں چھپے گی کہ پہاڑ کی چوٹی پر جو بچہ ہے وہ پندرہ ستمبر کو پیدا ہوا تھا اور جلپائی گوڑی کے بالک آشرم سے مہیش چند اور ان کی پتنی کی گود میں پہنچا تھا تو جانتے ہیں کیا ہوگا؟ وہی ہوگا جو میں چاہتا ہوں۔ اس بچے کی اصلی ماں جہاں بھی ہوگی وہ اخبار پڑھتے ہی سات پردوں سے نکل کر اپنے بچے کی طرف بھاگے گی۔ اونہہ، میرا نام داس دیو ہے داس دیو......''

وہ بڑے گھمنڈ سے پاؤں پٹختا ہوا وہاں سے چلا گیا۔ میربا نے مایوسی سے کہا۔

''یہ نہیں مانے گا۔ اس کی نادانی سے ان دو ماؤں تک یہ خبر پہنچ جائے گی۔ یہ میں جانتی ہوں کہ ان کے دلوں پر کیا گزرے گی۔ میرے اندر تو ایسی تڑپ اور بے چینی ہے کہ میں پنکھ لگا کر پہاڑ کی چوٹی پر پہنچ جانا چاہتی ہوں''۔

''دھیرج رکھو بیٹی! بھگوان سے بچے کے پرارتھنا کرو، وہی تم تین عورتوں کی لاج بھی رکھے گا۔ پتا نہیں وہ دو عورتیں کہاں ہیں۔ ان میں سے ایک نے اپنے بچے کو آشرم کے دروازے پر چھوڑ دیا تھا یعنی اپنے آپ کو چھپالیا تھا مگر اب بچے کی بپتا سن کر وہ چھپی نہ رہ سکے گی''۔

''دوسری کو میں پہچانتی ہوں۔ اس کا نام یشورانی ہے......''

○☆○

یشورانی جیل کی آہنی سلاخوں کے پیچھے کھڑی ہوئی خلا میں ایک ٹک دیکھ رہی تھی۔ یہ انسان کی بہت پرانی عادت ہے کہ جب وہ اپنے اندر جھانکتا ہے تو بے اختیار خلا میں گھورنے لگتا ہے۔ اسی طرح یشورانی خلا میں گھورتی ہوئی جیل کی آہنی سلاخوں سے نکل کر ماضی کے اس دور میں پہنچ گئی جب وہ کنواری کنیا کہلاتی تھی۔

ماتا پتا نے اس کا نام یشودھا رکھا تھا۔ بھگوان کرشن کنہیا کو جنم دینے والی ناری کا نام بھی یشودھا تھا۔ اس ناطے سے یشورانی کے ماں باپ نے اپنی بیٹی کو پوتر اور بھاگوان بنانے کے لیے اس کا نام یشودھا رکھا۔ جب وہ پنگھٹ پر پانی بھرنے کے لیے جانے لگی تو ایک دن بستی کے ایک شریر نوجوان نے غلیل چلا کر پانی سے بھری ہوئی اس کی گاگر توڑ دی۔ یشودھا نے غصہ سے کہا۔

''تو نے گاگر توڑ دی، پانی گرادیا۔ ساڑھی بھگودی۔ مجھے ستا کے تجھے کیا ملا؟''

نوجوان نے مسکرا کر کہا ''کرشن کنہیا بھی اپنی رادھا کو اسی طرح ستایا کرتے تھے''۔

''مگر میں رادھا نہیں ہوں۔ میرا نام یشودھا ہے''۔

''کسی ماں کا نام یشودھا ہو تو اچھا لگتا ہے۔ تیری جیسی چنچل اور البیلی نار صرف رادھا کے روپ میں اچھی لگتی ہے''۔

یہ بات یشودھا کے من میں بیٹھ گئی۔ اسے احساس ہو گیا کہ وہ دنیا کی جوان آنکھوں میں سمانے کے لیے جوان ہوگئی ہے۔ اس رات وہ دیر تک بستر پر کروٹیں بدلتی رہی۔ اس نوجوان کی نگاہوں کی گرمی کبھی اس کا یہ پہلو اور کبھی

وہ پہلو جلاتی رہی۔ دوسرے دن پنگھٹ پر نوجوان نے کہا۔

''میرا نام مرلی دھر ہے۔ آج رات جب چاند ڈوب جائے گا تو میں تیرے مکان کے پچھواڑے کھلیان میں انتظار کروں گا''۔

اس کی ہر بات انگارے کی طرح چور جذبوں کو چھو لیتی تھی۔ رات آئی تو وہ اپنے جذبات سے لڑنے لگی کہ کھلیان میں نہیں جائے گی۔ یہ بری بات ہے۔ واقعی یہ باتیں تو بری ہوتی ہیں۔ کوئی بھی سیدھی سادی شرمیلی سی لڑکی خود کبھی بے شرمی کی طرف نہیں جاتی۔ جوانی کا مقناطیس جبراً اسے اپنی طرف کھینچتا ہے۔ اس کنواری نے سوچا۔

رادھا بھی شام سانورے سے ملنے جاتی تھی۔ اگر اس میں کوئی برائی ہوتی تو بھگوان خود کبھی ایسا نہ کرتے۔ ان کی مرلی کی تان سمجھاتی ہے کہ پریم بھاؤنا سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ پریم ایسی شکتی ہے جو رادھا کرشن کے روپ میں پوجی جاتی ہے''۔

جب چاند ڈوب گیا تو کھلیان میں یشودھا کا حسن طلوع ہوگیا۔ دنیا کے تمام ماں باپ اپنی جوان بیٹیوں کے آگے لچھمن ریکھا کھینچتے ہیں کہ بیٹیاں اس حیا اور حفاظت کی لکیر سے باہر قدم نہ نکالیں لیکن پریم شکتی اسے کھینچ کر لے گئی تھی۔ اس سمے یشودھا نے یہ نہیں سوچا کہ پریم اور پاپ کے بیچ ناخن برابر فاصلہ ہوتا ہے۔ بھاؤنا میں ڈوب کر یہ فاصلہ کیسے ختم ہو جاتا ہے یہ پتا نہیں چلتا۔ پھر بھی وہ بڑی سہی ہوئی تھی۔ مرلی دھر نے فاصلے کو پاٹنا چاہا تو وہ کترا گئی۔

''نہیں مرلی! اگر تم بیاہ سے پہلے مجھے ہاتھ بھی لگاؤ گے تو میں اپنی نظروں سے گر جاؤں گی۔ تم میرے من میں سما گئے ہو اس لیے چلی آئی۔ میرے اس طرح آنے کی لاج رکھ لو''۔

مرلی دھر نے سمجھ لیا کہ دال نہیں گلے گی۔ اس نے پوچھا۔

''پھر ہم کس طرح ایک ہوں گے۔ تیرا باپ اونچی ذات کا برہمن ہے اور میں ذات کا کھتری ہوں۔ ہماری شادی نہیں ہو سکے گی کیا میں سارا جیون تجھے دیکھتا اور ترستا رہوں گا؟''

اس نے بڑے دکھ کا اظہار کرتے ہوئے بڑی محبت سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ایسے جذباتی لمحوں میں وہ انکار نہ کر سکی ہولے ہولے کانپنے لگی۔ پہلی بار اسے معلوم ہوا کہ کوئی ہاتھ پکڑ لے تو عورت ساری کی ساری پکڑ میں آجاتی ہے۔ مرلی دھر نے اس کے نازک سے ہاتھ کو اپنے سینے سے لگاتے ہوئے کہا۔

''وچن دو کہ مجھ سے شادی کرو گی۔ ہم مندر میں جا کر بھگوان کے سامنے ایک ہو جائیں گے۔ پھر ہمارے بیچ ذات پات کی کوئی دیوار نہ ہوگی''۔

''مم میں سوچ کر بتاؤں گی'' وہ ہاتھ چھڑا کر بھاگ گئی۔

وہ دنوں میں شش و پنج میں مبتلا رہی۔ بوڑھے ماتا پتا کی بدنامی سے ڈرتی رہی لیکن جذبات کے ترازو میں بڑھاپے کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ جوانی کا پلڑا ہمیشہ بھاری پڑتا ہے۔ تیسرے دن وہ پوجا کے لیے مندر گئی وہاں لگن منڈپ نہیں تھا۔ اس نے ہونے والے پتی کے ساتھ سات پھیرے نہیں لگائے صرف بھگوان کو شاکست مان کر مرلی دھر کو اپنا پتی مان لیا۔

اس کے بعد اسے پتا چلا کہ وہ مرلی دھر کے ساتھ کتنی مضبوط زنجیر میں بندھ گئی ہے۔ اب اسے پتی سمجھ کر اس کی آگیا کا پالن کرنا اس کا دھرم ہوگیا تھا۔ ایک رات مرلی دھر نے کہا۔

''ہم کب تک چوری چوری کھلیان میں ملتے رہیں گے۔ میری بات مانو یہاں سے بمبئی شہر چلو۔ میں پورا

بمبئی گھوم آیا ہوں۔ تم اتنی سندر ہو کہ فلم کمپنی میں تمہیں کام مل جائے گا۔ یہاں ہولی کے تہوار میں رادھا کا جو سوانگ رچایا تھا اسے دیکھ کر میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ تم کامیاب ہیروئن بن جاؤ گی۔ پھر ہمارے پاس اتنی دولت ہوگی کہ تم اس کا حساب نہیں کر سکو گی۔

وہ ہر رات اسے سہانے سپنے دکھانے لگا۔ کچھ سپنوں کی رنگینیاں تھیں اور کچھ اپنے پتی کا حکم تھا کہ بمبئی چلے۔ یہاں رہے گی تو ماں باپ زبردستی دوسری جگہ شادی کر دیں گے۔ لہٰذا وہ مرلی دھر کے ساتھ بمبئی پہنچ گئی۔ اس میں شبہ نہیں کہ وہ بے حد حسین تھی۔ چہرے کے نقوش ایسے تیکھے اور ایسے جاذب نظر تھے کہ نظریں جذب ہو کر رہ جاتی تھیں۔ پربھات پروڈکشنز کے مالک پنالال نے اسے دیکھا تو منہ سے رال ٹپک گئی۔ وہ مرلی دھر کو دوسرے کمرے میں لے جا کر دیر تک باتیں کرتا رہا۔ پھر مرلی دھر نے واپس آ کر خوش خبری سنائی۔

یشودھا! تم بہت لکی ہو سیٹھ پنالال تمہیں اپنی فلم میں ہیروئن کا رول دے رہے ہیں۔ اب تم ایک بہت خوبصورت کوٹھی میں رہو گی۔ تمہارے پاس کار ہوگی، نوکر ہوں گے، پنالال کی پانچ فلموں میں کام کرنے تک تمہیں ہر ماہ بیس ہزار روپے ملیں گے"۔

یشودھا حیرانی سے سنتی رہی کہ سپنے کس طرح سچ ہو رہے ہیں۔ دوسرے ہی دن وہ ہوٹل سے اپنا سامان لے کر مرلی دھر کے ساتھ اپنی کوٹھی میں آ گئی۔ اس کوٹھی کا ایک کمرہ فلم کے دفتر کے طور پر استعمال ہوتا تھا۔ اسی بہانے پنالال بھی صبح سے رات گئے تک وہاں رہتا تھا اور یشودھا سے فلمی رول کی ریہرسل کراتا تھا۔ ریہرسل کے دوران مرلی دھر باہر چلا جاتا تھا کیونکہ پنالال کا اعتراض تھا کہ وہ اپنے پتی کے سامنے جھجکتی اور شرماتی ہے۔

پنالال اسے سمجھانے لگا کہ اگر وہ تنہائی میں شرمائے گی تو کیمرے کے سامنے کام نہیں کر سکے گی۔ مگر شرم تو ایک فطری جذبہ ہے وہ بعض اوقات جھلا کر سوچتی کہ ایسا کام نہیں کرے گی لیکن پانچ سال کا ایگریمنٹ ہو چکا تھا۔ مرلی دھر نے کہا۔

"تم کام چھوڑو گی تو پنالال کا لاکھوں روپے کا نقصان ہوگا وہ تمہیں جیل تک پہنچا دے گا۔ ذرا عقل سے کام لو۔ جیل میں جانے کے بدلے عزت اور شہرت حاصل کر لو"۔

پانچ سال کے ایگریمنٹ نے اسے مجبور کر دیا تھا اور مجبوری کے وقت عقل سے کام لینا پڑتا ہے۔ اس لیے وہ مرلی دھر کی عقل کے مطابق کام کرنے لگی۔ ایک ماہ بعد فلم کے ایک ایسے سین کا ریہرسل تھا جس میں ویلن ہیروئن کو دھوکے سے شراب پلا کر اس کی عزت لوٹ لیتا ہے۔ پنالال نے اسے سمجھایا کہ اب اسے ایک گلاس میں شربت پلایا جائے گا اور وہ پینے کے بعد ایسی ایکٹنگ کرے گی جیسے سچ مچ شراب پی لی ہو۔ یشودھا نے کہا۔

"میں ایک شرابی عورت کی ایکٹنگ کیسے کروں گی۔ میں کیا جانوں کہ شراب پی کر کیسا لگتا ہے"۔

"تم فکر نہ کرو" پنالال نے کہا آہستہ آہستہ تم سب کچھ سیکھ جاؤ گی۔ شراب تو معمولی چیز ہے تم زہر پی کر بھی مرنے کی کامیاب اداکاری دکھا سکو گی۔ چلو اب اس گلاس کی شراب کو ایک سانس میں پی جاؤ"۔

یشودھا نے گلاس کو اٹھایا۔ مگر چند گھونٹ پینے کے بعد اسے ابکائی سی آنے لگی۔ حلق جلنے لگا۔ پنالال نے ذرا جلدی سے کہا۔

"شربت کو میں نے جان بوجھ کر ذرا کڑوا رکھا ہے تاکہ تم خود کو سچ مچ شراب پیتی ہوئی محسوس کرو۔ اسی لیے

کہتا ہوں کہ ایک سانس میں پی جاؤ''۔

شراب ہو یا زہر، پہلی بار پیتے وقت ایک سانس کی مدت بھی بہت ہوتی ہے۔ دوسری سانس میں گلاس خالی ہوگیا مگر سر میں آندھیاں سما گئیں۔ ساری دنیا اس کے چاروں طرف گھومنے لگی۔ اس وقت جو کچھ اس پر گزر رہی تھی اسے وہ فلم کا سین سمجھ رہی تھی کیونکہ زندگی میں جو کچھ ہوتا ہے وہ فلموں میں دہرایا جاتا ہے اور فلموں کے ذریعے جو کچھ سکھایا جاتا ہے زندگی میں اس کی سچی ریہرسل ہوتی ہے۔

جب اسے ہوش آیا تو وہ دونوں ہاتھوں سے منہ چھپا کر رونے لگی۔ شام مرلی دھر آیا تو وہ اس کے قدموں سے لپٹ کر روتے ہوئے صاف صاف کہنے لگی۔

''اب میں آپ کے قابل نہیں رہی۔ جس پنالال کو تم دیوتا کہتے تھے، اس نے دیو بن کر مجھے مسل ڈالا ہے۔ میں آپ سے مارے شرم کے آنکھ نہیں ملا سکتی۔ میں مر جاؤں گی''۔

مرلی دھر نے اسے قدموں سے اٹھا کر سینے سے لگالیا۔

''میری جان! اتنی ذرا سی بات پر رو رہی ہو۔ پہلے ہی چانس میں پانچ فلموں کی ہیروئن بننے کے لیے ہر طرح کی قربانی دینی پڑتی ہے''۔

یشودھا نے چونک کر سر اٹھایا پھر حیرانی سے اس کا منہ تکنے لگی۔ وہ سوچ رہی تھی کہ مرلی دھر یہ بات سنتے ہی غیرت کے جوش میں پنالال کو قتل کردے گا یا پھر اپنی دھرم پتنی کا ہاتھ تھام کر ساری دولت اور جھوٹی عزت و شہرت کو ٹھوکریں مار کر اسے گاؤں واپس لے جائے گا لیکن اپنے پتی کی بے غیرتی دیکھ کر جیسے ایک جھٹکے سے اسے عقل آگئی کہ وہ اس کا پتی کب تھا؟ لگن کہاں ہوا تھا؟ اس بھگوان کے سامنے جو پتھر کا بنا ہوا تھا۔ اگر اس پتھر کے سینے میں دل ہوتا تو وہ اسے ٹھوکریں کھانے سے پہلے ہی بچالیتا مگر یہ بے غیرتی اوپر سے نیچے تک ہے۔ بھگوان نے بڑی خاموشی سے اسے مرلی دھر کی بے غیرت جھولی میں ڈالا۔ مرلی دھر نے اسی طرح پنالال کی گود میں اسے ڈال دیا۔ ایسے وقت میں سمجھ میں نہیں آتا کہ بھگوان اور انسان دونوں کا عمل ایک جیسا کیوں ہوتا ہے؟

اس روز وہ مرلی دھر سے کچھ نہ بولی۔ من ہی من میں کڑھتی رہی۔ دوسرے دن پنالال آیا تو وہ بولی۔

''سیٹھ صاحب! ایگریمنٹ کس سے ہوا ہے؟''

''تم سے''

''آپ ہر ماہ بیس ہزار روپے کس کے ہاتھ میں رکھیں گے؟''

''تمہارے ہاتھ میں......''

''یہ کوٹھی اور کار کس کی ہے؟''

''تمہاری ہے میری جان!''

''جب میں تمہاری جان ہوں تو یہ دلال اس کوٹھی میں کیوں رہتا ہے؟ اسے دھکے مار کر نکال دو''۔

یشودھا نے نفرت سے مرلی دھر کی طرف اشارہ کیا تو وہ اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

''یشودھا یہ کیا بکواس کر رہی ہو۔ کیا تم ہوش میں ہو کہ تم نے اپنے پتی کا اپمان (توہین) کیا ہے؟''

''میں ابھی ہوش میں آئی ہوں۔ تم میرے پتی کب تھے؟ اور تم کیا جانو کہ پتی کا کرتو کیا ہوتا ہے؟ ارے

بے شرم! مرد وہ ہوتا ہے جو ایک ہاتھ سے اپنی عورت کا ہاتھ پکڑتا ہے اور دوسرا اٹھا کر اس کے لیے ساری دنیا سے لڑتا ہے۔ مگر تم دلال ہو دلال! نکل جاؤ میرے گھر سے۔ جب میں محنت کرتی ہوں، میں کماتی ہوں، میں اپنی پرورش آپ کرتی ہوں، سب کچھ میں ہی کرتی ہوں تو پھر تمہارا یہاں کیا کام ہے؟ میں ایک کتے کو پال سکتی ہوں، تمہیں نہیں پال سکتی۔ سیٹھ پنالال اگر مجھ سے دوستی رکھنا چاہتے ہو تو اس بے غیرت کو ابھی یہاں سے نکال دو''۔

یشودھا کے اس حکم کے بعد مرلی دھر دودھ کی مکھی بن گیا۔ پنالال کے آدمیوں نے اسے چٹکی سے پکڑ کر کوٹھی کے باہر پھینک دیا۔ اس کے ایک ہفتے بعد فلم کی پبلسٹی شروع ہوئی تو پنالال نے کہا۔

''یشودھا جیسا نام بہت پرانا ہے تمہارا کوئی ماڈرن قسم کا نام ہونا چاہیے''۔

یشودھا نے کہا۔

''ہاں یشودھا بہت ہی پوتر (مقدس) نام ہے۔ میرے ماتا پتا اس نام کے سائے میں مجھے ایک شریف لڑکی بنانا چاہتے تھے۔ آہ میرے بھاگ (نصیب) میں یہ دن لکھے تھے، چلو اب کوئی بدمعاش قسم کا نام رکھ دو''۔

پنالال نے ہنستے ہوئے کہا۔

''اب تم زہریلی باتیں کرنا سیکھ گئی ہو۔ اب تمہاری اداکاری میں گہرا رنگ آئے گا۔ میرا خیال ہے تمہارا نام رانی ہونا چاہیے تم فلم دیکھنے والوں کے دلوں پر راج کرو گی''۔

''صرف رانی نہیں، میرے اپنے نام کا بھی کچھ حصہ ہونا چاہیے تاکہ میں اپنے آپ کو یاد رکھ سکوں۔ یشو رانی کیسا نام ہوگا''۔

''بہت خوب۔ بس آج سے تمہارا نام یہی ہے''۔

یشو رانی اپنے نام کے ساتھ بدل گئی۔ دو ماہ بعد فلم کی شوٹنگ شروع ہوگئی۔ آٹھ ماہ کے بعد وہ فلم مکمل ہو کر ریلیز ہوئی تو دیس کے کونے کونے میں یشو رانی کے نام کا ڈنکا بجنے لگا۔ تمام کروڑ پتی فلم ساز اس کے دروازے پر آنے لگے لیکن وہ پانچ سال تک پنالال کی پابند تھی۔ پنالال اب اسے ہر ماہ ایک لاکھ روپے دے رہا تھا اور وعدہ کر رہا تھا کہ دوسری فلم مکمل ہوتے ہی اس سے شادی کر لے گا۔ اگرچہ اب پنالال سے بھی زیادہ دولت مند لوگ اس سے شادی کی تمنا کرتے تھے لیکن یشو رانی نے سوچا کہ جو اس کی عزت تک پہنچ چکا ہے اسی ایک مرد کی ہو کر رہے تو بہتر ہے اس لیے وہ دوسری فلم کے ریلیز ہونے تک پھر ایک ازدواجی اور گھریلو زندگی کا خواب دیکھنے لگی۔

دوسری فلم ریلیز ہوئی مگر باکس آفس پر کامیاب نہ ہوئی۔ ایسے ہی وقت یشو رانی کو پتا چلا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ اس نے فون پر پنالال کو اطلاع دی کہ فوراً ہی شادی کر دو ورنہ ہمارا بچہ ناجائز کہلائے گا۔ پنالال فلم کی ناکامی کے باعث سر پکڑے بیٹھا ہوا تھا، اس نے جھلا کر جواب دیا۔

''میرے ایک کروڑ روپے ڈوب رہے ہیں اور تمہیں شادی اور رنگ رلیوں کی سوجھ رہی ہے، ابھی میرے ساتھ بکواس نہ کرو''۔

یشو رانی نے غصہ سے کہا۔

''تم بکواس نہ کرو۔ جب میں ڈوب رہی ہوں تو تمہارے ڈوبنے کی پرواہ نہیں کروں گی۔ ہمارے ہونے والے بچے کو بدنامی سے بچاؤ۔ نہیں تو میں تمہارا پیچھا نہیں چھوڑوں گی''۔

پنالال نرم پڑ گیا۔ کیونکہ یشورانی اب پہلے جیسی کمزور اور بے سہارا عورت نہیں تھی۔ کتنے ہی دولت مند ہاتھ اسے سہارا دینے کے لیے تیار تھے۔ ایک مشہور فلمی ہیرو چندر شیکھر اس سے دیوانہ وار عشق کرتا تھا۔ پنالال نے شیکھر سے ملاقات کی اور اس سے پوچھا۔

''میں یشورانی کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ کیا تم اسے اپناؤ گے؟''

شیکھر نے ایک دم سے خوش ہو کر کہا۔

''میں دل و جان سے اسے اپناؤں گا۔ مگر مجھے یقین نہیں آتا کہ تم اتنی حسین عورت کو میری خاطر چھوڑ دو گے''۔

''یقین کرو۔ میری دو شرطیں مان کر تم اسے حاصل کر سکتے ہو۔ پہلی شرط یہ ہے کہ تمہیں کل ہی یشورانی سے بیاہ کرنا ہوگا۔ دوسری شرط یہ ہے کہ تم میری اگلی فلم میں کام کرنے کا معاوضہ نہیں لو گے''۔

''مجھے منظور ہے''۔

''تو پھر جاؤ اور یشورانی کو یہ خوش خبری سنا دو کہ تم اس سے بیاہ کر کے اس کے ہونے والے بچے کے باپ بن جاؤ گے''۔

''کیا مطلب ہے؟'' شیکھر نے چونک کر پوچھا۔

''کیا تم اسے اس جرم کی وجہ سے چھوڑ رہے ہو کہ وہ تمہارے بچے کی ماں بننے والی ہے؟ یہ تو بڑا کمینہ پن ہے''۔

''شیکھر! میں فضول باتیں نہیں کرنا چاہتا۔ اپنا آخری فیصلہ سنا دو۔ میری دو شرطیں منظور کرتے ہو یا نہیں؟''

''میں یشورانی سے سچی محبت کرتا ہوں۔ اس سے ہر حال میں شادی کروں گا''۔

وہ بڑے عزم سے یشورانی کے پاس چلا گیا۔ پنالال اطمینان سے اپنے گھر میں بیٹھ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ ڈوبنے والے کو تنکے کا سہارا کافی ہوتا ہے۔ یشورانی کو بھی فوری طور پر اپنے بچے کے لیے ایک باپ کی ضرورت ہے لہٰذا وہ شیکھر کو قبول کر لے گی لیکن رات کے دس بجے ملازم نے آ کر اطلاع دی کہ یشورانی ملنے آئی ہے۔

پنالال نے کہا۔

''جا کر کہہ دو سیٹھ صاحب گھر میں نہیں ہیں کل آ کر ملاقات کرے''۔

ملازم چلا گیا۔ پنالال ڈر گیا تھا کہ وہ ہنگامہ کرنے آئی تھی اور آسانی سے اس کا پیچھا نہیں چھوڑے گی۔ اس نے فیصلہ کر لیا کہ کچھ دنوں کے لیے بمبئی چھوڑ دے گا۔ جب وہ ہار پچھتا کر شادی کر لے گی تو پھر واپس آ جائے گا۔ ملازم نے واپس آ کر بتایا کہ یشورانی واپس چلی گئی ہے۔ اسے اطمینان ہو گیا کہ بلا ٹل گئی ہے۔

ایک گھنٹے بعد وہ اپنے بیڈروم میں سونے کے لیے گیا تو وہ بلا وہاں موجود تھی۔ پنالال نے گھبرا کر کہا۔

''تم یہاں کیسے آ گئیں؟''

''کیا اس بیڈروم میں پہلے کبھی نہیں آئی۔ آج کوئی نئی بات تو نہیں ہے''۔

''ٹھیک ہے، ٹھیک ہے آرام سے بیٹھو''۔

''میں بیٹھنے نہیں ہمارے تمہارے پچھلے گناہوں کا حساب کرنے آئی ہوں۔ ہوس کے غلام! کیا تم اس دن کے لیے مجھے محبت کا فریب دے رہے تھے۔ تم لوگ اتنی بے شرمی کے بعد بھی مرد کیسے کہلاتے ہو؟ مرلی دھر نے مجھے تمہارے حوالے کیا اور اب تم مجھے شیکھر کے حوالے کر رہے ہو۔ کیا اپنی بہن اور بیٹی کے ساتھ بھی ایسا ہی کرتے ہو؟''

''دیکھو یشورانی! جھگڑا نہ بڑھاؤ۔ میں خاندانی آدمی ہوں۔ تم فلموں میں ناچنے والی عورت ہو۔ اگر میں تم سے شادی کروں گا تو برادری والوں سے سارے ناطے ٹوٹ جائیں گے۔ دوسری فلم میں میری رقم ڈوب گئی ہے، تیسری فلم کے لیے میرا باپ مجھے رقم نہیں دے گا۔ ہم دونوں کی بھلائی اسی میں ہے کہ ہم صرف پروڈیوسر اور ہیروئن کے ناطے سے ایک دوسرے کا ساتھ دیتے رہیں۔ تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ شیکھر جیسا ہیرو تمہارا جیون ساتھی بننا چاہتا ہے''۔

''شیکھر آدمی نہیں دیوتا ہے۔ سچی محبت اسے کہتے ہیں۔ وہ میرا پتی اور بچے کا پتا بن کر میرے گناہوں پر پردہ ڈال دے گا۔ میں ایسے مرد کو بھگوان بنا کر پوجتی رہوں تو بھی کم ہے مگر ابھی تو میں تم سے نمٹنے آئی ہوں۔ میری عزت اتنی سستی نہیں ہے کہ تم لوگ مجھے پرشاد (پوجا کی مٹھائی) کی طرح دوسروں میں بانٹتے پھرو۔ مرلی دھر بچ کر نکل گیا ہے مگر تم زندہ نہیں بچو گے''۔

یہ کہتے ہی اس نے پیتل کا گلدان اٹھا کر اس پر حملہ کیا۔ پہلی بار تو وہ بچ گیا۔ دوسری بار اپنی دھوتی سنبھالتے سنبھالتے مار کھا گیا۔ یشورانی کے اندر الاؤ پک رہا تھا۔ غصے اور جنون میں وہ اس کے سر پر گلدان کی ضربیں لگاتی رہیں۔ پھر اسے اس وقت ہوش آیا جب پنالال خون میں لت پت ہو کر فرش پر ہمیشہ کے لیے ٹھنڈا ہو گیا۔

یشورانی دیدے پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھنے لگی۔ اسے یقین نہیں آرہا تھا کہ اس نے ایک انسان کی جان لے لی ہے۔ ایسے وقت اسے اپنے ہونے والے بچے کا خیال آیا۔ اگر وہ جیل جائے گی تو اس معصوم بچے کا کیا بنے گا۔ جب اس نے ماں بن کر سوچا تو عقل آئی۔ اس نے پیتل کے گلدان کو ساڑھی کے آنچل سے صاف کیا۔ پھر کھڑکی کے راستے سے باہر جاتے وقت بھی ان تمام جگہوں کو پونچھتی چلی گئی جہاں اس کی انگلیوں کے نشانات پائے جا سکتے تھے۔

اتنی احتیاط کے باوجود دوسری صبح پولیس اس کے دروازے پر پہنچ گئی۔ قانون کے ہاتھ اسے حوالات میں لے گئے۔ پھر حوالات سے کچہری اور کچہری سے جیل میں لے گئے۔ مقدمہ چلنے کے دوران بڑے بڑے فلم ساز اسے بچانے کی کوشش کرتے رہے۔ شیکھر اکثر اسے ملنے آتا تھا اور اسے تسلیاں دیتا رہتا تھا۔ پنالال کے ملازم کی گواہی نے اسے جیل میں پہنچا دیا تھا لیکن گواہ نے یہ بھی کہا تھا کہ جب پنالال نے ملاقات سے انکار کر دیا تو یشورانی واپس چلی گئی تھی۔ پنالال کا باپ یشودھا سے خار کھائے بیٹھا تھا اس لیے اسے سزائے موت دلانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا تھا۔

مقدمہ کے دوران مہینے گزرتے رہے۔ زچگی کا وقت قریب آگیا۔ ان دنوں مقدمہ اس کے خلاف جا رہا تھا اور وہ سوچتی رہتی تھی کہ اگر اسے پھانسی کی سزا ملے گی تو بچے کیا انجام ہوگا۔ جیلر اور دوسری قیدی عورتیں سمجھاتی تھیں کہ بچے کو کسی آشرم میں چھوڑ دینا چاہیے اگر نہیں چھوڑے گی تو پھانسی کا پھندہ اسے چھڑا دے گا۔

آخر وہی ہوا، پولیس اسپتال کے میٹرنٹی ہوم میں بچے نے جنم لیا۔ ان دنوں وہ جلپائی گوڑی کی جیل میں منتقل کر دی گئی تھی۔ اس طرح وہ بچہ جلپائی گوڑی کی آشرم میں پہنچ گیا۔

اب وہ جیل کی آہنی سلاخوں کو تھام کر خلا میں گھور رہی تھی۔ یہ انسان کی بہت پرانی عادت ہے کہ جب وہ اپنے اندر جھانکتا ہے تو بے اختیار خلا میں گھورنے لگتا ہے۔ مگر اب یشورانی ماضی کے...... بے نام خلا سے واپس آگئی تھی اور سوچ رہی تھی۔

''کیا مجھے پھانسی کی سزا ہوگی؟ نہیں نہیں میں زندہ رہوں گی۔ جیل کی اس چار دیواری سے باہر جاؤں گی اور آشرم میں پہنچ کر اپنے بچے کو سینے سے لگا لوں گی۔ اسے ہر قیمت پر آشرم سے حاصل کر لوں گی''۔

O☆O

پندرہ ستمبر کی صبح طیارے کو حادثہ پیش آیا تھا۔ دن کے گیارہ بجے تک ریڈیو کے ذریعے یہ خبر ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک پہنچ گئی۔ کوئی ایسا گھر نہیں تھا جہاں ایک مظلوم اور دہشت زدہ بچے کا ذکر نہ ہو رہا ہو۔ کوئی دل ایسا نہیں تھا جو بچے کی سلامتی کے لیے دعائیں نہ مانگ رہا ہو۔ ملک کے کونے کونے سے مختلف ریڈیو اسٹیشنوں کو فون کر کے یہ مطالبہ کیا جا رہا تھا کہ اس بچے کے متعلق ایک ایک لمحے کی خبر نشر کی جائے۔ لہٰذا ہر آدھے گھنٹے کے بعد ریڈیو کے ذریعہ یہ یقین دلایا جا رہا تھا کہ بچے کے سلسلے میں جیسے جیسے خبریں موصول ہوتی رہیں گی، انہیں عوام تک پہنچایا جاتا رہے گا۔

کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ بچہ مر چکا ہوگا، کچھ لوگ یہ سوچ کر کانپ جاتے تھے کہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر ایک ناسمجھ بچہ دوپہر کی دھوپ اور رات کی سردی کا مقابلہ کیسے کرے گا؟ وہ حادثہ سے بچنے کے بعد رات کی تاریکی میں دہشت سے مر جائے گا۔ دوپہر کو ریڈیو سے یہ خبر سنائی گئی کہ ہیلی کاپٹر سے جانی کے لیے کھانے کا سامان اور کمبل وغیرہ پھینکے جا رہے ہیں۔

آدھ گھنٹے کے بعد پھر یہ خبر سنائی گئی کہ پولیس، اسکاؤٹس اور فوجی جوان اس پہاڑی کے دامن میں کیمپ لگا رہے ہیں۔ ریڈیو، محکمہ اطلاعات اور اخبارات کے رپورٹر اور فوٹو گرافر بھی وہاں پہنچ رہے ہیں۔ اس کے علاوہ فوری طور پر بجلی پہنچائی جا رہی ہے تاکہ رات کے وقت دور تک اس پہاڑی کو روشن رکھا جا سکے۔ اس کے باوجود بجلی کی روشنی جانی کو بلندی تک نہیں پہنچا سکتے تھے۔

ساری خلقت نے حادثے کی یہ خبر سن لی تھی۔ صرف ایک بانو اس خبر سے بے خبر تھی۔ وہ صبح سے کچھ نامعلوم سی بے چینی محسوس کر رہی تھی۔ ریڈیو آن کر کے کوئی گیتوں بھرا پروگرام سننے کو دل نہیں چاہا۔ اس لیے گھر کا ریڈیو خاموش پڑا رہا۔ شام کو پانچ بجے سرتاج حسین فوجی جیپ میں بیٹھ کر آیا تو اس کے ہاتھوں میں شام کا اخبار تھا۔ اس نے اخبار کو بانو کی طرف بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''آج ریڈیو سنا تھا؟''

''نہیں، میرے سر میں درد ہو رہا ہے''۔

''آج کی خبریں سن کر تمام انسانوں کے دل میں درد اٹھ رہا ہے۔ ایک طیارہ پہاڑی چٹان سے ٹکرا گیا ہے''۔

''ہوائی جہاز کے حادثات تو ہوتے ہی رہتے ہیں۔ یہ افسوس کی بات ہے مگر کوئی نئی بات تو نہیں ہے''۔

''نئی بات یہ ہے بانو کہ ایک پانچ برس کا بچہ زندہ بچ گیا ہے اور بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر تنہا پڑا ہوا ہے''۔

بانو کا دل دھک سے رہ گیا۔ پانچ برس کی گنتی کے ساتھ ہی اپنے بچے کی جدائی تڑپانے لگی۔ اس نے ہاتھ بں پکڑے ہوئے اخبار کو دیکھا۔ پہلے صفحہ پر جانی کی تصویر تھی۔ بڑی ہی من موہنی دل میں اتر جانے والی تصویر تھی۔ بانو نے سوچا ''میرا بچہ بھی اتنا ہی بڑا ہوگا اور ایسا معصوم اور خوبصورت ہوگا''۔

سرتاج حسین نے کہا ''ذرا گرم گرم چائے پلا دو، میں ابھی چلا جاؤں گا۔ پہاڑی کے دامن میں میری ڈیوٹی ہے۔ میرا خیال ہے کہ بچے کو اتنی بلندی سے نیچے لانے تک ساری رات گزر جائے گی۔ ساری رات جاگنا ہوگا''۔

یہ کہتے ہوئے اس نے ریڈیو کا سوئچ آن کر دیا۔ موسیقی کا پروگرام نشر ہو رہا تھا۔ وہ چائے بنانے کے لیے کچن میں چلی گئی۔ اگر وہ اپنے ساتھ اخبار لے جاتی تو چائے تیار ہونے کے دوران وہ دھماکہ خیز معلومات حاصل کر سکتی لیکن اخبار کی صرف ایک تصویر نے اسے دور ماضی میں پہنچا دیا تھا۔

جب وہ ایک ٹرے پر چائے سے بھری ہوئی دو پیالیاں رکھ کر اپنے سرتاج حسین کے پاس جانے لگی تو موسیقی کی آواز دور سے سنائی دے رہی تھی پھر اچانک وہ آواز تھم گئی اور کسی مرد کی آواز سنائی دینے لگی۔

''یہ آل انڈیا ریڈیو کی اردو سروس ہے۔ چند منٹ کے لیے موسیقی کا پروگرام روک کر جانی کے متعلق تازہ ترین معلومات فراہم کی جارہی ہے۔ سامعین! وہ بدنصیب جانی جو اپنے مردہ ماں باپ کے قریب زندہ ہے، دراصل ایک لے پالک بچہ ہے۔ جیسا کہ ہم بتا چکے ہیں اس کی تاریخ پیدائش......''

بانو ایک دم سے ٹھٹک کر کھڑی ہوگئی۔ پندرہ ستمبر کی تاریخ سن کر اس کے ہاتھوں میں چائے کی ٹرے کانپ رہی تھی۔ ریڈیو کی آواز نے کہا۔

''اب ایک مقامی اخبار نے یہ انکشاف کیا ہے کہ سورگ باسی مہیش چند چٹرجی اور ان کی دھرم پتنی نے اس بچے کو جلپائی گوڑی کے بالک آشرم سے حاصل کیا تھا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ اس کی اصل ماں......''

ایک زوردار دھماکہ ہوا۔ حالانکہ چائے کی پیالیاں گر کر ٹوٹنے سے دھماکہ نہیں ہوتا۔ سرتاج ایک دم سے اچھل کر کھڑا ہوگیا۔

''کیا ہوا بانو؟''

کیا ہوا؟ بانو کیسے بتائے کہ کیا نہیں ہوا۔ ایک ننھا بچہ اس کے سینے پر لاتیں مار رہا تھا ''امی، امی! نانی جان نے مجھے جلپائی گوڑی کے بالک آشرم میں چھوڑا تھا''۔

وہ بچہ بانو کے دل کو اپنی ننھی مٹھیوں سے مسل رہا تھا ''امی، امی! آپ نے مجھے کیوں چھوڑ دیا۔ دیکھیے تقدیر نے بھی مجھے کہاں لے جا کر چھوڑ دیا ہے۔ مجھے ایسی بلندی نہیں چاہیے، مجھے اپنی گود میں اتار لیں امی......''

بانو نے ممتا سے بے قابو ہو کر دونوں ہاتھ اپنے سینے کے اطراف یوں بھینچ لیے جیسے بچے کو نامعلوم بلندی سے اتار کر سینے سے لگا رہی ہو۔ ایسے وقت وہ بھول گئی تھی کہ اس کا سرتاج اس کے سامنے موجود تھا۔ یوں تو آس پاس کی اور بھی بہت ساری دنیا آباد تھی مگر اسے اپنے بچے کے سوا کچھ نظر نہیں آرہا تھا۔ جس بچے کو اس نے جنم دیا تھا اور جس کی صورت اس نے کبھی نہیں دیکھی تھی، اب اس بچے کے تصور کو جانی کی تصویر سے قائم کر رہی تھی۔

پھر وہ چونک گئی۔ سرتاج اس کے دونوں بازو پکڑ کر جھنجھوڑ رہا تھا ''بانو کچھ تو کہو یہ اچانک تمہیں کیا ہوگیا ہے؟''

وہ دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ کر رونے لگی۔ اب اسے اپنی بے بسی کا احساس ہوا کہ وہ صرف ایک بچے والی نہیں، ایک شوہر والی بھی ہے اور اپنے شوہر سے اس گمنام بچے کا وجود چھپاتی آئی ہے۔ اب وہ کس طرح چھپا سکتی ہے؟ اگر اب بھی اپنی زبان بند رکھے گی تو بچے کے پاس کبھی نہیں پہنچ سکے گی اور اگر زبان کھولے گی تو سرتاج کے دل کو ٹھیس پہنچے گی۔ وہ اب تک اسے دل و جان سے چاہتا رہا۔ اپنی محبوب بیوی کا جھوٹ اور فریب سامنے آئے گا تو جنون کی حد تک محبت کرنے والے شوہر کا ردعمل کیا ہوگا؟ ہوسکتا ہے کہ اس فریب کو برداشت نہ کرے اور اسے طلاق دے دے''۔

وہ دوراہے پر کھڑی تھی۔ ایک طرف سرتاج کی رفاقت تھی، عزت آبرو اور خوشگوار ازدواجی زندگی تھی۔ دوسری طرف پانچ برس سے بچھڑے ہوئے لاپتا بچے کا پیار اپنا پتا بتا رہا تھا۔ اب وہ اپنے دامن میں طلاق نامہ اور بدنامیاں لے کر اپنی ممتا کی تسکین کرسکتی تھی۔ اس نے ذرا سی دیر میں فیصلہ کرلیا کہ سرتاج کو سینکڑوں بیویاں مل سکتی ہیں مگر ایک ماں نے دیر کردی تو وہ بچہ پھر نہ مل سکے گا۔

سرتاج سمجھ رہا تھا کہ بانو کو کسی قسم کا ذہنی صدمہ پہنچا ہے۔ اس نے تسلی دینے کے لیے اسے سینے سے لگایا۔ وہ ایک دم سے تڑپ کر الگ ہوگئی پھر رو رو کر کہنے لگی۔

''آپ مجھے سینے سے نہ لگائیں، میں آپ کے قابل نہیں ہوں۔ میں نے آپ کو دھوکا دیا ہے''۔

''کیسا دھوکا؟''

''مم میں آپ کی بیوی بننے سے پہلے ایک مطلقہ عورت تھی۔ یہ حقیقت میں آپ سے چھپاتی رہی، اب آپ جو چاہیں مجھے سزا دیں''۔

بانو نے دیکھا وہ مسکرا رہا تھا۔ شاید طنزیہ انداز میں مسکرا رہا تھا۔ پھر وہ ہنسنے لگا۔ شاید اپنی شریک حیات کی بے حیائی پر ہنس رہا تھا۔ پھر اس نے کہا۔

''میں سپاہی ہوں اور سپاہی کسی علاقہ کو فتح کرنے سے پہلے اس کے جغرافیائی حالات سے واقف ہو جاتا ہے۔ میں نے بھی تمہیں اپنی منکوحہ بنانے سے پہلے معلومات حاصل کی تھیں۔ پتا چلا کہ تم ماں بیٹی پہلے جلپائی گوڑی میں رہتی تھیں۔ وہاں جا کر مسلمانوں کے محلے میں پتا چلا کہ آصف نام کے کسی شرابی جواری سے تمہاری شادی ہوئی تھی، وہ تمہارا گھر لوٹ کر اور تمہیں طلاق دے کر چلا گیا۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ تم ایک بچے کی ماں بننے والی تھیں۔ اب بتاؤ وہ بچہ پیدائش سے پہلے ضائع کر دیا گیا یا......''

''نہیں، نہیں وہ زندہ ہے'' وہ قدموں سے لپٹ کر روتی چیختی ہوئی بولی ''آپ مجھے مار ڈالیں مگر میرے بچے کو پہاڑ کی اس خطرناک بلندی سے زندہ سلامت اتار کر لے آئیں''۔

سرتاج حسین نے حیران ہو کر قدموں سے لپٹی ہوئی بانو کو دیکھا۔ چشم زدن میں یہ واضح ہو گیا کہ جو بچہ پہاڑ کی بلندی پر ہے، اس کی ماں قدموں کی پستی پر بلک بلک کر رو رہی ہے اور ہچکیوں اور سسکیوں کے درمیان بتا رہی ہے کہ چودہ اور پندرہ ستمبر کی درمیانی شب کس طرح فرقہ وارانہ فساد کی آگ بھڑک گئی تھی۔ غنڈے نوزائیدہ بچوں کو نیزوں پر اچھال رہے تھے۔ ان حالات میں بچے کو زندہ رکھنے کی خاطر آشرم میں چھوڑ دیا گیا تھا۔

سرتاج نے اسے دونوں بازوؤں سے پکڑ کر قدموں سے اٹھاتے ہوئے کہا۔

''میں پورے تین سال سے انتظار کر رہا تھا کہ تم اپنی حقیقت بتاؤ گی۔ کبھی میں سوچتا تھا کہ تم جھوٹی اور خودغرض ہو۔ صرف اپنا مستقبل سنوارنے کے لیے تم نے مجھ سے شادی کی ہے۔ کبھی تنہائی کے لمحات میں تمہاری قربت اور محبت سے پتا چلتا تھا کہ تم صرف مجھے چاہتی ہو مگر اس چاہت کے دوران کوئی کانٹا سا کھٹکتا رہتا ہے۔ اگر کوئی رقیب کانٹا بن کر سامنے آتا تو میں کبھی برداشت نہ کرتا۔ لیکن اب یہ سن کر اطمینان ہوا کہ ہماری محبت کے درمیان صرف ایک بچہ کھٹک رہا ہے اور ایک معصوم بچہ کسی کا دشمن نہیں ہوتا''۔

بانو نے خوشی سے لرزتے ہوئے کہا۔

''تو پھر آپ میری مدد کریں گے؟ میرے لعل کو زندہ سلامت میری گود میں پہنچائیں گے؟''

''بانو اس بچے کو صحیح سلامت پہاڑ کی چوٹی سے نیچے لانے کی ہر ممکن کوشش کی جا رہی ہے۔ اب میں ایک باپ بن کر اس بچے میں دلچسپی لوں گا۔ میں وہاں جا رہا ہوں۔ تم فوراً جلپائی گوڑی کے آشرم میں پہنچ کر یہ ثبوت حاصل کرو کہ وہ بچہ تمہارا ہے یعنی ہمارا......''

''اوہ سرتاج! آپ انسان نہیں فرشتہ ہیں۔ آپ نے یہ کہہ کہ مجھے ہمیشہ کے لیے خرید لیا ہے کہ آپ میرے اس بچے کے باپ ہیں''۔

وہ اس کے سینے پر سر رکھ کر خوشی سے رونے لگی۔

O☆O

میرا جب پہاڑی کے دامن میں پہنچی تو وہاں ہزاروں آدمیوں کا مجمع تھا۔ ہزاروں آنکھیں پہاڑ کی بلندی کی طرف اس عمودی چٹان پر لگی ہوئی تھیں جہاں سے وہ بچہ نظر نہیں آ سکتا تھا مگر دلوں میں ایک ہی مشترکہ حسرت تھی کہ وہ بخیریت نظر آ جائے۔

اتنے بڑے ہجوم کو روکنے کے لیے دور تک موٹے موٹے رسے باندھ کر حد بندی کر دی گئی تھی۔ حد بندی کے اندر فوجی جوان کوہ پیماؤں کی مدد کر رہے تھے۔ پہاڑ پر چڑھنے کی تیاریاں مکمل ہو گئی تھیں۔ رسے کے چاروں طرف پولیس اور اسکاؤٹ کے نوجوان کھڑے ہوئے تھے۔ حد بندی کے باہر ہوٹل کھل گئے تھے۔ لوگوں کو رات گزارنے کے لیے فی چارپائی پانچ روپے کے حساب سے مہیا کی جا رہی تھی۔ بستر، کمبل، گرم کپڑے، دھوپ کے چشمے، دوربین اور کھانے کی مختلف چیزیں فروخت ہو رہی تھیں۔ ایک بچہ جبکہ زندگی اور موت کے درمیان اچھوتی بلندیوں پر پڑا ہوا تھا۔ اس کی پستی میں خودغرض لوگ تجارت کر رہے تھے اور ایک گلاس پانی کی قیمت دس پیسے وصول کر رہے تھے۔

میرا اس ہجوم میں ادھر سے ادھر بھٹکتی ہوئی معلومات حاصل کر رہی تھی کہ بچے کو بحفاظت نیچے اتارنے کے لیے کیسے انتظامات کیے گئے ہیں۔ وہاں جتنے منہ اتنی باتیں تھیں۔ ہیلی کاپٹر اس عمودی چٹان کے قریب نہیں جا سکتا تھا۔ پیراشوٹ کے ذریعے اترنے میں خطرہ تھا کہ اترنے والا نہ جانے کس کھڈ میں جا گرے اس لیے دیس کے مشہور اور تجربے کار کوہ پیما اجیت سنگھ کی خدمات حاصل کی جا رہی تھیں۔ وہ اپنی ٹیم کے ساتھ اس خطرناک بلندی کو سر کرنے کی سعی میں مصروف تھا۔ ایک اندازے کے مطابق وہ صبح تک اس بچے کو واپس لا سکتا تھا۔

میرا کے دل کی عجیب حالت تھی۔ وہ جب بھی آنکھوں سے دوربین لگا کر بلندی کی طرف دیکھتی تو اس کا دل خوف اور مایوسی کی پستی میں ڈوبنے لگتا اور وہ ندامت سے سوچنے لگتی ''میں ظالم ہوں میں نے اس معصوم کو اپنے وجود سے نوچ کر پھینک دیا اور اب میں اس کے لیے اندر ہی اندر مر رہی ہوں''۔

پھر وہ سوچنے لگی ''وہ میرا ہی بچہ ہوگا بلکہ میرے ہی جگر کا ٹکڑا ہے۔ خدا کرے کہ دوسری دعویدار عورتیں یہاں نہ آئیں۔ میں ہزار بدنامیوں کے ساتھ اپنے لعل کو اپنے سینے سے لگا کر یہاں سے لے جاؤں گی''۔

اسے اپنے پیچھے داس دیو کی آواز سنائی دی۔ اس نے پلٹ کر دیکھا تو وہ بھی آنکھوں سے دوربین لگائے کوہ پیماؤں کی طرف دیکھ رہا تھا۔ بڑی بڑی سرچ لائٹ دور تک پہاڑ کو روشن کر رہی تھیں۔ داس دیو نے آنکھوں سے دوربین ہٹاتے ہوئے کہا۔

''میرا! تم نے آج شام کا اخبار پڑھا ہوگا۔ اس سے اندازہ لگاؤ کہ ہم کتنی تیز رفتاری سے کام کرتے ہیں''۔

میرا نے کوئی جواب نہیں دیا۔

''میں اس یقین کے ساتھ آیا ہوں کہ ہمارا اخبار پڑھتے ہی بچے کی ماں ضرور آئے گی مگر اتنے بڑے ہجوم میں صرف ایک عورت تم ہی نظر آ رہی ہو''۔

میر بانے دھڑکتے ہوئے دل سے سوچا ''کیا میں بتاؤں کہ بچے کی ماں تمہارے سامنے کھڑی ہے؟ مگر نہیں جب تک یہ راز رہے، بہتر ہے''۔

اس کے دماغ کے کسی گوشے میں یہ بات تھی کہ پہلے بچے کا انجام دیکھ لینا چاہیے اگر وہ زندہ سلامت واپس آئے گا تو کھل کر بچے کا دعویٰ کرے گی ورنہ بچے کے ساتھ ماں کے رشتے کو بھی دفن کر دے گی''۔

اس کے سوچنے کے دوران داس دیو نے اچانک کہا۔

''آ گئی، جس کا انتظار تھا، وہ آ گئی۔ میں دعوے سے کہتا ہوں کہ وہی اس بچے کی ماں ہے''۔

میر بانے گھوم کر دیکھا۔ بانو بھیڑ کو چیرتی ہوئی رسے کی طرف آ رہی تھی۔ اس کا شلوار کرتا گرد آلود تھا۔ دوپٹہ ایک شانہ سے ڈھلک کر اس کے قدموں سے الجھ رہا تھا۔ چہرے سے وحشت برس رہی تھی۔ اس کی بڑی بڑی سیاہ آنکھیں یوں جنونی انداز میں پھیلی ہوئی تھیں جیسے دل کی تمام دھڑکنیں آنکھوں کی دہلیز پر آ کر پکار رہی ہوں ''میرے لعل رات ہو چکی ہے واپس آ جاؤ، میں دروازہ بند کروں گی''۔

داس دیو نے کہا ''اس کی اجڑی ہوئی حالت بتا رہی ہے کہ یہ بچے کی ماں ہے۔ میں ابھی دھماکہ خیز معلومات حاصل کرتا ہوں۔ کل کا اخبار ہاتھوں ہاتھ بکے گا''۔

بانو رسے کے پاس آئی اور ذرا جھک کر حد بندی لائن کے اندر جانے لگی۔ ایک پولیس آفیسر نے اس کا راستہ روک کر کہا۔

''شریمتی جی! اندر آنا منع ہے۔ آپ باہر چلی جائیں''۔

بانو نے ہانپتے ہوئے کہا ''مجھے معلوم ہے۔ تم سامنے سے ہٹ جاؤ، میں کیپٹن سرتاج حسین کی بیوی ہوں''۔

آفیسر فوراً ہی ادب سے ایک طرف ہٹ گیا۔ داس دیو بھی ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ میر بانے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''رک کیوں گئے؟ کیا فوجی کیپٹن کی بیوی نے تمہاری کھوپڑی میں دھماکہ کر دیا ہے؟''

داس دیو آنکھیں سکیڑ کر دور جاتی ہوئی بانو کو دیکھ کر بولا۔

''تعجب ہے۔ یہ تو حلیے سے کیپٹن کی بیوی نہیں، صرف ایک اجڑی ہوئی ماں نظر آتی ہے''۔

میر با بھی سنجیدگی سے بانو کے متعلق سوچنے لگی کہ ایک کیپٹن کی بیوی یہاں پریشان حال کیوں آئی ہے۔ بچے سے اس کا کیا تعلق ہو سکتا ہے؟ یہ تو مسلمان ہے اور بچہ ہندوؤں کے آشرم سے آیا ہے۔ کیا ایک مسلمان ماں اپنے بچے کو ایسے آشرم میں چھوڑ سکتی ہے۔

چھوڑنے کی بات یاد آئی تو یہ یاد آیا کہ کوئی عورت اپنے بچے کو آشرم کے دروازے پر چھوڑ گئی تھی۔ کیا وہ عورت یہی کیپٹن کی بیوی تھی؟ میر با سوچتے سوچتے تھک گئی۔ اس لیے بھی تھک گئی کہ وہ بچے کو صرف اپنی ملکیت سمجھتی تھی۔ کسی دوسری عورت کو اس کا حقدار سمجھنے سے تکلیف پہنچتی تھی۔ وہ تھکن مٹانے کے لیے ایک ریسٹورنٹ کی طرف چائے پینے چلی گئی۔ داس دیو بھی اس کے ساتھ تھا اور اس سے کہہ رہا تھا۔

''تم عورت ہو کیپٹن کی بیوی سے دوستی کر کے بہت کچھ معلوم کر سکتی ہو''۔

میر بانے خشک لہجے میں کہا۔

''اگر میں معلومات حاصل کروں گی تو تمہیں کوئی فائدہ نہیں پہنچے گا''۔

"تم تو بے کار مجھے اپنا دشمن سمجھ رہی ہو اگر میں سچی خبریں شائع کرتا ہوں تو اس کے لیے تمہیں ناراض نہیں ہونا چاہیے"۔

"اگر سچی خبر سے کسی معصوم اور مظلوم کی زندگی تباہ ہو جائے تو اسے شائع کرنا اخلاقی جرم ہے"۔

"کیا اس ناجائز بچے کو جنم دیتے وقت اس عورت کو اخلاقیات کا خیال نہیں آیا؟"

"تم کیا سمجھو گے کہ عورت کن حالات میں مجبور ہو جاتی ہے، کس طرح محبت کے نام پر پگھل جاتی ہے؟ اور کس طرح دوسروں کی ہمدردی میں لٹ جاتی ہے؟"

"کیا تمہارا اپنا ایسا کوئی تجربہ ہے؟"

وہ چائے کا آخری گھونٹ پی کر جلدی سے اٹھ گئی۔ داس دیو نے اس کی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی تھی مگر وہ بھی باز آنے والی نہیں تھی۔ ہوٹل کے کاؤنٹر پر دو پیالی چائے کے پیسے ادا کرتے ہوئے بولی۔

"یہ میری اور میرے اس بیٹے کی چائے کے پیسے ہیں"۔

پھر وہ داس دیو کی طرف پلٹ کر بولی۔

"میں کسی اخبار میں شائع نہیں کروں گی کہ تم میرے ناجائز بیٹے ہو"۔

وہ تیزی سے چلتی ہوئی ہوٹل کے باہر چلی گئی۔ داس دیو چند لمحوں کے لیے ساکت رہ گیا پھر اس نے غصہ سے میربا کی جانب دیکھا لیکن غصہ نہ دکھا سکا۔ ٹھیک اسی وقت ایک بڑی سی ویگن کار ہوٹل کے قریب آ کر رکی۔ ڈرائیونگ سیٹ کا دروازہ کھول کر ایک بہت مشہور ہیرو شیکھر باہر آیا۔ پھر اس نے دوسری طرف کا دروازہ کھولا۔ اس دروازے سے اس مجمع کی تیسری عورت باہر آ رہی تھی۔

وہ سیاہ بارڈر کی سفید ساڑھی پہنے ہوئے تھی۔ سیاہ بلاؤز سے اجلے بدن کی چاندنی پھوٹ رہی تھی۔ ماتھے پر چندن کا ٹیکا تھا۔ ریشمی جوڑے کے پس منظر میں اس کا حسین چہرہ بجھا بجھا سا تھا۔ گاڑی سے باہر آتے ہی اس کی آنکھیں پہاڑ کی تاریک چوٹی سے جا لگی تھیں۔ وہ آنکھیں اپنی زبان بے زبانی سے کہہ رہی تھیں۔

"میرے کرشن، میرے نندلال، میرے ماکھن چور، تیری یشودھا میا آ گئی ہے۔ ایک عیاش نے یہ نہیں سوچا کہ ہمیں ماں بیٹے کے رشتے میں پرو کر وہ سماج اور دھرم کو کتنی بڑی گالی دے رہا ہے۔ یہ تو صرف ماں کا حوصلہ ہوتا ہے کہ وہ اتنی بڑی گالی کو بڑے پیار سے دودھ پلاتی ہے۔ نیچے اتر آ میرے لال! میری گود خالی ہے"۔

داس دیو نے اسے دیکھتے ہی میربا کے قریب آ کر کہا۔

"ارے یہ تو مشہور فلم اسٹار یشورانی ہے۔ میں سنا تھا کہ یہ کسی قتل کے کیس میں سزا کاٹ رہی ہے۔ اتنی مصروف اداکارہ ایک بچے کو دیکھنے یہاں آئی ہے یقین نہیں آتا کہ یہ بچے کی ماں ہو سکتی ہے۔ میں ابھی معلوم کرتا ہوں"۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا یشورانی کے پاس پہنچ گیا۔ پھر اسے مخاطب کرتے ہوئے بولا۔

"میڈم! میں ایوننگ نیوز کا رپورٹر داس دیو ہوں۔ آپ نے آج شام کے اخبار میں پڑھا ہو گا کہ وہ بچہ لے پالک ہے یعنی اس کی اصل ماں اب بھی کہیں زندہ ہو گی۔ مجھے یقین ہے کہ وہ یہاں آئے گی۔ میں اس کی تلاش میں آیا ہوں"۔

یشورانی چند لمحوں تک اسے دیکھتی رہی اور سوچتی رہی۔ پھر اس نے پوچھا۔

"آپ اس کی ماں کو تلاش کر کے کیا کریں گے؟"

''یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے میڈم! میں اس عورت کی تصویر اور اس کا بیان شائع کروں گا''۔
''کسی عورت اور ایک معصوم بچے پر کیچڑ اچھال کر تم کتنے پیسے کمالو گے؟''
''آں! مم میں تو سچائی......''
وہ بات کاٹ کر بولی ''سچائی کی بات نہ کرو۔ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے کہ سچائی کی آبروریزی کس طرح ہوتی ہے''۔ پھر اس نے شیکھر سے کہا۔
''شیکھر اس رپورٹر سے پوچھو کہ اس کے اخباری دفتر اور پریس کی قیمت کیا ہے۔ یہ جتنے دام بتائے اتنے نوٹ اس کے منہ میں ٹھونس کر منہ بند کردو''۔
وہ اپنا پرس سنبھالتی ہوئی رسے کی طرف جانے لگی۔ میرا تیز قدموں سے چلتی ہوئی اس کے ساتھ ہوگئی پھر اس سے بولی۔
''یشورانی! میرا نام میرا ہے پہلے بھی ہمارا سامنا ہو چکا ہے شاید تم نے مجھے پہچانا نہیں''۔
وہ رک کر اسے پہچاننے کی کوشش کرنے لگی۔ پھر انکار میں سر ہلا کر بولی۔
''میرے اتنے پرستار ہیں کہ میں ہر ایک کا چہرہ یاد نہیں رکھ سکتی۔''
''میں تمہاری پرستار بن کر تمہارے سامنے نہیں آئی تھی۔ آج سے پانچ برس پہلے پندرہ ستمبر کی صبح ہم دونوں آشرم میں موجود تھیں اور ہم دونوں ایک ہی ارادے سے وہاں گئی تھیں''۔
یشورانی نے ایک گہری سانس لی اور کہا۔
''اوہ میں سمجھ گئی۔ میں پنڈت گردھاری لال سے مل چکی ہوں۔ انہوں نے بتایا ہے کہ اس بچے کے تین دعویدار ہیں۔ ایک میں ہوں۔ دوسری تم نظر آرہی ہو۔ کیا یہاں تیسری بھی موجود ہے؟''۔
''ہاں ایک عورت اور ہے میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ وہ تیسری دعویدار ہوگی۔ بہتر ہے کہ ہم کہیں اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کریں''۔
''نہیں، پہلے میں اپنے بچے کی خبر لوں گی''۔
میرا نے تصحیح کی ''اپنا بچہ نہیں، ہمارا بچہ۔ جب تک فیصلہ نہ ہو جائے کہ وہ کس کا بچہ ہے، اس وقت تک وہ ہم تینوں کا ہوگا''۔
یشورانی کو اس کی بات بری لگی کیونکہ ممتا خود غرض ہوتی ہے۔ اپنی گود کے بچے کو دوسری گود سے منسوب نہیں کرسکتی لیکن ممتا دوسری ماؤں کا درد بھی سمجھتی ہے۔ یشورانی کو تسلیم کرنا پڑا کہ فی الحال وہ تینوں کا مشترکہ بچہ ہے۔
میرا نے کہا ''صبح سے پہلے بچے کے متعلق کچھ نہیں معلوم ہو سکے گا۔ کوہ پیما اجیت سنگھ اپنی ٹیم کے ساتھ روانہ ہو چکا ہے۔ جب تک کوئی نئی اطلاع ملے ہم کہیں تنہائی میں بیٹھ کر باتیں کریں گے''۔
یشورانی اس کے ساتھ اپنی گاڑی میں آکر بیٹھ گئی۔ پھر اس نے پوچھا۔
''اس بات کا فیصلہ کیسے ہوگا کہ وہ بچہ کس کا ہے؟''
''یہ میری سمجھ میں نہیں آتا۔ جب میں نے اپنے بچے کو جنم دیا تو اس وقت میں نیم بے ہوشی کی حالت میں تھی۔ میرے ایک ہمدرد مکرجی نے مجھے اس بچے کی صورت نہیں دکھائی کہ کہیں میری ممتا مچل نہ جائے۔ انہوں نے

اسے آشرم میں پہنچا دیا۔ اگر میں اس کی صورت دیکھ بھی لیتی تو کیا پانچ برس کے بعد وہ صورت سے پہچانا جا سکتا ہے؟''

''نہیں'' یشورانی نے کہا۔ ''میں نے اسے جنم دینے کے بعد دیکھا تھا۔ آج اخبار میں اس کی تصویر بھی دیکھی، اب وہ پہچانا نہیں جاتا۔ پانچ برس میں بڑی تبدیلیاں آجاتی ہیں''۔

''کیا اس کے جسم پر کوئی واضح شناختی نشان تھا؟''

وہ کچھ دیر سوچنے کے بعد بولی۔

''اس بات کا میں نے خیال نہ رکھا۔ مجھے اس کی کوئی نشانی یاد رکھنی چاہیے تھی مگر میں قتل کے مقدمے اور بچے کے بچھڑنے کے خیال سے اس طرح دماغی پریشانی میں مبتلا تھی کہ بچے کے کسی شناختی نشان کی طرف دھیان نہ دے سکی''۔

وہ بولتے بولتے سوچنے لگی ''کاش میں بچے کو آشرم میں نہ دیتی مگر وہ لوگ مجھے یقین دلا چکے تھے کہ مجھے پھانسی ہو جائے گی۔ ان دنوں شیکھر بھی دیس سے باہر شوٹنگ میں مصروف تھا ورنہ میں بچے کو اس کے حوالے کر دیتی۔ اور جب وہ واپس آیا تو میری تقدیر نے بھی میرا ساتھ دیا۔ عدالت نے یہ کہہ مجھے بری کر دیا کہ پنالال کے ملازم نے مجھے پنالال سے ملاقات کیے بغیر واپس جاتے دیکھا تھا۔ اس کے بعد دوبارہ اس نے مجھے اس کوٹھی میں نہیں دیکھا اور نہ ہی جائے واردات پر میری موجودگی کا کوئی ثبوت پایا گیا، محض شبہ کی بنا پر مجھے سزا نہیں دی جاسکتی۔

جیل سے رہا ہوتے ہی میں شیکھر کے ساتھ آشرم میں پہنچی تو ایک سال کا عرصہ گزر چکا تھا۔ پنڈت گردھاری لال نے یہ کہہ کر مایوس کر دیا کہ اس آشرم میں کسی کے بچے کی شناخت نہیں ہو سکتی۔ اس سلسلے میں وہ تحریری کارروائی نہیں کرتے البتہ میرے یاد دلانے پر پنڈت جی کو یاد آ گیا کہ چودہ اور پندرہ ستمبر کی درمیانی شب فرقہ وارانہ فسادات ہوئے تھے......''

میر بانے پوچھا ''یشورانی کیا سوچ رہی ہو؟''

''آں؟'' وہ چونک کر بولی ''اپنے بچے کے لیے سوچ رہی ہوں جواب ہمارا ہو گیا ہے''۔

اسی وقت ان دونوں نے گاڑی کے باہر دیکھا۔ باہر تاریکی میں ایک عورت سائے کی طرح نظر آرہی تھی۔

میر بانے فوراً ہی پہچان لیا۔ وہ دروازہ کھول کر بولی۔

''تم کیپٹن سرتاج حسین کی شریک حیات ہو۔ اندر آجاؤ''۔

بانو نے گاڑی کے اندر آکر دروازے کو بند کیا پھر ان کے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

''میرا نام بانو ہے۔ شاید میں اپنے بچے کی دو ماؤں سے مل رہی ہوں''۔

میر بانے اس سے بھی کہا کہ وہ اپنا بچہ نہیں، ہمارا بچہ کہے۔ بانو نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''جو بچہ ازل سے میری کوکھ میں لکھ دیا گیا ہے، میں اسے آخری سانس تک اپنا کہوں گی۔ تم دونوں بھی اسے اپنا کہو گی تو میں اعتراض نہیں کر سکوں گی۔ سیدھی سی بات ہے وہ اپنا نہ ہوتا اور اپنائیت نہ ہوتی تو ہم تینوں یہاں نہ آتیں''۔

یشورانی نے کہا ''تم ٹھیک کہتی ہو۔ اسے اپنا کہتے وقت اعتماد پیدا ہو جاتا ہے کہ وہ اپنا ہی ہے مگر اس طرح ہمارے درمیان جھگڑا پیدا ہو گا''۔

''ہاں سمجھوتے کا کوئی راستہ نظر نہیں آرہا ہے''۔

''بچہ ممتا کے بازار میں تین ماؤں کے درمیان نیلام بھی نہیں ہو سکتا''۔

''اس کے لیے لاٹری کی پرچی بھی نہیں اٹھائی جاسکتی''۔

''حضرت سلیمان کے دربار میں دو عورتوں نے ایک بچے کا دعویٰ کیا تھا۔ وہاں اصل ماں کے ساتھ انصاف ہو گیا تھا مگر ہم تین ماؤں کا فیصلہ کسی دربار میں نہیں ہو سکتا''۔

میر بانے کہا ''خود غرضی کا تقاضا ہے کہ ہم اپنی اپنی صلاحیتوں اور طاقت کے بل بوتے پر اسے حاصل کریں۔ میرے پاس قلم کی طاقت ہے، میں اپنے بچے کو حاصل کرنے کے لیے دیس کے سارے اخبارات کو جھنجھوڑ ڈالوں گی''۔

یشورانی نے کہا ''میں ایک فلم میں کام کرنے کا معاوضہ چالیس لاکھ روپے لیتی ہوں۔ اس وقت میرے پاس سات کروڑ کا بینک بیلنس اور دو کروڑ کی جائیداد ہے۔ میں اپنے بچے کے لیے آٹھ کروڑ روپے داؤ پر لگا دوں گی اور سب جانتے ہیں کہ روپے سے بڑی کوئی طاقت نہیں ہے''۔

بانو نے سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر یقین مستحکم سے کہا۔

''میرے پاس بھی بہت بڑی طاقت ہے اور وہ ہے خدا......''

O☆O

رات پہاڑ بن گئی تھی۔ ان تینوں کی آنکھوں سے نیند اڑ چکی تھی۔ پتا نہیں وہ بچہ بارہ ہزار فٹ کی بلندی پر آسمان کے پالنے میں سو رہا تھا یا جاگ رہا تھا۔ زندہ تھا یا مر چکا تھا۔ اسی تشویش میں ماؤں کی نیند مر گئی تھی۔

میر بانے ہنستے ہوئے کہا ''ہم سب پڑھی لکھی سمجھدار عورتیں ہیں۔ ہمیں جاہلوں کے انداز میں ایک دوسرے کو چیلنج نہیں کرنا چاہیے۔ اگر ہم سہولت سے پرسکون ہو کر سوچیں تو شاید کوئی حل نکل آئے''۔

بانو نے کہا ''میرے خیال سے ہم تینوں اپنی اپنی داستان سنائیں۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کے دکھ درد کو اچھی طرح سمجھ سکیں گے۔ جب ہمارا درد مشترک ہو گا تو ہم مشترکہ محبت کے جذبہ سے کوئی دانش مندانہ فیصلہ کر سکیں گے''۔

وہ راضی ہو گئیں۔ پھر رات گزارنے کے لیے باری باری اپنی داستان سنانے لگیں۔

پہلے میر بانے اپنی کتاب زندگی کھولی۔ اس نے اعتراف کیا کہ وہ جذبات کی رو میں بہہ کر جوانی کی ایک عام سی غلطی کر بیٹھی تھی۔ اس کی داستان عام سی تھی مگر ممتا اپنی ذات میں خاص درجہ رکھتی ہے۔ وہ بحالت مجبوری بچے کو جدا تو کر سکتی ہے لیکن اس کی محبت کو دل سے نوچ کر نہیں پھینک سکتی۔ اس نے داستان کے آخر میں کہا۔

''میں یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ دنیا والے میرے بچے کو ناجائز کہیں اور میں اپنا کیریئر بھی تباہ نہیں کرنا چاہتی تھی۔ اس لیے میں نے بچے کو آشرم میں چھوڑ دیا''۔

یشورانی نے اپنی داستان کے آخر میں کہا۔

''فلم کی ہیروئن کوئی اتنی نیک نام بھی نہیں ہوتی۔ میں بدنامیاں اٹھا کر بچے کو ضرور پالتی مگر پھانسی پانے کے خیال سے میں اپنے بچے کو آشرم جیسی محفوظ جگہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئی''۔

بانو نے اپنی داستان سنانے کے بعد کہا۔

''نہ مجھے بدنامی کا ڈر تھا اور نہ ہی کوئی میرے بچے پر انگلی اٹھا سکتا تھا۔ میں آخر وقت تک اپنی ماں سے لڑتی اور ضد کرتی رہی کہ بچہ میری گود میں پرورش پائے گا لیکن مذہب اور دھرم کی آڑ میں خون کی ہولی کھیلنے والے درندوں نے میرے دل میں دہشت بٹھا دی کہ بچہ کسی محفوظ مقام پر نہ پہنچایا گیا تو ظالم اسے نیزوں پر اچھالیں گے......''

یہ کہتے ہی وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ تھوڑی دیر کے لیے گاڑی کے اندر سناٹا چھا گیا۔ یہ سناٹا ان تینوں

عورتوں کے اندر بھی تھا۔ ایک دوسرے کے دکھ درد کو سمجھنے کے بعد اب وہ کسی کی گود سے بچے کو نہیں چھین سکتی تھی کیونکہ پرائی گود کا درد اب اپنا ہی درد تھا۔

صبح ہو رہی تھی۔ وہ تینوں آنسو پونچھتی ہوئی گاڑی سے باہر آگئیں۔ بانو انہیں حد بندی لائن کے پار لے گئی اور اپنے سرتاج سے دو باقی ماؤں کا تعارف کرانے لگی۔ سرتاج حسین نے مسکرا کر کہا۔

''میں تم تینوں کو یہ خوش خبری سنا دوں کہ اجیت سنگھ سے ٹرانسمیٹر پر گفتگو ہو چکی ہے، وہ بچے کو بحفاظت لے کر آ رہا ہے''۔

مارے خوشی کے ان تینوں کی آنکھوں سے آنسو نکل پڑے۔ بانو نے سرتاج کے بازو سے لگ کر کہا ''میرا بچہ!''

میربا نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا ''میرا بچہ!''

یشورانی پہاڑ کی بلندی کو نگاہوں سے چھو کر بولی ''میرا بچہ!''

جب سے دنیا آباد ہوئی ہے ''میرا اور تیرا'' کا جھگڑا چل رہا ہے مگر وہ تینوں مائیں اپنے اندر لڑتے تھک گئی تھیں اور یہ بات سمجھ میں آگئی تھی کہ آپس کے جھگڑے میں بچہ دنیا والوں کے سامنے تماشہ بن جائے گا۔

وہ سوچتی رہیں اور بچے کی واپسی کا انتظار کرتی رہیں۔ حد بندی کے باہر ہزاروں افراد بھی پہاڑ کی جانب تک رہے تھے۔ تقریباً چار گھنٹے کے بعد اجیت سنگھ اپنی ٹیم کے ساتھ بچے کو اپنی پشت پر باندھ کر صحیح سلامت نیچے آگیا۔

وہ تینوں بے اختیار اس کی طرف دوڑتی چلی گئیں۔ اب بچے کو کمبل میں لپیٹ کر اسٹریچر پر لٹایا جا رہا تھا۔ تینوں مائیں اس پر جھک گئیں۔ وہ آنکھیں بند کیے لیٹا تھا۔ اس کا چہرہ ایسا معصوم اور جاذب نظر تھا کہ ماؤں کے دل اس کی طرف کھنچے جا رہے تھے۔

فوجی ڈاکٹر نے کہا ''آپ سب بچے کے پاس سے ہٹ جائیں، اسے فوری طبی امداد کے لیے اسپتال پہنچانا ہو گا پلیز......''

وہ تینوں ایک طرف ہو گئیں۔ حد بندی کے باہر کھڑے ہوئے داس دیو نے اپنی کھوپڑی کو سہلاتے ہوئے سوچا ''یہ تین کا ہندسہ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ پچھلی رات سے یہ تینوں ایک ساتھ نظر آ رہی ہیں۔ اب اس میں شبہ نہیں رہا کہ ان میں سے کوئی ایک اس بچے کی ماں ہے۔ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ان تینوں نے مل کر اس ایک بچے کو جنم دیا ہو......''

یشورانی، میربا اور بانو کسی حتمی فیصلے تک پہنچنے کے لیے پھر اسی گاڑی کی طرف جانے لگیں۔ گاڑی کا دروازہ کھلا ہوا تھا اور اندر پنڈت گردھاری لال بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ تینوں انہیں دیکھ کر خوش ہو گئیں جیسے وہ اصل ماں کی نشاندہی کرنے آئے ہوں۔ انہوں نے کہا۔

''اندر آ کر دروازہ بند کر لو اور مجھے بتاؤ کہ تم لوگوں نے کیا فیصلہ کیا ہے؟''

وہ تینوں اندر آ گئیں۔ دروازہ بند ہو گیا۔ میربا نے کہا۔

''ہم میں سے کوئی فیصلہ کرنے کے قابل نہیں ہے۔ آپ ہماری مدد کریں''۔

''بیٹی! صرف اپنی ممتا کے لیے سوچو گی تو کبھی فیصلہ نہیں ہو سکے گا۔ تم تینوں کو صرف بچے کی بھلائی کے لیے سوچنا چاہیے۔ کیا تم تینوں نے بچے کو بدنامی سے بچانے کے لیے آشرم میں نہیں چھوڑا تھا؟''

یشورانی اور میربا نے تائید کی۔ بانو نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے کہا۔

''جی نہیں۔ بچہ میرے پاس عزت سے رہ سکتا تھا اور اب بھی اسے وہی عزت ملے گی۔ میں آپ کو بتا چکی ہوں کہ میں اپنے بچے کو نیزے کی انی پر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کی سلامتی کے لیے اسے چھوڑ دیا تھا''۔

''تم ٹھیک کہتی ہو اب میں میر با اور یشورانی سے پرارتھنا کرتا ہوں کہ وہ بچے کو کسی ایسی جگہ رکھیں جہاں وہ ناجائز نہ کہلائے۔ بانو کا بچہ جائز تھا بلکہ ہے۔ اس لیے اسے بانو کے پاس رہنے دو۔ تم کبھی کبھی بانو کے ہاں جا کر ایک ماں کی حسرتیں پوری کر سکتی ہو۔ اگر تم دونوں نے میرے اس فیصلے سے انکار کیا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ بچے کی عزت تمہیں پیاری نہیں ہے''۔

یہ کہہ کر پنڈت جی باہر چلے گئے اور میر با اور یشورانی تھوڑی دیر تک سر جھکائے بیٹھی رہیں۔ جب بانو ان کے قریب گئی تو وہ دونوں بانو کے سینے سے لگ کر رونے لگیں۔ ان کی آنکھوں سے بہنے والے آنسو ایک معصوم بچے کی بدنامی کو ہمیشہ کے لیے دھو رہے تھے۔

باہر داس دیو نے پنڈت جی کو دیکھ کر کہا۔

''پنڈت جی! میں سب سمجھتا ہوں کہ اس گاڑی کے اندر کیا کھچڑی پک رہی ہے۔ سچی خبر میرے اخبار میں آ کر ہی رہے گی''۔

پنڈت گردھاری لال نے قریب آ کر آہستگی سے کہا۔

''میرے سچے صحافی بیٹے! ایک مسلمان عورت نے ہندو غنڈوں سے اپنے بچے کو محفوظ رکھنے کے لیے اسے آشرم میں چھوڑ دیا تھا۔ کیا یہ سچی خبر تم ہمارے دیس کے کسی اخبار میں شائع کر سکو گے؟''

داس دیو کا لٹکا ہوا منہ بتا رہا تھا کہ ایسی سچی خبروں کو اخباری زبان میں پروپیگنڈا کہتے ہیں۔

☆O......O☆

کلی کا کفن

لوگو!
تم انتقامی جذبوں کو لہو کا کفن
اور پھول کے رشتوں کو خزاں کا کفن
پہناتے ہو
اب آؤ
اور اس کلی کو ہوس کا کفن پہنا دو
تمہاری تہذیب مکمل ہو جائے گی۔

کبھی کبھی میری ٹیکسی دلہن کی طرح سنورتی ہے اور اس دلہن کی آغوش میں دلہا سہرا باندھ کر بیٹھ جاتا ہے۔ آگے آگے بینڈ باجے والے فلمی دھن سناتے جاتے ہیں اور آگے پیچھے باراتی اور دلہا کے رشتے دار پانچ پیسے اور دس پیسے لٹاتے رہتے ہیں۔ ایسے وقت یوں لگتا ہے جیسے میں اپنی پچیس برس کی کنواری شمشاد کے لیے اس دنیا کے مہنگے بازار سے ایک دلہا خرید کر لے جا رہا ہوں۔

برات ہمارے محلے شریف آباد سے چلی تھی اور اورنگی ساڑھے گیارہ نمبر پر پہنچ کر رکی تھی جہاں مصیبت کے مارے لوگ بنگلہ دیش سے آکر پناہ لے رہے تھے۔ برات کے دلہا کا نام شریف احمد ہے۔ شریف احمد واقعی اسم با مسمی ہے۔ ہمارے محلے میں اس نے شرافت کی مثال قائم کی ہے۔ وہ کبھی نظریں اٹھا کر جوان لڑکیوں کو نہیں دیکھتا۔ میرے کچے مکان کے ٹھیک سامنے اس کا پکا مکان ہے۔ خود میری بہن شمشاد نے اس کی تعریف کی ہے کہ شریف احمد ہمیشہ اس کے سامنے سے سر جھکا کر گزر جاتا ہے۔

میں سچ کہتا ہوں کہ اس کی حد سے زیادہ شرافت مجھے مہنگی پڑی ہے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ دوسروں سے نظریں بچا کر میری بہن کو دیکھے، مجھ سے چھپ کر میری بہن کی محبت میں گرفتار ہو جائے۔ آپ مجھے بے غیرت کہیں گے اور زیادہ کہیں تو مجھے بہن کا دلال کہہ کر پکاریں گے مگر ایسا کہنے سے پہلے آپ کو میری غریبی اور میرے کچے مکان کو دیکھنا ہوگا۔ میری بہن کی بڑھتی ہوئی عمر کا حساب کرنا ہوگا۔ ان حالات میں لڑکی والے یہی چاہتے ہیں کہ کوئی لڑکا ان کی لڑکی کی خوبصورتی اور خوب سیرتی دیکھ کر پھنس جائے۔ اگر پھانسنے کے اس عمل کا نام دلالی ہے تو ہم سب اس سوسائٹی کے مہذب دلال ہیں۔

شریف احمد کا باپ نعیم احمد بھی بہت زیادہ شریف اور غریب پرور ہے۔ وہ اپنے بیٹے کے لیے کسی غریب لڑکی کو بہو بنا کر لانا چاہتا تھا اور اکثر میری شمشاد کی تعریفیں کیا کرتا تھا۔ میں اس دھوکے میں رہا کہ وہ کسی دن میری بہن کا رشتہ مانگنے آئے گا مگر انہی دنوں بنگلہ دیش سے مہاجرین کے قافلے آنے لگے۔ ان کی مصیبتوں میں کام آنے کے لیے صاحب حیثیت لوگ روپے پیسے کی امداد کے علاوہ لٹے ہوئے خاندان کے افراد کو کہیں کام دھندے سے لگانے لگے اور کہیں ان کا گھر بسانے لگے۔ نعیم احمد بھی ایک مہاجر لڑکی کو اپنی بہو بنانے کے لیے برات لے کر ان کی بستی میں پہنچ گئے۔

ہم سب کو مہاجروں سے ہمدردی ہے لہٰذا میں نعیم احمد سے یہ نہ پوچھ سکا کہ بندہ پرور آپ میری بہن کی تعریفیں کیا کرتے تھے پھر ایک خانماں برباد لڑکی کی خانہ آبادی کیوں کر رہے ہیں؟ ایسا پوچھتے وقت میں خودغرض کہلاتا اس لیے چپ چاپ شریف احمد کو دلہا بنا کر اسے اپنی ٹیکسی میں بٹھا کر اس لڑکی کے دروازے پر لے آیا جو میری بہن کی جگہ دلہن بنی بیٹھی تھی۔

ہم ٹیکسی والے یوں تو اپنی مرضی کی سواری بٹھاتے ہیں لیکن پولیس والوں کے سامنے اور اپنے محلے والوں کے سامنے اپنی من مانی نہیں کرتے کیونکہ محلے میں ہمیں رہنا ہوتا ہے اور حوالات میں ہم رہنا نہیں چاہتے۔ اگر میرے بس میں ہوتا تو میں شریف احمد کی برات کے ساتھ جانے سے انکار کر دیتا لیکن میں ٹیکسی ڈرائیور بھی تھا اور محلے کا براتی بھی۔ اس لیے مجھے نکاح میں بھی شریک ہونا پڑا۔ مزید ستم یہ کہ نکاح پڑھانے والے قاضی صاحب نے مجھے قاضی بنا کر دو وکیلوں کے ساتھ لڑکی کے پاس ایجاب و قبول کی گواہی کے لیے بھیج دیا۔

مجھے یہ اعزاز اس لیے حاصل ہوا کہ میں میٹرک پاس ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ انگریزی اچھی طرح سمجھ لیتا ہوں اور اردو فصاحت و بلاغت سے بولتا ہوں۔ محلے والوں پر میرا اور میری بہن کا رعب طاری رہتا ہے کیونکہ وہ بھی ان دنوں فرسٹ ائیر میں پڑھ رہی تھی۔

جب میں نکاح قبول کرانے عورتوں میں گیا تو وہ سانولی سلونی بنگالی دوشیزہ گھونگھٹ نکالے بیٹھی تھی۔ بنگال کے حسن کا سلونا پن مشہور ہے۔ میں اس کا چہرہ تو نہ دیکھ سکا مگر حنائی ہاتھوں کی نزاکت اور ملائمت بتا رہی تھی کہ بڑا نمکین حسن ہے۔ میں ابھی تک کنوارا ہوں مگر ٹیکسی کے ایک ایک پرزے کی طرح عورت کے کل پرزوں کو سمجھتا ہوں۔ میری داستان حیات بتائے گی کہ ایک تجربہ کار ٹیکسی ڈرائیور بننے کے لیے عورت کو سمجھنا کتنا ضروری ہے۔

جب تک میں اپنی بہن کو دلہن بنا کر رخصت نہ کرتا اس وقت تک اپنے لیے دلہن نہیں لا سکتا تھا۔ فی الحال ایک رات کی دلہنوں کے ساتھ نہایت شرافت سے زندگی گزار رہا تھا۔

اس وقت بھی اس سانولی سلونی لڑکی کو دلہن بنے دیکھ کر ٹیکسی کے میٹر کی طرح میرے دل کا بے ایمان میٹر بہت تیزی سے چل رہا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ میں نے کس طرح اس سے نکاح قبول کرایا تھا۔ نکاح پڑھانے کے دوران صرف اتنا یاد ہے کہ اس دلہن کا نام زیب النساء عرف بیلا رانی تھا۔ مجھے صرف بیلا رانی یاد رہ گئی۔

رخصتی کے وقت جب بیلا رانی کو بیلے کی لڑیوں میں چھپا کر ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر بٹھا دیا گیا تو میں نے عقب نما آئینے کا رخ اس کی طرف پھیر دیا تاکہ تمام راستے اس کے سبک سے نمکین ہاتھ نظر آتے رہیں۔ اگر اس وقت شریف احمد میری بہن کو دلہن بنا کر لے جا رہا ہوتا تو میں آئینے کی پوزیشن نہ بدلتا۔ وقت وقت کی بات ہوتی ہے، وقت انسان کو کبھی غیرت مند بنا دیتا ہے اور کبھی بے غیرت۔ ویسے بھی مجھ جیسا تجربہ کار کنوارا ہر عورت کو اپنی بہن تو نہیں بنا سکتا۔

میں نے بیلا رانی کو اس کے سہاگ کی پہلی منزل تک پہنچا دیا۔ شریف احمد اور اس کی ماں دلہن کو سہارا دے کر اپنے گھر میں لے گئے۔ اس گھر کے سامنے میرا گھر تھا۔ شمشاد کھڑکی سے لگی ایک لڑکی کو دلہن بن کر اپنی منزل تک پہنچتے دیکھ رہی تھی۔ میں سمجھتا تھا کہ اس وقت اس کی نگاہوں میں کتنی حسرتیں ہوں گی اور دل میں کتنے طوفان اٹھ رہے ہوں گے۔ ایسے وقت میں اپنی بہن کا سامنا نہیں کر سکتا تھا اس لیے ٹیکسی اسٹارٹ کر کے دارو پینے چلا گیا۔

زندگی جب بہت زیادہ ٹھوکریں مارتی ہے تو شراب بھی پانی ہو جاتی ہے، سالا نشہ ہی نہیں ہوتا۔ ہوتا بھی ہے تو بہن کا اداس چہرہ نگاہوں کے سامنے آجاتا ہے۔ غم غلط نہیں ہوتا، صحیح ہو کر دماغ میں اور سکہ جمالیتا ہے۔ اس کی محرومیاں کہتی ہیں۔

''میرے ٹیکسی ڈرائیور بھائی! تو ہر مسافر کو اس کی منزل تک پہنچا دیتا ہے پھر بہن کو راستے میں کیوں چھوڑ دیا ہے؟ کتنے ہی مسافروں کو تو میٹر تیز کر کے پہنچاتا ہے، مجھے بھی ایمانداری سے نہ سہی بے ایمانی سے ہی کہیں پہنچا دے، کسی کی دلہن بنا دے اس دنیا میں سب کچھ ہوتا ہے۔ تجھ سے کچھ نہیں ہوتا......''

میں بہت کچھ کر سکتا ہوں۔ پہلے میں ایماندار تھا۔ میٹر کے مطابق پیسے لیا کرتا تھا۔ میں سمجھتا تھا کہ ایمانداری سے ٹیکسی چلا کر رئیس اعظم بن جاؤں گا۔ پھر میری سمجھ میں آیا کہ اس دنیا میں ایک کو نقصان پہنچائے بغیر دوسرا فائدہ حاصل نہیں کر سکتا۔ دو وقت کی روٹی کھانے کے لیے کسی نہ کسی کی جیب سے پیسہ نکالنا پڑتا ہے۔ اگر میں کسی سواری سے کہوں کہ میٹر سے چلنے میں میرا نقصان ہے ایک روپیہ زیادہ دو تو وہ سیدھی طرح کبھی نہیں دے گا۔ اسے میرے نقصان کی پرواہ نہیں ہوگی کیونکہ لوگ صرف اپنے فائدے پر نظر رکھتے ہیں۔ پھر میں کیوں نہ اپنا فائدہ دیکھتا؟

اس لیے میں نے میٹر تیز کر دیا۔ ایمان کا میٹر بہت سست ہے کیونکہ ایمان کا حساب قیامت کے دن ہوگا۔ ابھی جس قیامت کا سامنا ہے۔ اس سے نجات حاصل کرنا ضروری ہے۔ کھانے، کپڑے، مکان کا کرایہ اور تعلیم کے اخراجات کے لیے ہر شخص بے ایمانی کا میٹر تیز چلا رہا ہے۔ یہ جتنی تیزی سے چلاتا ہے اتنی ہی تیزی سے مہنگائی بڑھتی جاتی ہے اور بہن کی کنواری آہیں بھی دل کو چھلنی کرتی جاتی ہیں۔ اس لیے اب میں مسافروں کو باتوں میں لگا کر یا راستہ خراب ہونے کا بہانہ کر کے لمبے راستے سے لے جاتا ہوں۔ وہ فریب کھا کر مجھے خوشی سے زیادہ پیسے دیتے ہیں اور اپنی نادانی سے سمجھاتے ہیں کہ یہ دنیا فریب کھا کر ہی خوش رہتی ہے۔

اس طرح میں نے پانچ برس میں بہن کی شادی کے لیے نئے کپڑے، سونے کے زیورات اور جہیز کا تھوڑا سا سامان جوڑ لیا ہے۔ لیکن اتنی بے ایمانیوں کے باوجود یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اپنی بہن کے لیے کس طرح بے ایمانی سے ایک دلہا خرید کر لے آؤں؟ اگر ایک دلہا کو پھانسنے کے سلسلے میں ذرا بھی بھول چوک ہوئی تو میں غیر مہذب دلال کہلاؤں گا۔

دارو کی آگ حلق سے اتارتے وقت میں ایسی بہت سی گہری باتیں سوچتا ہوں جو فلاح و بہبود کے اداروں اور سماج کے مصلحین کو سوچنا چاہیے۔ پہلے میں نے ایک ادھا پیا۔ جب نشہ اپنی اٹھان تک نہیں پہنچا تو میں نے ایک پوا اور حلق میں اتارا۔ پھر سرور میں آکر بے سری آواز میں فلمی گیت گاتا ہوا ٹیکسی میں آکر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دور تک ڈرائیو کرنے کے بعد ایک برقعہ پوش عورت نے ہاتھ اٹھا کر ٹیکسی روکنے کا اشارہ کیا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ فٹ پاتھ کی ٹیکسی ہے اور گاہک کی تلاش میں نکلی ہے۔ ایسی برقع پوش ٹیکسیاں میری آمدنی میں اضافہ کرتی ہیں اس لیے میں نے گاڑی روک دی اور فوراً میٹر آن کر دیا تا کہ معاملہ طے ہونے تک میٹر تیزی سے بل بناتا رہے۔

اس نے نقاب الٹ کر گاڑی کے اندر جھانکتے ہوئے مجھے دیکھا۔ پھر خوش ہو کر بولی۔

''ارے شیدے تو ہے؟''

ہاں میں شیدا ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔ اس شہر کی تمام وہ عورتیں، جو اپنی جوانی کا میٹر آن کر کے سواری کی تلاش میں نکلتی ہیں، وہ مجھے پہچانتی ہیں اور میں انہیں پہچانتا ہوں اور ہم سب کو پولیس والے پہچانتے ہیں اور پولیس والوں کو حرام کی آمدنی پہچانتی ہے۔ اس طرح نہایت ایمانداری سے ہم عورت کی کمائی انصاف سے بانٹ کر مہنگائی کا مقابلہ کرتے رہتے ہیں۔

جب اس نے نقاب الٹا تو اس وقت نشے کے باعث میری کھوپڑی گھوم رہی تھی۔ میں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اسے دیکھا پھر جھومتے ہوئے پوچھا۔

''کون زرینہ؟ اری اتنی رات کو نکلی ہے اگر کسی ایماندار پولیس والے نے پکڑ لیا تو سیدھی حوالات میں پہنچ جائے گی''۔

وہ ٹیکسی کا اگلا دروازہ کھول کر میرے پاس بیٹھتے ہوئے بولی۔

''جو پولیس والے ایماندار ہوتے ہیں ان کی معلومات بھی محدود ہوتی ہیں۔ وہ مجھے نہیں پہچانتے کہ میں پیشہ کرتی ہوں۔ ایسوں کے سامنے تو مجھے اپنی گھر والی بنا لینا۔ میں تجھے کیا سمجھاؤں؟ تو نے گھاٹ گھاٹ کا پانی پیا ہے۔ اس وقت کوئی بہانہ نہ کرنا۔ میں بہت پریشان ہوں۔ چل گاڑی آگے بڑھا، راستے میں کوئی نہ کوئی گاہک پھنس ہی جائے گا''۔

میں نے ٹیکسی کے میٹر کی طرف دیکھا۔ ابھی تک ایک روپیہ دس پیسے بنے تھے۔ میں اتنی جلدی آگے نہیں بڑھنا چاہتا تھا۔ میں نے اس سے کہا۔

''اگر جلدی چلنا ہے تو پھر میں میٹر سے نہیں جاؤں گا۔ یہاں سے پٹیل پاڑہ تک جانے آنے کے بیس روپے لوں گا''۔

''شیدے تو جانتا ہے کہ اب میں پہلے جیسی نہیں رہی۔ پہلے گاہک میرے پیچھے آتے تھے اور مجھے منہ مانگی رقم دیتے تھے اب میں اندر سے کھوکھلی ہو گئی ہوں اور اوپر سے اجڑ گئی ہوں اسی لیے دن کی روشنی میں نہیں نکلتی ہوں۔ رات کو برقعہ پہن کر آتی ہوں تاکہ یہ پچکے ہوئے گال اور سوکھا ہوا جسم اچھی طرح نظر نہ آئے۔ کچھ تو گہرے میک اپ سے چہرے پر رونق آ جاتی ہے اور کچھ گاہک عقل کے اندھے ہوتے ہیں۔ رات کو عموماً شراب کے نشے میں رہتے ہیں ایسے وقت انہی گدھی بھی حور پری نظر آتی ہے، اس طرح مجھے میرے حصے کا رزق ملتا رہتا ہے''۔

یہ کہہ کر وہ میرے قریب کھسک آئی پھر میرے گھٹنے پکڑ کر بولی۔

''رزق ملتا ہے پھر بھی ایک دو دن کے فاقے ہوتے ہیں۔ رات کے مہربان اتنی رقم نہیں دیتے کہ میں اس میں سے پولیس والوں کو بھی دے سکوں اور ٹیکسی ڈرائیور کا بل ادا کر سکوں اور مہنگائی کے بڑھتے ہوئے ہاتھوں کو کاٹ سکوں۔ آج میں تجھے بیس روپے نہیں دے سکوں گی شیدے......''

وہ میرے بالکل قریب آ گئی تھی۔ اس نے ٹھیک کہا تھا کہ نشے کی حالت میں سوکھا ہوا گلاب بھی پر شباب نظر آتا ہے۔ وہ مجھے دنیا کی سب سے حسین عورت نظر آ رہی تھی۔ شراب پی کر گندی نالیوں میں گرنے کی بجائے سوکھی عورت کی پناہ میں گرنا بہتر ہوتا ہے۔ میں نے اس سے کہا۔

''میری ٹیکسی میں رہ جا۔ میں تجھے بیس روپے دوں گا''۔

وہ خوش ہو کر بولی ''تیری بڑی مہربانی ہو گی تو اپنا ہی آدمی ہے۔ مجھے جلدی چھوڑ دے گا۔ دوسروں کی طرح پریشان نہیں کرے گا۔ مجھے جلدی واپس جانا ہے، میرا بچہ بیمار ہے''۔

بچے کا ذکر آتے ہی میرا موڈ خراب ہو گیا کیونکہ دس دس کے نوٹ پھینکتے وقت مرد فطرتاً کنواری اور اچھوتی عورت کا تصور کرتا ہے۔ میں نے بگڑ کر کہا۔

''تم سالی ٹیکسیاں بن کر بچے کیوں پیدا کرتی ہو، میری ٹیکسی نے تو کبھی بچہ نہیں دیا۔ ٹیکسی کو صرف پیسے پیدا کرنے چاہیے بچے نہیں۔ چل جا یہاں سے میں بیس پیسے بھی نہیں دوں گا''۔

اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ ٹیکسی کی نیم تاریک دنیا میں چند لمحوں کے لیے سب کچھ گم ہو گیا، صرف آنسوؤں کی جھلملاہٹ رہ گئی۔ یہ جو شراب ہے نا یہ ہمیں بہت کمزور بنا دیتی ہے۔ پرائے آنسوؤں کی تہہ میں اتر کر اپنے زخم کے حوالے سے بہت کچھ سمجھا دیتی ہے۔ وہ بڑے کرب سے کہہ رہی تھی۔

''دو دن ہو گئے۔ میری چھاتی سے دودھ نہیں اترا۔ بچے کو اوپری دودھ پلایا تو وہ بیمار ہو گیا۔ مجھے روٹی کے لیے پیسے نہیں چاہئیں۔ نئے کپڑے خریدنے کے لیے میں پرانا برقعہ اوڑھ کر نہیں نکلی ہوں اور نہ ہی اپنے جسم کو کھنڈر بنا کر شیش محل میں رہنے کا خواب لے کر آئی ہوں۔ میں صرف بچے کی دوا کے لیے پیسے حاصل کرنے آئی ہوں''۔

میں نے اس کی آنسوؤں کو نظر انداز کرتے ہوئے پتھر بننے کی کوشش کی اور سخت لہجے میں کہا۔

''تم سب عیاشی کے لیے نکلتی ہو۔ بھانت بھانت کے مردوں کے بغیر تم لوگوں کو نیند نہیں آتی مگر دوسروں کی ہمدردیاں حاصل کرنے کے لیے اپنی محرومیوں کے افسانے گھڑ لیتی ہو اور اس افسانے کا کلائمیکس پر پہنچانے کے لیے ایک نوزائیدہ دودھ پیتے بچے کو پیش کرتی ہو۔ یہ سب محض ڈرامہ ہے اور کچھ نہیں......''

اچانک ہی وہ میرا گریبان پکڑ کر مجھے جھنجھوڑنے لگی اور جھنجھلا کر کہنے لگی۔

''یہ ڈرامہ نہیں ہے، وہ بچہ دودھ اور دوا کے لیے بلک رہا ہے۔ وہ بچہ کس کا ہے؟ کسی حاجی کریم الدین کا ہے، کسی صنعت کار سیٹھ کا ہے یا کسی رئیس زادے نواب کا ہے یا تیرے جیسے ٹیکسی ڈرائیور کا ہے۔ بے غیرت، بے مروت، تمہاری سمجھ میں یہ کیوں نہیں آتا کہ تم سب کے مشترکہ بچے کو دودھ پلانے کے لیے اپنے جسم کا کاروبار کر رہی ہوں۔ تم سب میرے وجود سے بھاگتی ہوئی ٹریفک کی طرح گزر جاتے ہو اور اس بچے کو چھوڑ جاتے ہو۔ کیا اس کے لیے دودھ کی ایک بوتل خرید کر نہیں دے سکتے؟''

میں نے جلدی سے بیس روپے نکال کر دے دیئے۔ ایک فاحشہ کی زبان پر سنسر کی قینچی چلانے کے لیے بیس روپے کافی ہیں۔ جو حقیقت ناقابل برداشت ہوتی ہے اسے دولت کی قینچی سے کاٹ کر پھینک دیا جاتا ہے۔ اس نے دس دس کے دو نوٹ لے کر اپنے سینے سے لگا کر بھینچ لیے اور ٹیکسی کا دروازہ کھول کر اپنے بچے کی طرف جانے کے لیے نکلی۔ پھر ٹھٹک کر کھڑی ہو گئی اور پلٹ کر بولی۔

''اوہ! میں تو بھول ہی گئی تھی کہ ابھی بیس روپے کی قیمت چکانی ہے''۔

اس نے دوبارہ دروازے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ اس سے پہلے ہی میں نے گاڑی اسٹارٹ کی، گیئر بدلا اور ایک جھٹکے سے ڈرائیو کرتا ہوا اس سے دور چلا گیا۔ عورت جب ماں کے روپ میں آتی ہے تو سارا نشہ ہرن ہو جاتا ہے۔ میں بڑبڑاتا ہوا اور اسے گالیاں دیتا ہوا اپنے گھر کے دروازے پر آ کر رک گیا۔

جب میں دروازہ کھول کر مکان میں داخل ہوا تو اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ شمشاد آنگن میں چار پائی
ئے اس پر چاروں شانے چت لیٹی ہوئی شریف احمد کے مکان کو دیکھے جا رہی تھی۔ ہمارے آنگن سے شریف احمد
مکان کی اُوپری منزل کا ایک کمرہ اور بالکونی نظر آتی ہے اور اس کی بالکونی سے ہمارا پورا آنگن نظر آتا ہے۔ جب
رنی رات میں شمشاد چار پائی بچھا کر لیٹ جاتی تو میں سوچا کرتا تھا کہ شریف احمد اپنی بالکونی سے اسے دیکھ رہا ہوگا۔
، پہل مجھے یہ بات ناگواری گزری تھی اور پھر حالات نے مجھے سمجھا دیا کہ پرائے ہاتھوں میں جانے والی ہر چیز کو
بس میں رکھ کر اس کی اہمیت بڑھائی جاتی ہے۔ اس حد تک اگر وہ میری بہن کو دیکھ لے اور میری بہن اسے دیکھ لے
دنیا والوں کو اس کی خبر نہ ہو تو یہ بے شرمی نہیں ہے۔

مگر اب وقت گزر چکا تھا۔ شریف احمد، بیلا رانی کو بیاہ کر لے آیا تھا۔ اب شمشاد کسے دیکھ رہی تھی؟ اور ایسے
یھ رہی تھی جیسے سکتے میں آگئی ہو۔ اسے بھائی کی موجودگی کا احساس بھی نہیں تھا۔ ہر بات اپنے وقت پر سمجھ آتی ہے
ں وقت میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اب وہ شریف احمد کو نہیں دیکھ رہی ہے بلکہ دماغ کی اسکرین پر بیلا رانی کو سہاگ کے
رحلوں سے گزرتے دیکھ رہی ہے۔

میں چپ چاپ سر جھکا کر اپنے کمرے میں آگیا۔ دوسری صبح شریف احمد کے باپ نعیم احمد نے مجھے بلایا۔
ستور کے مطابق بیلا رانی کو اس کے میکے بھیجا جا رہا تھا۔ صبح سویرے اپنی دہاڑی کون برباد کرتا ہے۔ میں ٹیکسی لے کر
کلتا تو اس وقت اچھے پیسے دینے والی سواریاں مل جاتیں۔ محلے والوں سے پیسے کم ملتے ہیں پھر بھی میں نے بیلا رانی
کے لیے اس کے میکے جانا منظور کر لیا۔

جب وہ میری ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھی تو پچھلی رات کی طرح گھونگھٹ میں نہیں تھی۔ میں نے عقب
ما آئینے کا رخ اس کی طرف پھیر دیا۔ ہائے میں بیان نہیں کر سکتا کہ اس سانولی لڑکی کا چہرہ کتنا دلکش تھا۔ آئینے سے گزر
کر سیدھا دل میں اتر رہا تھا۔ میں چند لمحوں تک دم بخود اسے دیکھتا رہ گیا۔ دستور کے مطابق شریف احمد کو بھی اس کے
ساتھ جانا چاہیے تھا لیکن صرف اس کی ماں اس کے ساتھ جا رہی تھی۔ راستے میں، میں نے محسوس کیا کہ شریف احمد کی
اں بہت خاموش اور بہت اداس ہے۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ بہو کتنی ہی خوبصورت کیوں نہ ہو ساس پہلے ہی دن
سے ناپسند کرتی ہے اور کبھی خوشی کا اظہار نہیں کرتی۔ بیلا رانی کے میکے پہنچ کر شریف احمد کی ماں نے مجھے انتظار کرنے
کے لیے کہا اور بہو کو لے کر مکان کے اندر چلی گئی۔

میں ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھا انتظار کرنے لگا۔ تھوڑی دیر بعد مکان کے اندر سے لڑنے جھگڑنے کی آوازیں
آنے لگیں۔ میں نے کان لگا کر سننے کی کوشش کی لیکن بات سمجھ میں نہیں آئی کہ کس لیے جھگڑا ہو رہا ہے؟ ایک گھنٹے کے
بعد شریف احمد کی ماں تنہا واپس آکر ٹیکسی میں بیٹھ گئی۔ میں نے ٹیکسی اسٹارٹ کی اور اپنے محلے کی طرف روانہ ہو گیا۔
میں نے عقب نما آئینے میں دیکھا وہ اپنے دوپٹے کے آنچل سے آنسو پونچھ رہی تھی اور سیٹ کی پشت سے ٹیک لگا کر
گہری گہری سانسیں لے رہی تھی۔ وہ مجھے برسوں کی بیمار نظر آئی۔ میں نے پوچھا۔

''ماں جی، کیا بات ہے کیا پہلے ہی دن بہو سے جھگڑا ہو گیا ہے؟''

میرے سوال پر وہ چونک پڑی۔ شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ وہ ٹیکسی میں تنہا نہیں ہے۔ میں اسے دیکھ رہا
ہوں۔ کوئی اپنے گھر کے راز کسی غیر کو نہیں بتاتا۔ وہ میرے سوال کو ٹال گئی لیکن میں محسوس کر رہا تھا کہ وہ ادھیڑ عمر خاتون

ہر لمحہ مرتی جا رہی ہے۔

O☆O

کبھی کبھی میری ٹیکسی جنازہ بن جاتی ہے۔ کیماڑی میں ایک کشتی ڈوب گئی۔ کتنے ہی ڈوب کر مر گئے تھے اور کتنے ہی ایسے تھے جنہیں جان کنی کی حالت میں ایمبولینس کے ذریعے اسپتال لایا جا رہا تھا۔ شریف احمد کی ماں پچھلے کئی دنوں تک اسپتال میں بیمار رہنے کے بعد مر گئی تھی۔ اس کی لاش گھر لانے کے لیے ایمبولینس نہیں مل رہی تھی کیونکہ اسپتال کی تمام ایمبولینس کیماڑی کی طرف گئی ہوئی تھیں۔ میں محلے کا ٹیکسی ڈرائیور ہوں اس لیے اس کی لاش میری ٹیکسی میں لائی گئی تھی۔ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر ایک ہفتہ پہلے اس کی بہو کو دلہن بنا کر لے گیا تھا اب اس ٹیکسی کو جنازہ بنا کر لے جا رہا تھا۔

محلے والے شریف احمد اور اس کے باپ نعیم احمد سے افسوس اور ہمدردی کر رہے تھے۔ ان پر ایک ساتھ کتنے غم کے پہاڑ ٹوٹ پڑے تھے۔ بیلا رانی سہاگ کی دوسری صبح اپنے میکے گئی تھی پھر پلٹ کر اپنے شوہر کے پاس نہیں آئی تھی۔ بہو نے پہلے ہی گھر کو ویران کر دیا تھا۔ اب ماں کی موت نے ہنستے بستے گھر کو اور بھی اجاڑ کر رکھ دیا تھا۔ نعیم احمد رو رو کر محلے والوں کو بتا رہا تھا کہ بہو کتنی نک چڑھی تھی۔ اس کی بیوی بڑے ارمانوں سے اسے بہو بنا کر لائی تھی۔ وہ پہلی رات شریف احمد سے کہہ رہی تھی کہ وہ ماں باپ سے الگ ہو جائے۔

کسی نے کہا "ان مہاجروں نے پہلے مشرقی پاکستان کو الگ کیا۔ اب یہ لڑکی یہاں آ کر بیٹے کو والدین سے الگ کر رہی تھی۔ ان لوگوں سے ہمدردی کرنا فضول ہے"۔

نعیم احمد نے کہا "ہم تو نیکی کرتے ہیں اور دریا میں ڈال دیتے ہیں۔ میں نے تو چاہا تھا کہ ایک خانماں برباد لڑکی یہاں آ کر سکھ چین کی زندگی گزارے گی مگر واقعی یہ مہاجر اپنی فطرت سے مجبور ہیں۔ اپنی الگ حیثیت بنانے کے لیے نہ ادھر کے رہتے ہیں نہ ادھر کے۔ ہمارا کیا ہے ایک دن وہ بری طرح پچھتائے گی"۔

میں ان کی باتیں سن رہا تھا۔ پتہ نہیں کیوں نعیم احمد کو روتے دیکھ کر مجھے خوشی ہو رہی تھی۔ اس کی وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ اس نے میری بہن کی خوشیوں کو برباد کیا تھا اور خود بری طرح برباد ہو گیا تھا۔ ظلم کرنے والے کو آنکھوں کے سامنے سزا مل جائے تو دل کو بڑا سکون حاصل ہوتا ہے۔

اس واقعہ کو چھ ماہ گزر گئے۔ شریف احمد نے بیلا رانی کو طلاق دے کر اس کے مہر کی رقم پانچ سو روپے ادا کر دی۔ میرے لیے پھر امید بندھ گئی۔ راستہ صاف ہو چکا تھا۔ اب اس گھر سے کسی دن بھی میری بہن کا رشتہ آ سکتا تھا۔ شمشاد معمول کے مطابق روزانہ کالج جایا کرتی تھی اور میں نے معمول سے زیادہ بے ایمانی شروع کر دی تھی تا کہ زیادہ سے زیادہ آمدنی ہوتی رہے اور بہن کا رشتہ آئے تو محدود آمدنی رکاوٹ نہ بنے۔

ایک صبح وہ کالج نہیں گئی۔ میں کمرے سے نکل کر آنگن میں آیا تو وہ آنگن میں نلکے کے پاس بیٹھی قے کر رہی تھی۔ میں نے پوچھا۔

"کیا بات ہے شمشاد تمہاری طبیعت ٹھیک نہیں ہے؟"

میری آواز سنتے ہی اس نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ ایک دم سے گھبرا گئی تھی۔ اس کا چہرہ ایسا زرد پڑ گیا تھا جیسے برسوں کی بیمار ہو۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میرا دل گھبرانے لگا۔ میں اس کے قریب آیا تو وہ اپنی مٹھی میں پکڑی ہوئی کسی چیز کو پشت کی طرف لے جا کر چھپانے لگی۔

''کیا ہے تمہارے ہاتھ میں؟''

میں نے اس کا ہاتھ پکڑلیا۔اس نے ہاتھ چھڑانے کی ناکام سی کوشش کی لیکن میں نے جبراً اس کی مٹھی کھول دی۔مٹھی کھلتے ہی آم کے اچار کا ایک ٹکڑا زمین پر گر پڑا۔

میں اک دم سے سناٹے میں آگیا۔اب میں ایسا نادان بھی نہیں تھا کہ بات کی تہہ تک نہ پہنچ سکتا۔میں نے ایک زوردار طمانچہ رسید کرتے ہوئے پوچھا۔

''بول یہ سب کیا ہے؟ بے حیا، بے غیرت۔کیا میں اس لیے تجھے کالج میں پڑھنے کے لیے بھیجتا ہوں؟''

اس کی خاموشی اور اس کے آنسوؤں نے میرے شبہے کی تصدیق کردی۔میں بے تحاشہ اسے مارنے پیٹنے لگا۔ان حالات میں بھائی ہو یا باپ، بہت مجبور ہوتا ہے۔اونچی آواز میں گالیاں نہیں دے سکتا اور گالیاں دے کر بیٹی یا بہن کو خود اپنی زبان سے بدنام نہیں کرسکتا اس لیے میں خاموشی سے اسے مارتا رہا کہ کسی کو خبر نہ ہو۔وہ مار کھاتے کھاتے زمین پر گر پڑی، میں اسے گھسیٹتا ہوا کمرے میں لے آیا۔وہاں لاکر میں نے اس سے پوچھا۔

''بتا وہ کمینہ کون ہے؟ میں ابھی اس کے پلے تجھے باندھ دوں گا۔نہیں بتائے گی تو گلا گھونٹ کر ہمیشہ کے لیے تجھے ختم کردوں گا''۔

اس نے روتے روتے بتایا کہ وہ کالج کا ایک پروفیسر تھا۔شاعری کی کتاب پڑھاتے پڑھاتے اسے خوابوں کی دنیا سے گزار کر اپنی خواب گاہ میں لے گیا۔مگر اب وہ اس شہر میں نہیں ہے، ملازمت چھوڑ کر کہیں چلا گیا ہے۔

میں سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔میں جو ٹیکسی ڈرائیور ہوں اور سڑک پر چلنے والی ہر عورت کا چہرہ پڑھ لیتا ہوں۔اپنی بہن کے پچیس برس کے چہرے کو نہیں پڑھ سکا تھا۔میں یہ بھول گیا تھا کہ میرے آنگن کے درخت میں جو پھل پک رہا ہے وہ پکتے پکتے کچی دیوار کے باہر گر پڑے گا۔

میں گہری سوچ میں ڈوبا اپنی بدنامی کے خیال سے کانپ رہا تھا اور ہر شریف آدمی کی طرح اپنی بہن کے دامن پر لگے ہوئے دھبے کو مٹانے کی ترکیب سوچ رہا تھا۔اتنے میں دروازے پر دستک سنائی دی۔میں یوں چونک پڑا جیسے بدنامی دستک دے رہی ہو۔جب عزت خطرے میں پڑی ہو تو ہر دستک اور ہر آہٹ پر دل کانپتا ہے۔میں نے دانت پیستے ہوئے شمشاد سے کہا۔

''خبردار، اس کمرے سے باہر نہ نکلنا میں ابھی آتا ہوں'' میں اسے غصے سے دیکھتا ہوا ایک کمرے سے نکل کر دوسرے کمرے میں آیا اور باہر کے دروازے کو کھول دیا۔دروازے پر نعیم احمد کھڑے ہوئے تھے۔وہ ادھیڑ عمر کے قد آور ایک صحت مند آدمی تھے۔اجلی پیشانی پر ایک داغ بتا رہا تھا کہ وہ پانچوں وقت کے نمازی ہیں۔اس وقت میں کسی نمازی یا فرشتے سے ملنا نہیں چاہتا تھا لیکن انہوں نے بڑی شفقت سے مسکراتے ہوئے کہا۔

''بیٹے میں تمہاری مشکل آسان کرنے آیا ہوں''۔

ان کی باتیں سن کر مجھے یاد آیا کہ میں شمشاد کو ان کی بہو بنانا چاہتا تھا۔اس وقت وہ واقعی فرشتہ بن کر آئے تھے۔میں نے فوراً ہی انہیں کمرے میں لاکر بٹھایا۔انہوں نے بیٹھتے ہوئے بڑی نرمی سے کہا۔

''کیا جوان لڑکیوں کو مارنے پیٹنے سے مسائل حل ہو جاتے ہیں؟''

میں چونک کر انہیں دیکھنے لگا۔میں نے تو بڑی خاموشی سے شمشاد کی پٹائی کی تھی، میری آواز میرے مکان

کے دروازے تک نہیں پہنچی تھی پھر انہیں کیسے پتہ چل گیا کہ میں شمشاد کو مار رہا تھا۔

انہوں نے مسکرا کہا۔

''بیٹے، میرا مکان بہت اونچا ہے اور بالکونی سے تمہارا آنگن نظر آتا ہے۔ میں نے شمشاد کو قے کرتا دیکھا تو پہلے یہی سمجھا کہ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے لیکن تم غصے کی حالت میں اسے مارنے لگے تو ساری بات میری سمجھ میں آ گئی''۔

ان کی باتیں سن کر میرا دل بیٹھنے لگا۔ انہوں نے مجھے گھبراتے ہوئے دیکھ کر کہا۔

''میں ایک شریف آدمی ہوں۔ تمہارا یہ راز ہمیشہ میرے سینے میں دفن رہے گا۔ بلکہ میں تمہاری بدنامی پر پردہ ڈالنے آیا ہوں۔ میں تمہاری شمشاد کو اپنی بہو بنانا چاہتا ہوں''۔

مارے حیرت کے میری آنکھیں کھلی رہ گئیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ اس دنیا میں ایسے فرشتے بھی موجود ہیں جو پرائے گناہ کا بوجھ اٹھا کر اپنے گھر لے جاتے ہیں۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا۔ میری آنکھوں میں بے یقینی دیکھ کر انہوں نے کہا۔

''میں تمہارا بزرگ ہوں۔ میں تم سے مذاق کرنے یا جھوٹ بولنے نہیں آیا۔ سارا محلہ جانتا ہے جو بات میری زبان سے نکل جاتی ہے وہ پتھر کی لکیر بن جاتی ہے۔ آج شام کو میں چند شریف آدمیوں کے ساتھ قاضی صاحب کو لے کر آؤں گا اور شریف احمد کا نکاح شمشاد سے پڑھوا کر اس اپنے گھر کی عزت بنا کر یہاں سے لے جاؤں گا''۔

میں فرط عقیدت سے تڑپ کر اپنی جگہ سے اٹھا اور ان کے قدموں سے لپٹ کر رونے لگا۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں زندگی میں کبھی نہیں رویا۔ اس وقت بھی آنکھیں پونچھنے کے لیے میں نے ہاتھ اٹھایا تو پتہ چلا کہ میری آنکھوں سے آنسو نہیں بہہ رہے ہیں۔ میں صرف خوشی سے رونے کے انداز میں گڑگڑا رہا ہوں۔ میں بہت سنگدل ہوں۔ انسان کا کوئی جذبہ یا کوئی مصیبت مجھے نہیں رلا سکتی۔

پھر وہ آدمی کیسے روسکتا ہے جس پر مصیبت آتے ہی اس مصیبت کا خوبصورت حل پیش کر دیا گیا ہو۔ میری مصیبت بڑی آسانی سے ٹل گئی۔ شمشاد دنیا والوں کی نظروں میں عزت و آبرو سے دلہن بن کر اسی رات شریف احمد کے ہاں چلی گئی۔

میں نے جو زیورات کپڑے اور جتنی نقدی بے ایمانی سے جمع کی تھی۔ وہ بے ایمانی سے بنائی دلہن کے جہیز میں دے دی۔

اس کے بعد میں آزاد ہو گیا۔ اب اس بات کی فکر نہیں تھی کہ کسی ذمے داری کو پورا کرنے کے لیے مجھے دن رات ٹیکسی چلانا ہے۔ میں اپنی مرضی کے مطابق شہنشاہ بن کر ٹیکسی میں بیٹھتا تھا۔ دل چاہتا تو اپنی پسند کی سواری اٹھا لیتا ورنہ کسی ٹیکسی اڈے میں بیٹھ کر چرس کے سگریٹ پیتا رہتا۔

شادی کے ایک ماہ بعد شمشاد کا حمل ضائع ہو گیا مگر وہ خوش تھی۔ اس کا شوہر اور اس کا سسر نعیم احمد بھی بہت خوش تھے اور شمشاد کی بڑی عزت کرتے تھے۔ ایک سال بعد پھر شمشاد کے پاؤں بھاری ہوئے۔ کچھ عرصے بعد اس نے ماں بن کر مجھے ماموں جان بنا دیا۔

O☆O

کبھی کبھی میری ٹیکسی سماج کی کچرا گاڑی بن جاتی ہے اور شہر کی جتنی غلیظ خواہشات ہوتی ہیں انہیں ایک جگہ سے سمیٹ کر دوسری جگہ لے جاتی ہے۔ تقریباً دو سال کے بعد میں نے زیب النساء اسٹریٹ پر بیلا رانی کو دیکھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر ٹیکسی کو روکنے کا اشارہ کیا۔ میں نے دیکھا تو پہلی نظر میں پہچان نہ سکا۔ گرمیوں کی مہکی مہکی سی شام تھی۔ وہ ہلکے آسمانی رنگ کی ساری میں آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچا رہی تھی۔ اس کے ساری باندھنے کا انداز اتنا خوبصورت تھا کہ بدن کے نشیب و فراز

بغاوت کے انداز میں ابھر آئے تھے۔ اس کے جوڑے میں پھولوں کی وینی مہک رہی تھی اور سانولی پیشانی پر سنہری بندیا جگمگا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک خوبرو نوجوان کھڑا ہوا تھا۔ ٹیکسی رکتے ہی وہ دونوں پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھ گئے۔ میں نے فوراً ہی عقب نما آئینے کا رخ اس کی طرف پھیر دیا۔ وہ آئینے پر ایک نظر ڈال کر مسکراتے ہوئے اپنے ساتھی سے بولی۔

''کہاں چلنا ہے؟''

اس کے ساتھی نے مجھے مخاطب کرتے ہوئے کہا۔

''سوسائٹی طارق روڈ''۔

میں نے ٹیکسی آگے بڑھا دی۔ جب ٹیکسی کچھ دور نکل گئی تو میں نے نئے نوٹوں کی کھڑکھڑاتی آواز سنی۔ ہم ٹیکسی ڈرائیوروں کی چار آنکھیں ہوتی ہیں۔ دو آنکھیں سامنے راستے کی طرف دیکھتی ہیں اور باقی کی دو آئینے کے پیچھے کے مناظر دکھاتی ہیں۔ وہ سو سو کے تین نوٹ اس کی طرف بڑھا رہا تھا۔ بیلا رانی نے انکار میں سر ہلاتے ہوئے دھیمی آواز میں کہا۔

''نہیں پورے پانچ سو......''

اس نے سو کا ایک نوٹ اور بڑھا دیا۔ وہ ہاتھ جھٹک کر بولی۔

''میں کوئی فٹ پاتھ کی ٹیکسی نہیں ہوں، مجھ سے سودے بازی نہ کرو''۔

اس نے پانچ سو روپے پورے کر دیئے۔ بیلا رانی نے پانچوں نوٹوں کو تہہ کر کے پرس میں رکھ لیا۔ راستے میں اس نوجوان نے ٹیکسی رکوا کر وہسکی کی ایک بوتل خریدی پھر طارق روڈ کی ایک عمارت کے پاس پہنچ کر وہ دونوں اتر گئے۔

میری ٹیکسی خالی ہوگئی۔ مجھے یوں لگا جیسے سینہ دل سے خالی ہوگیا ہے۔ وہ شروع ہی سے میرے دل میں دھڑک رہی تھی۔ جب میں نے شریف احمد سے اس کا نکاح پڑھوایا تھا اس وقت سے اس کا حنائی ہاتھ میرے دل پر رکھا ہوا تھا۔ آج دوسری بار اس نمکین ہاتھ کو ایک دوسرا شخص پکڑ کر میرے سامنے سے لے گیا تھا۔ ٹیکسی خالی ہونے کے بعد بیلا مہکتی رہی۔

میں نے پلٹ کر پچھلی سیٹ کی طرف دیکھا جیسے وہ واپس آ گئی ہو۔ وہ نہیں تھی۔ پچھلی سیٹ پر بیلا کے پھولوں کی بنی ہوئی وینی پڑی ہوئی تھی۔ میں نے ہاتھ بڑھا کر اسے اٹھا لیا پھر دونوں ہاتھ پر رکھ کر اسے سونگھنے لگا۔ عجیب سی خوشبو تھی۔ میرا خیال ہے بیلے کے ساتھ بیلا کے بدن کا پسینہ بھی مہک رہا تھا۔ میں سوچ رہا تھا کہ وہ اورنگی ٹاؤن کے سستے علاقے سے زیب النساء اسٹریٹ کے مہنگے علاقے تک کیسے پہنچ گئی؟ وہ کیسے حالات تھے جنہوں نے اسے سمجھا دیا تھا کہ وہ بہت اونچی قیمت پر ہر رات پانچ سو روپے دین مہر کے عوض بک سکتی ہے۔ یہ دین مہر پہلی بار شریف احمد نے مقرر کیا تھا۔ وہاں ایک رات رہ کر وہ سمجھ گئی تھی کہ یہی اس کی قیمت ہے۔

یہ سوچتے ہوئے میرا دل دھڑکنے لگا کہ کیا میں اس کی قیمت چکا سکتا ہوں؟ وہ میرے دل و دماغ پر چھائی ہوئی تھی۔ جب وہ ٹیکسی کی پچھلی سیٹ پر آ گئی تھی تو اگلی سیٹ پر بھی آ سکتی تھی۔ لیکن میں اس کے لیے ایک مہینے میں بھی پانچ سو روپے جمع نہیں کر سکتا تھا۔ ٹیکسی کی قسطیں ادا کرنے میں اور آئے دن اس کی مرمت کرنے میں میری آمدنی کا تین چوتھائی خرچ ہو جاتا تھا۔ باقی حصے میں سے کچھ ٹریفک پولیس والے لے جاتے تھے اور کچھ نشے کی ضرورتیں لے جاتی تھیں۔ باقی پیٹ کی آگ بجھانے میں خرچ ہو جاتا تھا۔ اس وقت بیلا رانی میرے لیے بہت مہنگی تھی۔ بہت اونچی تھی۔ میں ہاتھ اٹھا کر اسے چھو نہیں سکتا تھا۔

جسے ہم چھو نہیں سکتے اس کے لیے دل زیادہ مچلنے لگتا ہے۔ پہلے تو میں نے سوچا کہ فی الحال صبر کرنا چاہیے۔

فٹ پاتھ پر جو عورتیں آتی ہیں، پہلے ان کا ریٹ بہت اونچا ہوتا ہے پھر آہستہ آہستہ پنکچر ہوتی جاتی ہیں اور ان کا بھاؤ گرنے لگتا ہے۔ دو چار سال تک انتظار کرنے کے بعد وہ مجھے پچاس روپے میں مل سکتی تھی۔ اس وقت واقعی میں نے صبر کر لیا لیکن غیر شعوری طور پر وہ میرے دماغ میں کلبلاتی رہی۔ جب ٹریفک کے ہنگاموں سے دور رات کی تنہائی اور خاموشی میں، میں نے سونے کی کوشش کی تو اس کا حنائی ہاتھ میری نگاہوں کے سامنے چلا آیا۔ میں نے اس خیالی ہاتھ کو تھام کر پوچھا۔

''بی بی زیب النساء عرف بیلا رانی۔ تمہیں شیدے ٹیکسی ڈرائیور کے نکاح میں بعوض پانچ سو روپے دین مہر فی شب کے حساب سے دیا جا رہا ہے۔ کیا تمہیں یہ غیر شرعی نکاح قبول ہے؟''

اس کی سریلی آواز سنائی دی ''قبول ہے۔ قبول ہے۔ قبول ہے''۔

پھر وہ دلہن بنی میرے پہلو میں آگئی۔ میں اپنی یادداشت کے سہارے اس کے چہرے کے نقوش کو دیکھنے اور چھونے لگا۔ اسے چھوتے وقت میرا سر گھوم رہا تھا، در و دیوار گھوم رہے تھے۔ بیلے کے پھولوں کے ساتھ اس بنگالی دوشیزہ کے بدن سے جو پسینہ مہک رہا تھا اس میں مچھلیوں کی بساند تھی۔ مجھے ابکائی آنے لگی۔ میرے پلٹ کرتے کرتے ہی سارے خواب چکنا چور ہو گئے۔ دراصل میں نے بہت زیادہ پینے کے بعد فرائی کی ہوئی پاپلیٹ مچھلی کھائی تھی۔ اس مچھلی کی مناسبت سے بنگالی دوشیزہ یاد آرہی تھی۔

بس اسی طرح وہ کسی نہ کسی بہانے یاد آتی رہی۔ دراصل عورت خود کو دور رکھ کر اپنی اہمیت بہت زیادہ بڑھا دیتی ہے۔ اس کے متعلق نہ سوچنے کے باوجود محرومی کا احساس سوچنے پر مجبور کرتا رہتا ہے۔ ایسے وقت مجھے ایک لومڑی کی طرح سوچنا چاہیے تھا انگور کھٹے ہیں مگر وہ سر سے پاؤں تک میٹھی اور رس بھری تھی۔ میں اسے کھٹی کہہ کر دل کو جھوٹی تسلیاں نہیں دے سکتا تھا۔ میں نے فیصلہ کیا کہ اب تھوڑے تھوڑے پیسے بچاؤں گا۔ پانچ سو روپے جمع کرنے کے بعد اسے اپنے گھر لے آؤں گا۔

اس دن سے میں نے پیسے بچانے شروع کر دیئے۔ لیکن جو لوگ محدود آمدنی میں پیسے بچاتے ہیں وہی میرے حالات کو سمجھ سکتے ہیں کہ بچائے ہوئے پیسے اکثر ناگہانی ضرورتوں کی نذر ہو جاتے ہیں۔ چھ ماہ کے بعد جب میرے پاس ساڑھے تین سو روپے جمع ہو گئے تو میں اچانک ہی بیمار پڑ گیا۔ دکھ بیماری کے آگے کون رکاوٹیں کھڑی کر سکتا ہے وہ تو کسی وقت بھی آسکتی ہیں۔ میں چھ دن تک بیمار رہا۔ چھ دن تک ٹیکسی میرے دروازے پر کھڑی رہی۔ ایسا ہر ایک کے ساتھ ہوتا ہے کہ آمدنی رک جاتی ہے مگر ضرورتیں نہیں رکتیں۔ ٹیکسی کا مہاجن آکر ہفتہ واری قسط لے گیا۔ کچھ دواؤں اور انجکشنوں میں پیسے نکل گئے۔ بیماری سے اٹھ کر بہن کے گھر گیا تو بھانجے کی سالگرہ تھی، اسے کھلونوں کا تحفہ دے کر واپس آیا تو ٹیکسی کا گیئر بکس بیٹھ گیا تھا۔ جب اس کی مرمت کرانے کے بعد کمائی کے لیے نکلا تو اس وقت تک بچائے ہوئے ساڑھے تین سو روپے خرچ ہو چکے تھے اور میں دو سو روپیہ کا قرض دار بن چکا تھا۔ میں نے جھلا کر اپنی تقدیر کو پوری ایک درجن گالیاں دیں اور دل کو سمجھا لیا کہ اللہ میاں نے بیلا رانی کو میرے لیے پیدا نہیں کیا ہے۔ لیکن سمجھانے سے کیا ہوتا ہے جب میں ٹیکسی کے اڈے پر آیا تو جو سب سے پہلی سواری ملی وہ بیلا رانی تھی۔

وہ دستور کے مطابق پچھلی سیٹ پر آکر بیٹھ گئی۔ اس بار میں نے آئینے کا رخ نہیں بدلا۔ اس لیے کہ جو چیز حاصل نہ ہو اس سے کترانے کی کوشش کرنا دانشمندی ہے۔ بیلا رانی نے اگلی سیٹ کی طرف جھکتے ہوئے آہستگی سے پوچھا۔

''آج تم نے آئینے کا رخ نہیں بدلا؟''

میں نے چونک کر دیکھا۔ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

''عورت بظاہر خاموش رہتی ہے مگر وہ اپنے آس پاس سے گزرنے والوں کی ایک ایک حرکت کو سمجھتی ہے۔ جب میں شادی کی دوسری صبح اپنے میکے جا رہی تھی اسی وقت میں نے تمہاری شرافت کو بھانپ لیا تھا، تم آئینے میں مجھے بار بار دیکھ رہے تھے۔ اس روز بھی زیب النساء اسٹریٹ پر جب میں پچھلی سیٹ کا دروازہ کھول کر اندر آئی تو تم نے آئینے کا رخ میری طرف پھیر دیا۔ کیا میں غلط کہہ رہی ہوں؟''

میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔

''تم درست کہہ رہی ہو۔ جب پہلی بار تم دلہن بنی بیٹھی تھیں اور جب میں پہلی بار ایجاب و قبول کرنے کے لیے تمہارے پاس آیا تھا تو اسی وقت سے تمہارے حنائی ہاتھوں نے میرے خیالات بہکا دیئے تھے کہ تم ان ہاتھوں سے آگے بھی بہت دور تک حسین ہو۔ جب بات کھل ہی گئی ہے تو میں صاف طور سے کہہ دوں کہ میں تمہیں حاصل کرنا چاہتا ہوں۔ پچھلے کئی ماہ سے میں نے پانچ سو روپے جمع کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی ہے۔ میں ساڑھے تین سو روپے تک جمع کر چکا تھا لیکن اچانک ہی بیماری نے مجھے توڑ دیا۔ اب میں دو سو روپے کا قرض دار بن گیا ہوں۔ اس لیے اب میں تمہیں خیالوں کی دنیا میں حاصل کرتا ہوں اور جب خیال کا طلسم ٹوٹتا ہے تو میں بڑی ذہنی اذیتوں میں مبتلا ہو جاتا ہوں۔ کیا تم مجھے ان اذیتوں سے کسی طرح نجات دلا سکتی ہو؟''

اس نے جواب دیا ''پہلے تم اپنا قرض ادا کرو پھر پانچ سو روپے جمع کرو۔ میں اتنے بڑے شہر کے کسی بھی فٹ پاتھ پر مل جاؤں گی۔ ابھی مجھے پریٹ کلب جانا ہے۔ گاڑی آگے بڑھاؤ''۔

میں نے گاڑی آگے بڑھا دی۔ مجھے اس کی صاف گوئی پر بہت غصہ آ رہا تھا لیکن بزنس آخر بزنس ہے۔ اگر کوئی غریب آدمی میری ٹیکسی رکوا کر یہ کہے کہ وہ بیمار ہے، اس کے پاس پیسے نہیں ہیں اور میں اسے اسپتال پہنچا دوں تو میں کبھی اسے لفٹ نہیں دوں گا کیونکہ ٹیکسی لفٹ دینے کے لیے نہیں، کاروبار کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ وہ بھی لفٹ دینے کے لیے نہیں کاروبار کرنے کے لیے نکلی تھی۔ ایک کاروباری کی حیثیت سے مجھے اس کی بات کا برا نہیں ماننا چاہیے تھا مگر اس حقیقت سے کیسے انکار کیا جائے کہ مرد اپنی ناکامی برداشت نہیں کر سکتا۔

میں نے تہیہ کر لیا کہ بہت جلد پانچ سو روپے اس کے منہ پر ماروں گا۔ اس کے لیے میں دن رات ٹیکسی چلانے لگا۔ وقت گزرتا گیا، پیسے جمع ہوتے گئے اور ضرورتوں کے چور دروازوں سے نکلتے گئے۔ ہم سے اور آپ سے اگر پوچھا جائے کہ آمدنی کہاں جاتی ہے تو ہم اخراجات کا صحیح حساب نہیں بتا سکیں گے کیونکہ بہت سی ضرورتیں چوری چھپے آتی ہیں اور نقب لگا کر چلی جاتی ہیں۔

سال کے بعد سال گزرتا گیا۔ وہ مجھ سے ملتی رہی اور بچھڑتی رہی۔ تین سال کے بعد میرے پاس تین سو روپے جمع ہو گئے تھے۔ مجھے یہ معلوم کر کے بہت خوشی ہوئی کہ اس کا بھاؤ اک دم سے گر کر دو سو روپے پر آ گیا تھا۔ میں وقتی طور پر یہ بھول گیا تھا کہ جسموں کی منڈی میں بھاؤ ہمیشہ گرتا ہے کسی بھی حالت میں اوپر کی طرف نہیں جاتا۔

وہ پچھلی سیٹ پر آ کر بیٹھی تو میں نے اس کی طرف دیکھا وہ مرجھا گئی تھی۔ اس کے باوجود باسی پھول کی اڑی اڑی سی رنگت ابھی باقی تھی۔ اس پر میک اپ کا سلیقہ ایسا تھا کہ وہ کاغذی پھول کی طرح کھل گئی تھی اور کسی بدیسی سینٹ کی مہک نے اس میں اچھی خاصی کشش پیدا کر دی تھی۔ میں نے اسے دیکھتے ہی کہا میرے پاس ایک سو روپے ہیں حالانکہ جیب میں تین سو روپے تھے۔ بھاؤ گرتا رہے تو اور گرانا چاہیے۔ مجھے اس کا وہ غرور اب تک یاد تھا جب اس نے

مجھے طنزیہ انداز میں پانچ سو روپے جمع کرنے کے لیے کہا تھا۔ وہ سر جھکا کر بولی۔

''مجھے دو سو روپے کی سخت ضرورت ہے میرا چالان ہو گیا ہے، اگر صبح تک میں نے ڈیڑھ سو روپے تھانے میں نہیں پہنچائے تو وہ مجھے حوالات میں ڈال دیں گے''۔

''اچھا تو پھر ڈیڑھ سو لے لو''۔

''مجھے مزید پچاس کی سخت ضرورت ہے، میری لڑکی دوسری جماعت میں ہے۔ اس کے لیے نئی کتابیں خریدنی ہیں''۔

میں نے کہا ''اچھی بات ہے رات کے بارہ بجے اسی جگہ آ کر ملنا۔ میں دو سو روپے لے کر آؤں گا اور تمہیں ساتھ لے جاؤں گا''۔

اس نے کہا ''ابھی دس بجے ہیں۔ اس وقت بھی رات ہے، یہ دو گھنٹے کا انتظار میرے لیے عذاب بن جائے گا''۔

میں نے جیب سے سو سو کے نوٹ نکال کر دکھاتے ہوئے کہا۔

''میں پیسوں کے لیے مجبور نہیں ہوں، محلے والوں سے مجبور ہوں۔ وہاں بارہ بجے کے بعد سناٹا چھا جاتا ہے میں اسی وقت تمہیں وہاں لے جا سکتا ہوں۔ تم کبھی اس محلے کی عزت بن کر گئی تھیں بہت سے لوگ تمہیں پہچانتے ہیں''۔

''میں کسی سے نہیں ڈرتی مگر تم اس محلے میں رہتے ہو تمہیں ڈرنا چاہیے۔ اچھی بات ہے میں دو گھنٹے انتظار کر لوں گی''۔

یہ کہہ کر وہ ٹیکسی سے اتر گئی۔ میں وہاں سے آگے بڑھ گیا۔ میں نے اسے یہ نہیں بتایا تھا کہ جس گھر میں وہ بیاہ کر گئی تھی اب وہاں میری بہن رہتی ہے۔ چونکہ بہن کا سسرال بالکل گھر کے سامنے ہے اس لیے میں اسے چھپا کر اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا۔ میں نے سوچا دو گھنٹے بعد جب وہ میرے گھر آئے گی تو میں دو سو روپے اس کے منہ پر پھینک کر اسے بھی طعنے دوں گا کہ دیکھو تمہیں شرافت کی زندگی راس نہیں آئی۔ جس شریف احمد کو تم ٹھکرا کر چلی گئی تھیں آج میری بہن اسی شریف آدمی کی بیوی بن کر عزت کی زندگی گزار رہی ہے۔ میں سمجھتا تھا کہ میری یہ باتیں اس کے دل میں نشتر کی طرح اتریں گی۔

دو گھنٹے بعد جب میں اسی فٹ پاتھ پر پہنچا تو وہ وہاں موجود نہیں تھی۔ میں ٹیکسی روک کر سامنے والے ہوٹل میں چائے پینے چلا گیا۔ وہ میری ٹیکسی کو اچھی طرح پہچانتی تھی جب بھی وہاں آتی ٹیکسی کا دروازہ کھول کر بیٹھ جاتی۔ چائے پی کر میں ہوٹل میں سے باہر آیا تو ٹیکسی بدستور خالی تھی۔ مجھے اس پر غصہ آیا کہ پتہ نہیں کہاں مر گئی ہے۔ میں وہاں سے چرس کا ایک سگریٹ خریدنے کے لیے تھوڑی دور چلا گیا۔

جب میں سگریٹ کے کش لگاتا ہوا واپس آیا تو ٹیکسی خالی تھی۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ میں نے چاروں طرف دور دور تک نظریں دوڑائیں۔ مزید ایک گھنٹے تک انتظار کرتا رہا مگر وہ نہیں آئی۔ میں جھنجھلا کر گھر واپس آ گیا۔ چرس کا نشہ گھر کی تنہائی میں مجھے تڑپاتا رہا اور میں تڑپ تڑپ کر اسے گالیاں دیتا رہا۔ دوسری صبح میں دیر تک سوتا رہا۔ جب دوپہر کو ٹیکسی لے کر سڑک پر آیا تو اسی وقت فیصلہ کر لیا کہ اب وہ میری ٹیکسی میں بیٹھنا بھی چاہے تو نہیں بٹھاؤں گا۔ اسے دور ہی سے دھتکار دوں گا۔

رات کے نو بجے میں نے ٹیکسی کا میٹر باندھ دیا اور اسے دروازے کے سامنے کھڑی کر کے پینے چلا گیا۔ رات کے ایک بجے واپس آیا تو گھر کا دروازہ کھولتے وقت ٹیکسی کا پچھلا دروازہ بھی کھل گیا۔ وہ نیم تاریکی میں کھڑی

ہوئی تھی۔ میں نے اندھیرے کے باوجود اسے پہچان لیا۔ میں جو اسے دھتکارنا چاہتا تھا، اسے دیکھتے ہی سہم کر آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے گھر کے اندر لا کر دروازہ بند کر دیا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری بہن کے سسرال والے اسے دیکھ لیں۔ کمرے میں آنے کے بعد میں نے غصے سے پوچھا۔

''کل تم نے مجھے دھوکا کیوں دیا تھا؟''

''تمہارے جانے کے بعد مجھے تین سو والی ایک آسامی مل گئی تھی''۔

''تم اس طرح سر جھکا کر کہہ رہی ہو جیسے بہت مظلوم ہو مگر میں سمجھتا ہوں کہ تم کتنی مکار اور چالباز ہو۔ آج سے پانچ برس پہلے جب میں نے تمہاری آرزو کی تھی تو تم نے خالص کاروباری انداز میں مجھے ٹھکرا دیا تھا''۔

وہ بولی ''کاروبار آخر کاروبار ہوتا ہے۔ اس میں مکاری بھی ہوتی ہے اور چالبازی بھی۔ تم نے محبت سے تو میری تمنا نہیں کی تھی۔ تم عورت کو مشین بنا کر یہ توقع کیوں کرتے ہو کہ اس کے سینے میں بھی دل دھڑکتا ہوگا۔ کبھی میرے سینے میں دل دھڑکتا تھا کبھی میں تمنا کرتی تھی کہ کوئی مجھے محبت سے اپنائے، کوئی مجھے ٹائم ٹیبل کے مطابق ملنے والا کھانا نہ سمجھے۔ لیکن تم جیسے مرد نگاہوں کے ایکسرے سے صرف عورت کے لباس کے اندر جھانکتے ہو۔ اس سینے میں کتنا خوبصورت دل ہے یہ کبھی نہیں سمجھتے۔ جب مجھے فٹ پاتھ پر لے آئے ہو تو پھر میرے کاروباری لہجے کا برا کیوں مانتے ہو؟ یہ دیکھو میں کاروبار میں کتنی دیانت دار ہوں۔ کل مجبور ہو گئی تھی، آج اس کی تلافی کے لیے آ گئی ہوں۔ یہ نہ سمجھو کہ میں تمہارے عشق میں گرفتار ہوں یا اپنی ضرورتوں سے مجبور ہو کر یہاں آئی ہوں، میں نے کاروباری مصلحتوں کو پیش نظر رکھا ہے اگر انکار کرو گے تو واپس چلی جاؤں گی''۔

اس کی باتیں سن کر میں نرم پڑ گیا۔ وہ درست کہہ رہی تھی۔ کاروبار میں انکار و قرار کی تکرار ہوتی ہی رہتی ہے۔ مجھے برا نہیں ماننا چاہیے تھا۔ میں نے جیب سے دو سو روپے نکال کر اس کی طرف بڑھا دیئے۔ وہ روپے لے کر اپنے پرس میں رکھنے لگی۔ یہ وہی پرس تھا جسے میں نے پہلی بار زیب النساء اسٹریٹ پر دیکھا تھا۔ شاید اس سے دو سال پہلے بھی یہ پرس اس کے ساتھ رہا ہوگا۔ جب وہ اس راستے پر آئی تھی، وہ پرس بھی اس کے ساتھ آیا تھا اور اس کی طرح رفتہ رفتہ پرانا ہوتا جا رہا تھا۔ اس میں جو رنگ برنگے نگ جڑے ہوئے تھے وہ جگہ جگہ سے اکھڑ گئے تھے۔ آدمی کی جیب ہو یا پرس وہ اپنی آمدنی کے مطابق ہلکا ہوتا اور مرجھاتا جاتا ہے۔

میں اپنی عادت سے مجبور ہوں۔ طنز کا موقعہ آئے تو ہاتھ سے نہیں جانے دیتا۔ میں نے طنزیہ انداز میں کہا۔

''یہ پرس شاید اس وقت بھی تمہارے ساتھ رہا ہوگا جب تم پہلی بار دلہن بن کر اس سامنے والی مکان میں آئی تھیں؟''

اس نے پلٹ کر کھڑکی کی طرف دیکھا۔ کھڑکی بند تھی لیکن چشم تصور میں وہ مکان نظر آ گیا جہاں وہ دلہن بن کر گئی تھی۔ اس نے نفرت سے ہونٹ سکوڑ کر کہا۔

''اس مکان کی بات نہ کرو وہ جگہ جہنم سے بدتر ہے''۔

میں نے حقارت سے کہا۔

''کیا آج کل تم جنت میں زندگی گزار رہی ہو؟ خبردار اس مکان کو جہنم نہ کہنا کیونکہ وہ میری بہن کی جنت ہے۔ جہاں تم شرافت سے نہیں رہ سکیں وہاں میری بہن عزت و آبرو سے زندگی گزار رہی ہے''۔

اس نے حیرانی سے آنکھیں پھاڑ کر مجھے دیکھا پھر دھپ سے چارپائی پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''کیا تم نے اپنی بہن کو وہاں بیاہ دیا؟ یہ کب کی بات ہے؟''

''جب تمہیں طلاق دی گئی تھی، اس کے چھ ماہ بعد میری بہن اس گھر کی عزت بن گئی۔ اس کی شادی کو ساڑھے چھ برس گزر گئے ہیں''۔

''تعجب ہے'' اس نے حیرانی سے کہا ''اب تک تمہاری بہن کو میری طرح فٹ پاتھ پر آجانا چاہیے تھا''۔

میں چیختے چیختے سنبھل گیا۔ رات کے سناٹے میں میری آواز بہن کے سسرال تک پہنچ سکتی تھی۔ وہ تلخی سے مسکراتی ہوئی بولی۔

''تم سمجھ دار ہو۔ اچھا ہوا خود ہی غصے کو ضبط کرلیا۔ مجھے بھی افسوس ہے کہ میں نے تمہاری بہن کے متعلق ایسی بات کہہ دی۔ میں کیا کروں؟ میں بھی زخم کھائی ناگن کی طرح تڑپتی ہوں اور جو بھی سامنے آجائے اسے ڈس لینا چاہتی ہوں۔ پہلے میں ایسی نہیں تھی۔ پہلے میں سمجھتی تھی کہ عورت کو صرف محبت ملتی ہے۔ نفرت بھی ملے تو وہ اسے محبت میں بدل دیتی ہے۔ بہت پہلے جب میں سولہ برس کی تھی تو میری زندگی میں ایک نوجوان آیا۔ وہ بہت خوبصورت تھا۔ اسے دیکھ کر اس کی عبادت کرنے کو جی چاہتا تھا۔ میں اپنی خوش قسمتی پر ایک دم سے پاگل ہوگئی۔ اس کی خوبروئی اور اس کی شخصیت کے سامنے اپنی ذات کو گم کر دیا۔ محبت میں ایسا ہوتا ہے کہ عورت اپنے آپ کو مار کر صرف اپنے محبوب کی شخصیت کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ اس کے بعد وہ کچھ اور بننے کی تمنا نہیں کرتی۔ مگر بہت جلد محبت کا یہ سپنا ٹوٹ گیا۔ وہ اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکہ چلا گیا۔ سات سمندر پار جانے کے بعد وہ کہاں گم ہوگیا، میں نہیں جانتی۔ لیکن اس وقت تک میری معصومیت، میرا اکنوارا پن سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔ صرف محبت کی تلخ اور شیریں یادیں رہ گئی تھیں۔ میں نے سوچا تھا کہ انہی یادوں کے سہارے زندگی گزار دوں گی لیکن والدین میرے جذبات کو نہیں سمجھ سکتے تھے۔ جوان لڑکی بیاہی نہ جائے تو وہ سوسائٹی میں سر اٹھا کر نہیں چل سکتے۔ وہ میری شادی کی فکر کرنے لگے۔ انہی دنوں مشرقی پاکستان میں ہنگامے شروع ہوگئے۔ میں نہیں جانتی کہ کون بنگالی اور کون بہاری ہے۔ اس ہنگامے میں جو لوگ میرے باپ کو قتل کر کے مجھے اٹھا کر لے گئے تھے ان کا تعلق انسان کی کسی قوم سے یا کسی ذات سے نہیں تھا۔ میرے والدین بہاری ہیں لیکن میں پیدائشی طور پر بنگالی ہوں کیونکہ بنگال میں میرا جنم ہوا ہے۔ اس ہنگامے میں ایک بار بنگالیوں کا پلہ بھاری ہوا۔ دوسری بار بہاریوں کا پلہ بھاری ہوگیا۔ جب مجھے بنگالی اٹھا کر لے گئے تو انہوں نے مجھے بہاری لڑکی سمجھ کر میری عزت کو کھلونا بنا دیا کیونکہ وہ میرے بہاری والدین کی مناسبت سے مجھے جانتے تھے۔ جب بہاریوں نے میری عزت لوٹی تو میں ان کی نظروں میں بنگالی تھی کیونکہ میں نے بنگلہ میڈیم سے تعلیم حاصل کی ہے۔ میں بنگالی زبان روانی سے بولتی ہوں اردو اچھی طرح نہیں بول سکتی''۔

وہ ایک گہری سانس لے کر ذرا دیر کے لیے چپ ہوئی پھر آنسوؤں سے بھیگی آواز میں کہا۔

''میں کسے الزام دوں؟ کوئی پاکستانی ہوتا تو میں اس کی طرف انگلی اٹھا کر اسے شرم دلاتی۔ وہاں سے یہاں تک میں نے یہی دیکھا کہ سب بنگالی، بہاری، پنجابی، سندھی اور سرحدی ہیں اور فٹ پاتھ کی دنیا میں یہ تو میں بھی نہیں ہیں، صرف دلال اور گاہک ہیں۔ پاکستانی کہیں سو رہے ہیں۔ میں کیسے بتاؤں کہ مجھے فٹ پاتھ پر کون لایا ہے؟''

میں نے کہا ''کوئی بھی لایا ہو لیکن جب تمہیں شرافت کی زندگی گزارنے کا موقع ملا تو تم نے دلہن بننے کے بعد بھی اس زندگی کو ٹھکرا دیا''۔

''ہاں میں دلہن بنی تھی اس لیے کہ ہر عورت کے دل میں دلہن بننے اور پھر ماں بننے کا ارمان ہوتا ہے۔ اس

کی آنکھوں میں ایک خیالی جنت کا خواب ہوتا ہے، میں اپنی آنکھوں میں ایک خواب سجا کر اس سامنے والے گھر میں سہاگ کی سیج پر آئی تھی۔ اس رات میرے خواب پورے ہوگئے۔ میں نے دیکھا کہ میرا شوہر ادھیڑ عمر کا آدمی ہے مگر بہت محبت کرنے والا ہے۔ اس نے مجھے بہت پیار کیا۔ میں نے اب تک اپنی زندگی میں درندے دیکھے تھے جو عورت کی مرضی کے خلاف اسے چھین لیتے ہیں مگر اس نے بڑی محبت سے میرے وجود کے ذرے ذرے کو حاصل کرلیا''۔

''پھر تم نے ایسی محبت بھری زندگی کو کیوں چھوڑ دیا؟''

اس نے گہری نظروں سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔

''میں بتاتی ہوں، تم بیچ میں نہ بولو۔ صبح چار بجے تک میں اس کی آغوش میں رہی پھر وہ غسل کر کے نماز پڑھنے چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد میری ساس میرے پاس آئی اس نے بڑی محبت سے میرا ہاتھ تھام کر بڑی لجاجت سے کہا۔

''بیلا رانی، اب تم اس گھر کی عزت ہو اس لیے تمہیں بھی اس گھر کی عزت کا خیال رکھنا ہوگا۔ میرا بیٹا شریف احمد شادی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ جب سے وہ جوان ہوا تھا ہم اس کے لیے فکر مند تھے کہ گھر میں بہو کیسے آئے گی۔ نہیں آئے گی تو لوگ میرے بیٹے کا مذاق اڑائیں گے کہ وہ شادی کے قابل نہیں ہے۔ میں کسی طرح اس کی شادی کرنا چاہتی تھی یوں سمجھو کہ میں اس کی مردانگی کا بھرم رکھنا چاہتی تھی۔ لیکن وہ تیس برس کا ہوگیا اور مسلسل شادی سے انکار کرتا رہا تو میرے خاوند نے ایک تجویز پیش کی۔ وہ تجویز ایسی تھی کہ میرے بیٹے کی لاج رہ جاتی لیکن میں ایک عورت ہو کر اس تجویز کو کبھی پسند نہیں کرسکتی تھی۔ پہلے میرے خاوند نے مجھے بہت سمجھایا پھر مجھے اور میرے بیٹے کو مارنے پیٹنے لگا۔ میں اپنے اوپر ظلم برداشت کرسکتی تھی لیکن آئے دن بیٹے کو لات جوتے کھاتے نہیں دیکھ سکتی تھی۔ مجھے ڈر تھا کہ وہ ایک دن اسی طرح میرے بیٹے کو مار ڈالے گا۔ آخر میں نے مجبور ہو کر اس کی بات مان لی اور یہ شادی ہوگئی۔ ابھی تمہارے ساتھ جو رات گزار کر نماز پڑھنے کے لیے گیا ہے وہ میرا خاوند نعیم احمد تھا......''

میں لڑکھڑا کر یک بیک یوں پیچھے چلا گیا جیسے بیلا رانی نے مجھے زور کا طمانچہ مارا ہو اور اس کے ساتھ ہی میرے منہ پر تھوک دیا ہو۔ اس وقت میرا سر گھوم رہا تھا۔ شراب کے نشے میں تو گھومتا ہی ہے لیکن حالات کے حرامی نشے نے میرے سارے وجود کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔ یہ ہم سب کیسی حرامی زندگی گزار رہے ہیں۔ فٹ پاتھ سے لے کر شریف گھرانوں کے آنگنوں تک ہم کیسی دوغلی حرکتیں کر رہے ہیں اور اس کے ساتھ ہی اپنی نورانی پیشانی پر سجدوں کا داغ بنائے نماز پڑھنے بھی جاتے ہیں۔ اس وقت میری نگاہوں کے سامنے بیلا رانی نہیں، شمشاد سہاگ کی سیج پر بیٹھی ہوئی تھی اور ایک بچے کو گود میں کھلا رہی تھی۔

وہ کس کا بچہ ہے؟ چاروں طرف سے ایک ہی سوال گونج رہا تھا۔ وہ بچہ کس کا ہے؟

وہ بچہ کسے اپنا باپ کہے گا؟ جو دادا ہے، اسے باپ کہے گا جو باپ ہے اسے سوتیلا بھائی کہے گا۔ جو بہو ہے وہ بیوی ہے جو بیوی ہے وہ سوتیلی ماں بن گئی ہے۔ اخ تھو۔ ہم اس دنیا میں کیسے کیسے رشتوں کی کھچڑیاں پکا کر کھاتے ہیں، ہضم کرتے ہیں اور ڈکار لے کر فخر کرتے ہیں کہ ہم انسان ہیں۔

میں چکرا کر گر پڑا۔ مجھے صرف اتنا ہوش ہے کہ بیلا رانی مجھے سہارا دے کر چارپائی پر لے آئی تھی۔ میں غصے، نفرت اور توہین کے احساس سے کانپ رہا تھا۔ میری نس نس میں شرارے سلگ رہے تھے۔ میری حالت ایسی تھی جیسے کوئی خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار کر تکلیف سے تڑپ رہا ہو۔ میں اپنے ہاتھوں اپنی بہن کے گاہک کا گریبان نہیں پکڑ

سکتا تھا کیونکہ اس میں میری بہن کی بدنامی تھی، وہ اپنے بچے کے ساتھ دنیا والوں کے سامنے تماشہ بن جاتی۔
میں سڑکوں پر ٹیکسی چلانے والا اور فٹ پاتھ کی زندہ ٹیکسیوں کو اپنے منافع کی انگلیوں پر نچانے والا مداری اپنی بہن کو اس سطح پر ناچتے ہوئے نہیں دیکھ سکتا تھا۔ جب اپنی انگلی کٹتی ہے تو پتہ چلتا ہے کہ دوسروں کا گلا کیسے کٹتا ہے۔ اس وقت میں چاہتا تھا کہ کسی طرح میری آنکھوں سے آنسو نکل جائیں اور میں پھوٹ پھوٹ کر رونا شروع کردوں مگر نہ جانے آنسو میرے پتھریلے وجود کے اندر کہاں چھپے ہوئے تھے۔ یہ کب جاگیں گے اور کب میری پلکوں کی دہلیز تک آئیں گے۔ میں زندگی کے ہر درد و کرب سے گزرتا ہوں مگر آنسو میری بے حیا آنکھوں میں نہیں آتے۔
جب آنسو نہیں نکلے تو اندر کا سارا غبار بخار کی صورت میں ابھر آیا۔ بیلا رانی نے مجھے چھو کر کہا۔
''تمہیں تو بخار چڑھ رہا ہے۔ کیا میں ڈاکٹر کو بلاؤں؟''
میں نے انکار میں سر ہلایا۔ اس نے میرے جوتے اتار دیئے اور دوسرے کمرے سے لحاف لا کر مجھ پر ڈال دیا۔ لحہ بہ لحہ بخار تیز ہوتا جا رہا تھا اور میں بڑبڑاتا جا رہا تھا کہ مجھے ہوش بھی تھا۔ بیلا رانی میرے قریب تھی۔ اس نے کہا۔
''میرے پاس اسپرو کی دو ٹکیاں ہیں انہیں کھالو''۔
پتہ نہیں اس نے مجھے اسپرو کی دو گولیاں کیسے کھلائیں۔ اس وقت مجھے بیلا رانی جیسی عورتوں کے پرس یاد آرہے تھے جن میں بی سی ٹیبلٹ ہوتی ہیں، جن میں اسپرو کی ٹکیاں ہوتی ہیں۔ جن میں خواب آور گولیاں ہوتی ہیں، جن میں ان کے ہر زخم کا علاج ہوتا ہے۔ کاش کہ میری بہن کے پرس میں بھی کوئی ایسی ٹکیہ ہوتی جسے نگل کر وہ ہمیشہ کی نیند سو جاتی مگر میرے سوچنے سے میری بہن نہیں مر سکتی تھی اور میری دنیا کی بے حیائی نہیں مر سکتی تھی۔ اسے مارنے کے لیے مجھ جیسے لوگوں کو مرنا پڑے گا لیکن میں کیسے مر سکتا ہوں۔ اپنی زندگی کسے عزیز نہیں ہوتی۔ اگر مجھ جیسے لوگ اتنی جلدی، اتنی آسانی سے مر جاتے تو بیلا رانی جیسا پھول پیار کے گلدان میں سجنے کی بجائے سماج کے اگالدان میں نہ چلا جاتا۔
صبح تک میں بخار میں پھنکتا رہا۔ بیلا رانی میرے پاس رہی حالانکہ اسے چلا جانا چاہیے تھا۔ جب اس کا خریدنے والا بیمار تھا اور اسے اپنے استعمال میں نہیں لا سکتا تھا تو ایسی صورت میں ہمارے درمیان کوئی جھوٹا رشتہ بھی نہیں رہ جاتا تھا۔ وہ میرے گھر سے جا سکتی تھی لیکن اس وقت میں نے سوچا کہ وہ صبح تک رہ کر میری تیمارداری کے فرائض انجام دے کر دو سو روپے وصول کرنا چاہتی ہے۔ دو سو روپے کی رقم بہت بڑی ہوتی ہے وہ صبح تک میرے پاس رہ کر کہہ سکتی تھی۔
''سودے کے مطابق میں نے تمہارے ساتھ رات گزاری ہے اب اگر تم مجھے ہاتھ نہیں لگا سکے تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے''۔
لیکن صبح ساڑھے چار بجے جب اذان کی آواز آنے لگی تو اس نے اپنا پرس کھولا اور اس میں سے دو سو روپے نکال کر میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔
''ہمارا سودا مکمل نہ ہو سکا۔ تم نے مجھ سے میری قیمت وصول نہیں کی اس لیے میں یہ روپیہ نہیں لے سکتی''۔
یہ کہہ کر اس نے سو سو کے دو نوٹ میرے سرہانے رکھ دیئے اور پرس بند کر کے اپنی جگہ سے اٹھتی ہوئی بولی۔
''ابھی اندھیرا ہے، مجھے یہاں سے نکل جانا چاہیے۔ اگر نعیم احمد نے دیکھ لیا تو میرا کچھ نہیں بگاڑے گا اس کا سر میرے سامنے شرم سے جھکے گا بشرطیکہ اسے شرم آجائے لیکن تم اس کے سامنے سر نہیں اٹھا سکو گے کیونکہ وہ تمہارا اصلی بہنوئی ہے''۔

یہ کہہ کر وہ کمرے سے باہر چلی گئی۔ مجھے نعیم احمد کا ڈر نہیں تھا۔ میں صرف محلے والوں سے ڈرتا تھا کہ کہیں کوئی اسے دیکھ نہ لے۔ اس خیال سے میں نے اپنے بستر کے سرہانے کی طرف سے ذرا اٹھ کر لائٹ آف کر دی اور سرہانے کی کھڑکی کھول دی۔ کھڑکی کا پردہ پڑا ہوا تھا اور کمرے میں اندھیرا تھا۔ باہر سے کوئی مجھے دیکھ نہیں سکتا تھا، میں باہر کا منظر دیکھ سکتا تھا۔ اس وقت گلی ویران تھی صرف ایک کتا چہل قدمی کر رہا تھا۔ لیکن جس وقت بیلا رانی میرے مکان کا دروازہ کھول کر باہر نکلی اور چند قدم آگے بڑھی اسی وقت سامنے میری بہن کے مکان کا دروازہ کھلا۔ نعیم احمد سر پر ٹوپی رکھتے ہوئے نماز پڑھنے کے لیے مسجد کی طرف جانے والا تھا۔ ہم دونوں کے مکان کے درمیان تقریباً بارہ گز کا فاصلہ تھا، اتنے قریب سے وہ بیلانی رانی کو دیکھتے ہی ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ بیلا رانی بھی رک کر اسے دیکھنے لگی۔

پہلے تو نعیم احمد نے میرے گھر کے دروازے کی طرف دیکھا۔ اسے توقع تھی کہ شاید میں نظر آؤں گا۔ پھر اس نے کھڑکی کی جانب دیکھا میں تاریکی میں پردے کے پیچھے تھا اسے نظر نہ آ سکا پھر اس نے محتاط نظروں سے اپنے چاروں طرف دیکھا، جب اسے اطمینان ہو گیا کہ کسی طرف سے بدنامی کا چھینٹا اڑ کر اس کے اجلے دامن تک نہیں آ سکے گا تو وہ بیلا رانی سے نظریں ملا کر اپنی مختصر سی داڑھی پر ہاتھ پھیرتے ہوئے معنی خیز انداز میں مسکرانے لگا۔

بیلانی رانی کی پشت میری جانب تھی اس لیے میں اس کے چہرے کے تاثرات نہ دیکھ سکا۔ ویسے میرا خیال تھا کہ وہ نفرت کا اظہار کرے گی اور اس کمبخت پر تھوک کر چلی جائے گی لیکن وہ اپنی کمر پر ہاتھ رکھے ایک ادائے ناز سے کھڑی ہوئی تھی۔ اس نے ایک جھٹکے سے اپنی ساڑھی کا آنچل ڈھلکا دیا پھر سینہ تان کر ایک ہاتھ سے پرس جھلاتی ہوئی لچکتی اور بل کھاتی ہوئی نعیم احمد کی طرف بڑھنے لگی۔

اسے اپنی طرف آتے دیکھ کر نعیم احمد ایک دم سے بوکھلا گیا اور بدک کر مسجد کی طرف تیز قدموں سے جانے لگا۔ اسے بھاگتے دیکھ کر بیلا رانی وہاں سے پلٹ گئی پھر کھڑکی کے پاس آ کر آہستگی سے بولی۔

''بس مرد کی مردانگی یہی تک ہوتی ہے۔ تم لوگ عورت کے سامنے صرف تنہائی کے مرد میدان ہو۔ تنہائی سے باہر اسی عورت سے سامنا ہو جائے تو خدا یاد آ جاتا ہے۔ تمہارا دوغلا بہنوئی اللہ میاں کے پاس پناہ لینے گیا ہے''۔

وہ ہنستی ہوئی اور پرس جھلاتی ہوئی مجھ سے دور ہوتی چلی گئی۔ میں اتنی دیر بیٹھنے کی وجہ سے تھک گیا تھا، نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑا۔ ایک رات کے بخار نے مجھے بہت کمزور بنا دیا تھا۔ نہیں میں غلط کہہ رہا ہوں اس دنیا کی زہریلی سچائی نے مجھے اندر سے توڑ پھوڑ کر رکھ دیا تھا۔

مجھے بیلا رانی کی زہریلی ہنسی پر غصہ نہیں آیا۔ میں نعیم احمد کو دیکھ کر جھلا گیا تھا۔ میرے جی میں آیا تھا کہ میں دوڑتا ہوا باہر جاؤں اور اس کا گلا دبا دوں۔ لیکن میرے ہاتھ بہت کمزور ہو گئے تھے کیونکہ میں نے نادانستگی میں ان ہی ہاتھوں سے اپنی بہن کو اس کے عشرت کدے میں بھیجا تھا۔ مجھے سنجیدگی سے یہ فیصلہ کرنا تھا کہ اب وہ ایسی شرمناک زندگی نہ گزارے گی۔ یہ فیصلہ کرنے کے لیے میں بہن کے دروازے تک نہیں جا سکتا تھا کیونکہ بستر پر اٹھ کر بیٹھتے وقت اب میرا سر چکرانے لگا تھا۔ میں بہت دیر تک اندر ہی اندر کڑھتا رہا اور خیال ہی خیال میں نعیم احمد کو قتل کرتا رہا۔ آدھے گھنٹے کے بعد نعیم احمد زیر لب مقدس آیتیں پڑھتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے سے پریشانی ظاہر تھی اور میرے چہرے سے غصہ ظاہر ہو رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھتے ہی کہا۔

''تمہارے دیکھنے کا انداز بتا رہا ہے کہ بیلا رانی تمہیں سب کچھ بتا چکی ہے''۔

میں نے غصے کی حالت میں تھوک اڑاتے ہوئے کہا۔

''ہاں وہ مجھے بتا چکی ہے کہ اب تم کتنے بڑے شیطان ہو۔ مجھے بیماری سے اٹھنے دو، میں تمہیں زندہ نہیں چھوڑوں گا''۔

وہ ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا۔

''اچھا ہی ہوا کہ تم بیمار ہو۔ نہ زیادہ چیخ سکتے ہو نہ مجھ پر ہاتھ اٹھا سکتے ہو۔ اس طرح میں سکون سے کچھ باتیں کرسکوں گا۔ ابھی بیلا رانی کو تمہارے کمرے سے نکلتے دیکھ کر میں بہت پریشان ہوگیا تھا۔ میں یہ بھول گیا تھا کہ ٹیکسی ایک چوراہا ہے جہاں سے شہر کا ہر آدمی ایک بار ضرور گزرتا ہے۔ ٹیکسی میں شریف عورتیں بھی سفر کرتی ہیں اور بازاری بھی۔ مجھے بہت پہلے پتہ چلا گیا تھا کہ بیلا رانی بازاری بن چکی ہے مگر تمہیں اپنی ٹیکسی میں اسے یہاں نہیں لانا چاہیے تھا''۔

''میں کسی کو بلانے نہیں جاتا سواریاں خود ہی ہاتھ اٹھا کر مجھے بلاتی ہیں۔ اچھا ہوا کہ وہ آگئی اور اس نے تمہارے شیطانی چہرے کو ننگا کردیا۔ اگر تم اپنی خیریت چاہتے ہو تو ابھی میری بہن کو یہاں لے آؤ''۔

''تمہاری بہن جہاں ہے، اسے وہیں رہنے دو۔ اسی میں ہم دونوں کی بھلائی ہے۔ تم مجھ پر ہاتھ اٹھاؤ گے یا مجھے بدنام کرنا چاہو گے تو میرے ساتھ تمہاری بہن بھی بدنام ہوگی۔ شریف احمد ایک آہنی پردہ ہے جس کے پیچھے تمہاری شریف بہن عزت کی زندگی گزار رہی ہے''۔

میں نے غصے سے چیخ کر کہا۔

''ایسی باتیں نہ کرو۔ میں تمہیں جان سے مار ڈالوں گا''۔

''شیدے! غصہ کرنے سے پہلے یہ سوچو کہ شادی سے پہلے تمہاری بہن ماں بننے والی تھی۔ اتنی بڑی دنیا میں ایک میں ہی ہوں جس نے تمہیں بدنامی سے بچایا ہے۔ اگر میں اس گناہ کی گٹھڑی کو اپنے گھر نہ لاتا تو کیا اس وقت بھی تم اسی طرح چیخ چیخ کر کہہ سکتے تھے کہ تمہاری بہن بدکار ہے۔ نہیں ایک بھائی اپنی زبان سے اپنی بہن کے لیے ایسی باتیں نہیں کہہ سکتا اور آج بھی تم ایسی بات نہیں کہہ سکتے۔ اگرچہ وہ آج بھی بدکار ہے مگر باسی مٹھائی پر پڑے ہوئے چاندی کے ورق کی طرح وہ چمکیلی اور عزت دار زندگی گزار رہی ہے۔ اس عزت کی چمک کے پیچھے وہ کیا ہے؟ میں کیا ہوں؟ وہ کیسی ہے؟ میں کیسا ہوں؟ یہ نہ دیکھو۔ تم کیوں اور کیسے کا نشتر لے کر نکلو گے تو یہ ساری دنیا تمہیں بڑی گھناؤنی نظر آئے گی''۔

''میں تمہاری ان فضول باتوں کو سمجھنا نہیں چاہتا۔ تم ابھی جاؤ اور میری بہن کو یہاں پہنچا دو''۔

وہ اپنی جگہ سے اٹھتا ہوا بولا۔

''میں خوب سمجھتا ہوں کہ تم ٹیکسی چلاتے وقت دوسروں کی بہنوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ پہنچاتے ہو۔ انہیں ان کے گھر بھی واپس لے آتے ہو۔ میں بھی تمہاری بہن کو تمہارے گھر پہنچا دوں گا''۔

یہ کہہ کر وہ کمرے سے چلا باہر گیا۔ اس کی باتیں میرے سینے میں خنجر کی طرح اتر رہی تھیں۔ میں جو کچھ کرتا رہا اب وہی میرے سامنے آیا۔ کیا اتنے شرمناک واقعے کے بعد مجھے عبرت حاصل ہوسکتی تھی؟

ہاں عبرت حاصل ہوئی لیکن میں کس طرح شرافت کی زندگی گزار سکتا تھا اور دوسروں کو گمراہی سے بچا سکتا تھا؟ کیا بیلا رانی جیسی عورتیں میری ٹیکسی میں آکر بیٹھیں تو میں انہیں نصیحتیں شروع کردیتا؟ نیک ہدایت دینے والے اس دنیا میں بہت ہیں لیکن نیکی پھر بھی کہیں نہیں ہے۔ بیلانی رانی کو اپنی ٹیکسی میں نہیں بٹھاؤں گا تو اس کے لیے ہزاروں

ٹیکسیوں کے دروازے کھلے ہیں، بیلا رانی توبہ کرکے شریفوں کی دنیا میں آئے گی تو پھر کوئی شریف آدمی غیر شرعی دین مہر ادا کرکے ایک عورت کی کمزوری سے فائدہ اٹھائے گا۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لمحے یہ بات میری سمجھ میں آگئی۔ میں آپ کو بھی سمجھاتا ہوں اور میں اس دنیا کے ہادی اور مصلحین کو بھی سمجھاتا ہوں کہ تم اب تک غلطی سے چوروں، بدمعاشوں اور غلط کاروں کو سمجھاتے آئے ہو۔ دراصل تمہیں شریف آدمیوں کو سمجھانا چاہیے کیونکہ اس دنیا کی زیادہ سے زیادہ غلاظتیں شریف گھرانوں کی دہلیز سے نکل کر فٹ پاتھ پر آتی ہیں۔

نعیم احمد جلدی ہی شمشاد کو لے کر میرے پاس آگیا۔ شمشاد اپنے چار برس کے لڑکے کو اٹھائے دروازے پر آکر کھڑی ہوگئی مگر میرے کمرے کے اندر نہیں آئی۔ اس کا جھکا ہوا سر بتا رہا تھا کہ اسے تمام حالات کا علم ہو چکا ہے۔ میں نے اسے دیکھتے ہی غرا کر کہا۔

''شمشاد تم اندر آؤ اور اس خبیث کو باہر جانے دو اگر میں بستر سے اٹھنے کے قابل ہوتا تو اسے دھکے دے کر گھر سے باہر نکال دیتا''۔

شمشاد اندر نہیں آئی۔ نعیم احمد باہر نہیں گیا۔ اس نے کہا۔

''شیدے، تو احمق ہے، کیا تو نے نہیں دیکھا کہ بیلا رانی میری زندگی سے نکل کر کہاں پہنچی ہے؟ تو اپنی بہن کو میری زندگی سے نکال کر کہاں پہنچانا چاہتا ہے؟ اس معاشرے میں تیری کون سی عزت ہے کہ تو اس عزت کا تھوڑا سا حصہ بہن کو دے سکے گا؟ اگر حقیقت کی نظر سے دیکھے گا تو یہ شمشاد، بیلا رانی کی سطح پر زندگی گزار رہی ہے۔ ایسے وقت عقل کی ضرورت ہوتی ہے۔ اگر اپنی آنکھوں میں کوئی عیب ہو تو تاریک شیشوں کی عینک لگا کر اسے چھپایا جاتا ہے۔ اس طرح سیاہ چشمے سے گورے چہرے کا حسن بھی بڑھ جاتا ہے۔ ہر برائی کو چھپانے کے لیے ایک خوبصورت نقاب کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس محلے میں جو میری شہرت جو میری عزت ہے اس سے زیادہ خوبصورت نقاب تیری بہن کو نہیں مل سکتا۔ اچھی طرح سوچ لے تو شمشاد کو مجھ سے چھین کر اس کی زندگی برباد کر دے گا''۔

وہ جھوٹی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے بڑی عمدہ تجویز پیش کر رہا تھا۔ یہ بات بھی گھر کی چار دیواری سے باہر نہیں گئی تھی اگر میں خاموش رہتا تو یہ راز یہیں دفن ہو جاتا اور ہم سب سماج کے عزت دار افراد کی طرح پھر سے زندگی گزارنے لگتے۔ میں نے شمشاد کو سوالیہ نظروں سے دیکھا، وہ پہلی بار بولی۔

''مجھے اس راہ پر لانے والا ایک معلم، ایک پروفیسر تھا۔ جب تعلیم دینے والے ایسی راہوں پر لگا دیں تو ایک کے بعد دوسری راہیں کھلتی جاتی ہیں۔ مجھے دوسری راہ کا یہ رہبر ملا۔ یہ میرا مجازی خدا نہیں ہے۔ مجازی کا مطلب جھوٹا اور فرضی ہے تو یہ پھر میرے جسم و جان کا جھوٹا خدا ہے۔ اس کے بعد میں کسی تیسرے کے ہاتھ میں نہیں جانا چاہتی۔ میں جہاں ہوں مجھے وہیں پڑا رہنے دو۔ یوں بھی اب میں صرف تمہاری بہن نہیں ہوں، اپنے اس بچے کی ماں بھی ہوں۔ یہ دنیا والوں کے لیے ناجائز سہی لیکن بچہ کبھی ماں کے لیے ناجائز نہیں ہوتا۔ میں اس بچے کی زنجیر سے نعیم احمد کے ساتھ بندھ چکی ہوں۔ تم مجھے بھول جاؤ۔ ہو سکے تو یہ گھر اور محلّہ چھوڑ کر چلے جاؤ۔ میں نہیں چاہتی کہ اب ہماری نگاہیں ملیں۔ کم از کم بھائی بہن کی آنکھوں میں تو اتنی حیا ہو کہ وہ بدکار زندگی کے آئینے میں ایک دوسرے کو نہ دیکھ سکیں''۔

یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ حیا کی بات آئی تو مجھے خیال آیا کہ جب سے وہ دروازے پر آئی تھی اس نے ایک بار بھی مجھ سے آنکھ نہیں ملائی تھی اور تب یہ بات بھی سمجھ میں آئی کہ جنہیں ہم گناہ گار سمجھتے ہیں وہ ہمارے تمہارے سامنے لباس

تو ضرور کھولتی ہیں لیکن حیا سے آنکھ نہیں کھولتیں۔ اتنی بڑی دنیا میں اگر شرم کہیں ہے تو صرف عورت کی آنکھ میں ہے۔

O☆O

کبھی کبھی میری ٹیکسی جرائم کا اڈہ بن جاتی ہے۔ رات کے وقت گرومندر سے سواری اٹھا کر آگے بڑھا تو لسبیلہ کے چوراہے پر چاروں طرف سے پولیس کی گاڑیوں نے میری ٹیکسی کو گھیر لیا۔ پچھلی سیٹ پر بیٹھے ہوئے تین آدمیوں نے ٹیکسی سے نکل کر بھاگنے کی کوشش کی لیکن پکڑ لیے گئے۔ میری ٹیکسی کی اگلی اور پچھلی سیٹ کے درمیان ایک بڑا سا تھیلا رکھا ہوا تھا۔ پولیس والوں نے جب مجھے بھی ہتھکڑی پہنائی تو پتہ چلا کہ اس تھیلے میں چرس بھری ہوئی تھی۔ میں نے تھانے کی طرف جانے کے دوران بڑی بڑی قسمیں کھا کر یقین دلانے کی کوشش کی کہ میں مجرم نہیں ہوں، ان لوگوں کو میں نے پہلے نہیں دیکھا تھا جو چرس کا تھیلا کہیں لے جا رہے تھے۔

ٹیکسی ڈرائیور کب ایماندار اور شریف سمجھے جاتے ہیں؟ کسی نے میری سچائی کا یقین نہیں کیا۔ تھانے کا انچارج اتنا ایماندار تھا کہ ان تین مجرموں کی بڑی سے بڑی رشوت بھی کام نہ آسکی، اس نے ہم سب کے باری باری بیانات لیے۔ جب میرے بیان دینے کی باری آئی تو میں نے ٹیکسی کے ڈیش بورڈ سے میٹرک کا سرٹیفکیٹ نکال کر بتایا کہ میں نے دس برس پہلے فرسٹ ڈویژن میں میٹرک پاس کیا تھا۔ میں ایک شریف آدمی ہوں۔ حالات مجھے ٹیکسی ڈرائیور بنا کر ایک ایسی جگہ لے آئے ہیں جہاں صرف چور بدمعاش آتے ہیں۔

تھانے کا انچارج واقعی شریف آدمی تھا۔ وہ میری تعلیمی صلاحیتوں اور میری باتوں سے متاثر ہو گیا۔ اس نے کہا۔

''میں مانتا ہوں کہ مسافروں کو ٹیکسی میں بٹھانے سے پہلے ان کا سامان چیک کرنے کا دستور نہیں ہے۔ ٹیکسی ڈرائیور اس بات سے بے خبر ہوتے ہیں کہ ان کی گاڑی میں بیٹھنے والے غیر قانونی چیزیں ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جا رہے ہیں پھر بھی اکثر ٹیکسی ڈرائیور دانستہ مجرموں کا ساتھ دیتے ہیں اور اپنی ٹیکسیوں کو جرائم کا اڈہ بناتے ہیں۔ اگر کوئی شریف آدمی تمہاری ضمانت دے گا تو میں تمہیں چھوڑ دوں گا۔ اس وقت تک تمہیں حوالات میں رہنا پڑے گا۔ کوئی ایسا آدمی ہو تو مجھے اس کا نام اور پتہ بتاؤ، میں اسے یہاں بلوالوں گا''۔

میں سوچ میں پڑ گیا کہ کس شریف آدمی کا نام اور پتہ بتاؤں۔ اس دنیا میں شریف آدمی ضرور بستے ہوں گے لیکن میں زندگی کے جس ٹریفک سے گزرتا آیا ہوں وہاں کوئی شریف آدمی کبھی نظر نہیں آیا۔ اب میں تھانے کے انچارج سے یہ بات نہیں کہہ سکتا تھا۔ وہ جواباً یہی کہتا کہ آدمی خود شریف ہو تو اسے شریفوں کی صحبت مل جاتی ہے۔ میں نے کہا۔

''جناب! میں تو اس دنیا میں تنہا ہوں۔ میرے دن رات کا زیادہ حصہ ٹیکسی میں بیٹھ کر یا سو کر گزرتا ہے۔ کراچی شہر میں کوئی شریف آدمی تنہا یا اپنی فیملی کے ساتھ سال ڈیڑھ سال سے زیادہ ایک ہی کرائے کے مکان میں نہیں رہ سکتا۔ مالک مکان ہزار بہانوں سے اسے مکان خالی کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ مکان خالی کرانے کے لیے کبھی وہ اپنے مکان کو فروخت کرنے کا بہانہ کرتا ہے، کبھی بیرونی ملک سے اس کے رشتے دار آنے والے ہوتے ہیں، کبھی اس کی بیٹی کی شادی کے لیے مکان خالی کرنا پڑتا ہے۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ جب تک ہم ایک مکان اور ایک محلے میں رہ کر شریف لوگوں سے تعلقات پیدا کریں اس وقت تک ہم مکان بدر اور محلہ بدر کر دیئے جاتے ہیں یا پھر وہ شریف لوگ محلہ چھوڑ کر چلے جاتے ہیں جو ہماری شرافت کے ضامن ہو سکتے ہیں۔ ایسی صورت میں، میں ضمانت کے لیے کسے طلب کر سکتا ہوں؟ مجھے سوچنے کا موقع دیجیے''۔

مجھے رات بھر سوچنے کے لیے حوالات میں بند کر دیا گیا۔ یہ میرے لیے بڑی شرم کی بات تھی کہ میں اتنی طویل زندگی میں ایک بھی شریف آدمی سے دوستی نہیں کر سکا تھا اگر دوستی اور تعلقات پیدا بھی کیے تو اس نے اپنی شرافت کے پیچھے چھپی ہوئی ذلالت دکھا دی۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ کون سے ایمان اور کون سی تہذیب کی کسوٹی پر شریف آدمی پہچانے جاتے ہیں؟

میں حوالات کی سلاخوں کو تھامے کھڑا تھا کہ اتنے میں بیلا رانی آ گئی۔ اس کے ساتھ ایک اچھا قبول صورت نوجوان تھا۔ نوجوان نے تھانے کے انچارج کو سلام کرنے کے بعد بیلا رانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

''جناب یہ میری بیوی ہے۔ میرا نام مصلح الدین ہے ابھی میں لسبیلہ چوک سے گزر رہا تھا تو شیدے ٹیکسی ڈرائیور کو آپ گرفتار کر کے لے جا رہے تھے۔ میری بیوی نے مجھے بتایا کہ شیدا بہت اچھا انسان ہے۔ اس نے ایک بار میری بیوی کو غنڈوں سے بچایا تھا۔ ہم اِس خیال سے یہاں آئے ہیں کہ شاید ہم کسی طرح شیدے کا احسان کا بدلہ چکا سکیں۔ ہم غریب آدمی ہیں، روپے پیسے سے اس کی ضمانت نہیں دے سکتے لیکن جس طرح بھی ممکن ہو یہ یقین دلا سکتے ہیں کہ یہ شریف آدمی چرس کا دھندا نہیں کرتا ہے''۔

تھانے کے انچارج نے پوچھا ''تم کہاں رہتے ہو؟''

''اورنگی نمبر ایک میں''۔

''کیا کام کرتے ہو؟''

''ریڑھے پر پھل بیچتا ہوں''۔

اتنے میں ایک سپاہی نے تھانے کے انچارج سے کہا۔

''سر! آپ اس علاقے میں نئے آئے ہیں۔ یہ بیلا رانی اس تھانے میں کئی بار آ چکی ہے۔ پیشہ کرنے والی عورت ہے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ یہ اس نوجوان سے شادی کر چکی ہے''۔

تھانے کے انچارج نے گھور کر بیلا رانی اور مصلح الدین کو دیکھا۔ بیلا رانی نے جلدی سے کہا۔

''حضور! پہلے میں بری عورت تھی مگر خدا کی قسم میں چھ ماہ سے ایک وفادار بیوی بن کر مصلح الدین کے ساتھ شرافت کی زندگی گزار رہی ہو۔ اگر میں پہلے کی طرح ہوتی تو اتنی دلیری سے یہاں نہیں آتی۔ کیا میں نہیں جانتی کہ یہاں کے تمام سپاہی مجھے جانتے ہیں۔ یہاں میرا جھوٹ پکڑا جائے گا۔ چونکہ میں جھوٹی نہیں ہوں اسی لیے اپنے خاوند کے ساتھ آئی ہوں''۔

تھانے کے انچارج نے کہا۔

''یہ بڑی اچھی بات ہے کہ تم شرافت کی زندگی گزار رہی ہو لیکن ہم نہیں جانتے کہ تم کب تک مستقل مزاجی سے عزت کی زندگی گزارو گی۔ ابھی تم آزمائشی دور سے گزر رہی ہو۔ مجھے افسوس ہے کہ ابھی تمہاری کوئی ضمانت یا کسی طرح کی یقین دہانی قبول نہ ہوگی۔ تم دونوں اگر شیدے کے کام آنا چاہو تو کسی ایسے شخص کو لاؤ جو اس معاشرے کا یا اپنے علاقے کا معزز اور شریف انسان ہو''۔

میں نے سلاخوں کے پیچھے سے بیلا رانی کو دیکھا۔ وہ مایوس ہو کر کبھی میری طرف اور کبھی مصلح الدین کی طرف دیکھ رہی تھی۔ مصلح الدین کی نگاہوں کی بے بسی بتا رہی تھی کہ اس نے بھی اس معاشرے میں کوئی معزز اور شریف

انسان نہیں دیکھا۔ یہ عجیب سی بات ہے کہ کانٹوں کی زندگی میں پھول کا حسن ہوتا ہے۔ سائے کی زندگی میں سورج کی اجلی اور شفاف کرنیں ہوتی ہیں۔ پھر ہم جیسے ذلیل انسانوں کی زندگی میں کوئی اجلے، بے داغ دامن والا شریف آدمی کیوں نظر نہیں آتا۔ آخر یہ شریف آدمی کہاں پائے جاتے ہیں؟

بیلا رانی اور مصلح الدین وہاں سے اٹھ کر کسی معزز آدمی کی تلاش میں چلے گئے، میں بیلا رانی کے متعلق سوچنے لگا۔ میں نے اسے کبھی غنڈوں سے نہیں بچایا تھا۔ وہ تو خواہ مخواہ میرے ناکردہ احسان کا بوجھ اٹھانے آئی تھی۔ میں سمجھ گیا کہ اس نے صرف تھانیدار کو متاثر کرنے کے لیے جھوٹ کہا تھا۔ پتہ نہیں اس میں کہاں تک سچائی تھی کہ وہ مصلح الدین سے شادی کر چکی ہے۔

ایک گھنٹہ بعد میں نے سلاخوں کے پیچھے سے نعیم احمد کو دیکھا۔ وہ ایک بغل میں فائل دبائے اور دوسرے ہاتھ میں ہاتھی دانت کے دستے کی ایک چھڑی پکڑے ہوئے تھا۔ بدن پر کفن کی طرح سفید لباس تھا جو اس کی شخصیت اور کردار کو اجلا اور بے داغ بتا رہا تھا۔ اس کی پیشانی کا داغ اور خضاب رسیدہ مختصری داڑھی اس کے شریف اور ایماندار ہونے کا سرٹیفکیٹ پیش کر رہی تھی۔ وہ حسب معمول مقدس آیتیں پڑھ رہا تھا۔ میں چیخ کر کہنا چاہتا تھا کہ اس کی زبان سے ان مقدس آیتوں کو چھین لو، کلام پاک کو مذاق نہ بناؤ۔ کیا یہ ہدایت دینے والی کتاب ایسے ہی بے ایمان نمازیوں کے لیے اتاری گئی ہے؟

مگر میں کچھ نہ کہہ سکا کیونکہ میری زبان کھلتے ہی اس کے ساتھ میری بہن بھی بدنام ہو جاتی۔ ویسے بھی کیا ہم سب اپنے جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کے لیے اور اپنی جھوٹی عزت کا بھرم رکھنے کے لیے خدا کی قسم اور کلام پاک کی قسم نہیں کھاتے ہیں؟ وہ بھی مقدس آیتوں کو کھا رہا تھا۔

اس نے ایک نظر مجھ پر ڈالی۔ پھر تھانے کے انچارج کو سلام کرتے ہوئے مصافحہ کیا۔ اس کے بعد ایک کرسی پر بیٹھ کر فائل کھولتے ہوئے کہا۔

"بندے کو شیخ نعیم احمد کہتے ہیں۔ خاکسار اب سے بارہ برس پہلے اپنے محلے کا بی ڈی ممبر اور اس کے بعد چیئرمین رہ چکا ہے۔ یہ دیکھیے یہ ہیں کاغذات......"

وہ فائل سے ایک ایک کاغذ نکال کر دکھانے لگا۔ وہ کاغذات بتا رہے تھے کہ وہ اپنے محلے کا سب سے عزت دار اور مخلص انسان ہے۔ اس نے چیئرمین بننے کے بعد محلے میں پانی کے نلکے لگوائے ہیں، پرائمری سکول کھولا ہے، مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا ہے۔ محلے کی ایک گلی کو آج بھی گلی نعیم احمد کہا جاتا ہے۔ غرض کہ اس دنیا میں نیک کام کر کے وہ مرنے کے بعد جنت میں جانے کے تمام اہم سرٹیفکیٹ حاصل کر چکا ہے۔

اتنے اہم سرٹیفکیٹ دیکھ کر تھانے کا انچارج اس کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ اس نے پوچھا۔

"آپ شیدے کو کیسے جانتے ہیں؟"

نعیم احمد نے جواب دیا "شیدے کی سگی بہن میرے بیٹے کی شریک حیات ہے۔ حالات نے اسے ٹیکسی ڈرائیور بنا دیا ورنہ یہ شریف خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ اسی لیے میں نے اس کی بہن کو بڑی عزت و آبرو کے ساتھ اپنی بہو بنایا ہے"۔

تھانے کے انچارج نے مطمئن ہو کر کہا۔

یہ بات شیدے کو پہلے ہی بتانا چاہیے تھا کہ وہ آپ جیسی معزز ہستی کا رشتے دار ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بعض لوگ اتنے خود دار ہوتے ہیں کہ بہن اور بیٹی کے سسرال والوں کو تھانے کچہری میں بلا کر زحمت نہیں دیتے بہرحال آپ شیدے کو ساتھ لے جائیں مگر اس کیس میں جب بھی شیدے کی طلبی ہو، اسے عدالت میں حاضر کرنا آپ کی ذمہ داری ہوگی"۔

نعیم احمد نے ذمے داری لے لی اور میں رہا کر دیا گیا۔ حوالات کے آہنی دروازے سے نکلتے وقت یہ عقدہ حل ہوگیا کہ اس معاشرے کے شریف آدمی صرف کریکٹر سرٹیفکیٹ میں پائے جاتے ہیں۔

میں نے نعیم احمد سے بات نہیں کی۔ تقریباً دو برس سے میں نے اس کی اور اپنی بہن کی صورت نہیں دیکھی تھی۔ میں نے وہ محلہ ہی چھوڑ دیا تھا۔ مجھے کیا معلوم تھا کہ مجھ سے زیادہ کمینہ آدمی مجھ سے زیادہ شریف بن کر میری ضمانت کے لیے آجائے گا۔ مجھے اس کا احسان نہیں لینا چاہیے تھا، اسی طرح حوالات میں رہنا چاہیے تھا مگر اس کمبخت نے تھانے میں آکر بھی بڑی معصومیت سے کہہ دیا تھا کہ میری بہن اس کے گھر میں ہے۔ ایسی صورت میں، میں اس کی رشتہ داری سے انکار نہیں کرسکتا تھا۔ تھانیدار کے سامنے میرے انکار کی کوئی معقول وجہ نہیں تھی۔

میں نعیم احمد کے ساتھ تھانے سے باہر اپنی ٹیکسی کے پاس آیا۔ وہاں بیلا رانی پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ نعیم احمد میرے ساتھ سامنے والی سیٹ پر آگیا۔ میں نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے کہا۔

"بیلا! تم اپنی کوشش میں کامیاب نہیں ہوسکیں۔ میرے لیے یہی بہت ہے کہ تم میری ہمدردی میں اب تک یہاں موجود رہیں"۔

"ارے واہ! میری کوشش کامیاب کیوں نہیں ہوئی۔ اس شریف مرغے کو میں ہی تو پکڑ کر لائی ہوں"۔

میں نے حیرانی سے عقب نما آئینے میں اسے دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"کیا نعیم احمد کو تم بلا کر لائی ہو؟"

"ارے شیدے! تو نے بھی گھاس کھائی ہے۔ مجھ جیسی ٹیکسی کے بلانے سے بھلا کوئی شریف آدمی گھر سے نکل کر آسکتا ہے؟ میں نے مصلح الدین کو قاصد بنا کر اس کے پاس پیغام بھیجا تھا کہ تیرا سالا شیدے حوالات میں ہے......"

میں نے غصے سے کہا "بکواس مت کر میں اس بدمعاش کا سالا نہیں ہوں"۔

وہ بولی "تیرے انکار کرنے سے حقیقت تو نہیں بدل جائے گی تو گرم کیوں ہوتا ہے؟ چل تجھے سالا نہیں کہوں گی پہلے میری بات سن لے۔ تیرا یہ بہنوئی نہیں...... پھر مجھ سے بھول ہوگئی اسے تیرا بہنوئی کہوں گی تو پھر سالا بن جائے گا۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ ان حرامی رشتوں کو دنیا والوں کے سامنے کن رشتوں سے پکارا جائے؟ میں یہ کہہ رہی تھی کہ یہ سالا نعیم تیری ضمانت کے لیے یہاں آنے سے انکار کر رہا تھا"۔

نعیم احمد نے عاجزی سے کہا۔

"دیکھ بیلا رانی! میں عزت دار آدمی ہوں، مجھے گالی نہ دے کیا تو سیدھی طرح بات نہیں کرسکتی؟"

"کیا تو سیدھے طرح تھانے میں آگیا تھا؟ میں نے مصلح الدین کے ذریعے دھمکی دی تھی کہ شیدے کی ضمانت نہیں لے گا تو میں تیری پارسائی کا پول کھول دوں گی۔ محلے والوں سے کہوں گی کہ وہ تیرے جوان بیٹے کا معائنہ کروائیں اور اس حقیقت کو سمجھیں کہ بیلا رانی اور شمشاد کی گود میں ایک ایک بچہ کہاں سے آیا ہے؟"

میرے منہ پر ایک طمانچہ پڑا۔ بیلا رانی کے ساتھ میری بہن کا نام آ رہا تھا۔ میں نے ایک جھٹکے سے گاڑی روک دی۔ پھر اپنا سر اسٹیئرنگ پر ٹیک دیا کیونکہ میرا سر چکرا رہا تھا۔ جو بھی الٹے سیدھے رشتے قائم ہو چکے تھے میں انہیں کہاں تک جھٹلا سکتا تھا۔ میں ایک عزت دار بدمعاش کا سالا کہلانے سے انکار کر سکتا تھا لیکن بیلا رانی اس سچائی سے انکار نہیں کرنا چاہتی تھی کہ اس کی بیٹی اور میری بہن کا بیٹا آپس میں سوتیلے بھائی بہن ہیں اور ایک ہی نعیم احمد کی اولاد ہیں۔

نعیم احمد نے ہم دونوں کے سامنے ہاتھ جوڑ کر التجا کی۔

''خدا کے لیے مجھے جانے دو۔ میں یہاں سے رکشے میں چلا جاؤں گا۔ تم دونوں کے ساتھ بیٹھ کر مجھے شرم تی ہے کہ میں اس دنیا کا سب سے ذلیل انسان ہوں۔ جو گناہ کر رہا ہوں اس سے توبہ نہیں کر سکتا۔ توبہ کروں گا تو شمشاد اور اپنے بیٹے سے رشتہ توڑنا ہوگا۔ رشتہ ٹوٹنے کے بعد شمشاد میرے گھر سے نکلے گی تو میں دنیا والوں کو کیا کہوں گا کہ میری بہو کہاں جا رہی ہے؟ کیوں جا رہی ہے؟ کس کا بچہ لے کر جا رہی ہے؟ خدا کے لیے تم دونوں میرا پیچھا چھوڑ دو۔ مجھے بے غیرت بن کر نیک نام رہنے دو''۔

میں نے دروازے کی طرف اسے زور سے دھکا دیتے ہوئے کہا۔

''جا بھاگ جا یہاں سے ذلیل کمینے! نہ میری کوئی بہن ہے، نہ تجھ سے میرا کوئی رشتہ ہے۔ تو صرف بیلا رانی کی دھمکی سے گھبرا کر میری ضمانت کے لیے آیا تھا۔ جا اب یہ تجھے دھمکی نہیں دے گی''۔

وہ دروازہ کھول کر جانے لگا تو بیلا رانی نے کہا۔

''دھمکی کیسے نہیں دوں گی؟ شیدے جب بھی عدالت میں تیری پیشی ہوگی۔ یہ الو کا پٹھا تیرے ضامن کی حیثیت سے ضرور آئے گا۔ نہیں آئے تو اس کی شرافت کی ایسی کی تیسی کر کے رکھ دوں گی''۔

''میں آؤں گا تو جب بھی بلائے گی میں چلا آؤں گا'' اس نے گڑگڑا کر کہا ''مگر تو میرے محلے میں نہ آنا خدا کے لیے میری عزت رکھ لینا......''

وہ عزت کی بھیک ان سے مانگتا رہا جو بے عزت تھے۔ میں نے ایک جھٹکے سے گاڑی اسٹارٹ کی اور اسے پیچھے چھوڑتا ہوا آگے بڑھ گیا۔ بیلا رانی نے کہا۔

''شیدے! اتنی زندگی گزارنے کے بعد بھی سمجھ میں نہیں آتا کہ کیسے زندگی گزاریں؟ کس سے محبت کریں اور کس سے نفرت کریں؟ کس کی عزت کریں اور کس کی بے عزتی کریں؟ میں نے جھنجھلا کر نعیم احمد کی جو بے عزتی کی ہے اس میں کھوکھلا پن ہے کیونکہ بالواسطہ اس کی عزت کرتی ہوں یعنی اس کی دی ہوئی بیٹی جو میرے پاس ہے میں اس بیٹی سے محبت کرتی ہوں۔ میں اس کے شریف خون کو بازار میں نہیں لا سکتی۔ وہ میری بھی بیٹی ہے، میں اسے عزت و آبرو سے دلہن بنا کر رخصت کرنا چاہتی ہوں۔ سوچا جائے تو میں اس شیطان کی عزت کا بھرم رکھ رہی ہوں۔ سوچا جائے تو، تو بھی سر بازار اسے بہن کی خاطر گالیاں نہیں دے سکتا، دنیا والوں کے سامنے اس کی عزت کرنے پر مجبور ہے۔ ہم لوگ جو عزت والے نہیں ہیں، اسی طرح دوسروں کو عزت دار بناتے ہیں''۔

عزت کی بات آئی تو مجھے خیال آیا کہ اب وہ بھی عزت کی زندگی گزارنے کی کوشش کر رہی ہے۔ میں نے اس سے پوچھا۔

''کیا سچ مچ تو نے مصلح الدین سے شادی کر لی ہے؟''

''ہاں شادی تو ہوگئی ہے مگر سچ مچ ہوگئی ہے یا نہیں یہ میں یقین سے نہیں کہہ سکتی''۔

''اس کا مطلب کیا ہوا؟''

''مطلب یہ ہوا کہ مصلح الدین کے ماں باپ مجھے بہو بنانے کے لیے راضی نہیں تھے۔ اس کا باپ بہت دولت مند ہے، پھلوں کا تھوک کا بیوپاری ہے۔ مصلح الدین مجھ پر جان دیتا ہے۔ جب اس نے ماں باپ کی بات نہیں مانی تو اسے گھر سے نکال دیا گیا۔ وہ میرے عشق میں ثابت قدم نکلا ہے۔ اس نے ہمت نہیں ہاری۔ اس میں یہ حوصلہ اس لیے بھی پیدا ہوا کہ میں نے پرانے دھندے سے توبہ کرلی تھی۔ میں اپنی لڑکی مونا کے ساتھ ایک دو وقت کے فاقے کرتی تھی مگر گاہک کی تلاش میں گھر سے نہیں نکلتی تھی۔ اگر ایک عورت اپنے مرد کے اعتماد کے مطابق چلے پچھلے گناہوں سے توبہ کرلے اور آئندہ پارسا اور وفادار بن کر رہے تو مرد پورے خلوص، لگن اور تندہی سے اپنے گھر کی جنت آباد کرلیتا ہے۔ مصلح الدین اپنے گھر سے کچھ پیسے لے کر نکلا تھا۔ اس نے ان پیسوں سے پرانا ریڑھ خرید لیا ہے اور فٹ پاتھ پر پھل بیچا کرتا ہے۔ ہم نے اورنگی میں ایک کمرے کا ایک مکان کرائے پر لیا ہے اس گھر میں میری بیٹی مونا کی معصوم باتیں ہیں اور میرے محنت کرنے والے مرد کا پیار ہے۔ ہائے شیدے! میں بیان نہیں کرسکتی کہ جب وہ دن بھر کی محنت کی کمائی لاکر میری ہتھیلی پر رکھتا ہے تو میں اپنی ہی نظر میں کتنی عزت دار بیوی بن جاتی ہوں''۔

''میں نے تجھ سے یہ پوچھا کہ تو اس کی بیوی بن چکی ہے یا نہیں؟''

''ہاں ایمانداری سے بن چکی ہوں مگر کسی ایمان والے قاضی نے میرا نکاح نہیں پڑھایا۔ وہ کہتا تھا کہ پہلے اپنے ماں باپ کو یا کسی بزرگ کو ساتھ لاؤ مگر اس کے بزرگ فٹ پاتھ کی عورت کو اپنی بہو نہیں بنانا چاہتے تھے۔ ہم ایک کے بعد دوسرے اور دوسرے کے بعد تیسرے قاضی اور مولوی کے پاس گئے لیکن سب یہی سمجھے تھے کہ مصلح الدین مجھے کہیں سے بھگا کر لایا ہے اور چوری چھپے نکاح پڑھانا چاہتا ہے۔ انہوں نے کہا کہ پہلے کورٹ سے اجازت حاصل کریں۔ جب اجازت مل جائے گی تو شرعی طور سے نکاح پڑھا دیا جائے گا۔ کورٹ میں جانے کے لیے وکیل کی ضرورت تھی اور وکیل کے لیے فیس کی ضرورت تھی۔ ابھی مصلح الدین نے پھل بیچنے کا چھوٹا سا کاروبار شروع کیا تھا۔ اتنے پیسے فاضل نہیں تھے کہ ہم وکیل اور عدالت کے چکر میں پڑتے۔ جب ہماری سمجھ میں کچھ نہیں آیا تو ہم تھک ہار کر گھر میں آبیٹھے۔ میں نے مایوسی سے کہا۔

''مصلے! کیا یہ دنیا نہیں چاہتی کہ میں شریف عورت بنوں؟''

وہ محبت سے بولا ''نہیں بیلا! اللہ تعالیٰ جب اپنے نیک بندوں کا امتحان لیتا ہے تو انہیں ایسی ہی آزمائشوں سے گزرنے کے لیے چھوڑ دیتا ہے''۔

''میں تو بڑی سے بڑی آزمائشوں سے گزر جاؤں گی۔ مجھے اپنی پرواہ نہیں ہے۔ تیری فکر ہے، تو یہاں ایک ہی کمرے میں مجھ سے ذرا دور سوتا ہے۔ نہیں سوتا نہیں ہے، رات بھر بے چینی سے کروٹیں بدلتا رہتا ہے مگر نکاح سے پہلے میرے ساتھ سونا گناہ سمجھتا ہے۔ ایسے تو راتوں کو جاگ جاگ کر بیمار پڑ جائے گا۔ آدمی کو اتنا بھی شریف نہیں ہونا چاہیے کہ کھانے کی پلیٹ سامنے رکھ کر بھوکے پیٹ کروٹیں بدلتا رہے''۔

''مگر بیلا، ایسا کھانا حرام ہوتا ہے''۔

''تو کسی طرح مجھے حلال کردے......''

وہ مجھے گہری لگن سے دیکھنے اور سوچنے لگا۔ اس کی نگاہوں میں مجھے حاصل کرنے کی شدید خواہش تھی اس نے اپنی خواہش سے مجبور ہو کر کہا۔

''تجھے حلال کرنے کی ایک ہی ترکیب ہے کہ میں خود ہی دلہا اور خود ہی قاضی بن جاؤں۔ خداوند کریم ہمارے نکاح کا گواہ ہوگا۔ شرافت کی زندگی گزارنے کے لیے نیکی نیت سے جو کام کرو وہ خدا کو منظور ہوتا ہے۔ بول اس طرح نکاح قبول کرے گی؟''

''ہاں ہزار بار قبول کروں گی''۔

''ہزار بار نہیں، صرف تین بار ''قبول'' کہنا ہوگا۔ چل اب اٹھ کے وضو کر لے''۔

ہم دونوں نے وضو کیا۔ ہمارے کمرے کی ایک دیوار پر کعبہ کی سمت اللہ اور محمد کے طغرے لگے ہوئے ہیں۔ ہم ادھر منہ کر کے بیٹھ گئے۔ مصلح الدین زیادہ پڑھا لکھا آدمی نہیں ہے مگر اسے سورہ فاتحہ اور چاروں قل اچھی طرح یاد ہیں، انہیں پڑھنے کے بعد اس نے کہا۔

''بی بی زیب النساء عرف بیلا رانی! میں مصلح الدین ولد معین الدین تمہیں اپنے نکاح میں بعوض حق مہر...... ارے ہاں یہ تو پوچھنا ہی بھول گیا کہ مہر کی رقم کتنی ہوگی؟ اس وقت میرے پاس صرف بارہ روپے ہیں''۔

میری زبان سے بے اختیار نکل گیا ''مصلح! شریف بارہ روپے نہیں ہے''۔

وہ ایک دم سے چونک کر مجھے دیکھنے لگا۔ مجھے بھی فوراً ہی عقل آ گئی کہ نکاح کے وقت ایسا نہیں کہنا چاہیے۔ میں نے ندامت سے کہا۔

''مصلے! مجھے معاف کر دے۔ پتہ نہیں یہ بات میری زبان پر کیسے آ گئی۔ مجھے مہر کی رقم بارہ روپے منظور ہے''۔

اس نے کہا ''لیکن میں نے یہ بارہ روپے کل صبح راشن لانے کے لیے رکھے ہیں''۔

''میں مہر کی اس رقم سے راشن لے آؤں گی''۔

''نہیں بیلا! نہ میں عورت کی کمائی کھاتا ہوں اور نہ ہی میں تجھے دی ہوئی مہر کی رقم راشن کے لیے واپس لوں گا۔ شادی سے پہلے دال روٹی کی فکر ضروری ہے۔ یہ پیسے راشن کے لیے رہیں گے''۔

''اگر نقد رقم نہیں ہے تو مہر معجّل کی کیا ضرورت ہے جو فوراً ادا کیا جاتا ہے، ابھی مہر موجل ہونا چاہیے یعنی جب میں مطالبہ کروں گی تو مجھے وہ رقم ادا کر دینا''۔

''اوں ہونہہ میں شادی کی پہلی ہی رات عورت کے پیسے اپنے ذمہ نہیں رکھنا چاہتا۔ شرع محمدی کے مطابق انسان کی حیثیت دیکھ کر مہر کی رقم مقرر کی جاتی ہے۔ اس وقت میری حیثیت نقد رقم کی صورت میں نہیں بلکہ مال کی صورت میں یہ پھل وغیرہ ہیں ان سے کچھ پھل میں تیرے مہر کے لیے مخصوص کر دوں گا پھر تیرے حصے کے پھل جیسے جیسے فروخت ہوتے رہیں گے میں ان کے پیسے لا کر تجھے دیتا رہوں گا''۔

میں نے یہ بات منظور کر لی۔ پھر اس نے نکاح پڑھاتے ہوئے کہا۔

''بی بی زیب النساء عرف بیلا رانی! کیا تم مصلح الدین ولد معین الدین کو اپنے نکاح میں بعوض ایک درجن مالٹے، ایک سیر سیب اور دو درجن کیلے بطور مہر معجّل قبول کرتی ہو؟ کہو میں نے قبول کیا......''

میں نے تین بار قبول کیا۔ اس نے میرا ہاتھ تھام کر مجھے وہاں سے اٹھایا اور اپنے بستر پر لا کر بٹھا دیا۔ پھر اس

نے اپنی انگلی سے اسٹین لیس اسٹیل کی انگوٹھی نکال کر میری انگلی میں پہنائی۔ اس کے بعد گھونگھٹ اٹھا کر میرا چہرہ دیکھا۔ مجھے پیار کیا اور مجھے اپنے سینے سے لگالیا۔ اتنی لمبی عمر گزارنے کے بعد پہلی بار ایک سچے مرد نے مجھے زندگی کی سچی مسرتیں دیں۔ خدا کی قسم یہ دنیا اسی لیے خوبصورت ہے کہ ابھی یہاں مصلح الدین جیسے اصلاح کرنے والے اور ذلت کی ماری ہوئی عورتوں کو عزت دینے والے موجود ہیں۔

"شیدے! میں یقین سے نہیں کہہ سکتی کہ دنیا والوں کی نظروں میں ہمارا نکاح ہو چکا ہے یا نہیں مگر میں مطمئن ہوں کہ اس نکاح کے بعد میں اپنی بیٹی کے ساتھ ایک شریف آدمی کی پناہ میں آگئی ہوں"۔

میں بیلا رانی کی باتوں سے اور مصلح الدین جیسے اصلاحی جذبہ رکھنے والے نوجوان سے بے حد متاثر ہوتا رہا۔

میں نے کہا۔

"بیلا! تو نے یہ اچھا کیا کہ مصلح الدین سے شادی کرلی۔ اس طرح تجھ سے زیادہ تیری بیٹی مونا کو تحفظ حاصل ہوگیا ہے۔ جب وہ جوان ہوگی تو مصلح الدین کی سرپرستی میں کوئی اسے غلیظ نظروں سے نہیں دیکھ سکے گا"۔

"میری مونا بہت اچھی ہے، بہت خوبصورت ہے۔ ابھی چھ برس کی گڑیا ہے، مجھے اس کی فکر کھائے جارہی تھی، اب تمام فکروں سے آزاد ہوں۔ میں مرجاؤں گی تب بھی مصلح الدین باپ بن کر کسی شریف گھرانے میں اسے بیاہے گا۔ میری آخری تمنا یہی ہے کہ میری گڑیا کو ایک اچھا گھر اور ایک اچھا شوہر ملے۔ تم اسے دیکھو گے تو اس پر بڑا پیار آئے گا۔ کیا تم میری گڑیا رانی کو دیکھو گے؟"

"ہاں میں اس معصوم کلی کو ضرور دیکھوں گا جس کی حفاظت کے لیے تم نے گناہ گار زندگی سے توبہ کرلی ہے اور اس بچی کے اطراف اشراف کی مضبوط دیوار کھڑی کررہی ہو۔ اسی لیے تو میں اور نگی کی طرف جارہا ہوں"۔

بیلا رانی نے حیرت سے کہا۔

"ارے ہاں! مجھے تو باتوں میں یاد ہی نہ رہا کہ تم میرے ہی گھر کی طرف جارہے ہو۔ میں نے مصلح سے کہہ دیا تھا کہ وہ گھر میں رہے کیونکہ مونا وہاں اکیلی ہے۔ یہ سوچ کر کتنی خوشی ہوتی ہے کہ میری بیٹی کی حفاظت کے لیے اس کا ایک باپ موجود ہے"۔

وہ مجھے اپنے گھر کا راستہ بتانے لگی۔ پانچ منٹ کے بعد میں نے اس کے گھر کے سامنے ٹیکسی روک دی۔ مصلح الدین نے باہر نکل کر ہمیں دیکھا۔ اس نے میری رہائی پر مبارکباد دیتے ہوئے مصافحہ کیا اور گھر کے اندر لے گیا۔ وہ ایک چھوٹے سے کمرے اور چھوٹے سے آنگن کا گھر تھا۔ اس گھر میں چھوٹی چھوٹی ضرورت کی چیزیں تھیں اور جو سب سے بڑی چیز تھی وہ مونا کا پیار تھا۔

وہ معصوم بچی ایک چارپائی پر سو رہی تھی۔ وہ صرف چھ برس کی تھی مگر قد میں ماں کے کاندھے کے برابر ہوتی جارہی تھی۔ بچے یوں بھی معصوم ہوتے ہیں مگر نیند میں اور بھی معصوم نظر آتے ہیں۔ یہ ان کی زندگی کا وہ دور ہوتا ہے جب ان کے خوابوں میں صرف پریاں اور شہزادے آتے ہیں، اس زندگی کا کوئی المیہ ان معصوم خوابوں کو مجروح نہیں کرتا۔ میں تھوڑی دیر کے لیے زندگی کی تمام غلاظتوں سے نکل کر ایک خوبصورت دنیا میں آگیا جہاں نئی نسل کے ننھے منوں کی معصومیت ہوتی ہے۔

میں وہاں بہت دیر تک بیٹھ کر باتیں کرتا رہا۔ ان کے ساتھ کھانا کھایا۔ پھر چائے پینے کے بعد میں نے

جیب سے دس روپے نکال کر خوابیدہ مونا کی مٹھی میں رکھ دیئے اور بیلا رانی سے کہا۔
''یہ صرف تم دونوں کی نہیں، میری بھی بیٹی ہے مجھے بتاؤ کہ یہ کس اسکول میں پڑھنے جاتی ہے، کل سے میں روز صبح یہاں آیا کروں گا اور اسے اپنی گاڑی میں اسکول پہنچایا کروں گا۔ یہ اسکول کے نئے کپڑے پہنے گی اس کے نئے بستے میں نئی کتابیں ہوں گی اور ہم تینوں مل کر اسے ایک نئی اور صاف ستھری زندگی کا درس دیا کریں گے''۔
بیلا رانی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ وہ آنسوؤں کی جھلملاہٹ میں اپنی بیٹی کے روشن مستقبل کو دیکھ رہی تھی اور اس کے مستقبل تک جو راستہ گیا تھا اس راستے کو آنسوؤں سے دھو رہی تھی۔

O☆O

کبھی کبھی میری ٹیکسی سیاست کا اکھاڑہ بن جاتی ہے۔ ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہنگامے ہو رہے تھے۔ جلسے جلوسوں کی ہنگامہ آرائیاں کاروبارِ زندگی کو معطل کر رہی تھیں۔ شاہراہوں اور گلی کوچوں کے نقشے بدل گئے تھے۔ جہاں زندگی رونق تھی وہاں اِسی زندگی کو ختم کرنے کے لیے گولیاں چلائی جا رہی تھیں۔ تیس برسوں میں کتنی ہی بار انقلاب لانے اور عوام کی حالت بہتر بنانے کا فریب دیا گیا۔ ہر فریب کے ساتھ ساتھ گولیاں بھی چلائی گئیں۔ اب پھر نئے انقلاب کے لیے چراغ روشن کیے جا رہے تھے اور یہ چراغ غریبوں کے لہو سے روشن ہو رہے تھے کیونکہ سڑکوں پر وہی مارے جا رہے تھے اور کرفیو کے واقعات میں آمدنی اور راشن کے بغیر وہی بھوکے مر رہے تھے۔ جنہیں کھانے کے لیے کچھ مل جاتا تھا وہ اپنے گھروں میں تاش کی بازیاں جما رہے تھے جنہیں کچھ نہیں مل رہا تھا وہ چوریاں کر رہے تھے۔ جنہیں چوریوں سے دولت حاصل ہو رہی تھی وہ کرفیو کے سنہری مواقع کو اور طول دینے کے لیے سڑکوں پر ہنگامے کر رہے تھے۔ دیانت داری سے انقلاب لانے والے کم تھے اور کرپشن بڑھانے والے زیادہ تھے۔ یہ بات لوگوں کی سمجھ میں کیوں نہیں آتی کہ انقلاب لانے سے پہلے عوام کے ذہنوں میں تعمیری انقلاب لانے کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب تک غریبی اور جہالت رہے گی اس وقت تک کوئی بھی نظام سچائی سے قائم نہیں ہوسکتا۔
میں نے بھی موقع سے فائدہ اٹھا کر اپنی ٹیکسی کا میٹر خراب کر دیا تھا کیونکہ ان دنوں لوگ حواس باختہ تھے، ہنگامے کے دوران ادھر ادھر بھاگتے تھے اور مجھے منہ مانگا کرایہ دیتے تھے۔ میری ٹیکسی میں دونوں طرف کے کارکن وقتاً فوقتاً آکر بیٹھتے تھے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے اور تمام راستے میں تقریر کرنے والے انداز میں گفتگو کرتے تھے۔ پھر آپس میں بحث کرنے کے دوران مجھ سے بھی پوچھتے تھے کہ میں کس پارٹی کے ساتھ ہوں۔ میں ایک ناخدا ہوں جو سواریوں کو ٹریفک کے سمندر سے گزار کر ساحل پر پہنچاتا ہے۔ میں کرائے کے سلسلے میں تھوڑی سی بے ایمانی کرتا ہوں مگر انہیں منجدھار میں کبھی نہیں ڈبوتا۔ میں اپنے ہی جیسی کسی پارٹی کے ساتھ تھا جو میری طرح تھوڑی سی بے ایمان ہو لیکن اتنی ایماندار ہو کہ عوام کے جان و مال کے ساتھ انہیں بخیریت ساحل پر پہنچا دیا کرے۔
اگر میں پچھلی سیٹ پر بیٹھنے والوں سے یہ بات کہتا تو وہ میری پشت میں چھرا گھونپ دیتے۔ وہ صرف یہ سننا چاہتے تھے کہ ان کے سامنے آنے والا ہر شخص ان کی پارٹی کا ساتھ دینے والا ہے۔ اپنی ٹیکسی کو سلامت رکھنے کے لیے اور اپنے جسم کو توڑ پھوڑ سے بچانے کے لیے جو پارٹی سوالی بن کر میرے سامنے آتی تھی میں اسی کا ساتھ دینے کا وعدہ کرتا تھا۔ موقع محل کی مناسبت سے کامیاب لیڈروں کے وعدوں کی طرح میرے وعدے بھی بدلتے جاتے تھے۔ اتنی سیاست کے باوجود مجھے نقصان اٹھانا پڑا۔ ایک دن میری ٹیکسی ان ہنگاموں کی نذر ہوگئی۔ دو سیاسی پارٹیوں کے ٹکراؤ

کے درمیان میری ٹیکسی آ گئی تھی۔ میں نے وہاں سے ٹیکسی نکال کر لے جانے کی بہت کوشش کی مگر میں خود پتھراؤ کی زد میں آ گیا۔ مجھے مجبوراً ٹیکسی سے نکل کر بھاگنا پڑا۔ اتنے میں پولیس کی طرف سے لاٹھی چارج شروع ہو گیا۔ لوگوں کو دھمکانے کے لیے ہوائی فائر بھی کیے گئے۔ فائرنگ کی وجہ سے بھگدڑ مچ گئی۔ تھوڑی دیر بعد جب میدان صاف ہوا تو میں نے دیکھا کہ ایک جلتی ہوئی دکان کے سامنے میری ٹیکسی بھی جل رہی تھی۔

ہم ان ہنگاموں میں کس طرح لٹ جاتے ہیں، یہ میرے لٹنے کا منظر دیکھ کر سمجھ میں آ سکتا ہے۔ میں نے دس برس پہلے وہ ٹیکسی قسطوں پر لی تھی۔ پورے آٹھ برس تک میں اس کی قسطیں بھرتا رہا تھا۔ قسطیں ادا کرتے کرتے وہ نئی ٹیکسی کٹھارہ بن گئی تھی۔ وہ بیمار پڑتی تھی، میں اس کا علاج کرتا تھا۔ وہ میلی ہو جاتی تھی، میں اسے نہلاتا تھا۔ وہ روٹھ جاتی تھی، میں کارخانے میں لے جا کر اسے مناتا تھا جو کماتا تھا اس پر خرچ کر دیتا تھا۔ ایک نخریلی بیوی کی طرح وہ روٹھنے کی ادائیں دکھا دکھا کر میری جیب سے پیسے نکال لیا کرتی تھی۔ وہ جیسی بھی تھی میری تھی، مگر اب میری نہیں رہی تھی۔ میرے سامنے اس کی جلی ہوئی لاش پڑی تھی۔

میں نے اس کے قریب جا کر دیکھا۔ وہ باہر سے اور اندر سے اس قدر جل گئی تھی کہ اب وہ مرمت کے قابل نہیں رہی تھی۔ اسے مرمت کرانے کا مطلب یہ ہوتا کہ اسے نئے سرے سے ایک نئی ٹیکسی بنانی پڑتی۔ یعنی اسے دوبارہ سڑک پر لانے کے لیے کم از کم دس پندرہ ہزار روپے کی ضرورت تھی۔ میں وہاں سے سر جھکا کر ایک کباڑیے کے پاس پہنچا۔ کباڑیے سے اس کا سودا کرتے وقت میرا دل رو رہا تھا۔

کباڑیے نے موقع سے فائدہ اٹھا کر اس آہنی ڈھانچے کی قیمتی اتنی گرادی کہ میں نے اسے بیچنا مناسب نہیں سمجھا۔ دو گھنٹے بعد جب میں اس ٹیکسی کی طرف سے واپس آیا تو اتنی دیر میں وہ آدھی رہ گئی تھی۔ جو کل پرزے کام کے رہ گئے تھے لوگ انہیں کھول کر لے گئے تھے اب وہ ایک بوڑھی طوائف کی طرح اتنی کھوکھلی ہو گئی تھی کہ کوئی اس پر نظر ڈالنا بھی گوارا نہیں کر سکتا تھا۔ اسے فروخت کرنا تو دور کی بات تھی، میں نے جھنجھلا کر اسے ایک لات ماری اور اسے سڑک پر چھوڑ کر آگے بڑھ گیا۔

میں بہت دیر تک ادھر ادھر بھٹکتا رہا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کہاں جاؤں؟ کیا کروں؟ میں شرپسندوں سے پوچھنا چاہتا تھا کہ وہ میری ٹیکسی کو جلا کر اور میرے منہ سے دو روٹیاں چھین کر کون سا انقلاب لانا چاہتے ہیں۔ یہ وقت اور یہ ہنگامے گزر جائیں گے، کوئی نہ کوئی پارٹی اقتدار سنبھال لے گی مگر امن و امان کے بعد کسی کی سمجھ میں یہ نہیں آئے گا کہ غریب اور غریب ہو گئے ہیں اور بدکاری، بے حیائی اور کرپشن اور زیادہ بڑھ گئی ہے۔

میں بھٹکتا ہوا بیلا رانی کے دروازے پر پہنچ گیا۔ ان دنوں ہر گھر کے دروازے پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ اس دروازے پر بھی موت کی سی خاموشی تھی۔ اب سے پہلے میری گاڑی کی آواز سن کر مونا دوڑتی ہوئی دروازے پر آ جاتی تھی، کبھی میرا ہاتھ پکڑ کر گھر میں لے جاتی کبھی اسکول کی کتابیں اٹھائے میرے پاس ٹیکسی میں آ کر بیٹھ جاتی تھی۔ جب سے وہ بھی میری ٹیکسی میں بیٹھنے لگی تھی تب سے میں نے فٹ پاتھ کی ٹیکیوں کو پچھلی سیٹ پر بٹھانا چھوڑ دیا تھا۔ دو برس سے میں نے کسی بدکار عورت کا چہرہ نہیں دیکھا تھا۔ صرف اس معصوم بچی کا چہرہ اگلی سیٹ پر دیکھتا رہا جو میری مصلح الدین اور بیلا رانی کی بیٹی تھی۔ ہم تینوں اس معصوم بچی کی حفاظت کر رہے تھے اور وہ بچی ہم میں ایک صاف ستھری زندگی گزارنے کا جذبہ پیدا کر رہی تھی۔

اس روز مونا دروازے پر نہیں آئی کیونکہ اس نے دروازے پر گاڑی کی آواز نہیں سنی تھی۔ وہ ٹیکسی روزی کا ذریعہ نہ سہی ایک معصوم بچی کو اپنی طرف بلانے کا چلتا پھرتا کھلونا تھی۔ مجھ سے ٹیکسی اور مونا سے اس کا کھلونا چھن گیا تھا۔ میں دروازہ کھول کر اندر چلا آیا۔ شام کا وقت تھا، کمرے میں مدھم مدھم سی تاریکی پھیل رہی تھی۔ ایک چارپائی پر مصلح الدین لیٹا ہوا تھا، اسی چارپائی کے سرے پر مونا سر جھکائے بیٹھی ہوئی تھی۔ دروازے پر آہٹ ہوئی تو اس نے پلٹ کر دیکھا۔ مجھے دیکھتے ہی دوڑتی ہوئی اور روتی ہوئی آ کر مجھ سے لپٹ گئی۔ پھر رونے کے دوران سسکیاں لے کر کہنے لگی۔

''چاچا جی! مجھے بہت ڈر لگ رہا ہے، امی صبح سے گئی ہیں ابھی تک نہیں آئیں۔ ابو چپ چاپ پڑے ہیں کچھ بولتے نہیں ہیں۔ پڑوس کی ماسی کہہ رہی تھی کہ شہر میں بہت سے لوگ مر رہے ہیں۔ اس اندھیرے میں مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے بہت سے لوگ مجھے بھی مارنے کے لیے آ رہے ہیں۔ چاچا جی آپ مجھے چھوڑ کر نہ جائیں، امی بہت خراب ہیں مجھے چھوڑ کر چلی جاتی ہیں''۔

اب وہ اونچائی میں میرے کاندھے تک پہنچ گئی تھی مگر ہمارے لاڈ پیار نے اسے دنیا والوں سے بہت دور ایک معصوم اور بھولی بھالی گڑیا بنا کر رکھا تھا۔ وہ یا تو گھر کی چار دیواری میں رہتی تھی یا میری ٹیکسی میں بیٹھ کر اسکول آتی جاتی تھی۔ اس کے آگے جو دنیا ہے اس نے اسے نہیں دیکھا تھا۔ میں بڑے پیار سے اس کے سر کو سہلاتا ہوا اور پیٹھ کو تھپکتا ہوا تسلیاں دیتا رہا۔ پھر میں مصلح الدین کے قریب آیا، وہ اپنے بستر پر ایک لاش کی طرح پڑا ہوا تھا۔ اس نے صرف دیدے گھما کر مجھے دیکھا، اس کے ہونٹوں پر پھیکی سی مسکراہٹ آئی۔ میں نے خیریت پوچھی تو وہ کوئی جواب نہ دے سکا۔ مونا نے کہا۔

''ابو بہت بیمار ہیں، باتیں نہیں کر سکتے ہیں''۔

''کب سے بیمار ہیں؟''

''جب سے ریڑھ لوٹ لیا گیا ہے۔ باہر لوگ لوٹتے بھی ہیں اور مارتے بھی ہیں''۔

وہ نہیں جانتی تھی کہ اس گھر کے باہر والی دنیا میں کیا ہو رہا ہے اس لیے وہ تفصیل سے مجھے کچھ نہیں بتا سکی۔ میں نے پوچھا۔

''تم نے کیا کھایا ہے؟''

''چاچا جی کھانے کے لیے کچھ نہیں ہے، ابو دو مہینے سے بیمار ہیں۔ کبھی کھانے کے لیے ملتا ہے کبھی ہم بھوکے رہتے ہیں۔ صبح امی کہہ گئی تھیں کہ وہ آپ کے پاس جا رہی ہیں۔ آپ سے کچھ پیسے لے کر آئیں گی۔ آپ تو آ گئے مگر وہ ابھی تک نہیں آئیں''۔

میں نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر کہا۔

''فکر نہ کرو بیٹے میں ابھی تمہارے لیے کھانا اور ابو کے لیے دودھ لے کر آتا ہوں۔ تم لالٹین روشن کرو اندھیرا ہو رہا ہے''۔

یہ کہہ کر میں نے دودھ لانے کے لیے برتن لیا اور گھر سے باہر چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد کباب، روٹیاں اور دودھ لے کر واپس آنے لگا تو بیلا رانی نظر آئی۔ وہ آگے آگے جا رہی تھی اور میں پیچھے تھا۔ میں اسے آواز دینا چاہتا تھا کہ اسی وقت وہ اپنے گھر کے دروازے میں داخل ہو گئی۔ جب میں دروازے کے قریب پہنچا تو اندر سے اس کی آواز سنائی دی۔ وہ مونا سے کہہ رہی تھی۔

"بیٹی تمہارے چاچا ملے تھے انہوں نے مجھے ڈھیر سارے پیسے دیئے ہیں۔ دیکھو میں تمہارے لیے کتنی چیز لے کر آئی ہوں"۔

اس کی باتیں سنتے ہی میں دروازے سے باہر ٹھٹک کر کھڑا ہو گیا۔ وہ جھوٹ کہہ رہی تھی کہ مجھ سے ملاقات ہو چکی ہے اور جو پیسے اس کے پاس تھے وہ میں نے نہیں دیے تھے۔ پھر وہ کہاں سے لائی تھی؟ مونا کی آواز سنائی دی۔

"امی کتنی ساری چیزیں ہیں۔ چاچا جی بھی میرے لیے کھانا اور ابو کے لیے دودھ لینے گئے ہیں"۔

"آں" اس کی گھبرائی ہوئی سی آواز سنائی دی "کیا شیدے یہاں آیا ہے؟"

میں کمرے کے اندر آ گیا۔ بیلا رانی ایک دم سے گھبرا کر کبھی مجھے اور کبھی مصلح الدین کو دیکھنے لگی۔ مصلح الدین کی زبان بند تھی مگر کان کھلے تھے وہ سب کچھ سن چکا تھا اور بہت کچھ سمجھ چکا تھا۔ اس کے ساکت جسم میں اچانک ہلچل سی مچ گئی تھی۔ وہ چت لیٹے ہی لیٹے تھر تھر کانپ رہا تھا۔ بیماری اور نقاہت کے باوجود اس کا چہرہ ایک دم سے سرخ ہو گیا تھا، آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر ابلتی ہوئی نظر آ رہی تھیں پھر ایک جھٹکے سے اس نے سر گھما کر خون کی قے کر دی۔ بیلا رانی چیختی ہوئی اس سے لپٹ گئی۔

"نہیں مصلے! تم مجھے غلط نہ سمجھو، میں حرام کے پیسے نہیں لائی ہوں۔ میں نے یہ پیسے شیدے سے ادھار مانگے ہیں۔ شیدے تم خاموش کیوں کھڑے ہو؟"

وہ مصلح الدین کے پاس سے دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی اور مجھے جھنجھوڑتی ہوئی کہنے لگی۔

"شیدے خاموش نہ رہو۔ اسے بتاؤ کہ یہ پیسے تم نے دیئے ہیں۔ تم نہیں بولو گے تو میری دنیا لٹ جائے گی۔ یہ کئی بار خون کی قے کر چکا ہے۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ اس کا مکمل علاج نہیں ہو گا تو یہ......"

وہ میرے پاس سے دوڑتی ہوئی پھر مصلح الدین کے پاس گئی اور اس سے لپٹ کر کہنے لگی۔

"نہیں، میں تمہیں مرنے نہیں دوں گی۔ دیکھو میں تمہارے لیے کتنی دوائیں لے کر آئی ہوں۔ میں نے مزدوری کی ہے مصلے۔ میری مزدوری کی لاج رکھ لو۔ میری مونا کے لیے اچھے ہو جاؤ"۔

ساری باتیں میری سمجھ میں آ گئی تھیں۔ میں مصلح الدین کے قریب جا کر اسے سمجھانے لگا کہ بیلا رانی سچ کہہ رہی ہے۔ اس کی دوائیں میرے پیسوں سے آئی ہیں۔ مونا اپنے باپ کے چہرے، گردن اور تکیے پر گرے ہوئے لہو کو پونچھ رہی تھی مگر تیر کمان سے نکل چکا تھا۔ میرا جھوٹ اس کے آگے سچ نہ بن سکا۔ اس نے پھر قے کر دی۔ بیلا رانی تڑپ کر اٹھ گئی۔ چیخ کر بولی۔

"شیدے! جلدی سے ڈاکٹر کو بلاؤ۔ دیکھو ظالموں نے میرے مصلے کا کیا حال بنا دیا ہے"۔

میں جلدی سے پلٹ کر ڈاکٹر کو بلانے کے لیے گھر سے باہر آ گیا۔ میرے پیچھے بیلا رانی بھی آ گئی۔ میں نے اس سے کہا۔

"تم مصلح الدین کو چھوڑ کر نہ آؤ۔ میں ابھی ڈاکٹر کو لے کر آتا ہوں"۔

وہ میرے ساتھ چلتی ہوئی بولی۔

"ابھی میں اس کے سامنے رہوں گی تو مجھے دیکھ کر اسے اور تکلیف پہنچے گی"۔

"بیلا! میں پچھلے دو ماہ سے یہاں نہیں آ سکا۔ میں بھی شر پسندوں کی لپیٹ میں آ گیا تھا اور جیل میں ٹھونس دیا

گیا تھا۔ پرسوں رہا ہو کر آیا تو سوچا کہ کچھ کمائی کر لو پھر مونا کے لیے کچھ چیزیں خرید کر لے جاؤں گا مگر آج میری ٹیکسی جلا دی گئی ہے۔ آمدنی کا جو واحد ذریعہ تھا وہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا ہے"۔

"شیدے! ان سیاسی ہنگاموں نے ہمیں برباد کر دیا ہے۔ مصلح الدین کا رہڑہ لوٹ لیا گیا پھر اسے توڑ کر اس کی لکڑیوں کو لوگوں نے مار پیٹ کے ہتھیار بنا لیے۔ اس نے اپنی آخری پونجی کو بچانے کی انتہائی کوششیں کیں۔ اسی دوران قانون کے محافظ آ گئے۔ کسی کی پیشانی پر یہ نہیں لکھا ہے کہ کون ظالم ہے اور کون مظلوم؟ قانون کے محافظ سبھی کو ایک لاٹھی سے ہانکنے لگے۔ انہوں نے رائفل کے کندے سے مصلح الدین کے سینے پر کئی ضربیں لگائیں۔ تب سے وہ خون کی قے کر رہا ہے۔ دواؤں سے افاقہ ہوتا ہے مگر کچھ دنوں کے بعد پھر خون تھوکنے لگتا ہے۔ اس کے دل کے پاس کوئی رگ پھٹ گئی ہے۔ اگر توجہ سے علاج نہ ہو سکا تو وہ خون تھوکتے تھوکتے مر جائے گا"۔

یہ کہہ کر وہ رونے لگی اور اپنے آنچل سے آنسو پونچھنے لگی۔

"وہ بہت خوددار ہے شیدے۔ کہتا ہے بھوکی مر جاؤ۔ مجھے دواؤں کے بغیر مار ڈالو مگر فٹ پاتھ پر نہ جاؤ۔ حرام کا ایک پیسہ بھی لاؤ گی تو میں مر جاؤں گا۔ میں نے کام کرنے کی بہت کوشش کی مگر کام کہاں ملتا ہے۔ کارخانے بند پڑے ہیں۔ دو چار دن کے لیے کھلتے ہیں تو وہاں نئی کام والیوں کے لیے گنجائش نہیں نکلتی۔ کسی گھر میں ہانڈی برتن دھونے کا کام بھی نہ مل سکا۔ پچھلے دنوں میں نے پانی پی کر اور مونا کو ایک وقت کھلا کر دن کاٹے ہیں۔ میں بھوکی رہ سکتی ہوں اور مصلح الدین کی خودداری کو قائم رکھنے کے لیے مر بھی سکتی ہوں مگر ایک معصوم کلی کو مرجھاتے کیسے دیکھ سکتی ہوں۔ اپنے مجازی خدا کو دواؤں کے بغیر کس طرح مرتے دیکھ سکتی ہوں۔ دوائیں بند ہو جاتی ہیں تو خون جاری ہو جاتا ہے۔ میں بہت مجبور ہو گئی تھی شیدے میں بہت مجبور ہو گئی تھی۔ اس لیے پھر فٹ پاتھ پر چلی گئی۔ پچھلے دو دن سے میں نے یہ بات مصلے سے چھپا رکھی تھی۔ میں نے سوچا اگر میں دھوکا دے کر ایک شریف آدمی کو زندہ رکھ سکتی ہوں تو اس کی شرافت کو زندہ رکھنے کے لیے مجھے ذلالت پر اتر آنا چاہیے۔ ہاں میں ذلیل ہوں۔ جب وہ اچھا ہو جائے گا تو میں اپنے آپ پر تھوکوں گی مگر ابھی اسے خون تھوکتے نہیں دیکھ سکتی"۔

وہ کہتے کہتے اس طرح ہانپنے لگی جیسے صدیوں کی مسافت طے کر کے آ رہی ہو۔ پھر وہ ذرا دم لے کر بولی۔

"میں مصلے کے اعتماد کو قائم رکھنے کے لیے رات کو گھر سے نہیں نکل سکتی تھی اس لیے دن کو فٹ پاتھ پر آ گئی۔ میں نے سوچا ہنگاموں میں لوٹ مار کے دوران کوئی مجھے بھی لوٹ کر لے جائے گا تو کم از کم بیس پچیس روپے میرے ہتھیلی پر رکھ دے گا مگر لوٹ مار کے وقت جہاں نئے کپڑوں کے تھان، ریڈیو اور ٹی وی سیٹ ہاتھ آ رہے ہوں وہاں پرانی مشین کو اٹھا کر کون لے جاتا ہے؟"

اس کی باتیں سن کر میں نے اس پر نظر ڈالی تو وہ واقعی کھنڈر نظر آئی۔ وہ بالکل میری اسی ٹیکسی کی طرح تھی جس کے اندر سے لوگ اپنے کام کے کل پرزے نکال کر لے جا چکے تھے اور پچکے ہوئے ڈھانچے کو چھوڑ دیا تھا۔

جس ڈاکٹر سے وہ مصلح الدین کا علاج کرا رہی تھی وہ نہیں ملا۔ ہم دوسرے ڈاکٹر کو لے کر آ گئے۔ اس نے مصلح الدین کو دیکھتے ہی کہا۔

"اس کی حالت بہت نازک ہے۔ اسے دونوں وقت انجکشن لگانے ہوں گے۔ میں جو دوائیں لکھ کر دے رہا ہوں انہیں فوراً لے آؤ"۔

بیلا نے اپنی لائی ہوئی دوائیں اسے دکھائیں۔ ایک ڈاکٹر دوسرے ڈاکٹر کے علاج اور اس کی تجویز کردہ دواؤں سے متفق نہیں ہوتا۔ اس نے ڈھیر ساری دواؤں میں سے صرف ایک دوا کو کارآمد بتایا۔ باقی دواؤں کا نسخہ خود لکھ کر دیا۔ اپنی فیس اور انجکشن کے پندرہ روپے لیے اور تسلیاں دے کر چلا گیا۔

مصلح الدین آنکھیں بند کیے چپ چاپ لیٹا ہوا تھا۔ بیلا رانی نے مجھے ایک طرف لے جا کر کہا۔

''میں جو پیسے لائی تھی وہ دواؤں میں ختم ہوگئے اگر دوکاندار یہ دوائیں واپس لے کر نئی دوائیں دے دے گا تو میرا خیال ہے پیسوں کی ضرورت نہیں پڑے گی''۔

میں نے اپنی جیبیں ٹٹول کر پیسے نکالے۔ میرے پاس اٹھائیس روپے تھے میں نے وہ روپے اسے دیتے ہوئے کہا۔

''مونا یہاں اکیلی گھبرائے گی، میں یہاں رہتا ہوں تم یہ روپے لے جاؤ اگر دوائیں واپس نہ ہوسکیں تو نئی دوائیں خرید کر لے آنا''۔

وہ روپے لے کر چلی گئی۔ میں نے مونا کے پاس آکر اسے پیار سے پچکارتے ہوئے کہا۔

''چلو بیٹے تم کھانا کھالو۔ تمہاری امی دوائیں لینے گئی ہیں۔ اب تمہارے ابو اچھے ہو جائیں گے''۔

وہ باپ کے پاس سے اٹھ کر چٹائی پر آکر بیٹھ گئی۔ میں نے اس کے سامنے کھانے کی چیزیں رکھ دیں پھر اس کے پاس بیٹھ کر پہلا لقمہ اپنے ہاتھ سے کھلایا۔ اس کے بعد وہ اپنے ہاتھ سے لقمے اٹھا کر آہستہ آہستہ کھانے لگی۔ میں لالٹین کی روشنی میں اسے خاموشی سے دیکھ رہا تھا۔ میں نے شادی نہیں کی، میری کوئی اولاد نہیں ہے مگر وہ مجھے اپنے جگر کا ٹکڑا نظر آرہی تھی۔ بچے کھاتے وقت بھی کتنے معصوم اور ہر فکر سے کتنے آزاد نظر آتے ہیں۔ اس کی بے فکری نے مجھے دنیا جہان کی فکروں میں مبتلا کردیا۔ ٹیکسی نہیں تھی۔ رہڑہ نہیں تھا۔ مصلح الدین بیمار تھا اور میں بیکار تھا مگر زندگی کی ضرورتیں چیخ رہی تھیں۔ ابھی مزید دواؤں اور انجکشنوں کے لیے، روٹی اور کپڑے کے لیے، مونا کی تعلیم کے لیے اور اس کی معصوم ہنسی کو قائم اور دائم رکھنے کے لیے، صبح و شام پیسوں کی ضرورت تھی۔ پیسے کہاں سے آئیں گے؟ اس گھر میں کوئی ایسی چیز نہیں تھی جسے فروخت کر کے کچھ دنوں کے لیے زندگی کو بہلایا جاسکتا تھا۔ میں ٹیکسی سے چھوٹ کر پیدل ہوگیا تھا اور ہم سب پیدل کتنی دور تک چل سکتے تھے؟

مصلح الدین اچانک کھانسنے لگا۔ میں دوڑتا ہوا اس کے پاس آیا اور اس کے سینے کو سہلانے لگا۔ کھانسی کے دوران پھر اس کی آنکھیں اپنے حلقوں سے باہر ابل رہی تھیں۔ وہ وحشت زدہ نظروں سے اس اندھیری دنیا کو دیکھ رہا تھا۔ شاید اس اندھیرے میں وہ بیلا رانی کو تلاش کر رہا تھا اور انکار میں سر ہلاتے ہوئے رات کی رانی کو اندھیرے میں بھٹکنے سے روک رہا تھا۔ اس کے سر پٹخنے کا انداز بتا رہا تھا کہ وہ خوددار ہے، بے حیائی کا ایک پیسہ قبول نہیں کرے گا۔

وہ زبان سے کچھ نہیں کہہ سکا۔ اس نے کھانستے کھانستے پھر خون کی قے کی اور ایک دم سے ساکت ہوگیا۔

میں نے گھبرا کر اس کی نبض دیکھی۔ کان رکھ کر اس کے دل کی دھڑکنوں کو سننے کی کوشش کی مگر کچھ سنائی نہ دیا۔ بیلا رانی کے لیے دھڑکنے والا دل ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا تھا۔ پتہ نہیں مونا نے میرے چہرے کو کیسے پڑھ لیا، وہ کھانا چھوڑ کر دوڑتی ہوئی آئی۔

''چاچا جی! کیا ہوگیا ابو کو؟ ابو پھر خاموش ہوگئے؟''

وہ باپ کے بہتے ہوئے لہو کو پونچھنے لگی اور اسے آوازیں دینے لگی۔ جب میں نے اسے بتایا کہ وہ اس کی آوازوں سے بہت دور چلا گیا تو وہ باپ کے چہرے کو اپنے سینے سے لگا کر دھاڑیں مار مار کر رونے لگی۔ اسی وقت بیلا رانی کمرے میں داخل ہوئی۔ میری آنکھیں خشک تھیں کیونکہ یہ پتھریلی آنکھیں رونا نہیں جانتیں مگر بیٹی کو ماتم کرتے دیکھ کر اس کے ہاتھوں سے دوائیں چھوٹ گئیں۔ میں نے اپنی جگہ سے اٹھ کر سر کو جھکا لیا۔ وہ دوڑتی ہوئی مصلح الدین کی لاش پر گر پڑی۔

کمرے کی محدود فضا ماں اور بیٹی کی آہ و بکا سے گونج رہی تھی۔ محلے پڑوس والے تھوڑی دیر میں آنے لگے۔ عورتوں نے آ کر افسوس کا اظہار کیا۔ صبر کی تلقین کی پھر واپس چلی گئیں کیونکہ بارہ بجے کرفیو لگنے والا تھا۔ سبھی کو کل شام تک لیے روٹی کی فکر کرنی تھی۔ کچھ لوگ محلے کی دو آدمیوں کی لاشیں لے کر آئے تھے جو ہنگامے میں مارے گئے تھے۔ ان کے کفن دفن کے لیے چندہ لیا جا رہا تھا۔ مجھے بھی خیال آیا کہ میرے پاس بھی پھوٹی کوڑی نہیں ہے اور مصلح الدین کی تجہیز و تکفین کا مسئلہ درپیش ہے۔ میں نے بیلا رانی کو دیکھا اسے روتے اور بین کرتے وقت کسی بات کا ہوش نہیں تھا۔ وہ ہوش و حواس میں رہتی تب بھی اس کے پلے کچھ نہ نکلتا کیونکہ اس کے پاس کچھ ہوتا تو وہ دواؤں کے لیے مجھ سے پیسے لے کر نہ جاتی۔

میں پریشان ہو کر سوچنے لگا۔ دور دور تک خیالی دوڑ لگائی کہ کسی جان پہچان والے سے کچھ ادھار رقم مل سکتی ہے یا نہیں؟ مگر ایسے وقت کوئی مہربان نظر نہ آیا۔ میں گھبرا کر مکان سے باہر آ گیا۔ باہر آتے ہی یاد آیا کہ ابھی میری ٹیکسی کا ڈھانچہ راستے میں پڑا ہوگا میں اسے اونے پونے بیچ کر مصلح الدین کے لیے کفن خرید سکتا تھا۔

اب میری جیب میں اتنے پیسے نہیں تھے کہ میں رکشے میں بیٹھ کر وہاں تک جا سکتا۔ مجبوراً بس میں بیٹھ کر جانا پڑا لیکن وہاں پہنچا تو ٹیکسی کا ڈھانچہ غائب ہو چکا تھا۔ وہ کہاں گیا؟ اس کا جواب دینے والا کوئی نہ تھا کیونکہ اس علاقے میں آٹھ بجے کرفیو لگنے والا تھا اور اب آٹھ بجنے ہی والے تھے۔ تمام دکانیں بند ہو چکی تھیں۔ اکا دکا لوگ جو بھاگے جا رہے تھے، وہ نہیں بتا سکتے تھے کہ میری مردہ ٹیکسی کہاں لے جا کر دفن کر دی گئی ہے۔

میں ہار پچھتا کر واپس آ گیا۔ اس وقت تک بیلا رانی کو ہوش آ گیا تھا کہ مصلح الدین کو مرنے کے بعد بھی پیسوں کی ضرورت ہے۔ جب تک پیسے نہیں ہوں گے تجہیز و تکفین کی رسمیں ادا نہیں ہو سکیں گی۔ میں نے اسے بتایا کہ میں اپنی بساط بھر کوشش کر چکا ہوں کہیں سے پھوٹی کوڑی بھی حاصل نہیں ہوئی۔ اگر تین گھنٹے کے اندر ہم کفن وغیرہ نہ لا سکے تو اس کے بعد کرفیو لگ جائے گا۔ کرفیو کے اوقات میں بھی مردے کو دفن کرنے کے لیے خصوصی اجازت مل جاتی ہے لیکن پہلے سے کفن وغیرہ خرید لینا ضروری ہے۔

''اب کیا ہوگا؟'' بیلا رانی پریشان ہو کر مصلح الدین کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ زندگی کے تمام مسائل سے نجات حاصل کر چکا تھا مگر بیلا رانی کے لیے مسئلہ بن گیا تھا۔ وہ محلے پڑوس والوں سے مدد مانگنے چلی گئی۔ میں بھی باہر نکل کر کچھ کوشش کرنا چاہتا تھا مگر مونا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا۔

''چاچا! مجھے ڈر لگتا ہے مجھے چھوڑ کر مت جائیے''۔

میں نے اسے سینے سے لگا لیا۔ وہ ایک لاش کے ساتھ تنہا کمرے میں نہیں رہ سکتی تھی۔ بڑی عمر کی عورتیں بھی اپنے سگوں کی لاش کے قریب تنہا بیٹھتے ہوئے ڈرتی ہیں اور مونا کی ابھی عمر ہی کیا تھی، وہ تو بچی تھی۔ زندگی کا تجربہ بس اتنا ہی تھا کہ اس نے پہلی بار اپنے گھر میں ایک انسان کو خون تھوک کر مرتے دیکھا تھا۔

میں اسے چھوڑ کر نہ جا سکا۔ ایک گھنٹے کے بعد بیلا رانی خالی ہاتھ واپس آ گئی اور اپنے آنچل سے آنسو پونچھتی ہوئی کہنے لگی۔

''سب اپنی اپنی پریشانیوں کا رونا رو رہے ہیں۔ سب ہی یہ کہتے ہیں کہ یہ ہنگامے ختم نہیں ہوں گے اسی لیے ہر ایک کو کل کی فکر ہے۔ ایسے میں کون دو چار روپے کی مدد کرتا ہے؟ اور کیا دو چار روپے میں کہیں کفن آتا ہے؟ ہم کتنے دروازوں پر جا کر کفن کے لیے چندہ مانگ سکتے ہیں۔ یہاں پہلے ہی دو لاشوں کے لیے چندہ اکٹھا کیا جا رہا ہے اور یہ کتنے افسوس کی بات ہے کہ جس شخص نے میرے اور میری بیٹی کے لیے اپنا گھر چھوڑ دیا، اپنے خون کے رشتے توڑ دیئے، میری زندگی کا راستہ موڑ دیا، ہمارے لیے فٹ پاتھ پر ریڑھ لگاتا رہا اور پولیس والوں سے کبھی مار کھاتا رہا اور کبھی انہیں رشوت دے کر ہمارے لیے آوازیں لگا کر پھل بیچتا رہا، اب وہاں سے خون تھوکتا ہوا آ کر صرف ایک کفن کا مطالبہ کر رہا ہے۔ زندگی میں کچھ نہیں مانگا مرنے کے بعد مانگ رہا ہے تو میں اسے چندے یا خیرات کا کفن پہناؤں؟''

یہ کہہ کر اس نے دونوں ہاتھوں سے چہرے کو ڈھانپ لیا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ میں نے کہا۔

''یہ آنسو زندگی میں کچھ نہیں دیتے، کسی کے مرنے کے بعد کیا دیں گے؟ صرف پیسہ ہی سب کچھ دیتا ہے۔ اب یہی ایک راستہ رہ گیا ہے کہ ہم مصلح الدین کے والدین تک یہ خبر پہنچا دیں''۔

بیلا رانی نے سر اٹھا کر آنسو بھری آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ کچھ دیر تک سوچتی رہی پھر بڑے کرب سے بولی۔

''ہائے، میں اپنے مصلے کے آخری وقت بھی کام نہ آ سکی۔ تم ٹھیک کہتے ہو اس کے والدین کو معلوم ہو گا تو اسے عزت سے کفن نصیب ہو گا۔ اس کے ماں باپ رنچھوڑ لائن میں رہتے ہیں۔ تم میرے ساتھ [illegible] تو ہم ایک گھنٹے میں انہیں لے کر یہاں آ جائیں گے''۔

''میں تمہارے ساتھ کیسے جا سکتا ہوں؟ یہاں مونا اکیلی نہیں رہے گی''۔

وہ پریشانی سے مونا کو دیکھ کر بولی ''میں بھی تنہا نہیں جا سکتی۔ جگہ جگہ فوج کے سپاہی راستہ روک کر پوچھیں گے کہ میں کس نیت سے اتنی رات کو تنہا گھوم رہی ہوں''۔

وہ تنہا نہیں جا سکتی تھی۔ مونا کو بھی تنہا نہیں چھوڑا جا سکتا تھا۔ وہ پہلے ہی لاش کے پاس سے ہٹ کر میرے پاس آ گئی تھی۔ میں نے کہا۔

''ہم تینوں ساتھ چلیں گے۔ لاش تنہا رہ سکتی ہے۔ ہم دروازے کو باہر سے بند کر دیں گے۔ صرف گھنٹے آدھے گھنٹے کی بات ہے اگر ہم رکشے میں جائیں گے تو جلدی واپس آ جائیں گے۔ کیا تمہارے پاس دواؤں میں سے کچھ پیسے بچے ہیں؟''

''تمہارے اٹھائیس روپے میں سے صرف آٹھ روپے رہ گئے ہیں۔ کیا آنے جانے کا کرایہ ہو جائے گا؟''

''چلو جانے کا کرایہ تو ہو جائے گا۔ واپسی میں ہم مصلح الدین کے والدین کے ساتھ آئیں گے''۔

میں مونا کا ہاتھ تھام کر باہر آ گیا۔ بیلا رانی نے دروازے پر آ کر مصلح الدین کی لاش پر الوداعی نظر ڈالی۔ وہ اسے تنہا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی مگر مجبوری تھی۔ اس نے دروازے کو بند کر کے باہر سے تالا ڈال دیا۔ پھر ہم رکشے کی تلاش میں چل پڑے۔ ابھی سڑکوں پر آمد و رفت تھی۔ دوسرے دن شام تک گھروں میں بند رہنے کے لیے ضروری سامان کی خرید و فروخت ہو رہی تھی۔ ہمیں جلد ہی رکشہ مل گیا۔ ہم تین افراد کو رکشے میں بٹھانے کے لیے اس نے میٹر

سے ایک روپیہ زیادہ لیا اور ہمیں رنچھوڑ لائن تک پہنچا دیا۔

سیاسی ہنگاموں کے دوران رنچھوڑ لائن ایک ایسی جگہ تھی جہاں ہنگامے نہیں ہوتے تھے اور نہ ہی کرفیو کی پابندیاں عائد کی جاتی تھیں۔ وہاں راتوں کو بھی اچھی خاصی رونق رہتی تھی۔ وہاں قانون سے کھیلنے والوں نے شراب، جوئے اور وی سی آر پر بھارتی فلمیں دکھانے کے اڈے قائم کر رکھے تھے اور عیاش طبع لوگ عورتوں کی تلاش میں سڑکوں پر بھٹکتے رہتے تھے ہم مصلح الدین کے گھر پہنچے تو کوٹھی کے چوکیدار نے بتایا کہ صاحب لوگ لاہور چلے گئے ہیں، ہنگامے ختم ہونے کے بعد واپس آئیں گے۔

میں اور بیلا رانی ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ہم پورے یقین کے ساتھ وہاں گئے تھے کہ والدین اپنی نافرمان اولاد سے کتنی ہی نفرت کریں مگر آخری بار اس کا دیدار ضرور کرتے ہیں اور تجہیز و تکفین کی آخری رسوم بھی ادا کرتے ہیں لیکن ہم مصلح الدین کے والدین تک اس کے مرنے کی خبر بھی نہیں پہنچا سکتے تھے۔

ہم مایوس ہو کر وہاں سے لوٹ گئے۔ واپسی کے لیے پورا کرایہ نہیں تھا۔ مونا میرے بازو سے لگی چل رہی تھی۔ اس نئی نسل کے ساتھ چلتے وقت احساس ہوا کہ میں بہت بوڑھا ہو چکا ہوں اور ہر طرف سے اتنا ٹوٹ چکا ہوں کہ ایک جوان ہونے والی بیٹی کا بھی سہارا نہیں بن سکتا۔ بیلا رانی یوں بڑبڑاتی جا رہی تھی جیسے ہوش و حواس کھو چکی ہو۔

''میرا مصلے کیوں مر گیا؟'' وہ سوال کر رہی تھی اور خود ہی جواب دے رہی تھی ''اس لیے مر گیا کہ وہ خوددار تھا۔ اپنی زندگی میں حرام کا ایک پیسہ بھی قبول نہیں کرنا چاہتا تھا''

ہم ایک گلی سے نکل کر سڑک پر آ گئے اور ایک تھلے کے پاس نیم تاریکی میں کھڑے ہو گئے۔ ہماری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ہم کہاں جائیں اور کیا کریں؟ وہ بدستور بڑبڑا رہی تھی۔

اس کے بڑبڑانے کے دوران دو شرابی لڑکھڑاتے ہوئے آئے اور ہم سے ذرا دور رک کر آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ہمیں نیم تاریکی میں دیکھنے کی کوشش کرنے لگے۔ اچانک ہی بیلا رانی کمان سے نکلے ہوئے تیر کی طرح ہمارے درمیان سے نکلی اور ان کے سامنے پہنچ گئی۔ وہ دونوں نشے میں تھے۔ انہیں نئے اور پرانے مال، تازہ اور باسی کھانے کی پہچان نہیں تھی۔ نشے کی حالت میں وہ بیلا رانی کی عمر کا حساب نہیں کر سکتے تھے، اس لیے خوش ہو کر سودا کرنے لگے۔

اسی وقت ایک اسکوٹر موڑ کاٹتا ہوا وہاں سے گزرا۔ اس کی ہیڈ لائٹ کی روشنی مجھ پر سے ہوتی ہوئی مونا پر جھلملاتی ہوئی اور نیم تاریکی میں ایک کلی کے حسن کو اجاگر کرتی ہوئی گزر گئی۔ اچانک ہی سودا کرنے والوں کو نئے اور پرانے کی پہچان ہو گی۔

وہ پچکے ہوئے ڈھانچے کو ایک طرف دھکا دیتے ہوئے نئی ٹیکسی کے سامنے کھڑے ہو گئے۔ چشم زدن میں ایک کلی اپنی شاخ سے ٹوٹ کر طوفانی ہواؤں کی زد میں ادھر سے ادھر ہوتی نظر آئی تو میں پہلی بار زندگی میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

اب کس کے لیے بے حیائی کا کفن خریدنا تھا۔ ایک خوددار انسان کے لیے ایک مرجھائے ہوئے پھول کے لیے، یا ایک معصوم نوخیز کلی کے لیے......؟

☆O.....O☆